نگار

قیمت ۸ر

نرخنامۂ اجرت اشتہار

	ایک سال	۶ ماہ	۳ ماہ	ایک ماہ
ایک صفحہ	۷۵ روپیہ	۵۰ روپیہ	۲۵ روپیہ	۹ روپیہ
آدھ صفحہ	۵۰ "	۲۵ "	۱۳ "	۷ "
چوتھائی صفحہ	۲۵ "	۱۳ "	۷ "	۳ "

(۱) اجرت بہرحال پیشگی لیجائیگی۔ وی پی یا وی پی کے ذریعہ سے وصولی منظور نہیں۔

(۲) جتنی مدت کیلئے اشتہار دیا جانا طے ہوا ہو اسکی رقم پیشگی یکمشت لی جائیگی۔
ماہانہ ادائی کی صورت میں نرخ وہی ماہانہ رہیگا

(۳) اشتہار فراہم کرنے والی کمپنیوں کا کمیشن ذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے

منیجر

نگار کی قیمت

سالانہ ہندوستان کے اندر پانچ روپیہ ششماہی ہندوستان کے اندر تین روپیہ
" بیرون ہند آٹھ روپے " بیرون ہند پانچ روپیہ

(نوٹ) رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ تک شائع ہو جاتا ہے۔ ۲۵ تک اطلاع آنے پر دوبارہ روانہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ بعد کو ۸ رفی پرچہ کے حساب سے قیمت لی جائے گی

منیجر

حصول جواب کے لئے ٹکٹ آنا ضروری ہے

خط و کتابت میں اگر نمبر خریداری نہ دیا گیا تو تعمیل دشوار ہے

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین جولائی ۱۹۳۵ء	شمارہ (۱)

ملاحظات ———————— ۲
پارسی اہل کتاب ہیں ———— سید محمد طاہر رضوی ایم اے ———— ۹
دیر و حرم کے قصے (افسانۂ تاریخی) ———— پنڈت کشن پرشاد کول ———— ۲۲
مصطفےٰ کمال اور جنگِ عظیم ———————— ۳۴
جھانسی کی رانی (ڈرامہ) ———————— ۴۴
مسئلہ خلافت و امامت ———— سید ابو سعید بزمی ———— ۵۳
آفتاب کی کرشمہ سازیاں ———— حافظ غازیپوری ———— ۶۲
باب المراسلہ والمناظرہ (افسانہ [illegible] کی آپ بیتی) ————
[illegible] لی جائے [illegible]

[illegible] لوریپہان کا تعلیم یافتہ انسان اگر عاری ہوتا ہے تو [illegible] خصوصیات سے - یعنی نہ اس میں تمدن دنیا کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ اس کے دماغ میں اس امر کی اہلیت کہ وہ صدیوں سال قبل کی تصانیف سے ہٹ کر کسی نئی بات پر

نگار

ایڈیٹر:۔ نیاز فتحپوری

شمار (۱)	جولائی ۱۹۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات

ہماری مذہبی درسگاہیں اور ہمارے مذہبی رہنما

تمام تمدنی مسائل میں سب سے زیادہ اہم مسئلہ جس کو مرکزی و اساسی حیثیت حاصل ہے اور جس سے ایک قوم کا مستقبل متفرع ہوتا ہے، تعلیم وتربیت کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ انسان کی وہ خصوصیت خاصہ جو اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے یہی ہے کہ وہ اپنی دماغی ساخت کے لحاظ سے ایک کائنات ترقی اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے۔ اور زمانہ کی رَو کو بھی اپنے اقدامات سعی و عمل کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اسی لئے دماغی و ذہنی تعلیم وتربیت کا مسئلہ ہر ملک اور ہر زمانہ میں بہت اہم مانا گیا ہے۔ اور اسی کی ترقی و اصلاح پر قوموں کی ترقی کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

کچھ خبر نہ تھی کہ انسان کیا چیز ہے اور اس میں کتنی غیر محدود قابلیت ترقی کی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ سب سے پہلے جو تعلیم پیش کی گئی وہ توحید کی تھی۔ اس سے مدعا صرف یہ تھا کہ بتوں کی پرستش سے جو اضمحلال ان کے قوائے دماغی میں پیدا ہوگیا تھا وہ دُور ہو اور وہ دوسروں پر بھروسہ کرنا چھوڑ کر خود اپنے قوا کا منہ سے کام لینا سیکھیں۔ پھر اس کیساتھ ساتھ ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی کہ وہ ہر بات پر غور کرنے کی عادت ڈالیں۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور نوامیس فطرت کے خصائص کا مطالعہ کر کے کسی نتیجہ تک پہنچیں۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ کلام مجید تفکر و تدبر کی ہدایتوں سے بھرا پڑا ہے اور سب سے زیادہ زور اس نے اسی امر پر دیا ہے۔

پھر اسکا جو اثر ہوا وہ بھی تاریخ داں حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ وہ کونسا علم تھا جو مسلمانوں کی سعی و کاوش سے بچا رہا اور وہ کونسی تحقیق تھی جس میں انہوں نے انتہائی سرگرمی سے کام نہیں لیا۔ اگر یورپ کی موجودہ ترقی کی تاریخی جستجو کی جائے تو اسکا سررشتہ مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں نظر آئیگا اور علوم حالیہ کے ابتدائی خط و خال اگر دیکھنا ہوں تو اسلام کے عہد زریں کے اختراعات کو دیکھنا ضروری ہوگا۔ بہرحال مسلمانوں کی علمی، دماغی ترقیاں سب اسی تفکر و تدبر کا نتیجہ تھیں۔ اور ان کی تمام تعلیمی سرگرمیاں اسی اصول پر قائم تھیں۔ لیکن جب رفتہ رفتہ وہ عیش و راحت کے خوگر ہوکر اس جد و جہد سے غافل ہوگئے۔ تو اسکا نتیجہ وہی ہوا جو ہمیشہ ایک جگہ ٹھہر جانے والوں کا ہوا ہے۔

بعض لوگوں کا اعتراض ہے کہ یہ مذہب نہایت قدامت پرست واقع ہوا ہے اور اس میں ترقی کرنے کی صلاحیت موجود نہیں ہے۔ لیکن ایسا کہنا نتیجہ ہے بے خبری کا۔ کیونکہ حقیقتاً دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے سوائے عمل کے اور کچھ نہیں بتایا اور جو عبادت و طاعت کا بھی مفہوم صرف استعداد و ترقی قرار دیتا ہے۔ لیکن اسکی شکایت ہم کو غیروں سے کیا ہوسکتی ہے جبکہ اس حقیقت کو مسلمانوں ہی نے پس پشت ڈالدیا۔ اور انھیں کی ذہنیت نے مذہب کو دنیا سے علیحدہ کر کے اس کے مفہوم کو مسخ کر کے رکھدیا۔ یہانتک کہ آج ہماری درسگاہوں کی انتہائی معراج وہ ہے جو دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوہ میں نظر آتی ہے۔ اور ہم میں سب سے بڑا مسلمان وہ سمجھا جاتا ہے جو یہاں پڑھاتا ہے یا یہاں سے پڑھ کر باہر نکلتا ہے۔ سو آئیے۔ آج کی صحبت میں ایک غائر نگاہ ڈالکر ان کی حقیقت کا بھی جائزہ لے لیں۔ اور غور کریں کہ قوم کے بچوں کا مستقبل جن درسگاہوں اور جن اساتذہ کی تربیت میں سنوارا جا رہا ہے۔ اُن کا کیا حال ہے۔

تعلیم کا تنہا مقصود خواہ وہ کسی زبان کے ذریعہ سے دی جائے۔ محض تربیت اخلاق اور آزادی فکر و ضمیر ہے۔ یعنی ایک بچہ کو شروع سے صحیح معنی میں ایک انسان بننے کا درس دیا جائے اور اس کے دماغ میں آزادی کیساتھ سوچنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہماری مذہبی درسگاہوں میں اگر فقدان ہے تو انھیں دو چیزوں کا۔ اور یہاں کا تعلیم یافتہ انسان اگر عاری ہوتا ہے تو انھیں دو خصوصیات سے۔ یعنی نہ اس میں متمدن دنیا کا ساتھ دینے کی صلاحیت ہوتی ہے اور نہ اس کے دماغ میں اس امر کی اہلیت کہ وہ صدیوں سال قبل کی تصانیف سے ہٹ کر کسی نئی بات پر

غور کیجیے تو اسکا بڑا سبب یہ ہے کہ ہماری جتنی درسگاہیں ہیں۔ خواہ ان کو دارالعلوم کہا جائے یا اس سے بھی زیادہ مرعوب کن نام "دار الحکم والفنون" سے یاد کیا جائے۔ خالص مذہبی درسگاہیں ہیں۔ اور ان کو علوم و فنون سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان کا نصب العین صرف فقہ و حدیث کی تعلیم ہے اور اگر ان کیساتھ بعض اور علوم کی تعلیم ہوتی ہے تو وہ بھی صرف اس لئے کہ فقہ و حدیث کے سمجھنے کے لئے ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثلاً عربی صرف و نحو کہ اسکا حقیقی مقصود تکمیل ادب و انشاء ہے۔ لیکن وہاں ان کی تعلیم صرف اس لئے ہوتی ہے کہ طالب علم ہدایہ اور بخاری کی عبارت صحیح پڑھ سکے۔ منطق و ہیئت کی چند فرسودہ ابتدائی کتابیں بھی پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن صرف اس لئے کہ بعض فقہی مسائل کے استنتاج میں ان سے مدد ملتی ہے۔ علاوہ فقہ و حدیث کے تفسیر کا بھی درس ہوتا ہے۔ لیکن جلالین سے آگے نہیں بڑھتا۔ جس سے زیادہ سے زیادہ ضمائر کے مرجع وغیرہ کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ اور اگر بڑی ہمت کی تو کشاف کے بعض اجزاء پڑھا دئیے۔ الغرض ایک طالب علم کی زندگی کا بڑا حصہ صرف فقہ و احادیث کی کتابوں پر صرف ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ حد درجہ جذبۂ تقدس و احترام کیساتھ ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے، یہانتک کہ اگر دوران تعلیم میں کچھ شبہات بھی اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں تو وہ خوف خدا سے کانپ اٹھتا ہے اس لئے اسکی قوت نقد و درایت بالکل تباہ ہو جاتی ہے اور جس وقت وہ ان درسگاہوں سے فارغ ہو کر نکلتا ہے۔ تو ایسا محسوس کرتا ہے کہ وہ کوئی خاص چیز ہے جسے خدا نے اپنے ہاتھ سے ڈھالکر اس دنیا میں بھیجا ہے اور علاوہ اسکی ذات کے اس عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ یکسر باطل ہے۔

اس کی ذہنی غلامی کا یہ رنگ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مزعومات کے علاوہ کچھ اور سننا ہی نہیں چاہتا۔ اور اس کا دماغی افلاس اس حد تک پہنچا ہوا ہوتا ہے کہ اگر اس سے پوچھا جائے کہ ہر چیز جو اُچھالی جائے کیوں پھر زمین کی طرف مائل ہو جاتی ہے تو وہ سوائے خدا کی مرضی کے اور کوئی وجہ نہ بیان کر سکیگا۔

جس زمین پر وہ بستا ہے۔ اسکا صرف اتنا علم اسے حاصل ہے کہ وہ چپٹی ہے اور کوئی فرشتہ اسے سنبھالے ہوئے ہے۔ اور جس آسمان کے نیچے وہ زندگی بسر کرتا ہے اسکا حال صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ پیاز کے چھلکے کی طرح تہ بہ تہ ہے جس میں چاند سورج میخوں کی طرح گڑے ہوئے ہیں۔ اور زمین کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ جغرافیہ سے اسے مس نہیں۔ تاریخ سے اسے کوئی تعلق نہیں۔ ریاضی سے بالکل نابلد۔ سیاسیات و معاشیات۔ کیمیا و طبعیات و دیگر علوم کا کیا ذکر کہ ان کا تو نام لینا بھی اسکی بارگاہِ تقدس میں کفر کے مترادف ہے۔

اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ پانچ وقت نہایت احتیاط سے مضمضہ و استنشاق کے ساتھ وضو کرے اس کے بعد کانوں میں انگلی دیکر اذان دے اور پھر صحیح مخارج سے قرآن کی چند آیتیں پڑھ کر امامت کر لے۔ اس سے زیادہ اور ترقی کریگا تو محلہ کے جاہلوں کو حلال و حرام کے مسائل بتائے گا۔ اور اگر کوئی بدنصیب داڑھی منڈاکر مسجد میں داخل ہو تو جہنم کے سارے دروازے اسکے سامنے کھولکر رکھدیگا۔ اسکو مطلق خبر نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ کتنے جدید علوم و

فنون رائج ہو چکے ہیں اور آئندہ کیا ہونیوالا ہے، وہ اپنے حجرہ میں پڑا ہوا، لانبی داڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر جنت اور حوران جنت کے خواب دیکھا کرتا ہے۔ اور اسے ان "جنات عدن" کا کوئی حال معلوم نہیں جو اس دنیا میں دوسری قوموں نے اپنے لئے پیدا کرلی ہیں۔ جس وقت وہ لذیذ غذائیں کھانے کے بعد ڈکاریں لے لیکر الحمد للہ کہتا ہے تو ایسا محسوس کرتا ہے گویا خدا ابھی اس ادائے عبودیت پر نہایت مسرور ہے۔ اور اسے بالکل پروا نہیں اگر خود اس کے متعلقین فاقہ میں مبتلا ہیں۔ الغرض وہ ان درسگاہوں سے تعلیم پانے کے بعد ایک ایسا خود غرض، نفس پرست، بلید الذہن، ماؤف الدماغ، تنگ نظر اور تنگ حوصلہ شخص ہو کر نکلتا ہے۔ جس کے لئے نہ نظام تمدن میں کوئی جگہ ہے اور نہ عالم اخلاق میں۔ وہ اپنی فقہی و روایتی معلومات سے مدد لیکر دنیا میں ہر ظلم کے لئے تیار رہتا ہے اور مذہب کی آڑ پکڑ کر وہ انسانیت کو داغدار کرنے سے کبھی باز نہیں رہتا۔

یہیں لکھنؤ سے قریب ضلع بارہ بنکی میں ایک مشہور قصبہ ہے۔ جہاں بہت سے تعلقہ دار بھی رہتے ہیں، اور بعض خاندان مذہبی علماء کے بھی ہیں، ایک صاحب ثروت پختہ عمر کی بیوہ خاتون جو کافی متمول ہیں۔ حج کے لئے جانا چاہتی تھیں۔ لیکن چونکہ کوئی محرم موجود نہ تھا اس لئے پس و پیش میں تھیں کہ کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے اپنی اس مشکل کو قصبہ کے ایک "مولانا" کے سامنے پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ "بہ حالات موجودہ جبکہ کوئی محرم آپ کی معیت کے لئے موجود نہیں۔ آپ کا حج کے لئے جانا یقیناً درست نہیں۔ مگر ایک صورت ایسی پیدا ہو سکتی ہے کہ میں آپ کے ساتھ چلا چلوں"۔

خاتون یہ سنکر خوش ہو گئی۔ کیونکہ مولانا سے زیادہ مقدس و محترم ساتھی اور دوسرا کون ہو سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ارشاد ہو وہ کیا تدبیر ہے؟ انہوں نے کہا کہ "میرے دو چھوٹے بچے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ میں تمہارا نکاح بحیثیت ولی ہونے کے پڑھائے دیتا ہوں۔ اور اس طرح میں تمہارا محرم ہو جاؤں گا"۔ اس عزیزہ نے اس شرط کو منظور کر لیا اور کچھ نقد روپیہ بھی ان کے حوالہ کر کے حج کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔

جب اس خاتون کے اعزہ کو یہ حال معلوم ہوا تو انہوں نے کہا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ تمہارے خاوند کی یہ وصیت ہے کہ دوسرا نکاح کرنے کی صورت میں تم تمام جائداد سے محروم ہو جاؤ گی۔ یہ سنکر وہ بہت پریشان ہوئیں اور مولانا کے پاس جا کر کہا کہ میرا ارادہ اب حج کا نہیں ہے۔ اس لئے امانت کی رقم واپس کر دیجئے اور اس نکاح کے قصہ کو بھی ختم کیجئے۔ کیونکہ اس سے مقصود تو صرف آپ کو محرم بنانا تھا اور اس کی اب ضرورت باقی نہیں رہی۔

مولانا نے یہ سنکر روپیہ تو خیر واپس کر دیا کیونکہ وہ ہضم نہ کر سکتے تھے۔ لیکن نکاح کے بارہ میں جو جواب دیا ہے وہ سننے کے قابل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ میں بحیثیت ولی ہونے کے کسی نابالغ کی طرف سے کوئی چیز حاصل تو کر سکتا ہوں لیکن اس کو واپس دینے کا مجاز نہیں ہوں۔ اب تو جب لڑکا بالغ ہوگا اسوقت اسے اختیار ہوگا۔ خواہ آپ کو طلاق دے یا آپ کو لاکر گھر میں رکھے"۔

یہ ہے وہ ذہنیت جو مذہبی تعلیم سے پیدا ہو جاتی ہے اور یہ ہے وہ غلط استعمال فقہ و مذہب کا جس کی مثالیں بکثرت مولویوں کی زندگی میں نظر آتی ہیں - میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت جتنے علماء مذہب ہیں وہ سب اسی گمراہ ذہنیت کے ہیں - لیکن جو چند اچھے اخلاق کے ہیں - وہ یقیناً وہی ہیں جو فطرتاً حد درجہ نیک پیدا ہوئے ہیں اور جو اس سے زیادہ مفید ثابت ہوتے اگر اس ماحول میں ان کی تعلیم و تربیت نہ ہوتی -

عالم تمدن میں سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ باہمدگر جذبۂ اخوت کا پیدا ہونا ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنا - لیکن ایک ایسے شخص میں جس نے کسی مذہبی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے - سب سے پہلے یہی جذبہ فنا ہوتا ہے کیونکہ وہ سوائے اپنی جماعت کے باقی تمام نوع انسانی کو گمراہ و خاطی - باغی و کافر سمجھتا ہے - اور یہ ناممکن ہے کہ اس جذبہ کے ساتھ ساتھ نفرت و مغایرت کی کیفیت دل میں پیدا نہ ہو - ایک پابند مذہب شخص کسی دوسرے کو انسان دیکھنے سے قبل یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ وہ اس کا ہم عقیدہ و ہم خیال ہے یا نہیں اور اگر نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا کا مقہور و مردود بندہ ہے اور کسی طرح ہمدردی و محبت کا اہل نہیں -

میں نہیں کہہ سکتا کہ دیگر مذاہب کے علماء کا کیا حال ہے - لیکن کم از کم مسلمانوں میں یہ عیب ضرور پایا جاتا ہے - اور وہ سوائے اپنے کسی اور کو نجات کا مستحق سمجھتے ہی نہیں - یہ تو رنگ ہے ان کے اخلاق و روحانیت کا - اب اسی کے ساتھ آپ اس پر بھی غور کیجئے کہ دنیا کے کاروبار میں، سوسائٹی میں اور عملی میدان میں ان کی اہلیت کیا ہے - جن لوگوں کو اس جماعت کے افراد سے واسطہ پڑا ہے ان سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں ہے کہ ان کا دماغ کوئی صحیح بات سوچ سکتا ہے اور نہ وہ اسے اپنی زبان سے ادا کر سکتے ہیں - نہ وہ کسی مہذب و شائستہ سوسائٹی میں بیٹھ کر تبادلۂ خیال کر سکتے ہیں اور نہ کسی معاملہ کا اہتمام و انصرام اُن کے بس کی بات ہے - وہ ہر چیز کو موت اور مابعد الطبیعیات کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں - اور ہر کام کو خدا کے سپرد کر کے اپنے ہاتھ پاؤں ہلانا غیر ضروری سمجھتے ہیں - ان کا عقیدہ ہے کہ دُنیاوی زندگی غیر حقیقی زندگی ہے اور اصل حیات موت کے بعد شروع ہوتی ہے - اور یہ چند روزہ زندگی عسرت و افلاس نکبت و ذلت - بے سروسامانی میں بسر ہو تو بھی کیا پروا ہے - وہاں تو ان کے لئے آرام ہی آرام مقسوم ہے - پھر ظاہر ہے کہ جس قوم کے خیالات و عقائد یہ ہونگے وہ خاک کوئی کام دُنیا میں کر سکتی ہے اور اُس میں ترقی کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا کیونکر ممکن ہے - اس میں شک نہیں کہ اسوقت ہندوستان میں چند علماء مذہب ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے خیالات و اقوال کے لحاظ سے اتنے پست و فرومایہ نہیں ہیں - لیکن عملی حیثیت سے وہ بھی بیکار ہیں اور افراد قوم کی ایسی رہنمائی کرنا جو واقعی ان کے درد کا علاج ہو سکے ان کے امکان سے باہر ہے - یہ لوگ جس وقت وعظ و تقریر کیلئے کھڑے ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کوہ ہمالہ کو بھی اپنی جگہ سے سرکا دیں گے - لیکن جب وہ ڈائس سے اُتر کر نیچے آتے ہیں تو وہ پرکاہ کو بھی جنبش دینے کا اقدام نہیں کرتے -

اس لئے غور طلب امر یہ ہے کہ اس وقت جو لاکھوں روپیہ مذہبی درسگاہوں پر صرف ہو رہا ہے - اس سے ملک و قوم

کو کیا فائدہ پہنچ رہا ہے - اور اس وقت تک جو کچھ صرف ہو چکا ہے اسکا کیا نتیجہ نکلا ہے - ممکن ہے کہ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ آخرت میں حوروں کے کام آسکیں - یا جنت کے اس وسیع خلاء کو پُر کرسکیں جہاں سوائے مولویوں اور مولوی پرستوں کے کسی اور کی گنجائش نہیں ہے - لیکن سوال یہ ہے کہ جنت یا حوروں کے لئے یہ "پیداوار" "ملک معظم" کے سکّہ سے کیوں فراہم کی جائے - ایک کافر بادشاہ کے روپیہ سے عاقبت سنوارنا کیا معنی؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ یہ روپیہ فرمانروائے وقت کا نہیں بلکہ انھیں کا ہے جو اس کار خیر کے لئے دیتے ہیں - تو پھر یہ بتایا جائے کہ اس وقت تک مسلمانوں کی جماعت کو ان درسگاہوں سے کیا فائدہ پہنچا ہے - خیر دنیا کو چھوڑیئے - دین ہی کا کوئی فائدہ بتایا جائے - مادی ترقی نہیں کوئی اخلاقی و روحانی ہی ترقی ایسی پیش کی جائے جو ان مدارس کے ذریعہ سے دنیا میں اشاعت پذیر ہوئی - کتنے گمراہ اُن کی پند و موعظت سے راہ راست پر آئے، کتنے مندر و کلیسا انہوں نے مسجدوں میں تبدیل کئے -

مسلمانوں کے علاوہ اور مذہبی اقوام میں بھی علماء تیار کئے جاتے ہیں - لیکن نہ اُن پر اتنا مذہبی جنون سوار ہوتا ہے اور نہ بلحاظ علم وفضل وہ اتنے تنک مایہ ہوتے ہیں - مثلاً انگریزی مشنریوں کو لیجئے اور دیکھئے کہ ذہن وعمل دونوں حیثیتوں سے وہ کتنے ممتاز ہوتے ہیں - ان کے اخلاق کا یہ عالم ہے کہ اُن سے بات کرنا گویا ان کا گرویدہ ہو جانا ہے - ان کی قوتِ عمل و سلیقۂ تنظیم کی یہ کیفیت ہے کہ ایک ایک شخص نے نئے نئے مستعمرات تیار کرکے رکھ دیئے - اور جس کو عیسائی بنایا اسکی معیشت و معاشرت میں تغیر پیدا کرکے رکھ دیا - رہ گیا علم وفضل سو اُس کا یہ رنگ ہے کہ جب تک تمام علوم مروجہ میں کمال حاصل نہ ہو جائے ان کا اس خدمت کیلئے انتخاب ہو ہی نہیں سکتا - اور اس طرف جو کیفیت ہے اسکا حال بارہا صفحات "نگار" پر آچکا ہے - اور جن کو اس جماعت کے مطالعہ کا فخر حاصل ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ "خر فقہ لیثمینۂ طلاہ موباف است" - ہمارے علماء اپنے آپ کو ہمارا رہبر ظاہر کرتے ہیں اور ہماری دینی و دنیوی بہبود کے ذمہ دار ہیں اور ان کو ایسا ہونا چاہئے کیونکہ وہ شریعت نبوی کے ماہر، اسوۂ رسول کے پابند اور جانشین پیمبر ہیں - لیکن جب وقت ہم مسلمانوں کے موجودہ تدریجی انحطاط و زوال پر غور کرتے ہیں تو ہم کو کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ ہمارے علماء مذہب نے حقیقتاً کسی اسوۂ نبوی کا اظہار کیا ہو - یا کوئی کام ایسا کیا ہو جو قوم کی حالت کو سنبھالنے والا ہو -

انجمن خلافت کا جو حشر ہوا ظاہر ہے - کہ لاکھوں روپیہ مسلمانوں سے وصول کیا گیا اور قوم کے کسی ایک فرد کو بھی اس سے کوئی فائدہ نہ پہنچ سکا - اسی طرح تبلیغ کے نام سے بیشمار روپیہ تمام اکناف ہند سے فراہم کیا گیا - لیکن مسلمانوں کو بھی اس سے مسلمان نہ بنایا جاسکا - غیر مسلموں یا کافروں کا کیا ذکر ہے - پھر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر ہمارے رہنما اس قدر غافل وخود غرض واقع ہوئے ہیں تو ہم کیوں اتنے احمق و بیوقوف ہیں کہ باوجود اتنے تجربات کے ہنوز ان پر اعتماد باقی ہے اور اپنی حالت سنبھالنے کے لئے ہم ان کے مشورہ کے منتظر ہیں -

اس وقت مسلمانوں کے سامنے سوال نہ عربی تعلیم کا ہے نہ مسائل شرعیہ سمجھنے کا - نہ روزہ و نماز کے حفظ ارکان کا ہے -

نہ فریضۂ حج کے ادا کرنے کا - بلکہ صرف اس بات کا کہ وہ دُنیا کی اس جدید کشاکش میں زندہ کیونکر رہے - اور قوم کے ۹۰ فیصدی فاقہ کش بیلداروں کا پیٹ کس چیز سے بھرے - نمازیں پڑھنے سے پہلے بھی کبھی رزق فراہم نہیں ہوا اور اب بھی نہیں ہوسکتا - روزہ رکھنے سے کشائشِ رزق کا تجربہ نہ کبھی کامیاب ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے - اسی طرح فریضۂ حج ادا کرنے سے ہندوستان کے مسلمانوں کو کسی فائدہ کی توقع نہیں - پہلے اگر مسلمان یہ تمام فرائض شرعی ادا کرتے تھے تو صرف اس لئے کہ انھیں معلوم ہوسکے کون فرد ان کی جماعت کا ہے - انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ وہ نماز پڑھنے کے بعد ہاتھ پاؤں توڑ کر گھر میں بیٹھ رہے ہوں - وہ عبادت کرتے تھے محض اس لئے کہ ان میں ولولۂ عمل پیدا ہو - وہ خدا کے سامنے جھکتے تھے محض اس تمنّا میں کہ وہ دُنیا میں سربلند ہوسکیں - جو ہاتھ نماز میں بندھتے تھے وہ تلوار اٹھانے کے لئے بھی ہر وقت کھلے رہتے تھے - اور جو سر ایک بار بارگاہ ایزدی میں خم ہوجاتا تھا اس کے لئے کسی غیر کے سامنے جھکنا حرام ہوجاتا تھا -

سب سے پہلے اسلام ہی نے بتایا کہ آزادی انسان کا فطری حق ہے اور دُنیا میں وہی اوّلین مذہب تھا جس نے دین کو دنیا سے ملا کر اس حقیقت سے عالم کو روشناس کیا کہ جس نے دُنیا میں اپنی آنکھ پھوڑ ڈالی ہے وہ قیامت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا - پھر جب تک مسلمانوں نے اس رمز کو سمجھا انہوں نے نئے نئے علوم و فنون کی بنیادیں ڈالیں - عمران و مدنیت کو اپنی تہذیب و شائستگی سے رونق دی - تاریخ عالم میں جدید ابواب کا اضافہ کیا - زمین کا قدیم جغرافیہ بدل دیا - خشکی و تری پر ہر جگہ ان کے قدم پہنچے اور خدا کے ان تمام انعام و برکات کو جو اس دُنیا میں انسان کے لئے پیدا کئے گئے تھے اپنے لئے مخصوص کرلیا - لیکن اب کہ اسلام نام رہ گیا صرف ان مسجدوں کا جو سچّے نمازیوں سے خالی ہیں اور نماز مفہوم ہے اُن سجدوں کا جو نشۂ سربلندی سے معرّا ہیں - ہمارا اپنے آپکو مسلمان کہنا حقیقتاً توہین ہے اسلام کی - تذلیل ہے رسول خدا کی اور ذلّت ہے انسان و انسانیت کی -

ہماری تمام درسگاہیں بیکار ہیں - ہمارے علماء بے مصرف ہیں اور جب تک ہم ان پر اعتماد ترک کرکے خود اپنے نفس پر اعتماد کرنا نہ سیکھیں گے - ہم کبھی فنا ہونے سے نہیں بچ سکتے - مولویوں کو چندہ دینا بند کردو - مذہبی درسگاہوں کی اعانت سے ہاتھ کھینچ لو - کہ ان سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا - اگر تم ان درسگاہوں کو چلانا ہی چاہتے ہو تو ان کے اراکین سے دریافت کرو کہ تمہارے مدرسے کس مرض کی دوا ہیں - اور خود اپنے ہاتھ میں انتظام لیکر بچّوں کو وہ چیزیں سکھاؤ جو اس زندگی میں ان کے کام آنیوالی اور ان کے ذہن و عقل کو زمانہ کے دوش بدوش چلنے کا درس دینے والی ہیں -

---

تفسیر قرآن (اُردو) پہلا حصہ مکّی سورتیں :- یہ تفسیر شانِ نزول اور کتب مقدسہ کی روشنی میں لکھی گئی - اور پادری جے - علی بخش ۵۳ گوالمنڈی لاہور سے بقیمت ایک روپیہ فی جلد مل سکتی ہے -

پارسی اہلِ کتاب ہیں

(مسلسل)

حضرت زرتشت پیغمبر برحق اور نبی مرسل تھے

زرتشتیوں کے موحد ہونے کی تصدیق اکثر علماء نے کی ہے۔[1] اور جس کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کا خدا تعالیٰ عالم کا خالق[2] کُل انسانی افعال کا منصف[3] اور رحم و کرم کا سرچشمہ ہے۔[4] اور محض خدائے واحد ہی کی ذات اطاعت و فرمانبرداری کے لائق اور قابلِ پرستش ہے۔[5]

کُل الہامی مذاہب کا اہم ترین اصول نیکی و پاکبازی ہے۔ چنانچہ اس کے متعلق ژندو استا میں بڑے زور کیساتھ ہدایت کی گئی ہے اور مرقوم ہے کہ نیکی ہی مسرت کا باعث ہے اور یہی راہِ امن و امان ہے۔ نیکی کو عزت کا لباس اور بدی کو شرم و ذلت کی پوشاک سے تشبیہ دی گئی ہے۔[6] ژندو استا میں لکھا ہے کہ خدا کے نزدیک سب سے زیادہ قابل قبول قربانی اور عبادت انسان کے افعال نیک ہیں۔ اور جن کی مقبولیت کے لئے نیت کا نیک ہونا بھی ضروری ہے۔ تمام خوبیوں کی بنیاد سچائی کو قرار دیا ہے۔ اور دروغگوئی کو سب سے بڑا اور ناقابلِ عفو گناہ بتلایا ہے۔ محنت اور جانفشانی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کا ثمرہ ملنا لازمی ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ ایمان کو تنزل سے محفوظ رکھنے کے لئے محنت و مشقت ضروری چیز ہے۔ کاہلی انسان کی ذلت اور مفلسی کی

---

[1] قوانین حلم در دین زرتشت (مؤلفہ گوپر) دینیات زرتشتی (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) [2] تذکرہ پارسیان (مؤلفہ کارکا) انوار ایران باستان (مؤلفہ پیتا والا) [3] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم در دین زرتشت۔ ملاحظہ فرمایئے۔ [4] تذکرہ پارسیان اور قوانین حلم در دین زرتشت۔

[5] تذکرہ پارسیان ص۲۵ جلد دوم۔

[6] دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد دوازدہم صفحہ ۸۶۵۔

باعث ہے۔ اسی طرح مہمان نوازی اور غربا پروری کے بھی اصول مذہبِ زرتشت میں داخل ہیں۔[1]

ان باتوں کو دیکھ کر بھلا کیونکر پیروانِ دینِ زرتشت منکرِ خدا یا کافر کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ زمانہ موجودہ کے ایک مسلمان فاضل اس خصوص میں یوں اپنے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں[2]

"عام طور پر جو لوگ آتش پرست مشہور ہیں ان میں نیکی و خیرات اور لین دین میں ایمانداری کی عادتیں عناصرِ فطرت کی پرستش سے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی تھیں۔ انسان سے نیکی و شرافت کا ظہور اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ وہ اپنے دل کو پاک و صاف رکھ کر خدائے قدوس کے وجود کا قائل ہو کر انوارِ الٰہی کا پرتو حاصل نہ کر لے۔ خداوندِ عالم ہی تمام مخلوق کا جس میں آتش کا بھی شمار ہے سرچشمہ اور خالق ہے۔ زرتشت ان ہی پیغمبروں میں سے تھے جو ربّ العالمین کی طرف سے مذہب لے کر بندوں کی ہدایت کے لئے دنیا میں ظہور کرتے رہے ہیں۔"

یہ امر یقینی ہے کہ باری تعالیٰ جو بہترین عادل اور مہر و کرم کا منبع ہے کسی شخص کے اعمالِ نیک کی جزا دیئے بغیر نہ رہیگا۔ چنانچہ خود قرآن حکیم میں مرقوم ہے کہ وہ لوگ جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے اور نیک کام کرتے ہیں وہ اپنے رب سے اسکا بدلہ پائیں گے اور ان کے لئے کوئی امر باعثِ خوف نہیں۔ اور وہ رنج نہ اٹھائیں گے۔[3]

خدا کی وحدانیت اور حشر کے دن نیک و بد اعمال کی جزا و سزا پانے پر ایمان رکھنے کی تعلیم جیسی کہ پیغمبرِ ایران حضرت زرتشت نے دی ہے وہ پارسیوں کی روزمرہ زندگی میں بھی بخوبی آشکارا ہے۔ موجودہ پارسیوں کا اتقا اور ان کی شرافت اس کی بین دلیل ہے۔ چنانچہ ان باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر بلا پس و پیش اس امر کا اقرار کیا جا سکتا ہے کہ یہ قوم عقیدۃً موحد ہے اور ان کے پیغمبر بھی مثل دوسرے نبیوں کے سلطنتِ الٰہی کی بنیاد ڈالنے کے لئے مبعوث برسالت ہوئے تھے۔[4]

نیکی اور تقویٰ نام ہے پرہیزگاری کا۔ خدا۔ آخرت۔ فرشتے۔ انبیاء اور الہامی کتابوں پر ایمان رکھنے کا۔ خدا کی محبت میں فقراء۔ غربا۔ یتامیٰ کی اعانت و امداد کرنے کا۔ اور یہی عین عبادتِ الٰہی ہے۔ چنانچہ بلاشبہ یہی تعلیم زرتشتی بھی ہے اور حقیقتاً بھی یہ ہے کہ ہر مذہب نے دنیا میں اپنے پیروؤں کو اسی راہ پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ گو رفتارِ زمانہ نے اس قدر انقلابات ان کے اندر رونما کر دیئے ہیں کہ آج ان کی اصلی شکل پہچاننی مشکل ہے۔ ورنہ تمام مختلف ادیان کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے اور کل مذاہب مختلف اقوام و ممالک کے لئے مختلف اوقات میں خدا کا ایک ہی پیغام لیکر آئے۔ باری تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں صاف طور پر فرمایا ہے "اور بہ تحقیق ہم نے ہر قوم کے درمیان ایک ہادی و رہبر بھیجا اور جس نے خدا کی پیروی اور شیطان سے بیزاری کی تعلیم دی۔"[5] پھر ایک دوسری

---

[1] تذکرہ پارسیان صفحہ ۱۰۲ جلد دوم۔ [2] اسلام اور دین زرتشت صفحہ ۲۱ (مولفہ مرحوم خواجہ کمال الدین)

[3] سورۃ ۲ (آیہ ۶۲)۔ سورۃ ۵ (آیہ ۶۹) [4] دائرۃ المعارف امریکانی جلد شانزدہم (زرتشت)

[5] سورۃ ۱۶ (آیہ ۳۶) قرآن مجید۔

جگہ ارشاد فرمایا کہ "ہم نے جس ملک میں بھی اپنا نبی بھیجا وہ وہاں کے لوگوں کی زبان لیکر مبعوث ہوا۔ تاکہ لوگوں کو خدا کا پیغام صاف طور پر سمجھا سکے"[1]

پاکیزہ خیالات۔ عمدہ اقوال۔ اور نیک اعمال ہی کی ترغیب ہر نبی کی جانب سے بنی نوع انسان کے لئے ہوا کی ہے۔ اور یہی باتیں ہر سچے مذہب کی جڑ ہیں۔ چنانچہ دین زرتشتی بھی ان ہی اصول کا پابند رہا۔ اس مذہب کے پیروؤں نے بھی عام اس سے کہ وہ کسی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتے ہوں یا ادنیٰ مرتبہ کے ہوں اپنے ہادی و رہبر کی تعلیمات کو اپنے دل و دماغ سے کبھی محو نہ کیا۔ اسکا نتیجہ آج بھی ظاہر ہے۔ اور پارسی قوم اپنے اعلیٰ اخلاق کے سبب اس وقت بھی آپ اپنی مثال ہے۔

پادری ہیگل اپنی ایک معروف کتاب میں کیش زرتشتی کے خصوصیات اس طرح گنواتے ہیں[2]۔

(۱) یہ مذہب اپنے معبود کو کسی غیر مہذب صفت سے موصوف نہیں کرتا۔

(۲) کوئی غیر مہذب فعل اس دین کی عبادت میں شامل نہیں۔

(۳) اس کے کسی مذہبی رسم میں ظلم و بیدردی کا شائبہ نہیں پایا جاتا۔

(۴) نیکی و بدی کی جنگ میں زرتشتیوں کو نیکی کی معاونت کا حکم ہے۔

(۵) عورتوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کثرت ازدواج سے روکا جاتا ہے۔

(۶) کسی قسم کی بت پرستی اس مذہب میں داخل نہیں۔

(۷) پاکیزگی نفس اور اخلاق پر بڑا زور دیا گیا ہے۔

(۸) اوستا میں مستقبل کا ذکر اندوہگیں یا تاریک نہیں بلکہ انجام کار نیکی کی فتح مرقوم ہے۔

زند اوستا کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات ہم پر اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت زرتشت کی تعلیم و اصلاح کا اصلی مقصد اس زمانہ کی پست ذہنیت اور توہم پرستی کا دور کرنا تھا تاکہ لوگ عناصر فطرت اور دیگر مخلوقات کی پرستش سے باز آ جائیں[3]۔ زرتشت کے قبل بھی مختلف پیغمبروں نے لوگوں کے لئے ہدایت کے راستے کھولے تھے۔ مگر ان کی تعلیم تقریباً فراموش کی جا چکی تھی۔ سرزمین ہند کی طرح اس وقت ایران میں بھی دیوتاؤں اور معبودوں کی کثرت تھی۔ چنانچہ پیغمبر ایران نے صاف اعلان کر دیا کہ سارے کے سارے دیوتا گروہ شیاطین سے متعلق ہیں اور اس لئے ہرگز لائق پرستش نہیں ہیں[4] یہ اعلان ایرانیوں کے لئے جو خود بھی آریائی قوم کی ایک شاخ تھے اور دیوتاؤں کے پرستار۔ کچھ عجب نوعیت رکھتا تھا اور یہی سبب تھا کہ اول اول حضرت زرتشت کی سخت مخالفت کی گئی۔ مگر انجام کار لوگوں کو ایک سے زاید معبود کی پرستش سے باز رکھنے میں وہ کامیاب رہے اور اہورامزدا

---

[1] قرآن مجید۔ سورۃ ۱۴۔ آیہ ۴ ۔ [2] ہندوستان کے معروف مذاہب صفحہ ۱۶۲ ۔ [3] آئین پارسیان (مولفہ مولٹن) ۔ میڈیا (مولفہ راگزین) ۔ [4] مولفات ہاگ۔ مولٹن اور راگزین۔ ملاحظہ فرمایئے۔

(خدائے یکتا و دانا) کی عبادت اقلیم ایران میں ہمیشہ کے لئے رائج ہو گئی ۱؎ زرتشت نے ایرانیوں کو اچھی طرح سمجھا دیا کہ انسانی آنکھیں جمال باری کے دیکھنے سے معذور ہیں۔ اور ذات معبود کُل مادّی علائق سے معرا ہے۔ چنانچہ اس جگہ پر مناسب ہو گا اگر ہم اس خیال کی تطبیق ذیل کی آیت قرآنی سے بھی پیش کریں۔ خدا فرماتا ہے:-

"اللہ ہی تمہارا رب ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہی خالق ہے۔ پس اسکی عبادت کرو۔ وہی سب کا کارساز ہے۔ آنکھیں اسے دیکھ نہیں سکتیں۔ مگر وہ سب کچھ دیکھتا ہے ۲؎

اب ذرا اوستائے مقدس میں بھی حضرت زرتشت کی تخیل اس سلسلہ میں ملاحظہ ہو۔ ۳؎

"اے مزدا جب میں نے دریائے فکر میں غوطہ لگایا تو محض تیری ذات کو ازلی و ابدی اور قابل پرستش پایا۔ تو ہی تمام پاکیزہ خیالات کا بانی اور حقانیت و سچائی کا خالق ہے۔ تیری ہی ہستی اعمال انسانی کی منصف ہے اور ان ہی خیالات پر قائم رہ کر میں تجھ پر ایمان لایا ہوں"

نوشیرواں جی گو پرا اپنی کتاب "آئین حلم در دین زرتشت" میں ایک مجوسی عالم (مُغ) کی زبانی خدا کی تعریف یوں تحریر فرماتے ہیں:-

"میں اس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو دونوں جہان کا خالق اور پاک و یکتا ہے۔ نہ تو اس کی کوئی صورت (شبیہ) ہے۔ اور نہ اسکا کوئی شریک۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا۔ خدا جسم و جسمانیت سے منزہ ہے۔ وہ پاک و پاکیزہ اور بے مثل و درخشندہ نور میں مستور ہے۔ اس کی تعریف کا حق کسی سے بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ فرشتے اس کے محکوم ہیں۔ وہ بڑی طاقت والا ہے۔ اور ہر جگہ موجود۔ خدا عادل ہے اور حکیم۔ وہی لائق پرستش اور مستحق عبادت و فرمانبرداری ہے" ۴؎

پارسیوں کے مذہبی ادبیات میں خدا کی صفات جو مرقوم ہیں ان میں سے چند اس جگہ نقل کی جاتی ہیں:- ۵؎

۱؎ مقالات ہاگ۔ ہیڈیا۔ ۲؎ سورۃ ۶ (آیۃ ۱۶۲) ۳؎ یسنا۔ باب ۳۱۔ آیۃ ۸۔ ۴؎ اس سلسلہ میں توحید کے متعلق اقوال جناب امیرالمومنین علیہ السلام اور امام جعفر صادق بھی ملاحظہ ہو۔ (اصول کافی جلد دوئم۔ باب ۴-۲)

۵؎ ان کی مطابقت قرآن مجید میں بھی ملاحظہ ہو (سورۃ ۲۔ آیہ ۱۴۶۔ اور ۲۵۶۔ سورۃ آیۃ ۷۷۔ سورۃ ۱۰۔ آیۃ ۱۰۵۔ اور ۱۰۷۔ سورۃ ۱۹۔ آیۃ ۹۴-۹۱۔ سورۃ ۲۸۔ آیۃ ۸۸۔ سورۃ ۳۱۔ آیۃ ۱۲۔ سورۃ ۳۲۔ آیۃ ۶۵۔ سورۃ ۴۰۔ آیۃ ۶۶-۶۴)

اور بالکل اسی طرح توراۃ۔ سفر تثنیہ باب ۶۔ آیۃ ۴۔ سلاطین۔ کتاب اول باب ۸۔ آیۃ ۲۳۔ تاریخ ایام کتاب اول باب ۱۷۔ آیۃ ۲۰۔ کتاب مزامیر باب ۸۶۔ آیۃ ۱۰۔ کتاب اشعیا نبی۔ باب ۶۴۔ آیۃ ۹۔ کتاب ارمیا نبی باب ۱۰۔ آیۃ ۶۔

اور انجیل مقدس ملاحظہ ہو۔ متی۔ باب ۴۔ آیۃ ۱۰۔ باب ۲۳۔ آیۃ ۹۔ مرقس باب ۱۲۔ آیۃ ۲۹۔ لوقا باب ۴۔ آیۃ ۸۔

وہ بزرگ ترین و برترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)

وہ بہترین ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۶۔ آیتہ ۸)

وہ غیر منقلب ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۷)

وہ تمام چیزوں کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۵۔ آیتہ ۶)

اُس کے قبل کچھ بھی نہ تھا۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۳)

وہ تمام عالم کا پیدا کرنے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۰۔ آیتہ ۱۱)

وہ انسانی ارواح و ضمایر کا خالق ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۱)

وہ رحیم ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۸۔ آیتہ ۵)

اُس نے پانی۔ درخت اور کُل دوسری چیزوں کو پیدا کیا۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۷)

وہ خود مختار ہے۔ (یسنا باب ۴۳۔ آیتہ ۱)

وہ تمام ہستیوں کا مالک ہے۔ (یسنا باب ۲۸۔ آیتہ ۷)

وہ عاقل ہے۔ (یسنا۔ باب ۲۹۔ آیتہ ۶)

وہ سب کچھ جانتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۶۔ آیتہ ۱۹)

وہ سب کچھ دیکھتا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۳۔ آیتہ ۱۳)

کوئی اُسے دھوکا نہیں دے سکتا۔ (یسنا۔ باب ۴۳۔ آیتہ ۶)

وہ تمام رازوں کا جاننے والا ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۱۳)

وہ کُل باتوں سے واقف ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۵)

وہ پاکیزگی کا منبع ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۳۔ آیتہ ۳۔۴۔۵۔۷)

اُس کی سلطنت میں رحم و کرم کی بہتات ہے۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۴)

وہ پاکیزہ ترین ہستی ہے۔ (یسنا۔ باب ۴۴۔ آیتہ ۷)

وہ حکیم۔ رحیم۔ با اختیار اور عادل ہے۔ (یشت۔ ۱۔ ۷۔ ۱۲۔ ۱۴۔ ۱۵)

اُسی کی حکمت اس مادّی دُنیا کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ جسے وہ خود اپنی مرضی سے ختم کردیگا۔ (یشت۔ ۱۔ ۲۶) اس کے علاوہ پارسیوں کی عبادت روزمرّہ کی کتاب خورد اوستا میں خداوند کریم کی دیگر صفات حسنہ کا ذکر ہے۔ جو بتمام تر قرآن مجید کے مرقومہ صفاتِ الٰہی سے مطابق ہے۔ غرضکہ پارسیوں کے اعتقاد میں خدا ہی سب سے اعلیٰ و برتر و بہتر ہے۔ اور وہی تمام آفرینش کا باعث۔ نہ تو وہ کسی شے سے پیدا ہوا اور نہ اُس کے جیسی کوئی شے ہے۔ علاوہ بریں وہ لاتعد صفات کا

حامل ہے۔ جو اس کی ذات سے وابستہ اور اسکا عین جزو ہیں [۱]۔

پیغمبرِ ایران نے قطعی طور پر عناصرِ فطرت اور مصنوعات کی پرستش ممنوع قرار دیدی تھی۔ چنانچہ اپنے ہادی و رہبر کی ہدایات کے مطابق زرتشتی گروہ نے ہمیشہ اپنے تئیں بُت پرستی سے علیحدہ رکھا۔ اور اُسے ایسا گناہِ عظیم سمجھا کہ ان کے معبدگاہ مطلقاً بتوں سے بے سروکار رہے ہیں [۲]۔ ہیروڈوٹس مشہور یونانی مورخ جسکا زمانہ ساڑھے چار سو برس قبل مسیح گذرا ہے۔ ایک جگہ یوں رقمطراز ہے [۳]:-

"ایرانی مجوسیوں نے کبھی اصنام پرستی نہیں کی۔ بلکہ ایران کے بہادر ہمیشہ بُت پرستوں سے برسرِ پیکار رہے۔ اور ان کے صنم کدوں کو خاک میں ملانے کی کوشش جاری رکھی" [۴]۔

اقوامِ ہنود کی بُت پرستی سے قطع نظر کہ جن کے دینِ آبائی نے ہزاروں سال کے اندر بڑے بڑے انقلابات کا سامنا کیا ہم دیکھتے ہیں کہ خود وہ مذاہب جو آسمانی صحیفوں کے حامل یا کسی کتاب اللہ سے منسلک رہ کر فخر و مباہات کرتے ہیں۔ اُن کے پیرووں نے بھی ایک حد تک بُت پرستی سے تعلق ضرور رکھا ہے۔ موسائیوں نے اپنے برگزیدہ پیغمبر کی زندگی ہی میں گوسالہ پرستی کی تھی [۵] اور موجودہ زمانہ میں تو عیسائیوں کی ایک بڑی تعداد حضرت مسیح۔ کنواری مریم اور بہتیرے اولیاء کے بُتوں کی پرستش نہایت جوش و خروش کیساتھ اب تک کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فارنل ایک مغربی عالم فرماتے ہیں کہ دینِ عیسوی کی تاریخ اس خصوص میں حد درجہ افسوسناک ہے۔ قبل میں تو ایک مدت تک عبادت گاہیں اصولِ موسوی کی پابند رہیں مگر بہت جلد ہی رومی و یونانی جذباتِ صنم پرستی نے حضرت موسیٰ کی روحانی تعلیم پر غلبہ حاصل کرلیا۔ چنانچہ آج کل دُنیائے مسیحیت باستثنائے چند افراد پیورٹین پروٹسٹنٹ بُت پرستی میں مبتلا ہے [۶]۔

حضرت زرتشت نے ایسے زمانہ میں اپنی تبلیغ شروع کی تھی جبکہ ملک کے لوگ تہذیب و تمدن سے تقریباً ناواقف تھے [۷]۔ اُن کی تعلیم کی حقیقت اور اُن کے اصولِ ہدایت ہی سے اُن کے وجدان اور معرفتِ الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ جو درحقیقت کافی غور و فکر اور فلسفیانہ تخیل کا نتیجہ تھے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بالکل یہی معاملہ ہر نبی اور پیغمبر کے ساتھ پیش آیا۔ کسی نے بھی اُس وقت تک راہِ ہدایت کی تبلیغ پر کمر ہمت نہ باندھی جب تک کہ اُسے الہامی طور پر اس بات کا یقین نہ ہوگیا کہ حقیقتاً وہ معلم بزرگ و برتر کی جانب سے براہ راست اس اہم کام کے لئے مقرر ہوا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ہمارے کل انبیائے سلف بھی اُسی ہمارے

---

[۱] دینیات زرتشتی صہ ۲۰ (مولفہ ڈاکٹر دھالا) [۲] تاریخ ایران مولفہ مارخم صہ ۲۲ - [۳] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴ - صہ ۲۵ اور مقالات ہاگ - [۴] دینیات زرتشتی (مولفہ دھالا) صہ ۸۱ - [۵] قرآن مجید - سورۃ ۲ - آیہ ۵۱ - [۶] اوصافِ خداوندی - صہ ۳۶ - [۷] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد ۴ - صہ ۲۷ - میڈیا (مولفہ راگزین) اشعارِ دینی ایران پاستان (مولفہ مولٹن) - مقالات ہاگ - ملاحظہ ہو۔

افراد مخلوق ہی تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ "ہم نے (اے محمد صلعم) تم سے قبل اپنے رسول بھیجے اور انھیں بھی عیال و اطفال سے سرفراز کیا۔ لیکن کوئی نبی بغیر ہماری اجازت کے کوئی پیغام نہیں لایا۔" [1]

لازمی ہے کہ ہم جو کچھ کہیں یا کریں ذرا اپنی عقل سے بھی کام لیکر۔ زرتشت جیسی شخصیت کی نبوت یا اُن کی تعلیم کے متعلق کوئی خیال ظاہر کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ کچھ تحقیق بھی کریں۔ چنانچہ خود کلامِ الٰہی میں بار بار اس کی تاکید کردی گئی ہے۔ "ہم نے کوئی پیغمبر ایسا نہیں بھیجا جسے ہماری طرف سے الہام نہ ہوا ہو۔ اگر نہیں جانتے ہو تو عالموں سے پوچھو" [2] اسی بناء پر خواجہ کمال الدین مرحوم نے نہایت بجا و درست فرمایا تھا کہ حضرت زرتشت صحیح معنوں میں خدا کے بھیجے ہوئے رسول تھے۔ [3]

اگر ہم تمام مذاہب اور اُن کے معلمین کی سچی تعلیمات پر غور و انصاف کی نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائیگا کہ ہر مذہب کا اصلی مقصد محض اسی قدر تھا کہ چند ایسے اصول و قوانین کی اتباع پر اپنے گروہ کو مجبور کرے جو پسندیدہ خصائل کی تحریک میں معاون ہوں۔ اور ہر نبی کی یہی تعلیم رہی ہے کہ لوگ خدائے واحد کی پرستش کریں۔ جو خالق کلّ موجودات ہے۔ دُنیا میں امن و سکون قائم رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ مقصدِ آفرینش یہی ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے۔ محمد عربی صلعم نے کسی نئے دین کی ترویج نہیں فرمائی۔ وہ تو اسی پُرانے مذہب کی اصلاح اور تجدید کے لئے مبعوث برسالت ہوئے جس کی نوح۔ داؤد۔ ابراہیم۔ موسیٰ۔ عیسیٰ وغیرہ نے اپنے اپنے زمانہ میں تعلیم دی تھی۔ اکثر انبیاء کے نام سے ہم واقف ہیں اور اکثر کو نہیں جانتے۔ [4] چنانچہ قرآن حکیم میں ہمارے نبی سے خطاب ہوتا ہے:۔

"ہم نے تم پر اپنی کتاب محض اس واسطے نازل کی ہے کہ تم تمام اختلافی مسائل کو طے کر دو۔ اور لوگوں کیلئے ہادی اور رحمۃ اللعالمین بن جاؤ۔" [5] پھر ارشاد ہوتا ہے۔ "تحقیق کہ ہم نے تمہیں سچائی کے ساتھ بھیجا ہے۔ تم لوگوں کو خوشخبری پہنچانے والے اور ڈرانے والے ہو۔ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کے درمیان ہم نے اپنی طرف سے کوئی سمجھانیوالا نہ بھیجا ہو۔" [6]

پس ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہر مذہب اور ہر دین کی اصلی غرض محض ایک ہی تھی۔ حالانکہ ان مذاہب کی ترویج مختلف اوقات اور مختلف مقامات میں ہوئی۔ اس جگہ مناسب ہوگا اگر ہم سر سید احمد اعلی اللہ مقامہٗ کے ایک مشہور خطبہ

---

[1] سورۃ ۱۳۔ آیۃ ۳۸۔ [2] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۴۳۔ [3] اسلام و دینِ زرتشت۔ ص ۳۵۔

[4] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۶۳۔ [5] سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۶۴۔ [6] سورۃ ۳۵۔ آیۃ ۲۴۔

[4] قرآن۔ سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۵۸ اس سلسلہ میں کتاب "النبوۃ والخلافت" مصنفہ شمس العلماء سید نجم الحسن صاحب ملاحظہ فرمائیے۔ موصوف نے نبوت کے معنی اور لوازمات نبوت پر وضاحت کے ساتھ بحث فرمائی ہے۔

جس میں انہوں نے اسلام سے بحث فرمائی ہے۔ مختصر اقتباس ہدیۂ ناظرین کریں۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"وہ چیز جس پر یقین کرنے سے کوئی شخص مسلم یا مسلمان کہا جا سکتا ہے۔ وہ خدا کی توحید ہے۔ جو شخص خدا کو برحق جانتا ہے اور اس کی توحید پر یقین رکھتا ہے وہ مسلم یا مسلمان ہے۔ یہی رکن اول اور رکن اعظم اسلام کا ہے۔ اور باقی ارکان اس کے تحت میں اور اس کے ساتھ اس طرح ملے ہوئے ہیں جیسے کہ کسی خالص دوا کی معجون ہو اور اس کے ساتھ اور اجزاء بھی ملے ہوئے ہوں۔ خدا کو واحدِ مطلق اور خالق تمام چیزوں کا جاننا اور سمجھنا بلکہ نہ صرف جاننا اور سمجھنا بلکہ اس پر یقین ہونا اسلام ہے۔ اور جو اس پر یقین کرے وہ مسلم ہے۔ خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ کی بابت ایسا ذکر فرمایا ہے۔ جس نے خدا پر یقین کیا اور اپنا منہ خدا کے سامنے کیا اور نیک کام کرتا ہے۔ اسکا اجر خدا کے پاس ہے[1] خدا نے اہلِ کتاب سے اور کچھ نہیں چاہا۔ بجز اس کے کہ خدا کی توحید مانیں اور اسکی عبادت کریں۔ (اے اہلِ کتاب آؤ اور ہم تم صلح کرلیں کہ ہم سوائے اللہ کے اور کسی کی عبادت نہ کرینگے۔)[2] پھر ایک جگہ خدا نے فرمایا ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی۔ بلکہ ٹھیٹ مسلمان تھا۔[3] پس جو حقیقت اسلام کی خدا نے بتلائی وہ خدا کو ماننا اور اس پر یقین ہونا ہے۔ خدا پر اور خدا کی وحدانیت پر اس وقت یقین ہو سکتا ہے جب اسکی ذات و صفات پر جو حقیقت میں متحد ہیں اور اس کے استحقاق عبادت پر جو اسکو لازم ہے پورا پورا یقین ہو۔ اس کی ذات پر یقین اس کے موجود بالذاتِ ازلی و ابدی۔ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہونے پر یقین ہونا ہے۔ اس کی صفات پر یقین اس کی مانند صفات کسی دوسرے میں نہ ہونے پر یقین کرنا ہے۔ .... اس کے استحقاق عبادت پر یقین یہ ہے کہ کوئی شئے سوائے خدا کے مستحق عبادت نہیں یعنی عبادت کے لائق نہیں۔ جو شخص کہ اس طرح سے خدا پر یقین رکھتا ہے وہ مسلمان ہے میں نہیں کہتا بلکہ خدا نے یونہی کہا ہے۔ ہاں ایسے شخص کو جو محض خدائے واحد کو مانتا ہے میں یہ ضرور کہوں گا کہ وہ محمدی نہیں۔ قرآن کی اصطلاح تو یہی ہے جو میں نے بیان کی۔ مگر ہمارے زمانہ میں محمدی اور مسلمان کے الفاظ ایک ہی معنی میں لئے جاتے ہیں۔ اور مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ اس لئے مجھ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ محمدی ہونے کیلئے ضرور ہے کہ ہم اس شخص پر بھی جس نے ہم کو توحید کی نعمت دی اور جس نے ہم کو توحید کی تعلیم کی اور جس کی وجہ سے ہم نے خدا کو جانا۔ اور اس کی صفات کو سچا یقین کریں ...."[4]

بہرکیف آپ یہ سمجھ سکتے ہیں کہ محض اسی ذات کی جسے ہم خدا کہتے ہیں پرستش ہر مذہب کا رکنِ اعظم ہونا چاہیئے۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ طریقۂ پرستش اور عبادت جداگانہ اور مختلف ہو۔ اکثر تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مذہب کے مختلف گروہ اور جماعت میں طریقۂ عبادت اور پرستش میں نمایاں اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر باوجود اس فروعی اختلاف کے ہم انھیں اسی

---

[1] ۔ سورۃ ۲۔ آیۃ ۱۱۲ ۔ [2] قرآن سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۳ ۔ [3] قرآن۔ سورۃ ۳۔ آیۃ ۶۶۔

[4] ۔ مجموعہ لیکچر سر سید احمد خاں۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۰۰ء صفحہ ۲۸۸۔

مذہب کے پیروؤں میں شمار کرتے ہیں۔ ہر شخص خدا کو پہچاننے کے لئے اس کی کسی مخلوق ہی کو ذریعہ قرار دیتا ہے۔ یعنی اس کی قدرت سے موثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ مذہب زرتشتی کو بھی بت پرست مذاہب میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے کہ وہ آتش پرستی کی تعلیم دیتا ہے انصاف پر سخت ظلم کرنا ہے [1] ڈاکٹر مولٹن نے اپنی ایک کتاب میں جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان کا اس جگہ پر ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے [2] وہ فرماتے ہیں:۔

"پارسی جو آگ کیساتھ احترام وارادت کا اظہار کرتے ہیں۔ اسے لفظ عبادت و پرستش سے یاد کرنا سخت نادانی ہے۔ اگر اس سے ناسمجھ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ آگ کو خدا جانتے ہیں تو یہ ان کی سراسر غلطی ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس مذہب کے پیروؤں میں چند جہلا ایسے بھی ہوں جو اس طریقہ احترام کو عبادت سمجھیں مگر پڑھے لکھے اور سمجھدار پارسی کا ایمان صرف ایک خدا کی عبادت کرنا ہے۔ اگر وہ فرشتوں کا احترام کرتا ہے تو وہ بھی محض اس خیال سے کہ اُن کے ذریعہ اُسے خدا تک پہنچنے کی راہ ملتی ہے۔"

ہمارے ہم مذہب حضرات ہماری اس جرأت کو معاف فرمائیں۔ اگر ہم انھیں بھی خود ان کے غلط فہمی پیدا کرنیوالے طریقوں کی طرف متوجہ کریں۔ مسلمانوں کا سنگِ اسود کو ایام حج میں بوسہ دینا ایک اجنبی کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرسکتا ہے۔ کہ وہ پتھر پوجتے ہیں۔ حالانکہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ مراسم حج ادا کرتے ہوئے اگر ہم حجرِ اسود کا احترام ظاہر بظاہر بھی بجالاتے ہیں تو یہ ہرگز کسی طور بھی پرستش کا شائبہ نہیں رکھتا۔ اسی طرح کعبہ کے رخ نماز پڑھنی کعبہ پرستی نہیں کہلا سکتی۔ بس یہی حال ان پارسیوں کا ہے۔ وہ آگ کا احترام محض اس لئے کرتے ہیں کہ اس کی روشنی خدائی تجلی یا انوار الٰہی کا خیال اُن کے دلوں میں پیدا کرتی ہے اور بلاشبہ آگ یا روشنی کا احترام کوئی نیا طریقہ یا غیر معمولی جذبہ نہیں ہے [3] عناصر فطرت میں آتش کو ابتدائے آفرینش سے ایک امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہانتک کہ روشنی یعنی نُور کو خدا کی خلق کی ہوئی کُل اشیاء پر ترجیح ہے [4] اس دُنیا میں تمام مادی چیزوں کی بنا بعض علماء کے نزدیک آگ اور اسکی گرمی ہی ہے۔ چنانچہ جب یہی حقیقت زرتشتیوں پر بھی ظاہر ہوچکی کہ آگ اور روشنی خداوند کریم کی قدرت کے سلسلہ میں بہترین اور بزرگ ترین مظہر ہے۔ تو انہوں نے بھی خالق کون و مکاں کو پہچاننے کا ذریعہ اسی اعلیٰ ترین عنصرِ فطرت کو بنایا۔ اسی آگ سے وہ باری تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا صحیح اندازہ کرسکے [5] ان کے اس خیال کو ہرگز ہم لچر اور پوچ یا غیر منطقی نہیں کہہ سکتے۔ اس لئے کہ خود قرآن مجید۔ توراۃ و انجیل

---

[1] میڈیلیڈ (انگریزی) مقالات ہگ۔ اور اشعار دین ایران باستان۔ [2] گنجینۂ مغان ص۱۴۷ (مؤلفہ مولٹن)

[3] ۔ کتاب عقاید عالم (مؤلفہ جیمس گارڈنر) میں بالتفصیل درج ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے مذہبی ادبیات کے مطابق آگ ہی خدا کی نشانی کا کام دے سکتی ہے۔ ملاحظہ ہو جلد اوّل۔ [4] عقاید عالم (مؤلفہ گارڈنر) جلد اوّل۔

[5] ۔ دینیات زرتشتی (مؤلفہ دھالا) اور تصنیفات ڈاکٹر مولٹن ملاحظہ فرمایئے۔

میں بھی اکثروبیشتر اس طرح کا اشارہ کیا گیا ہے:-

مثلاً - خدا نے سب سے پہلے روشنی کو خلق کیا۔ (کتاب سفر پیدائش آفرینش - باب اول - آیۃ ۳)

روشنی کی اصلیت اور انبداد خدا کے علم میں محفوظ ہے۔ (ایوب - باب ۳۸ - آیۃ ۱۹)

خدا ایک نور ہے۔ (اشعیاء - باب ۱۱ - آیۃ ۱۷)

خدا کی مثال زمین وآسمان کے نور کی ہے۔ (قرآن - سورۃ ۲۴ - آیۃ ۳۵)

خدا خود کو پردۂ نور میں ڈھانکے ہوئے ہے۔ (مزامیر - باب ۱۰۴ - آیۃ ۲)

اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ستون پر چراغ روشن ہو۔ (قرآن - سورۃ ۲۴ - آیۃ ۳۵)

خدا کا نور دُنیائے آب وگِل کو ڈھانکے ہوئے ہے۔ (ایوب - باب ۳۵ - آیۃ ۳۰)

روشنی خدا کی علامت ہے۔ (مزامیر - باب ۳۸ - آیۃ ۲۸)

خدا کے نور نے وادیٔ ایمن میں موسیٰ کی رہنمائی کی۔ (قرآن - سورۃ ۲۰ - آیۃ ۱۰)

اس کے نور نے تاریکی میں بھٹکنے والوں کی ہدایت کی۔ (اشعیاء - باب ۹ - آیۃ ۲)

خدا کی مثال آفتاب کی سی ہے۔ (مزامیر - باب ۸۴ - آیۃ ۲)

اب ناظرین کے مزید اطمینان کی خاطر آگ (آتش) کے متعلق بھی قرآن مجید ودیگر آسمانی صحف سے چند مفید باتیں یہاں پر درج کی جاتی ہیں۔

آگ ہی کو قربانی کیلئے اصل ذریعہ اور واسطہ مقرر کیا گیا۔ (سفر - پیدائش آفرینش - باب ۱۵ - آیۃ ۱۷)

قربان گاہ پر ہمیشہ اور بلاناغہ آگ روشن رکھی گئی۔ (توراۃ سفر - پیدائش - باب ۸ - آیۃ ۲۰)

آگ کی اصلیت اسرار الٰہی میں پنہاں بتلائی گئی۔ (سفر - لیوی - باب ۶ - آیۃ ۲۰)

سلیمان پیغمبر کے عبادتخانہ میں آگ برابر روشن رکھی گئی۔ (تاریخ ایام - کتاب دوم - باب ۷ - آیۃ ۳)

آگ میں عود ولوبان جلا کر قربان گاہ کے اندر رکھا گیا۔ (سفر - لیوی - باب ۱۶ - آیۃ ۱۲)

آگ کو خدا کے قہر وجلال کی علامت بتایا گیا۔ (سفر - خروج - باب ۳۵ - آیۃ ۳)

آگ خدا کی قدرت - وجود - پاکبازی اور محافظت کی علامت ہے۔ (کتاب حزقیل - باب ۱ - آیۃ ۴ - باب ۱ آیۃ ۷)

آگ الہام اور معرفت الٰہی کی علامت ہے۔ (کتاب آرمیا - باب ۵ - آیۃ ۱۴)

موسیٰ پیغمبر نے وادیٔ طوبیٰ میں آگ دیکھی جس نے ان سے خطاب کیا۔ کہ اے موسیٰ بیشک میں تیرا رب ہوں۔ (قرآن سورۃ ۲۰ - آیۃ ۱۱)

آگ خدا کے انصاف کی علامت ہے اور یہی انسانی اعمال کو جانچتی ہے۔ (ذکریا - باب ۸ - آیۃ ۹)[1]

---

[1] قرآن مجید میں بھی گرمیٔ روز حساب کا ذکر ہے۔

آگ کے ذریعہ برائی کی سزا ملتی ہے۔ (مزامیر داؤد۔ باب ۶۸۔ آیتہ ۲)[۱]

خدا وادی سینا میں آگ کے اندر اترا اور وہاں سے تنور کی طرح دھواں اٹھا۔ (سفر خروج۔ باب ۱۹۔ آیتہ ۱۸)[۲]

اس لئے بنی اسرائیل کی رہنمائی آگ کے ذریعہ کی۔ (سفر خروج۔ باب ۸۔ آیتہ ۲۰۔ باب ۴۰۔ آیتہ ۳۸)

خدا اپنی قدرت سے ایک روشنی مثل آگ کے قائم کریگا۔ (اشعیاء۔ باب ۱۰۔ آیتہ ۱۷)

خدا کی رحمت کا ظہور ابراہیم کے لئے آگ کے اندر ہوا۔ (قرآن۔ سورۃ ۲۱۔ آیتہ ۶۹)

اب ذرا ادبیات مزدا یسنا یعنی زرتشتیوں کی مقدس مذہبی کتابوں کو بھی غور سے مطالعہ فرمایئے۔ تو یہ حقیقت منکشف ہوجائیگی کہ مذکورہ بالا اعتقاد آگ کے متعلق یہاں بھی بجنسہٖ نظر آتے ہیں۔ مثلاً

اہورا مزدا نے آسمانی دنیا کو پہلی مرتبہ روشنی سے منور کیا۔ (یسنا۔ باب ۳۱۔ آیتہ ۷)

خدا کی بزرگی کی دلیل اُس کا نور ہے۔ (یسنا۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۱)

خدا کا نور دنیا و آسمان کو محیط کئے ہے۔ (وندیداد۔ باب ۲۔ یشت باب ۲۰)

اہورا مزدا کا آخری فیصلہ آگ کے ذریعہ ظاہر ہوگا۔ (یسنا۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۲۹)

خلاق عالم نیکوں کو انعام اور بدوں کو سزا آگ کے ذریعہ دیگا۔ (یسنا۔ باب ۵۱۔ آیتہ ۹)

نیک بندوں کے اعمال کی جانچ اُس وقت ہوتی ہے جب وہ مزدا کی آگ پر قربانی چڑھاتے ہیں۔ (یسنا باب ۴۳۔ آیتہ ۹)

بلاشبہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ آگ کا احترام پارسیوں کے اندر اپنی حد سے کسی قدر تجاوز بھی کر گیا ہے۔ یہانتک کہ غیر اقوام کو ان کے متعلق آتش پرست ہونیکا گمان ہوگیا۔ چنانچہ ایک زرتشتی عالم نے خود بھی اس سلسلے میں اظہار خیال فرما کر افسوس ظاہر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں[۳]:۔

"بعض ایسے مراسم جن کو عہد حاضر کے زرتشتی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے درحقیقت زرتشت کے اصلی تعالیم سے منحرف اور برگشتہ ہوجانے کے باعث رونما ہوئے ہیں۔ اور یہ مراسم طبقۂ عوام اور جہلا کی توہم پرستی کے نتائج ہیں۔ آج اکثر پارسی اپنے دینی فرشتوں کا احترام جس طور پر بجا لاتے ہیں اسے زرتشت بھی دیکھ کر ناپسند فرماتے۔ ایران میں شاہ بہرام کے قدیمی آتشکدہ پر جانوروں کی گمراہانہ قربانی ایک حد تک بت پرستی کا شائبہ لئے ہوئے ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ یہ بدعات رفتہ رفتہ کم ہوتے جارہے ہیں"۔

۱؎ آتش جہنم کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے۔ ۲؎ قرآن کریم۔ سورۂ ہفتم میں حضرت موسیٰ کی داستان قابل مطالعہ ہے۔

۳؎ ایران و پارسیان (مؤلفہ نریمان)

تاہم یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اس طرح کی خامیاں تقریباً ہر مذہب اور ملت میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ معمولی عقاید جہلا اور عوام کے درمیان ایک مخصوص حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ خود مسلمانوں میں اس طرح کی کمزوری کے وجود پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مرحوم شمس العلماء شبلی نعمانی نے صحیح طور فرمایا ہے کہ[1] مسلمانوں کا عقیدہ عرش اور کرسی کے متعلق یا اُن کا حد درجہ کا احترام کعبہ کے لئے اگر غور سے دیکھا جائے تو بت پرستانہ رنگ سے مبرا نہیں۔ اور اس بحث نے اتنا طول کھینچا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا بھی فرقہ پیدا ہو گیا جو خدا کے جسم رکھنے تک کا قائل ہو گیا۔ خود محدثین بھی خدا کے ہاتھ اور صورت رکھنے اور اس کے روز حشر و نشر انسانی نظروں کے سامنے ظاہر ہونے پر اعتقاد رکھتے تھے[2]۔

قدیم ایرانیوں کا اہورا مزدا اپنے صفات میں یہودیوں کے جیہوا۔ عیسائیوں کے خدا۔ اور مسلمانوں کے اللہ ہی جیسا ہے۔ وہی تمام کائنات کا خالق اور اسی کی مرضی پر تمام نیک و بد اعمال کا فیصلہ منحصر ہے۔ وہ واحد و یکتا ہے۔ اس کی قدرت و اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ اور نہ کوئی قوت اس کے مقابلہ میں کامیاب ہو سکتی ہے[3]۔

زرتشتی خیال کے مطابق کل مخلوق دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک گروہ مزدا پرست یعنی خدائی۔ اور دوسری جماعت دیو پرست یعنی شیطانی[4]۔ ہر انسان اپنے افعال میں مختار اور اپنی راہ نجات کے انتخاب میں قادر ہے۔ اگر وہ خدا کو اپنا ذریعہ نجات سمجھتا ہے تو پھر اسے شیطانی قوت سے جنگ اور مقابلہ لازمی ہو گا اور اس سے کامیاب نکلنے پر اُسے نجات حاصل ہو سکے گی۔ اس مقام پر بھی عوام الناس نے غلط فہمی کو راہ دیکر زرتشتیوں کا شمار کافروں میں کیا۔ اور خدا اور شیطان کے متعلق جو اس جماعت کا عقیدہ ہے اسے متعصب مصنفین نے طرح طرح کی رنگ آمیزی کے بعد لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ پارسیوں پر یہ الزام کہ وہ دو خدا کے قائل ہیں اور اُن کے عقیدۂ توحید سے دُوئی کا اظہار ہوتا ہے۔ سر تا پا بے بنیاد اور لغو ہے۔ بالکل یہی باتیں تو آخر قرآن میں بھی مرقوم ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے :۔

شیطان خدا کے نیک بندوں کا مخالف اور بے ایمان لوگوں کا رہنما ہے۔ (سورۃ ۲۳۔ آیۃ ۹۷)

شیطان لوگوں کو بہکاتا اور بُرے کاموں کی طرف لے جاتا ہے۔ (سورۃ ۷۔ آیۃ ۱۲۰)

وہ بُری باتیں سکھاتا ہے۔ (سورۃ ۴۔ آیۃ ۱۲۰)

شیطان کی بدی گنہگاروں اور ایمان نہ رکھنے والوں پر اثر کرتی ہے۔ (سورۃ ۲۶۔ آیۃ ۲۲۱)

---

[1] شعر العجم جلد پنجم صفحہ 179۔ [2] معتزلی اور اشعری عقائد پر مفصل بحث کیلئے ملاحظہ ہو تاریخ ادبیات ایران (مؤلفہ براؤن) جلد اول صفحہ ۲۸۱۔ [3] تاریخ پارسیان (مؤلفہ کارکا)۔ تجلی ایران باستان (مؤلفہ پیتاوالا) دینیات زرتشتی (مؤلفہ ڈاکٹر دھالا) ملاحظہ ہو۔ [4] بیڈبار (مؤلفہ راگزین) مجوسیت قدیم (مؤلفہ مولٹن) اور اسی طرح کے عقیدہ کے متعلق قرآن مجید میں ذیل کی سورتیں بھی دیکھیے :۔ سورۃ ۱۶۔ آیۃ ۳۶۔ سورۃ ۱۹ آیۃ ۱۰۔ وغیرہ وغیرہ۔

شیطان نے خود کو خدا کا سب سے بڑا مخالف ثابت کیا۔ (سورۃ ۲۰۔ آیتہ ۲۸)

نیک بندوں کے خلاف کارروائی کرنیوالا ہمیشہ شیطان ہوتا ہے۔ (سورۃ ۴۱۔ آیتہ ۳۶)

انجام کار شیطان کو شکست ہوگی اور وہ بحکم خدا فنا کردیا جائیگا۔ (سورۃ ۴۔ آیتہ ۷۶)

اب ان ہی کو زند اوستا کی روشنی میں دیکھئے:۔

بدی کا اصلی موجد دیو (شیطان) ہے۔ (وینڈیداد۔ باب ۱۹۔ آیتہ ۳-۱)

دیو کی طبیعت ہی بدی سے ہے۔ (لیسنا۔ باب ۶۱۔ آیتہ ۲)

بدی نتیجہ ہے بُرے ایمان اور بُرے علم کا۔ (لیشت باب ۲۷ آیت ۱۔ وینڈیداد باب ۱۱۔ آیتہ ۱۰)

بُرائی کا بانی بلاشبہ شر بر قوت ہے۔ (لیشت۔ باب ۱۹۔ آیتہ ۹۷)

دیو کی تمام شرارتیں بحکم خدا برباد کردی جائیں گی۔ (لیشت باب ۱۰۔ آیتہ ۱۱۸)

خدا مختلف اوقات میں اہرمن کی شرارت سے بندوں کو محفوظ رکھنے کے لئے اپنے رسول بھیجتا رہا ہے۔ (دینکارد۔ جلد اول۔ باب ۳۶)

(باقی)

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چند بردائی۔ اور اسکے ہمعصر شعراء۔ جگ نائک۔ سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام۔ اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ۔ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور:۔ (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان کے پہلے کے بھگت شعراء۔ مقلدین رامانند۔ بھاونند۔ ریداس بھگت۔ کبیر۔ گورونانک دیو۔ میراں بائی۔ ملک محمد جائسی۔ تلسی داس۔ سورداس۔ عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دور ۔ (رزمیہ شاعری کا آغاز) کیشوداس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیشوداس کے ہمعصر سندرداس۔ سیناپت بابا دین۔ دیال گر۔ بھوشن۔ متی رام۔ چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی رزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی راے اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعراء۔ اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء۔ ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم ۔ (رنشٹاد کے بعد) للولال۔ سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار۔ بھارتندو بابو ہریشچندر۔ پدماکر۔ بینی پروین۔ سری دھر پاٹھک کی شاعری۔ شعرائے حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر۔ اردو شاعری پر ہندی کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے۔ اور اُردو رسم الخط میں بھی ضخامت کا اندازہ ۔۔ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت عہ ہوگی لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔ (مینیجر نگار)

دیر و حرم کے قصّے

۱

جہاں آرا اور چھتر سال

(مسلسل)

یہاں شمع و پروانہ کے اس سوز و گداز کے تماشہ پر پردہ پڑجاتا ہے۔ یا تو جہاں آرا بیگم نے درمیانی زمانہ کی داستان کو قلمبند کرنا ہی فضول سمجھا، یا اس فسانہ کے اوراق پریشان تتر بتر ہوگئے۔ اور یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ بالآخر جب پردہ اٹھتا ہے تو شہنشاہ شاہجہاں کی شدید علالت کا سین سامنے نظر آتا ہے۔ شہنشاہ دفعتاً کسی شدید مرض میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ جہاں آرا بیگم اور شہزادہ ولیعہد دارا شکوہ آدھی رات کو محل میں طلب کئے جاتے ہیں۔ بادشاہ کی حالت نازک معلوم ہوتی ہے۔ ہر ایک ماتم زدہ اور بدحواس نظر آتا ہے۔ صبح ہوتے ہوتے نہ صرف دارالسلطنت میں بلکہ اطراف ملک میں شہنشاہ کے فوت ہونے کی افواہ عام ہوجاتی ہے۔ شہر اور بازار بند۔ کاروبار ابتر اور ملک میں بدامنی اور خانہ جنگی کی تیاریاں نظر آتی ہیں۔ تینوں شہزادے تخت یا تابوت کا نعرہ بلند کرکے بغاوت کردیتے ہیں اور دارالسلطنت پر فوج کشی کی تیاریاں۔ چندہی روز میں بادشاہ کی طبیعت بہتر ہوجاتی ہے۔ اور اس نیت سے کہ رعیت کو بادشاہ کی زندگی کا علم و اطمینان ہوجائے شاہجہاں دہلی سے آگرہ کا سفر کرتا ہے۔ آگرہ پہنچکر شہنشاہ روزانہ جھروکہ درشن میں بیٹھ کر رعیت کے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ تاہم شائستہ خاں اور امین خاں اورنگ زیب کو مطلع کرتے ہیں کہ بادشاہ قریب مرگ ہے۔ اور اورنگ زیب کو آگرہ پر دھاوا کرنا چاہئے۔ یہ خطوط دارا شکوہ کے ہاتھ لگتے ہیں۔ دارا شکوہ ان دونوں امیروں کو قید کرلیتا ہے۔ لیکن روشن آرا بیگم کی سفارش سے یہ دونوں رہا کردیئے جاتے ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی سازشوں سے باز نہیں آتے۔ اورنگ زیب کی ریشہ دوانیوں اور بادشاہ کی علالت کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب تقریباً دو ثلث سپاہ اور سرداروں کو اپنا طرفدار بنالیتا ہے۔ اجین کی لڑائی میں شاہی فوج کو شکست ہوتی ہے۔

مراد اور اورنگ زیب آگرہ پر دھاوا بولتے ہوئے چمبل کے کنارے تک آپہنچتے ہیں۔ سلیمان شکوہ داراشکوہ کا بیٹا شہزادہ شجاع کا پیچھا بنگال میں کر رہا ہے۔ اور یہاں سوائے مہابت خاں اور راؤ راجہ چھتر سال کے داراشکوہ کے ساتھ اور کوئی نامی سردار یا سوربیر موجود نہیں۔

اس تمام داستان کو جہاں آرا بیگم نے نہایت دلچسپ اور رقت آمیز پیرایہ میں بیان کیا ہے۔ لیکن چونکہ حکومت کی ہنگامہ آرائیوں اور ریشہ دوانیوں سے حُسن و عشق کے فسانے کے لطف کو مکدّر کرنا منظور نہیں۔ یہ حصہ حذف کیا جاتا ہے۔

ملک میں ہر جانب ایک طوفان برپا تھا۔ سلطنت کی خیر نظر نہیں آتی تھی۔ شاہجہاں اور جہاں آرا دونوں خاندان تیموریہ کے آئندہ عروج و بقا سے مایوس ہوتے جاتے تھے۔ داراشکوہ البتہ مقابلہ کی تیاریاں کر رہا تھا۔ راؤ راجہ چھتر سال کی اورنگ زیب سے پیچھا چھڑا کر آگرہ پہنچنے کی خبر مشہور ہو رہی تھی۔ کہ عالم بیم و امید میں جہاں آرا ایک دن سلیم چشتی کے مزار پر دعا و زاری کرنے کی غرض سے فتح پور سیکری چل کھڑی ہوئی۔

تپتی ہوئی دھوپ اور لوؤں میں جہاں آرا فتح پور سیکری پہنچی۔ علاوہ سواروں کے جہاں آرا کے ساتھ صرف اس کا ناظر اور اس کی خادمہ اور سہیلی کومل تھی۔ نوبت خانہ سے گذر کر بلند دروازہ پر سواری ٹھہری۔ اور جہاں آرا نے مسجد کی طرف قدم بڑھایا۔ کچھ لوگ غریب اور بیکس بادصف ممانعت کے خیرات کی لالچ سے اِدھر اُدھر کھڑے بیگم کی سواری کا نظارہ کر رہے تھے۔ جونہی شہزادی نے مسجد کی طرف قدم اُٹھایا اُن میں سے ایک نے جو عمر میں جوان اور صورت شکل کا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن جس کی نگاہ سے وحشت اور بدحواسی کے آثار ظاہر تھے باآواز بلند اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔ شہزادی چونک پڑی۔ اور اسے اپنے عالمِ ہراس میں یہ محسوس ہوا کہ آلِ تیمور کے لئے جو نسلوں سے خدا کو بھلائے ہوئے بیٹھے ہیں یہ آوازِ غیبی آخری تنبیہ کا حکم رکھتی ہے۔ وہ کانپ گئی۔ اور آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔ مسجد میں پہنچکر اس نے یکسو ہو کر پہلے نماز ادا کی۔ پھر سلیم چشتی کے مزار پر سرنگوں ہو گئی۔ کچھ ڈھارس بندھی تو اکبر کے اس اُجڑے ہوئے دیار کا گشت لگانے لگی۔ دیوان خاص۔ خاص محل۔ خوابگاہ۔ پنج محل۔ پچیسی محل۔ ہر ایک پر غور سے نظر ڈالتی۔ اکبر کے زمانہ کے نظارہ اور کیفیت کو اپنے خیال میں تازہ کرتی۔ اپنے بچپن اور بھائی بہنوں کے کھیل کود کی باتیں یاد آتیں۔ آنکھوں کے سامنے ایک سماں بندھ جاتا۔ کیفیتِ درد اور عبرت سے آنکھیں نمناک ہو جاتیں۔ اور جب زمانۂ حال اور آئندہ کے ہنگاموں اور بربادی کی صورت سامنے آتی تو دل بیٹھنے لگتا۔ اسی خیال میں ڈوبی ہوئی جہاں آرا ایک محل کے بالاخانہ پر کھڑی ہوئی سیکری کے کھنڈروں کی طرف نظر ڈال رہی تھی۔ کہ قریب ہی پانچ سات آدمیوں کا ایک گروہ تالاب پر کھڑا دکھائی دیا۔ ان میں سے بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کا ساز و سامان بھی تھا۔ شہزادی کو دیکھتے ہی ان میں سے ایک نے اپنی دینا کے ساتھ میراں بائی کا یہ بھجن شروع کیا۔

میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی

جا کے سر مور مکٹ میرو پتی سوئی - شنک چکر گدا پدم کنٹھ مال ہوئی ؛ مات مات بھائی بند آپنو نہ کوئی - چھوڑ دی کُل کی لاج کیا کر لگا کوئی
آئی تھی میں بھگت جان جگت دیکھ روئی - سادھون سنگ بیٹھ بیٹھ لوک لاج کھوئی ؛ انسون جل سینچ سینچ پریم بیل موئی -
اب تو بیل پھیل گئی امرت پھل ہوئی ؛ اب تو بات پھیل گئی جانے سب کوئی - داس میراں سرن آئی ہونی ہو سو ہوئی ؛
میرے تو گردھر گوپال دوسرو نہ کوئی

یہ وہی بدحواس اور وحشت زدہ جوان تھا جس نے چند گھنٹہ پیشتر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا تھا - میراں کے بھجن میں درد کی کچھ کمی نہیں تھی - لیکن اس شخص کی آواز میں کچھ ایسا سوز و گداز تھا کہ جہاں آرا اس لمحہ ہمہ تن گوش ہو گئی - اور بندرابن کی کنج گلیوں میں کنہیا اور رادھا اور کرشن اور گوپیوں کے راس منڈل اور من کی موہنی کرنیوالی شبی کا نظارہ اسکی آنکھوں کے سامنے پھر گیا - وہ چند لمحہ وہیں کھڑی رہی - پھر جب اسے ہوش آیا اور وہاں سے چلی تو ایک ٹھنڈی سانس بھر کر اس نے من ہی من میں کہا کہ اگر ہند کو تباہ ہی ہونا ہے - اگر دارا کو شکست ہی بدی ہے - اگر راٹھور راجہ مارا ہی گیا تو میں بھی اس کے نام پر جوگن ہو کر متوالی پھرا کروں گی - یہ کہتی ہوئی جہاں آرا پھر سلیم چشتی کے مزار پر پہنچی - ظہر کی نماز ادا کی - اور دعا و زاری میں مصروف ہو گئی - اس سے فارغ ہو کر وہ ابھی کسی قدر سکون کی حالت میں بیٹھی ہی تھی کہ کانوں میں آواز آئی کہ جیسے کوئی صحن کی طرف سے چلا آ رہا ہے - اسے فوراً اپنے راکھی بند بھائی کا خیال آیا - ابھی یہ خیال اس کے ذہن سے پوری طرح دور بھی نہ ہوا تھا کہ کسی نے دروازہ کھولا - جہاں آرا نے جو نظر اٹھا کر دروازہ کی طرف دیکھا تو راٹھور راجہ چھتر سال سامنے کھڑا تھا - یہاں سے جہاں آرا کی آپ بیتی خود اس کی زبانی سنئے :-

میری حیرت کی کوئی حد نہ تھی - ایسے معجزے بھی دیکھنے میں آتے ہیں - باوجود اس حیرت کے میں از سر تا پا سکون و اطمینان میں تھی - مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا میں دنیا میں کئی جنم لے چکی ہوں اور تمام جنموں کے سنسکار اس لمحہ انتہائی مسرت کی شکل میں نمودار ہو رہے ہیں - دیکھنے کو میں جہاں آرا تھی - لیکن در اصل وہ لازوال شعلۂ نور جو ازل سے اب تک ہر جسم خاکی میں پنہاں رہا ہے - میں نے چہرہ سے نقاب الٹ دیا اور آنکھیں چار ہوئیں - وہ راز جو اب تک میری سمجھ میں نہ آیا تھا - وہ بات جس سے میں برابر دھوکا کھاتی رہی اس ایک لمحہ میں مجھ پر آشکارا ہو گئی - اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ وہ خط جس نے میری زندگی تلخ کر رکھی تھی اور جو میری بربادی کا باعث ہوا تھا اسکا لکھا ہوا نہ تھا - بلکہ میرا خط بھی اس تک نہ پہنچا تھا - اس کی نگاہ ایک خاص کیفیت سے سرشار تھی لیکن کیسی معصوم! مگر چشم زدن میں اس کے چہرہ کا رنگ بدلا - اس کی پیشانی پر شکن پڑی اور میں نے نقاب چہرہ پر ڈال کر اسے راکھی بند بھائی کے لقب سے خطاب کیا - اس نے مجھے اسی شان اور ادا سے سلام کیا جیسے اول دن کیا تھا - ہم دونوں قالین پر بیٹھ گئے - اور میں اس کے پیغام کے سننے کے لئے سراپا گوش بن گئی - راٹھور راجہ نے کہا کہ سلطنت کا مقدر اس وقت میرے ہاتھ میں ہے - اور اسی لئے وہ مجھے ڈھونڈتا یہاں تک پہنچا ہے - اس نے مجھے بتایا کہ شہنشاہ نے آج ہی یہ ارادہ ظاہر کیا ہے کہ وہ معرکۂ جنگ میں بہ نفس نفیس خود اپنی فوج کی سرداری اور

رہنمائی کرینگے۔ لیکن شائستہ خاں اور خلیل اللہ خاں۔ جو دونوں کے دونوں دوست نما دشمن ہیں شہزادہ ولیعہد کو اپنے مشورہ سے گمراہ کر رہے ہیں۔ اور دارا شکوہ اس پر بضد ہے کہ فوج کا سپہ سالار وہ خود بنے۔ یہ راستہ تباہی کا ہے۔ اور اگر دارا شکوہ کو اس سے کوئی باز رکھ سکتا ہے تو وہ میں ہوں۔ مجھے یہ کیفیت معلوم کر کے رنج ہوا۔ میں نے اطمینان دلایا کہ مجھ سے جو کچھ ہو سکیگا میں کروں گی۔

وہاں سے اٹھ کر ہم دونوں محل خاص کے ایک کمرہ میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ میں نے سب سے پہلے اس سے اپنے خط اور اس کے جواب کے متعلق دریافت کیا۔ اس نے دونوں سے لاعلمی ظاہر کی۔ میرا اطمینان ہو گیا۔ پھر اورنگزیب کی ریشہ دوانیوں اور رموز مملکت کی الجھی ہوئی گتھیوں کے متعلق بڑی دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اکبر اور نگ زیب راجستھان کے راجپوتوں، سب ہی کا تذکرہ باری باری سے ہوا۔ اگلی اور پچھلی سب ہی باتیں یاد آ گئیں۔ ہند کی ذلت اور بربادی کا خیال آتے ہی راؤ راجہ کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس کے خون میں جوش پیدا ہوا اور تیوریاں بدلکر بولا:-

"محمود غزنوی کو ہند کی دارالسلطنت کا محاصرہ توڑنے اور ناکام واپس جانے پر جس نے مجبور کیا تھا وہ ایک چوہان راجپوت ہی تھا۔ اس کے بعد محمود غزنوی پھر حملہ آور نہ ہوا۔ مگر افسوس کہ اس معرکہ میں اجمیر کا چوہان مہاراجہ کام آ گیا۔ ایک صدی اور گذری اور اس کے بعد ہند کی غلامی کا دور شروع ہوا۔ قنوج کے راجہ نے محمد غوری سے سازباز کر کے دہلی اور اجمیر کے مہاراجہ پرتھوی راج کو شکست دلوائی۔ گو اس کے بعد قنوج بھی تباہ ہو گیا۔ لیکن ہندوستان پر پھر ہمیشہ کے لئے غیروں کا تسلط ہو گیا۔"

میں:- سنجوگتا! (یہ نام میں نے اپنی دانست میں اس قدر آہستہ سے لیا تھا کہ گویا میں صرف اپنی یاد تازہ کر رہی تھی لیکن اس نے سن ہی لیا اور بولا:-

راؤ راجہ:- پرتھوی راج سنجوگتا کو قوت و اقتدار سے کہیں زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ ایک دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ ہم راجپوتوں نے محبت اور ننگ و ناموس پر سے ہر چیز قربان کر دی ہے۔ اور معرکۂ جنگ میں پھاند پڑے ہیں۔ اُس وقت فتح اور شکست کا بھی خیال نہیں رہا ہے۔ بیگم اپنے آنچل سے ایک پٹی پھاڑ کر بطور اپنی نشانی کے میری کلائی پر باندھ دو۔ تا کہ لڑتے وقت تم میری نظر کے سامنے ہو۔ اسلام کی زبردستیوں کے خلاف تو راجپوت ہمیشہ سے لڑتے آئے ہیں اور میں بھی اسکا مقابلہ کرنے سے گریز نہ کرونگا۔ لیکن تمہاری نشانی اگر میرے سامنے ہوگی تو میں تمہارے ننگ و ناموس کا بھی ویسا ہی پاس و لحاظ کروں گا کہ جیسا اپنے ننگ و ناموس کا۔ کیونکہ یہ دونوں میری نگاہ میں ایک ہی عزت رکھتے ہیں۔

یہ سنتے ہی میری جان میں جان آئی۔ مجھے پورا پورا اطمینان ہو گیا۔ میں نے اپنے دوپٹہ میں سے ایک پٹی پھاڑ کر اسکی کلائی پر باندھ دی۔ میں وہاں سے اٹھی۔ راؤ راجہ میرے ساتھ تھا۔ شام ہو گئی تھی دن ڈھل چکا تھا۔ سماں نہایت دلکش تھا۔ سامنے تالاب تھا جہاں بابر اُس وقت جب سیکری محض ایک گاؤں تھا۔ مچھلیوں کا شکار کھیلا کرتا تھا۔ ہم

دونوں ٹہلتے ٹہلتے وہاں پہنچے - اور میں تالاب کے قریب چبوترہ پر بیٹھ گئی - راؤ راجہ چبوترہ کی سیڑھیوں پر ٹھہر گیا - وہ گردن پھیر کر کسی چیز کو غور سے دیکھ رہا تھا - مجھے اس کے دوپٹہ میں دو موتی چمکتے نظر آئے - میں نے اپنے گلے کے گلوبند کو پہچانا اور خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں - اس نے گردن اٹھا کر کہا :-

"دیکھئے بیگم صاحب سامنے والے میدان کے آگے جو نشیب ہے بابر اور رانا سانگا میں وہیں لڑائی ہوئی تھی"

میں :- میں تو ان خانہ جنگیوں اور خونریزی سے تنگ آ گئی ہوں - ان باتوں کے ذکر سے میری طبیعت محظوظ نہیں ہوتی - خدا کرے کہ یہ لڑائی جو درپیش ہے آخری لڑائی ہو اور دارا فتحیاب ہو کر فتحپور سیکری میں اپنی فتح کا جشن منائے -

راؤ راجہ :- (نہایت لاپرواہی سے) فتحپور سیکری چتوڑ کی آخری تباہی کے دوران میں بسایا گیا تھا - اکبر نے بھی تو اپنی سلطنت کی بنیاد خونریزی ہی پر قائم کی تھی - اور خونریزی ہی نے اس سلطنت کو قائم اور مستحکم رکھا ہے - اکبر کا ارمان یہ ضرور تھا کہ وہ اپنے نئے عقیدے اور ایمان سے ہندوستان میں متحدہ قومیت پیدا کر دے - لیکن جس طرح تیمور لنگ کی عظیم الشان سلطنت اس کے بعد قائم نہ رہ سکی کیونکہ وہ نہایت عظیم الشان تھی - اسی طرح اکبر کا خواب و خیال بھی اس لئے پورا نہ ہو سکا کہ وہ نہایت جلیل القدر تھا -

میں :- (اضطراب کے ساتھ) اکبر ہند کی رعیت سے محبت رکھتا تھا - اس نے راجستھان کی کماریوں کو رانیوں اور بیگموں کا مرتبہ دیا -

راؤ راجہ :- ہاں لیکن اس نے ان کے ننگ و ناموس کا پاس و لحاظ ہمیشہ نہیں کیا - لوگ راجستھان میں آج تک کہتے ہیں کہ اکبر پرتھوی راج کی رانی پر بری نگاہ ڈالتا تھا - اور ایک دفعہ جشن نوروزی کے موقع پر اس نے رانی پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا - لیکن رانی کمر سے خنجر نکال کر مقابلہ کے لئے تیار ہو گئی -

یہ سن کر میری پیشانی پر بل پڑ گئے - میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی - میں نے جوش میں آ کر کہا - آدمی آدمی میں بڑا فرق ہوتا ہے - اکبر معمولی آدمی نہ تھا - کتنی عورتیں ہیں جو اس کی ایک نگاہ پر اپنے تئیں قربان نہ کر دیتیں -

یہ سنکر راؤ راجہ کے چہرہ کا رنگ بدلا - اس نے اپنی گردن جھکا کر نگاہیں نیچی کر لیں - میں سوچنے لگی کہ میں بھی تو راجستھان کے ایک شہزادہ پر اپنا تن من سب نچھاور کرنے کے لئے تیار ہوں - یہ خیال آتے ہی میں مسکرا دی - میرا نقاب بہت باریک تھا - اس نے غالباً مجھے مسکراتے دیکھ لیا -

راؤ راجہ :- (مسکرا کر بولا) شہزادی معاف کرنا - کچھ خیال آ گیا تھا - سپاہی کا خون بہت جلد کھولنے لگتا ہے - معاف کر دو - میں تمہارا ویسا ہی غلام ہوں جیسا تھا - اکبر کی عظمت اور اسکے مسلک کا میں ہمیشہ سے قائل رہا ہوں - اور اب بھی ہوں (یہ کہکر اس نے اس تعویذ کو جو میں نے اس کے ہاتھ پر باندھا تھا بوسہ دیا اور مجھے دیکھنے لگا)

چونکہ دن ڈھل چکا تھا اور دیر ہو گئی تھی - میں نے آگرہ واپس جانیکا قصد صبح تک ملتوی کر دیا - ملک میں شورش

اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ لہذا راؤ راجہ کو میرا تنہا فتحپور سیکری میں رات کو ٹھہرنا اندیشہ سے خالی نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی طے کیا کہ وہ رات کو وہاں ٹھہریگا۔ اور صبح ہوتے ہی جائیگا۔ میں نے محل کے ایک حصہ میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کرا دیا۔ شام کو ہم دونوں محل میں پھر ملے۔ کوئل نے بڑے سلیقہ سے دسترخوان بچھایا۔ میوہ جات اور لوزبات اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے چنے ہوئے تھے۔ شمع و فانوس کمرہ کو جگمگا رہے تھے اور پھولوں کی خوشبو دماغ کو معطر کر رہی تھی۔ راؤ راجہ مہمان تھا اور میں میزبان۔ ہم دونوں قریب قریب بیٹھے تھے۔ لیکن صدیوں کی سرگذشت اور موجودہ کشمکش اور ہنگامہ آرائیاں ہم میں فاصلہ پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے جامِ شراب بھر کر اپنے ہاتھ سے راؤ راجہ کی طرف بڑھایا۔ سلسلۂ گفتگو شروع کرنے کے لئے بجھے اور تو کچھ سوجھا نہیں۔ میں نے پوچھا:۔

آخر آپ لوگ جب اپنے ہاتھ سے اتنی جانوں کا خون کرتے ہیں تو کیا اس کی کراہت کا احساس آپکو نہیں ہوتا؟

راؤ راجہ:۔ (اس نے جام شراب بلا منہ سے لگائے ایک طرف رکھ دیا اور سنجیدگی سے بولا۔) اگر ہم راجپوتوں کو تلوار چلانی نہ آتی ہوتی تو نہ راجستھان باقی رہتا نہ سلطنت مغلیہ۔ شہزادی مرنا اور مارنا تو زندگی کا اُتار چڑھاؤ ہے ورنہ خالق و مخلوق کا رشتہ تو استحکام ابدی رکھتا ہے۔ کم از کم میں نے تو جب کبھی شہنشاہ کی رفاقت میں تلوار بے نیام کی اور دشمنوں کا خون بہایا ہے تو سوائے ننگ و ناموس کے تحفظ کے اور کوئی جذبہ مجھ پر غالب نہ تھا۔ اور جس دن میں لڑائی میں کام آجاؤنگا میں سمجھونگا کہ میں نے دُنیا میں سپاہی کا فرض ادا کیا۔ عاقبت کی خبر خدا جانے۔

یہ سنتے ہی میری طبیعت بےچین سی ہوگئی اور مجھ پر خوف طاری ہوا کہ مبادا میرا محبوب مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے کھوئی ہوئی سی حالت میں میں نے کہا:۔

"ہر لحظہ کی شورش آخر کس کو بھاتی ہے۔ کیا ہم امن و سکون کے جویا نہیں؟ کُشت و خون و ہنگامہ آخر تابکے؟

راؤ راجہ:۔ شہزادی ایک زمانہ گذرا کہ ہند میں مہاراجہ اشوک بڑا چکرورتی راجہ ہوا تھا۔ اُس نے کُشت و خون سے توبہ کی تھی۔ وہ امن و آشتی کا فرشتہ تھا۔ شانتی اسکا سبھاؤ تھا۔ خونریزی کرنا یا جان لینا اس کے نزدیک بڑا گناہ تھا۔ وہ اس گناہ کا مرتکب ہوا۔ مگر نتیجہ کیا نکلا۔ آریہ ورت کا دروازہ دوست و دشمن سب کے لئے کھلا رہا۔ دشمن آئے اور جوق جوق آئے۔ کشت و خون بھی جتنا کر سکتے تھے کیا۔ حتیٰ کہ ہند اس حالت کو پہنچ گیا۔

داستانِ پارینہ سے درگذر کر کے آنیوالی پریشانیوں اور اورنگ زیب اور مراد کی ریشہ دوانیوں کا تذکرہ ہونے لگا۔ میں سب کچھ سنتی جاتی تھی۔ کبھی چپ ہو جاتی کبھی جواب دیدیتی۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا جاتا میری طبیعت اداس ہوتی جاتی۔ کیونکہ میں بہت کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن تابِ گویائی نہ تھی۔ جو باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا وہ زبان سے نکلتی نہ تھیں۔ جب رات زیادہ گذرنے لگی مجھے خیال آیا کہ راؤ راجہ کو تڑکے ہی روانہ ہونا ہے۔ میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔ راؤ راجہ نے رخصت چاہی۔ میں سراپا انتظار تھی۔ کہ وہ بولا:۔

"شہزادی! جب آپکا کوئی پیام مجھ کو نہیں ملا تو میں سمجھا کہ آپ نے مجھے بھلا دیا۔ تاہم میرے دل سے آپ کی صورت کا وہ نقش جو میں نے اپنے خیال میں کھینچا تھا ماند نہیں پڑا۔ اور میں اسی تصوّر کا غلام رہا۔ لیکن اب جبکہ مجھ کو آپکا دیدار نصیب ہو چکا ہے۔ اب جبکہ میری اور آپ کی آنکھیں چار ہو چکی ہیں۔ قسمت ہی یاری نہ کرے تب تو بات دوسری ہے۔ ورنہ چھتر سال آپ سے جدا نہیں رہ سکتا۔"

یہ کہکر اس نے قدم اٹھائے اور نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ میں اپنی خوابگاہ پہنچی۔ اُمید و بیم نے طبیعت کو الجھن میں ڈال رکھا تھا۔ کچھ کھوئی ہوئی سی تھی۔ سامنے گلدان میں پھول چُنے ہوئے رکھے تھے۔ بے تحاشہ دوپٹہ کی روپہلی تاریں نکال کر اور چمپا کے پھول گلدان سے لیکر ہار گوندھنے لگی۔ ہار گوندھتے گوندھتے میں کمرہ کے برآمدہ میں جا کھڑی ہوئی۔ اور جھک کر دیکھنے لگی۔ اپنے کمرہ کے برآمدہ میں راؤ راجہ بھی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ تو شرماتی تھی کہ کہیں وہ مجھے دیکھ نہ لے۔ اور کچھ انتظار تھا کہ اس کی نگاہ میری طرف پڑے۔ لیکن وہ کسی غور و فکر میں ڈوبا ہوا سامنے دیکھ رہا تھا۔ لمحہ بھر بعد وہ کمرہ میں چلا گیا اور میں بھی اندر آگئی۔ کوئل چٹائی پر پڑی ایک طرف سو رہی تھی۔ میں بھی غلطاں و پیچاں پلنگ پر کچھ دیر پڑی رہی کہ دیکھئے اس کمبخت جنگ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ کبھی ملنا بھی بدا ہے کہ نہیں۔ میں اسکی صورت بھی دیکھ سکوں گی کہ نہیں۔ اتنی دیر کے لطفِ صحبت کے باوجود دل کی بات دل ہی میں رہی۔ اور کچھ کہنے نہ پائی۔

اسی خیال میں میں پلنگ سے اٹھی۔ اس دروازہ تک پہنچی جو میرے اور راؤ راجہ کے کمرہ کے درمیان بند تھا۔ بلا کسی ارادے کے جس طرح خواب میں کوئی نقل و حرکت کرتا ہے میں نے دروازہ کھولا۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میں اندر داخل ہوئی۔ کمرہ چاندنی سے روشن تھا۔ راؤ راجہ ایک مرگ چھالا پر ننگے سر سو رہا تھا۔ چاندنی اس کے چہرہ پر پڑ رہی تھی۔ آنکھیں بند تھیں۔ لیکن ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ اُس وقت اسکا حُسن انتہا درجہ دلفریب تھا۔ مجھے اس کی موہنی صورت کبھی ایسی بھولی اور پیاری نہیں معلوم ہوئی تھی۔ ایک لمحہ تو میں کھڑی محوِ نظارہ رہی اور پھر پاؤں پھیلا کر ہاتھ کے سہارے اسکے پہلو میں بیٹھ گئی۔ اس وقت مجھ پر وہ عالمِ محویت طاری تھا کہ مجھ کو دنیا و مافیہا کی خبر نہ تھی۔ نہ جو کچھ گذر گیا اسکا غم تھا نہ جو کچھ پیش آنیوالا تھا اسکی فکر تھی۔ اگر کسی بات کا احساس تھا تو صرف اس کا کہ میں ہوں اور میرا محبوب اور تیسرا کوئی مخل نہ ہو۔ لطفِ محبت کا یہ ایک لمحہ مجھے اپنے نشہ سے اس طرح سرشار کئے ہوئے کہ گویا یہی تمام تر زندگی ہے۔ ہم دونوں کی یہ چھوٹی سی دُنیا مجھے اس لمحہ کُل کائنات عالم میں محیط اور چھائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ زندگی کا تمام تر مقصد۔ میری ساری امیدیں اور خواہشیں بس اس ایک ارمان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھیں۔ کہ اگر وہ اس لمحہ جاگ جاتا اور آنکھیں چار ہو جاتیں تو میں اپنے اس سوزِ نہانی کا راز جس سے ساری عمر تڑپا کی اپنی زبان سے اس پر آشکارا کر دیتی۔ اور جواب میں پیامِ محبت و پیمانِ وفا کے دو کلمے اپنے کانوں سے سُن لیتی۔ چاہتی تھی کہ جگا دوں۔ شوق و انتظار تھا کہ وہ جاگ جائے۔ لیکن وسوسہ تھا کہ کہیں آنکھ کھلتے ہی یہ کیفِ خامشی جاتا نہ رہے۔ اس لمحہ کا جادو

ٹوٹ نہ جائے ۔ مجھے اس غلبۂ جذبات میں مشکل سے چند منٹ گذرے ہوں گے کہ اس نے ایک لمبی سانس لی ۔ اور کروٹ بدلی ۔ میں سراپا انتظار تھی کہ دفعتاً کمرہ کے پاس ہی کچھ شور سا ہوا ۔ بھاری بھاری قدموں کی آواز سنائی دی ۔ جیسے کوئی آیا اور جلدی واپس دوڑا ۔ میں سہم گئی ۔ اٹھی اور سیدھی اپنے کمرہ میں واپس آئی ۔ میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا ۔ پسینہ میں شرابور تھی ۔ تکان نے چور چور کر دیا تھا ۔ چند لمحہ افسردگی کی حالت میں پلنگ پر پڑی رہی لیکن پھر آنکھ لگ گئی ۔

تڑکا ہوتے ہی کسی کے زور سے چیخنے کی آواز نے مجھے جگا دیا ۔ اسی وقت کوئل باہر سے کمرہ میں گھبرائی ہوئی آئی ۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا ؟ اس نے یہ خبر سنائی کہ پہرے والوں نے کسی آدمی کو جو زبردستی محل میں داخل ہونا چاہتا تھا ۔ قتل کر دیا ۔ مجھے کچھ زیادہ غم نہ ہوا ۔ کیونکہ میں یہ سمجھی کہ غالباً یہ وہی آدمی ہوگا جس نے رات کو مجھے خائف کیا تھا ۔ تاہم اس کی چیخ کی آواز دیر تک میرے کانوں میں گونجتی رہی ۔ کوئل سے یہ بھی معلوم ہوا کہ راؤ راجہ بڑے تڑکے ہی سوار ہوکر آگرہ روانہ ہوگیا ۔ میں جب پلنگ سے اٹھنے لگی تو مجھے اس ہار کا دھیان آیا جو میں رات کو گوندھ رہی تھی ۔ میرے آس پاس کہیں اس کا پتہ نہ تھا ۔ خیال آیا کہ جب میں راؤ راجہ کے کمرہ میں گئی تھی تو ہار میرے کمرہ میں تھا ۔ وہاں جاکر دیکھا تو وہاں بھی نہ پایا ۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ راؤ کے ہاتھ لگا اور اس کے ساتھ گیا ۔ میں دل ہی دل میں شرمائی کہ اب جب ملاقات ہوگی تو مجھ سے آنکھیں چار کیسے کی جائیں گی ۔ تاہم میں خوش ہوئی کہ جس کے لئے گوندھا گیا تھا اسی کے ہاتھ لگا ۔

تھوڑی دیر بعد میں تیار ہوکر سوار ہوگئی ۔ ہماری سواری جس وقت نوبت خانہ سے نکلی تو کسی ہندو کی ارتھی جلانے کے لئے گھاٹ لے جائی جا رہی تھی ۔ نہ معلوم کیوں میں پوچھ بیٹھی کہ یہ کس کا جنازہ ہے ۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی شخص ہے جو تڑکے پہرے والوں کے ہاتھ سے مارا گیا ۔ گو دیوانہ تھا تاہم اس کی آواز بڑی سُریلی تھی اور گاتا اچھا تھا ۔ بیگم صاحب کو بھیرویں سنانا چاہتا تھا اسی لئے مارا گیا ۔ کسی نے یہ بھی کہا کہ اس نے کہیں سے ایک جڑاؤ پہونچی چرا لی تھی جو ہر وقت گلے میں ڈالے رہتا تھا ۔ مجھے فوراً دھیان آیا کہ یہ وہی شخص ہوگا جس نے میراں بائی کا گیت سنا کر مجھے خوش کیا تھا ۔ اور جس کو میں نے اپنی پہونچی انعام دی تھی ۔ اسکی ماں روتی پیٹتی ارتھی کے ساتھ جا رہی تھی ۔ میں نے ناظر کو حکم دیا کہ پہونچی عورت سے واپس نہ لی جائے بلکہ دوسری پہونچی بھی اتار کر دیدی ۔ مجھے اس شخص کے مارے جانے کا افسوس ہوا ۔ اور شگون اچھا نہیں معلوم ہوا ۔

جب میں آگرہ پہنچی تو ہر طرف جنگ کا چرچا اور لڑائی کی تیاریاں دکھائی دیں ۔ میں اپنے بھائی دارا کے پاس جانے کے لئے تیار ہو رہی تھی کہ مجھے ایک خط ملا ۔ یہ چھترسال کا تھا ۔ اس نے مجھے یہ اطلاع دی تھی کہ دارا یہانتک بضد ہے کہ اگر اسکو فوج کا سپہ سالار مقرر نہ کیا جائیگا تو وہ سینہ میں خنجر مار کر خودکشی کر لیگا ۔ اس دھمکی کا اثر شہنشاہ پر یہ ہوا کہ دارا کے فوج کا سپہ سالار مقرر کئے جانیکا حکم بادشاہ نے صادر کر دیا ۔ اور اب کچھ نہیں ہو سکتا ۔ اسی خط میں میرے محبوب نے رن کے لئے روانہ ہونے سے پیشتر مجھ سے آخری ملاقات کی درخواست بھی کی تھی ۔ چنانچہ دوسرے روز شام کو

میں تاج محل میں اس سے ملنے گئی - تاج کا سین حد درجہ پُر لطف و دلفریب تھا - بزمِ گُل ولالہ آراستہ تھی - سبزہ قدموں کے نیچے بچھا تھا - سرو پاسبان تھے - ہر طرف سکون کا تسلّط تھا - چاندنی کی جگمگاہٹ سے محفل روشن تھی - قدرت گلاب اور چمیلی کی خوشبو سے تواضع کرتی تھی - چڑیاں گھونسلوں میں بسیرا لیتے چہچہاتی جاتی تھیں - ان کا چہچہانہ نغمہ کا لطف دیتا تھا - اور تاج کا جوبن اور نکھار تو غضب ڈھاتا تھا - معلوم ہوتا تھا کہ یہ پیکرِ حُسن چاندنی کے آئینہ میں اپنا عکس دیکھ کر خود ہی محوِ حیرت ہے - حُسن و محبت کی اس تصویر کو دیکھ کر میں عش عش کر رہی تھی کہ پیچھے سے کسی کے قدموں کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا - گردن پھیر کر دیکھا تو راؤ راجہ تھا - جب نگاہیں ملیں تو اس نے سر جھکا دیا - میں نے سلام قبول کیا - اور ہم دونوں سنگ مرمر کے حوض پر بیٹھ گئے - میری طبیعت تو اس وقت جنگ و تذکرۂ جنگ کی طرف ایک لمحہ بھی دھیان دینے کو نہ چاہتی تھی - لیکن اس سے گریز و پناہ بھی نہ تھی - معلوم ہوا کہ اورنگ زیب اور مراد کی فوجیں چمبل کے کنارے پڑی ہیں - اور یہاں سے شاہی فوج کو صبح ہی مقابلہ پر جانے اور کوچ کرنے کا حکم مل گیا ہے - شہنشاہ کی مرضی تھی کہ ولیعہد سلیمان شکوہ کے بنگالہ سے واپس آنے تک انتظار کرے - لیکن اب توقف کا موقع نہ تھا - چمبل پر دونوں فوجوں کا مقابلہ ہونے کو تھا - راستہ کے تمام ناکوں کی مورچہ بندی ہو چکی تھی - صرف ایک مقام جو راجہ چمپت کے علاقہ میں تھا اس لئے باقی چھوڑ دیا گیا تھا کہ راجہ نے پختہ وعدہ کیا تھا کہ وہ غنیم کی فوج کو کسی حالت میں راہ نہ دیگا - راؤ راجہ کو راجہ چمپت کے وعدہ پر پورا بھروسہ نہ تھا - اور سب سے زیادہ خطرہ اس کو سردار خلیل اللہ خاں کی جانب سے تھا - غضب یہ تھا کہ خلیل اللہ خاں کی کمان میں تیس ہزار سپاہی تھے - راؤ راجہ نے غم و غصہ کے لہجہ میں کہا کہ اگر شہزادہ ولیعہد اب بھی خلیل اللہ خاں کی مکاری اور چاپلوسی سے آگاہ ہو جائے تو اورنگ زیب کے گولے اور بارود کا مقابلہ تو چنداں دشوار نہ تھا -

میں یہ سنکر تھوڑی دیر تک سوچ میں پڑی خاموش رہی - پھر میں نے چونک کر کہا کہ راؤ راجہ تمہارے راجپوت سورما اور رام سنگھ کے سواروں کا رسالہ تو قابلِ اعتبار ہے؟ راؤ راجہ نے مجھے اطمینان دلایا کہ میں اُدھر سے بے فکر رہوں -

جنگ و تذکرۂ جنگ کو بالآخر دماغ سے ہٹا کر ہم دونوں حوض پر سے اُٹھے اور تاج کی جانب چلے - راؤ راجہ کچھ اُداس اور سوچ میں تھا - اس کی نظر تاج پر پڑی - ایک لمحہ ٹھہرا اور تاج کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا - میں اسکو دیکھتی رہی - پھر آہستہ سے بولا :-

"آدمی بھی عجیب طرفہ تماشہ ہے - اپنی ہمت و قوت سے دُنیا پر حکومت کرتا ہے - بناتا بھی ہے بگاڑتا بھی ہے جس شئے کو ساخت کرتا ہے اسی کو غارت بھی کرتا ہے - انسان کی یہ طاقتِ ازلی اس کے حرکات و سکنات سب پر غالب رہتی ہے - ہاں اگر اس سے بھی کوئی قوت زبردست ہے تو وہ عورت کی ہے - جب عورت کا م دیو کے نقشِ قدم پر

چلنے لگتی ہے تو یہ اسی کا کرشمہ ہے کہ وہ نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر دیتی ہے۔"

یہ سنتے ہی مجھے اپنے چمپا کے ہار کا دھیان آیا۔ اور شبہ ہوا کہ کہیں اسکا اشارہ اس رات والی واردات کی طرف تو نہیں۔ اس لمحہ میرے دل کی بے چینی بڑھنے لگی۔ غلبۂ جذبات سے مجبور ہو کر میں تھکنے سی لگی۔ ایک محراب میں دم لینے کھڑی ہو گئی۔ راؤ راجہ نے فوراً ہی اپنا شال میرے بیٹھنے کے لئے بچھا دیا۔ میں بیٹھ گئی۔ میں نے ہمت باندھی۔ اور سوچا کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالوں۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں زبان کھولوں ایک عجیب کیفیت پیش آئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا نجابت خاں جسکا مجھے کبھی دھیان بھی نہ آتا تھا اس لمحہ میرے سامنے غیظ و غضب کی حالت میں کھڑا مجھے دھمکا رہا ہے۔ میں راؤ راجہ کو مخاطب ہی کیا چاہتی تھی کہ وہ بڑے غور و تامل کے بعد خود ہی بولا کہ "اورنگ زیب کے تمام لشکر میں سب سے پہلے اگر میں کسی شخص کا خاتمہ کیا چاہتا ہوں تو وہ نجابت خاں ہے۔" میں گھبرا کر لیکن ضبط سے بولی کہ "کیوں"؟ اس نے جواب میں کہا:۔

"اس لئے کہ مجھے اس سے سخت تنفر ہے۔"

مجھے شک ہوا کہ مبادا اس نے کچھ سنا ہو۔ ایسا نہ ہو کہیں اس کے دل میں میری طرف سے کچھ شبہ ہو جائے۔ میں نے فوراً ہی منہ سے نقاب الٹ دیا۔ کہ وہ میری نگاہ و بشرے سے میرے دل کی کیفیت معلوم کر لے۔ اور اس کو یقین ہو جائے کہ میرے اور اس کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہیں۔ کجا نجابت خاں! نقاب الٹنے کے فوراً ہی بعد میں نے ہمت کر کے بالآخر کہہ ہی ڈالا۔ "راؤ راجہ تمہیں اس خط کا کچھ دھیان ہے۔ جس کو میں نے تعویذ بنا کر اپنے سینہ سے لگا رکھا ہے؟ اس میں لکھا تھا کہ اگر میں سنجوگتا بھی ہوتی........" اتنا کہہ کر میری زبان خود بخود رک گئی۔ راؤ راجہ کے چہرے کا رنگ بدلا۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی۔ اور کہنے لگا:۔

"سالہا سال ہوئے کہ میں نے ایک خواب دیکھا تھا۔ یہ خوابِ شباب نہ صرف سہانا بلکہ ایسا لطیف و پاکیزہ تھا کہ باوجود ایک عرصہ گذر جانے کے مجھے اس طرح یاد ہے کہ گویا کل کی بات۔ وہ جوانی کی عمر تھی اور مجھے خوابوں پر عقیدہ تھا۔ لیکن زمانہ اور تجربہ نے ثابت کیا کہ خواب حقیقتِ زندگی سے بہت دور ہوتے ہیں۔ ان کی اصلیت بہت کم ہوتی ہے۔ ان کا سماں صرف چاندنی رات ہی میں بندھتا ہے۔ روزِ روشن میں یہ دھوپ کی تیزی سے کہرے کی طرح پھٹ جاتے ہیں۔ جنگ کے معرکوں کی یادگار تو دیکھو میری پیشانی "تلوار کے گھاؤ کے نشان کی صورت میں صاف دکھائی دیتی ہے لیکن جہاں آرا بیگم زندگی نے جو چرکے دیئے۔ خوابِ شباب کی امنگوں کو جس طرح مٹایا! ان زخموں کے داغ میرا دل چھپائے بیٹھا ہے۔ وہ نظرِ اغیار کے تماشہ کے لئے نہیں۔ مگر یہ سچ ہے کہ خوابِ شباب جوں جوں حقیقتِ زندگی سے دور ہوتا جاتا ہے اتنا ہی سہانا اور پیارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اور انسان اس امید پر جیتا ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں ہاتھ نہ لگا اس دنیا میں ملیگا۔"

یہ سنکر میری نگاہیں نیچی ہو گئیں۔ ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حوادثِ زندگی ہم دونوں

کو ایک دوسرے سے نہ صرف جدا بلکہ دُور کرتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ میں یہ بھی محسوس کرتی تھی کہ درحقیقت ہم ایک جان دو قالب ہیں۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میں نے آہستہ سے کہا "چلئے روضہ کے اندر چلیں"۔ مجاور مقبرے سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ چراغ روشن تھے۔ موتیوں ٹکی ہوئی زردوزی کے کام کی چادر جو ہر جمعہ کو میری ماں کی قبر پر چڑھائی جاتی تھی ابھی ابھی ڈالی گئی تھی۔ عود و عنبر کی خوشبو سے تمام مقبرہ مہک رہا تھا۔ ہم دونوں ایک لمحہ قبر کے سرہانے مودبانہ خاموش کھڑے رہے۔ پھر وہاں سے ہٹ کر مجَر کا طواف کرنے لگے۔ میں نے اپنے محبوب سے کہا کہ وہ کوئی ایسا نام جو اُسے پیارا ہو اپنے گلے سے ایسی آواز سے نکالے کہ اس کی ہر طرف گونج سنائی دے۔ لمحہ بھر میں میرا نام تاج کے تمام گنبد میں اس طرح گونج اٹھا کہ گویا کسی فرشتہ نے در و دیوار میں جان ڈال دی ہے۔

میں نے اپنا سارا پُرانا دُکھڑا کہہ سنایا۔ تمام داستانِ زندگی لکھ ڈالی۔ لیکن اب میرا قلم آگے چلنے سے خود بخود رُکتا ہے جو راز و نیاز کی باتیں اس وقت میرے اور میرے محبوب کے درمیان ہوئیں وہ میری نگاہ میں ایسا تقدس رکھتی ہیں کہ میں ان کو لکھنا نہیں چاہتی۔ البتہ یہ ضرور کہوں گی کہ جو عہد و پیمان ہمارے درمیان ہوئے وہ شادی کی معمولی رسم سے کہیں زیادہ متبرک اور استوار تھے۔ اگر مقدر نے وہ دن دکھایا کہ دارا شکوہ کو اس لڑائی میں فتح ہوئی اور بوندی کے راؤ راجہ چھترسال کی جان سلامت رہی۔ تو اس نے عہد کیا تھا کہ وہ ہماچل کے سمت ایک دیوی کے مندر کی زیارت کو جائیگا اور وہاں جا کر جنگ و خونریزی سے توبہ کریگا۔

ہم دونوں اب روضہ سے واپس ہو رہے تھے اور الوداع کہنے کی گھڑی سر پر کھڑی تھی۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔ "کیا میں بھی ہماچل کی زیارت گاہ کو جاؤں"؟ اس نے جواب میں کہا "ہاں جہاں آرا بیگم میں ہماچل کے دامن میں تمہارا انتظار کروں گا۔ یا تو وہاں ملیں گے یا (اوپر کی طرف اشارہ کرکے) پھر اُس دُنیا میں"!

یہ آخری لفظ تھے جو اُس نے کہے۔ مقدر نہ تھا کہ میں پھر اس کی صورت دیکھتی!

باقی حصہ اس سوانح حیات کا معرکۂ جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہاں اُس سے سروکار نہیں۔ صرف اس قدر اضافہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ جنگ میں شکست ہونے کی خبر شاہجہاں اور بیگم جہاں آرا کو پہنچ چکی تھی کہ بوندی کے راؤ راجہ چھترسال کے رسالہ کا ایک سوار خاک و خون آلودہ کسی طرح سے جہاں آرا بیگم کے سامنے لایا جاتا ہے اور وہ جہاں آرا بیگم کی نشانی کا وہ گلوبند جو اس نے چھترسال کو دیا تھا واپس سپرد کرکے یہ خبر دیتا ہے کہ چھترسال اپنی بہادری اور وفا کا حق ادا کرکے رن میں بخابت خاں کی گولی سے مارا گیا۔

(پنڈت کشن پرشاد کول)

(نگار) جہاں آرا اور چھترسال کی محبت کا یہ افسانہ جسے ہمارے عزیز دوست پنڈت کشن پرشاد صاحب کول نے انگریزی سے اخذ

اقتباس کر کے پیش کیا ہے۔ کوئی تاریخی اہمیت نہیں رکھتا۔ اور نہ اس نگاہ سے اسکا مطالعہ کرنا چاہئے۔

پنڈت کشن پرشاد صاحب جب میرے پاس اس کو لائے تو یہ بھی بیان کیا کہ بعض رسائل نے اسکی طوالت کا عذر پیش کر کے اشاعت سے انکار کر دیا تھا۔ لیکن جہاں تک میرا خیال ہے۔ یہ صرف بہانہ تھا۔ ورنہ حقیقت یہی ہے کہ انہوں نے جہاں آرا کے متعلق اس قسم کا مضمون شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے اسکی اشاعت صرف اس لئے منظور کر لی کہ اگر وہ کسی اور رسالہ میں شائع ہو گیا تو ممکن ہے اس کے خلاف تردیدی نوٹ درج نہ ہونے کیوجہ سے اس میں کوئی تاریخی اہمیت پیدا ہو جائے۔

اب چونکہ یہ مضمون ختم ہو گیا ہے اس لئے میں اس کی حقیقت سے لوگوں کو آگاہ کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اصل میں جہاں آرا کی نہ کوئی بیاض ہے جس سے یہ واقعات لئے گئے اور نہ اصل فرانسیسی مصنفہ میڈم بناشاں نے اس کو اس نیت سے لکھا۔ بلکہ یہ صرف فرانسیسی انشاء پردازی کا ایک مخصوص انداز ہے تاکہ پڑھنے والوں پر اثر ڈالا جا سکے۔ اس میں شک نہیں کہ بناشاں نے یہ ضرور لکھا ہے کہ قلعہ آگرہ میں سنگ مرمر کے کسی ٹوٹی ہوئی سل کے نیچے ایک بیاض اسکو ملی۔ لیکن اس ٹوٹی ہوئی سل سے مراد صرف مزار ہے۔ اور بیاض سے مراد وہ ہستی جو اس کے اندر مدفون تھی۔ اور کسی فسانہ کو اس نوع کے انداز بیان سے شروع کرنا فرانسیسی انشاء پردازی میں بہت عام ہے۔

اصل فرانسیسی کتاب کا ترجمہ انگریزی میں لارنس بنین نے کیا ہے۔ اور اس نے بھی اپنے مقدمہ میں اس فسانہ کو کوئی تاریخی اہمیت نہیں دی۔

یہ میں اس لئے نہیں لکھ رہا کہ جہاں آراء کوئی معصوم فرشتہ تھی۔ اور اس کی طرف کسی واقعہ عشق و محبت کو منسوب کرنا کوئی گناہ ہے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ تاریخ سے مطلقاً اس واقعہ کی تصدیق نہیں ہوتی اور غیر تاریخی واقعہ کو تاریخی وقعہ کی صورت سے پیش کرنا یقیناً جرم ہے۔

مکتوبات نیاز کی بعض ظاہری خصوصیات

۱۔ ۲۸ پونڈ کے چکنے کاغذ پر نہایت نفیس چھاپی گئی ہے۔

۲۔ حضرت نیاز کی تازہ ترین تصویر اس میں شامل ہے

۳۔ ایک اصلی خط کا بلاک بھی دیدیا گیا ہے۔

۴۔ کتاب مجلد شائع کی گئی ہے۔

(منیجر نگار)

مصطفیٰ کمال اور جنگِ عظیم

(بسلسلۂ ماسبق)

جب مصطفیٰ کمال معرکۂ درۂ دانیال اور جنگ چونق بیر سے فاتحانہ طور پر فارغ ہوکر قسطنطنیہ واپس آیا۔ تو وہ خود بھی اپنی اہمیت کو زیادہ محسوس کرنے لگا۔ اور ملک کی نگاہیں بھی خصوصیت سے اس پر پڑنے لگیں۔ تمام اخبارات میں وہ "محافظِ درۂ دانیال" کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔ اور اس کی عسکری شہرت بہت وسیع ہوگئی۔

وہ اربابِ حکومت جو پہلے اسکی کچھ سننا ہی نہ چاہتے تھے۔ اب اُس کی باتوں پر کان دھرنے لگے۔ اور حکومت کے انتظامی معاملات میں بھی وہ دخل دینے لگا تھا۔ وہ برابر علی الاعلان کہاکرتا تھا کہ ترکی کو ترکوں ہی کے ہاتھ میں رہنا چاہیے اور اگر جرمنی کے لوگ نوکر رکھے جائیں تو نوکروں کی طرح اُن کو دباکر رکھنا چاہیے۔ یہ نہیں کہ عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ اور چونکہ انور اپنی ناقابلیت کی وجہ سے ایسا نہیں کرسکتا۔ اس لئے اسکا وجود ملک کیلئے نہایت خطرناک ہے۔

اب رائے عامہ بھی اس کی طرف ہوتی جاتی تھی اور چونکہ جنگ کا جوش کم ہوتا جارہا تھا اس لئے اہلِ جرمنی کی طرف سے بھی لوگ بے پرواہ ہوگئے تھے۔ حتیٰ کہ ترکوں اور جرمنوں میں کئی بار جھگڑا بھی ہوگیا۔ اس میں شک نہیں کہ ترکی اس وقت بالکل جرمن مشین کا ایک حصہ ہوکر رہ گیا تھا۔ اور ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ جنگ میں کامیابی چاہے کسی کو ہو لیکن خسارہ ترکوں کو برداشت کرنا پڑیگا۔ ایک بار یہ سازش بھی ہوئی کہ تمام جرمن افسروں کو بیک وقت نکال باہر کردیا جائے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔

اب انور بھی جو حقیقتاً محض اہلِ جرمنی کی مدد سے ڈکٹیٹر بنا ہوا تھا۔ بدنام ہورہا تھا۔ اور انجمن اتحاد وترقی کے بھی بعض ممبر اس کے مخالف ہوگئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے خلاف سازشیں ہونے لگی تھیں۔ اور وہ اپنی جان کی طرف سے اتنا خائف رہتا تھا کہ بغیر باڈی گارڈ کے کہیں نہیں جاتا تھا اور اگر کبھی موٹر پر نکلتا تھا تو انتہائی تیز رفتاری کیساتھ۔

مصطفیٰ کمال کی جو رائے انور کے متعلق تھی وہ سب کو معلوم تھی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کہتا تھا علانیہ کہتا تھا۔ اس کے دوستوں میں سے ایک جمال تھا۔ جو اس وقت شام کی طرف تھا۔ اس لئے وہ طلعت کے پاس گیا جو اس وقت وزارتِ عظمیٰ

کے عہدہ پر ممتاز تھا۔ اور اس سے تمام حالات بیان کر کے دبی زبان میں گویا اسکا بھی اظہار کر دیا کہ وزارتِ حربیہ کا چارج اس کو ملنا چاہئے۔ طلعت نے بظاہر تو اس کی موافقت میں گفتگو کی۔ لیکن اس کے چلے جانے کے بعد بہت ہنسا۔ اس کی خبر مصطفیٰ کمال کو بھی پہنچی۔ اور اس کی برہمی اور زیادہ بڑھ گئی۔

مصطفیٰ کمال خلیل سے ملنے گیا جو امور خارجہ کا انڈر سیکرٹری تھا۔ اس نے نسیم بے وزیر خارجہ سے ملنے کا وقت مقرر کرا دیا۔ جب مصطفیٰ کمال وہاں پہنچا تو وہ کسی کام میں مصروف تھا اور اس کو کافی انتظار کرنا پڑا۔ اس توہین سے اس کا غصہ اور بڑھ گیا۔ اور جب ملاقات ہوئی تو اس نے نہایت سختی سے کہا کہ جنرل اسٹاف کی طرف سے جو خبریں مل رہی ہیں بالکل غلط ہیں اور انور ہرگز اس قابل نہیں ہے کہ وزارتِ حربیہ کا انچارج رہے۔ لیکن یہاں بھی اسے کامیابی نہ ہوئی۔ اور آخر کار لوگوں نے پھر اس کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اصل سبب یہ تھا کہ مصطفیٰ کمال کے مزاج سے ہر شخص خائف تھا۔ اور لوگ جانتے تھے کہ اگر یہ برسرِ اقتدار ہو گیا تو پھر کسی کی نہیں سُنے گا۔ کیونکہ اس میں اطاعت کرنے کا مادہ تھا ہی نہیں۔ اور دوسروں کو اپنے حکم کی تعمیل پر مجبور کرنا اس کی فطرت تھی۔

اس وقت قسطنطنیہ سازشوں کا مرکز تھا۔ اور اب بچہ بچہ واقف ہو گیا تھا کہ مصطفیٰ کمال جرمنوں اور انور کا دشمن ہے لیکن وہ خود کسی سازش میں حصہ نہیں لیتا تھا اور نہایت احتیاط سے کام لیکر بالکل علیحدہ رہتا تھا۔

انھیں سازشوں میں سے ایک سازش انور کے خلاف اور مصطفیٰ کمال کے موافقت میں تھی۔ جس کا سرغنہ ایک شخص یعقوب جمال تھا۔ اس سازش میں فوج کے معمولی افسران دوسرے درجہ کے شامل تھے۔ انور بھی اس سے آگاہ تھا لیکن اس نے اسوقت تک ہاتھ نہیں ڈالا جب تک اس کو پوری شہادت نہیں مل گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ مصطفیٰ کمال کے خلاف بھی کوئی ثبوت فراہم ہو جائے۔ لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اور یعقوب جمال اور اس کے بعض دیگر شرکاء کو سولی دیدی گئی۔ مصطفیٰ کمال کی نسبت وہ سوائے اس کے کچھ نہ کر سکا کہ اس کو قسطنطنیہ سے ہٹا کر پہلے قاف اور پھر دیار بکر کے فوجی ہیڈکوارٹر میں تبدیل کر دیا۔

ایک سال قبل انور بے نے قاف کی طرف سے روسی فوجوں کے خلاف اقدام کیا تھا۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری اور وہاں کی موسمی حالت کا اندازہ نہ کر سکنے کیوجہ سے اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک لاکھ فوج میں سے صرف بارہ ہزار واپس آسکی اور باقی سب کی سب جنوری کا مہینہ آتے ہی سردی کیوجہ سے ٹھٹھر کر ختم ہو گئی۔ اس میں اناطولیہ کی فوجیں بھی تھیں۔ جو خاصکر ترکیہ میں گل سرسبد کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد سے قاف کے محاذ کی طرف کسی کو توجہ نہ ہوئی۔ کیونکہ اس کے بعد درہ دانیال نے اپنی طرف سب کی توجہ مبذول کر رکھی تھی۔ اور روس آہستہ آہستہ بڑھ کر ارض روم تک پہنچ گیا۔

اس وقت تک روسی فوجوں کی نقل و حرکت کا مرکز تمامتر جرمن محاذ تھا۔ لیکن اب وہ سارا زور زندگی کی طرف دیتا

چاہتی تھی۔ چنانچہ گرانڈ ڈیوک نکولس روسی کمانڈر انچیف نے خود یہاں پہنچکر کمان اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔

مصطفےٰ کمال نے قاف پہنچکر ترکی فوج کی جو حالت دیکھی وہ حد درجہ مایوس کن تھی۔ نہ اسباب حرب موجود تھا۔ نہ سامان خور و نوش۔ وردیوں کی حالت یہ تھی کہ گویا بدن پر چیتھڑے لپیٹ لئے ہیں۔ فوجی ٹھیکیدار افسران سے مل ملکر خوب چوریاں کر رہے تھے۔ اور بدنظمی انتہائی نقطہ تک پہنچ گئی تھی۔

مصطفےٰ کمال نے یہاں پہنچکر معلوم کیا کہ روسی فوجیں ۱۹۱۷ء کے موسم بہار تک جارحانہ اقدام شروع کرینگی۔ اور اگر اس وقت تک کوئی تدبیر مناسب نہ ہوسکی تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ بلا مزاحمت پایۂ تخت تک پہنچ جائیں گی۔

مصطفےٰ کمال نے محکمۂ حربیہ کو تمام حالات سے ذریعۂ تار آگاہ کیا۔ اور لکھا کہ جس قدر جلد ممکن ہو سامان حرب اور دوائیں روانہ کی جائیں۔ کیونکہ فوج میں بیماری بھی پھیل گئی تھی۔ جب اسکا کوئی جواب نہ ملا تو اس نے براہ راست انور کو تار دیا۔ لیکن اس طرف سے بھی خاموشی اختیار کی گئی۔ کیونکہ انور دوسری اسکیموں میں مصروف تھا اور قاف کے محاذ کو جو بہت دُور واقع تھا کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔

اب مصطفےٰ کمال مجبور ہوگیا اور اس نے سوچا کہ جو کچھ کرنا ہے انھیں حالات میں کرنا ہے۔ اور اس لئے اس نے سب سے پہلے ٹھیکیداروں کی طرف توجہ کی اور جس کی طرف سے ذرا بھی غفلت یا بے ایمانی ثابت ہوئی۔ اس کو فوراً قتل کرا دیا۔ اسی طرح کاہل افسروں کو نہایت سخت سزائیں دینی شروع کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جمود میں کچھ حرکت پیدا ہوئی اور لوگ سوتے سے چونک پڑے۔ اس نے چیف آف اسٹاف عصمت کو مقرر کیا۔ اور کاظم قرہ باقر کو سیکنڈ کمانڈر۔ یہ دونوں آدمی ایماندار محنتی اور مطیع تھے۔ لیکن مصطفےٰ کمال ہنوز اس انتظام میں مصروف تھا کہ خوش قسمتی سے روس میں انقلابی تحریک پیدا ہوگئی اور روسی فوجیں درہم برہم ہوگئیں۔ مصطفےٰ کمال نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھاکر آگے بڑھنا شروع کیا۔ اور بعض ترکی علاقے واپس لیکر باطوم کی طرف بڑھا۔ لیکن اس وقت جنوب کی طرف ایک نیا خطرہ پیدا ہوا۔ یعنی شام کی طرف سے انگریزی فوجوں نے حملہ شروع کر دیا۔ اور قسطنطنیہ سے تار آیا کہ مصطفےٰ کمال فوراً شام روانہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے کاظم قرہ باقر کو چارج دیا اور روانہ ہوگیا۔

یہ نیا محاذ عراق و شام کا تھا۔ انگریز ایک طرف ہندوستانی فوج کی مدد سے بغداد پر قبضہ کرکے موصل کی طرف بڑھنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف فلسطین اور شام پر حملہ کرنے کے لئے مصر میں ایک زبردست فوج ترتیب دے رہے تھے۔

انور کی درخواست پر جرمن کمانڈر انچیف نے جنرل وان فالکنہین کو اُدھر بھیجدیا تاکہ وہ ایک جدید فوج مرتب کرے اور اس فوج کا نام یلدرم رکھا جائے۔ اس کا صدر مقام حلب قرار دیا گیا۔ اور بہت سے جرمن افسر اس میں شامل کئے گئے۔ مصطفےٰ کمال کو بھی رجمنٹ ۷ کا کمانڈر بنایا گیا۔ لیکن وہ جرمن اثر قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ لیمان وان سانڈرس کیساتھ

تو خیر اس نے بناہ لی تھی۔ کیونکہ وہ آدمی معقول تھا۔ لیکن اس نئے جرمن کمانڈر کی طرف سے وہ بالکل غیر مطمئن تھا اور جانتا تھا کہ اس میں ترک افواج سے کام لینے کی صلاحیت مطلق نہیں ہے۔ جب جرمن کمانڈر اپنی بعض تدابیر میں ناکام رہا۔ تو اس نے ایک صندوقچہ اشرفیوں سے بھرا ہوا مصطفےٰ کمال کے پاس تحفتاً روانہ کیا۔ مصطفےٰ کمال نے یہ صندوقچہ لیکر اس کی باضابطہ رسید دیدی اور جب اسے واپس کیا تو اپنی رسید کی واپسی کا بھی مطالبہ کیا۔

سب سے پہلا جلسہ اسٹاف افسران کا حلب میں ہوا۔ جس میں علاوہ جرمن افسروں کے انور۔ جمال اور مصطفےٰ کمال بھی شامل تھے۔ اس جلسہ میں جرمن کمانڈر نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔ اور مصطفےٰ کمال نے سب پر اعتراض کیا۔ ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ بھی تھی کہ بغداد اور نہر سویز پر حملہ کیا جائے۔ مصطفےٰ کمال نے کہا کہ ان میں سے کوئی مہم کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس اختلاف پر جرمن کمانڈر کو بہت غصہ آیا۔ اور آخر کار نوبت یہاں تک پہنچی کہ مصطفےٰ کمال نے استعفاء داخل کر دیا۔ انور اور جرمن کمانڈر نے کوشش کی کہ وہ اپنا استعفاء واپس لے لے۔ لیکن وہ نہیں مانا۔ اور اس نے بغیر انتظار منظوری اپنا چارج دوسرے کو دیدیا۔ جرمن کمانڈر نے چاہا کہ عدول حکمی کے جرم میں اسکا کورٹ مارشل کرے۔ لیکن انور نے اس کو مناسب نہیں سمجھا۔ اور پھر دیار بکر جانے کا حکم دیا۔ مصطفےٰ کمال نے وہاں جانے سے بھی انکار کر دیا۔ اور بیماری کی رخصت لیکر قسطنطنیہ چلا گیا۔

اب انور اور مصطفےٰ کمال کی باہمی مخالفت انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن چونکہ انور کی کمان مصطفےٰ کمال کے مقابلہ میں روز بروز گرتی جارہی تھی اور انور سمجھتا تھا کہ اگر کوئی کارروائی اس کے خلاف کی گئی تو ہنگامہ ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے وہ خاموش تھا اور خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا تھا۔

مصطفےٰ کمال نے پیرا پیلس ہوٹل میں ایک کمرہ لے لیا۔ اور وہیں رہنے لگا۔ اب یہ آزاد تھا اور پوری آزادی کے ساتھ حکومت کی پالیسی اور انور کی غلطیوں پر رائے زنی کیا کرتا تھا۔ اس دوران میں چونکہ لوگ جنگ سے بیزار ہوچکے تھے اور جرمن اثر بھی زائل ہوتا جارہا تھا اس لئے رفتہ رفتہ انور کے مخالفین مصطفےٰ کمال کے گرد جمع ہونے لگے۔

انور اس فکر میں رہتا تھا کہ مصطفےٰ کمال کے کانٹے کو کس طرح دور کرے۔ اتفاقاً ۱۹۱۸ء میں شاہزادہ وحید الدین کا جرمنی جانا طے پایا۔ اور مصطفےٰ کمال انھیں کے ساتھ لگا دیا گیا۔ مصطفےٰ کمال چونکہ تین مہینہ سے بیکار پڑا ہوا تھا اس لئے اس نے اس موقعہ کو غنیمت سمجھا اور یہ خدمت قبول کرلی۔ قسطنطنیہ اس وقت سازشوں کا آماجگاہ بنا ہوا تھا اور چونکہ تمام سازش کرنیوالے دوسرے درجہ کے لوگ تھے۔ اس لئے مصطفےٰ کمال ان کے ساتھ ملکر کوئی کام کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اور انور چونکہ وزیر حربیہ تھا اور فوج پر اپنا کافی اثر رکھتا تھا اس لئے اسکو ہٹانا آسان بھی نہ تھا۔

روانگی سے دو دن قبل مصطفےٰ کمال، شاہزادہ وحید الدین کے حضور میں پیش کیا گیا۔ اسٹاف کے اور افسران بھی فراک کوٹ پہنے ہوئے منتظر تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وحید الدین داخل ہوئے اور ایک زرکار کرسی پر بیٹھ گئے۔

مصطفےٰ کمال اُن کی صورت و وضع دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جس قوم کے شہزادے ایسے ہوں اس کی تباہی میں کس کو کلام ہو سکتا ہے ساٹھ سال کا ایک ضعیف انسان۔ لانبی خشک گردن۔ بیڈول جسم۔ چہرہ پر مردنی چھائی ہوئی۔ آنکھیں بند۔ قوتِ گویائی مفقود۔ مصطفےٰ کمال سمجھ گیا کہ خلیفہ عبدالحمید کی تربیت اور محل کے اندر ساٹھ سال تک اتاددا میں زندگی بسر کرنے کے بعد اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

اسٹیشن پر شاہزادہ پہنچا تو سویلین لباس میں تھا اور گارڈ آف آنر کے پاس سے دونوں ہاتھوں سے سلام لیتا ہوا گذرا۔ مصطفےٰ کمال نے افسرِ تشریفات سے کہا کہ یہ کیا لغویت ہے۔ لیکن اس کی کسی نے نہیں سُنی۔ اور اس سے کہا گیا کہ تم اب ڈویژن کے جنرل نہیں۔ بلکہ بریگیڈ کے جنرل ہو اور تمہارا ڈبہ سب سے اخیر میں لگایا گیا ہے۔ وہاں جاؤ۔ معمولی افسروں کا سا سلوک دیکھ کر مصطفےٰ کمال غصہ سے بیتاب ہو گیا۔ اور اسے افسوس ہوا کہ کیوں اس نے یہ خدمت منظور کر لی۔

وحید الدین اس میں شک نہیں کہ بظاہر حد درجہ کاہل۔ سُست۔ احمق۔ دیوانہ۔ نظر آتا تھا۔ لیکن فی الحقیقت وہ ایسا نہ تھا۔ محض خلیفہ عبدالحمید کے ڈر سے اس نے ایسی زندگی اختیار کی تھی۔ کہ جاسوسوں کو اس کے خلاف کچھ کہنے کا موقعہ نہ ملے۔ اور اب انور وغیرہ سے ڈرتا تھا۔ اندرونی طور پر وہ آزاد نہ تھا کہ سلطان بنے۔ لیکن انور کی پارٹی اس کے بھتیجے عبدالمجید کی طرفدار تھی اور اس لئے کوئی حرکت ایسی نہ کرتا تھا کہ کسی کو اس کی طرف سے شبہ پیدا ہو۔

جب ترکی کے حدود سے ریل نکل گئی تو وحید الدین نے مصطفےٰ کمال کو بلایا اور یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ وہی شخص جو چند گھنٹہ قبل بالکل سویا ہوا اور کھویا ہوا نظر آتا تھا اب نہایت ہوشیار و چالاک نظر آتا ہے۔ مصطفےٰ کمال نے جب اس سے گفتگو کی تو معلوم ہوا کہ وہ خود بھی انور وغیرہ کا مخالف ہے۔ اس لئے مصطفےٰ کمال نے یہ سوچکر کہ موجودہ خلیفہ بہت ضعیف و بیمار ہے اور اس کے بعد یہی تخت نشین ہوگا نہایت تفصیل کیساتھ گفتگو کر کے اس کو بتایا کہ انور کی جماعت نے جرمن اثرات کو قبول کر کے ترکی قوم کی سخت توہین کی ہے۔ اور اس جنگ میں جرمنی کا کامیاب ہونا بالکل محال ہے۔

مصطفےٰ کمال کی چال یہ تھی کہ اگر وحید الدین کو ابھی سے طرفدار کر لیا گیا تو تخت نشینی کے بعد وہی وزیر حربیہ بنایا جائیگا اور اسطرح اس کو کچھ کام کرنیکا موقع مل جائیگا۔ وحید الدین یوں تو مصطفےٰ کمال کی تمام باتوں سے بظاہر اتفاق کرتا تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر انور نہ رہا تو مصطفےٰ کمال کی گرفت اس پر اور زیادہ سخت ہوگی۔ اور وہ اندر ہی اندر اس فکر میں تھا کہ مصطفےٰ کمال کی مدد سے اپنے دشمن انور پر قابو حاصل کرلے اور پھر مصطفےٰ کمال کو بھی نکال باہر کرے۔

جرمنی پہنچنے کے بعد ہنڈنبرگ سے ملاقات ہوئی اور اس نے وحید الدین سے شام کے محاذ کا ذکر کرتے ہوئے بہت کچھ امیدیں دلائیں۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے تنہائی میں وحید الدین کو سمجھایا کہ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہے اور میں

جانتا ہوں کہ شام کے محاذ کی جو تفصیلات بتائی گئی ہیں وہ بالکل غلط ہیں۔

بعد کو جب لوڈنڈرف سے ملاقات ہوئی تو اس نے زیادہ تفصیل کے ساتھ جرمن طیاروں کا ذکر کیا۔ یہ سنکر مصطفےٰ کمال سے نہ رہا گیا اور اس نے پوچھا کہ "تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ مان لیا جائے کہ آپ کی یہ جارحانہ تدابیر کامیاب ہو جائیں تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اس کے بعد آپ کیا کرینگے۔ اور اس سے کیا فائدہ ہوگا"

فیلڈ مارشل نے کہا کہ "ہم ایک مقصد کو متعین کر لیتے ہیں۔ اور اس کے بعد نتیجہ کو حالات پر چھوڑ دیتے ہیں"

یہ سنکر مصطفےٰ کمال نے وحید الدین سے کہا کہ "یہ حال ہے جرمن اسٹاف کے سب سے بڑے افسر کا کہ اسے بھی نتیجہ کی خبر نہیں اور صرف تقدیر کے بھروسہ پر کام کرنا چاہتا ہے"

قیصر کے یہاں ڈنر تھا اور یہی جنگ کی گفتگو جاری تھی کہ مصطفےٰ کمال نے کھڑے ہو کر نہایت آزادی سے ہنڈنبرگ کو مخاطب کر کے کہا کہ "آپ نے شاہزادہ وحید الدین سے شام کے محاذ کے متعلق جو تفصیلات بیان کی ہیں۔ وہ بالکل غلط ہیں۔ میں چونکہ وہاں کام کر چکا ہوں اس لئے حالات سے واقف ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ آپ نے سواروں کے جس ڈویژن کا ذکر کیا ہے وہ کاغذ پر موجود ہو تو ہو لیکن حقیقتہً اسکا وجود کہیں نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ سب کچھ مان لینے کے بعد بھی یہ بتائیے کہ آپ کی ان تمام وسیع جارحانہ تدبیروں کا نتیجہ و مقصد کیا ہے"؟

ہنڈنبرگ ایک نوجوان افسر کے اس تیز و تند ریمارک کو سنکر خاموش رہا اور ان تمام سوالات کے جواب میں اس نے ایک سگریٹ مصطفےٰ کمال کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ تم ابھی بچے ہو۔ میں تم سے کیا کہوں۔

ایک بار کسی افسر نے ترکی کے متعلق اچھے الفاظ استعمال نہ کئے۔ تو مصطفےٰ کمال اسی وقت بگڑ گیا۔ اسی طرح گورنر السا‌لگ نے ایک بار ڈنر کے وقت کہا کہ اہلِ آرمینیا کے ساتھ ترکوں کا سلوک اچھا نہ ہوا۔ یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال کھڑا ہو گیا اور بولا کہ:-

"ایسی گفتگو ایسے شاہزادہ سے کرنا جو ہنوز تخت نشین نہیں ہوا۔ بالکل نامناسب ہے۔ آپ نے آرمینیا اور آرمینیا والوں کی کیا خبر۔ اول تو یونہی ترکی نے جرمن کے ساتھ اتحاد کر کے اپنے آپ کو کافی نقصان پہنچایا ہے اور اب آرمینیا کی موافقت میں ترکی کے خلاف اظہار رائے کر کے اس نقصان پر توہین کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کیا جرمنی اس سے واقف نہیں کہ آرمینیا ترکی کا کتنا سخت دشمن ہے"

یہ سنکر گورنر نے معذرت کی اور بات ٹال دی۔

جب یہ سیاحت ختم ہوئی اور جرمنی سے واپسی کا وقت آیا۔ تو مصطفےٰ کمال نے ایک بار پھر وحید الدین کو تمام نشیب و فراز سمجھا کر کہا کہ "میں آپ کو ایک تدبیر بتاتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ آپ کسی فوج کی کمان طلب کیجئے۔ ترکی کے شاہزادوں نے ہمیشہ فوجوں کی قیادت کی ہے اور پھر مجھے چیف آف اسٹاف کی حیثیت سے لے لیجئے"

وحید الدین نے پوچھا۔ "کس فوج کی کمان طلب کروں"؟

مصطفےٰ کمال نے کہا کہ "پانچویں کی"

وحید الدین:۔ "لیکن وہ مانیں گے نہیں"

مصطفےٰ کمال:۔ "کچھ پروا نہیں۔ کم از کم اس سے ان کو یہ تو معلوم ہو جائیگا کہ آپ کے جذبات کیا ہیں"۔

وحید الدین:۔ "بہتر ہے۔ میں قسطنطنیہ واپس پہنچکر اس پر غور کروں گا"

وحید الدین نے یہ کہنے کو تو کہہ دیا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ اگر کسی فوج کی کمان اسے مل گئی اور اس نے مصطفےٰ کمال کو چیف آف اسٹاف بنا لیا۔ تو پھر جو کچھ وہ چاہیگا وہی ہوگا۔ اور انور سے زیادہ سخت گیر ثابت ہوگا۔

قسطنطنیہ پہنچکر مصطفےٰ کمال سخت بیمار ہو گیا۔ گردوں کا مریض تھا اور اکثر درد کے دورے اس پر پڑا کرتے تھے۔ تبدیل آب ہوا اور علاج کے لئے یہ پہلے ویانا گیا اور پھر کارلسباد۔ اس دوران میں سلطان کا انتقال ہوگیا۔ اور وحید الدین تخت نشین ہوئے۔ قسطنطنیہ سے بہت سے خطوط لوگوں کے آئے کہ وہ لوٹ آئے۔ لیکن وہ نہ جا سکا۔ اور صرف ایک تار مبارکباد کا وحید الدین کو بھیجکر خاموش ہو گیا۔ اس وقت عزت پاشا جو انجمن اتحاد و ترقی اور انور کا سخت دشمن تھا۔ سلطان کا ایڈیکانگ تھا اور انور کے خلاف کارروائیاں شروع ہو گئی تھیں۔ عزت پاشا نے بھی مصطفےٰ کمال کو خط لکھکر اصرار کیا کہ جس قدر جلد ممکن ہو قسطنطنیہ پہنچ جائے۔ آخر کار وہ جولائی ۱۸ء میں کسی نہ کسی طرح قسطنطنیہ پہنچ گیا۔ اور یہاں آتے ہی اس کے تمام ولولے عود کر آئے۔

خلیفہ وحید الدین نے مصطفےٰ کمال کو بلایا۔ اور انتہائی بے تکلفی اور محبت سے پیش آیا۔ یہانتک کہ خود اپنے ہاتھ سے دیا سلائی جلا کر اسکا سگریٹ روشن کیا۔ مصطفےٰ کمال نے اس خلوص سے متاثر ہو کر دل کی تمام باتیں اس سے کہدیں۔ اور اسکو سمجھایا کہ جب تک انور اور جرمن افسروں کا اقتدار باقی ہے۔ ترکی تباہی سے نہیں نکل سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ انور کو فوراً علیحدہ کر دیا جائے اور مجھے اسکی جگہ مقرر کیا جائے"۔

اس کے بعد اور کئی ملاقاتیں ہوئیں اور جب آخری ملاقات میں مصطفےٰ کمال نے زیادہ جوش و قوت کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کی تو وحید الدین نے تھوڑی سی برہمی کے ساتھ جواب دیا کہ "میں انور اور طلعت سے مفاہمت کر چکا ہوں"۔ اور یہ کہہ کر مصطفےٰ کمال کو رخصت کر دیا۔

یہ سننے کے بعد اس کے پیچ و تاب کا جو عالم ہوا ہوگا۔ ظاہر ہے۔ بات یہ تھی کہ انور نے خلیفہ وحید الدین کو پوری طرح ڈرا دیا تھا کہ اگر کسی قسم کی مخالفت کا اظہار کیا گیا تو فوراً تخت سے اتار دیئے جائیں گے۔ خلیفہ نے اپنے داماد فرید پاشا سے مشورہ کیا تو اس نے بھی یہی کہا کہ انجمن اتحاد و ترقی کا مقابلہ آسان نہیں۔ الغرض خلیفہ وحید الدین نے اپنے کسی وعدہ کا خیال نہ کیا۔ اور مصطفےٰ کمال کو صاف جواب دیدیا۔ وہ یہ سمجھتا تھا کہ درپردہ یہ سب انور ہی کا کیا ہوا ہے اور غصہ کے مارے اپنے ہونٹ چبا رہا تھا۔

اس واقعہ کے دو ہفتہ بعد سلطان کے بعد خلیفہ نے مصطفےٰ کمال کو طلب کیا۔ تمام اسٹاف اور جرمن افسران بھی موجود تھے۔ جس وقت مصطفےٰ کمال وہاں پہنچا تو سلطان نے نہایت محبت و خلوص سے اسکا خیر مقدم کیا۔ اور حاضرین سے اسکا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ مصطفےٰ کمال پاشا ہے جو ٹرکی فوج میں سب سے زیادہ قابل جنرل ہے اور مجھے اس پر کامل اعتماد ہے۔" اس کے بعد مصطفےٰ کمال سے مخاطب ہو کر کہا کہ "ایکسیلنسی، میں تمہیں شام کے محاذ پر مامور کرتا ہوں جو اسوقت نہایت ہی اہتم بالشان محاذ ہے اور مجھے یقین ہے کہ تم دشمنوں کے ہاتھ میں اس حصہ ملک کو نہ جانے دو گے۔" یہ کہکر مصطفےٰ کمال کو رخصت کر دیا۔

دوسرے کمرہ میں افسروں کا ہجوم تھا۔ جن میں بہت سے جرمن افسر بھی شامل تھے۔ جب مصطفےٰ کمال اس کمرہ سے گذرتا ہوا آلون کے قریب پہنچا تو ٹھہر گیا۔ اور کچھ دیر تک نہایت خاموشی سے اسکو دیکھ کر بولا کہ "آلون، شاباش، میں اس کامیابی پر تم کو مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ شام کے محاذ کا کیا حال ہے اور وہاں کتنی فوج جمع ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ تم اس سے بہتر کوئی انتظام مجھ سے نہ لے سکتے تھے۔"

اسی وقت ایک جرمن افسر بول اٹھا کہ "ترکی فوج تو جانوروں کے گلے ہیں جن کو بھاگنے کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس لئے اسکا کمانڈر جو کوئی بھی ہو۔ رشک کے قابل نہیں۔"

یہ سنتے ہی مصطفےٰ کمال بھپر گیا۔ اسکی آنکھیں غصہ سے سرخ تھیں۔ بال کھڑے ہوگئے تھے۔ اس نے نہایت بلند آواز سے کہا:۔

"میں بھی سپاہی ہوں۔ میں نے بھی فوج کو کمانڈ کیا ہے۔ اور میں جانتا ہوں کہ ترکی سپاہی سب کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن بھاگنا اسکو نہیں آتا۔ اس لئے اگر تم نے کبھی کسی ترک سپاہی کی پیٹھ دیکھی ہوگی تو صرف اس وقت جب اس نے پہلے تمہاری پیٹھ دیکھ لی ہوگی۔ حیرت ہے کہ اپنی بزدلی کا الزام ترک فوج پر رکھتے ہو۔"

سارے مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ اور مصطفےٰ کمال سب کو اسی طرح خاموش و حیران چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

مصطفےٰ کمال شام کے محاذ پر اخیر اگست میں پہنچا۔ اور لبنان و ان سانڈرس کے پاس حاضری دی۔ جو اس محاذ کا کمانڈر انچیف تھا۔ چونکہ سانڈرس سے اس کے تعلقات اچھے تھے۔ اس لئے اسکو غنیمت جانا کہ کسی اور جرمن افسر کے ساتھ ملکر اس کو کام کرنا نہیں ہے۔ اس نے جنرل فوزی سے فوج کا چارج اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور تمام محاذ کا معائنہ کر کے وہ بہت مایوس ہوا کیونکہ فوج کی حالت حد درجہ خراب و خستہ تھی۔ اور ہزاروں ہیضہ و بخار میں مبتلا تھے۔ نہ کھانے کو ملتا تھا نہ پہننے کو۔ دوا کا کیا ذکر اس ریگستان میں پانی بھی میسر نہ آتا تھا۔ خندقوں میں پڑے ہوئے تھے۔ اور شکست کا انتظار کر رہے تھے۔ ان کے مقابلہ میں انگریزی فوج ہر لحاظ سے نہایت بہتر حالت میں تھی جس میں امیر فیصل بھی شریک ہو گیا تھا۔ لارنس کمانڈر تھا اور

برابر ریلوے لائن - تار اور ٹیلیفون کاٹتا ہوا آگے بڑھتا آرہا تھا - اور ملک میں سخت بد امنی پھیلی ہوئی تھی -

مصطفےٰ کمال ایک بار پھر ہمت کر کے فوج کی تنظیم کی طرف متوجہ ہوا - لیکن اتفاق سے درد گردہ نے پھر اسکو صاحب فراش کر دیا - اور کامل دو ہفتہ بیکار پڑا رہا - وہ سن رہا تھا کہ انگریزی فوج حملہ کرنے ہی والی ہے - اور اپنی بے دست وپائی دیکھ دیکھ کر ہونٹ کاٹ رہا تھا -

۱۷ ستمبر کو ایک ہندوستانی سارجنٹ انگریزی فوج سے بھاگ کر اس طرف آگیا - اور اس نے کہا کہ ۱۹ کو حملہ شروع ہوگا - یہ خبر رفعت نے مصطفےٰ کمال کو پہنچائی - اس نے عصمت اور علی فواد کو بھی بلالیا - اور باہم مشورہ کے بعد یہ قرار پایا کہ یہ خبر صحیح معلوم ہوتی ہے - اور بحالات موجودہ جس طرح ممکن ہو مدافعت کرنی چاہئے - جرمن کمانڈر - سانڈرس متفق نہیں تھا - وہ کہتا تھا کہ ہندوستانی سارجنٹ صرف دھوکا ہی دھوکا ہے - لیکن چونکہ مصطفےٰ کمال کو یقین ہو چکا تھا اس لئے وہ کسی نہ کسی طرح بستر سے اٹھا - درد موجود تھا - اور بخار بھی - لیکن فطرت نے قوت عزم اس کو اتنی زبردست دی ہے کہ جب وہ کسی بات کا ارادہ کر لیتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی چیز اسے باز نہیں رکھ سکتی - اس نے اسی حالت بیماری میں تمام افسروں کو بلایا - ان کو مناسب ہدایات دیں اور خود ہر جگہ پہنچکر مختلف مقامات کا معائنہ کر کے فوج کی ہمت بڑھائی -

آخر کار ۱۹ کو انگریزی فوج کا حملہ شروع ہوا اور سیلاب کی طرح آگے بڑھنے لگا - نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی فوج منتشر ہوگئی - اور مصطفےٰ کمال کو دمشق تک پیچھے ہٹنا پڑا - لیکن فوراً ہی اس نے محسوس کیا کہ یہاں بھی ٹھہرنا خطرہ سے خالی نہیں - اس لئے اس نے جنرل سانڈرس سے کہا کہ اب سوائے اس کے کوئی ترکیب نہیں کہ شام دشمن کے حوالہ کر کے حلب میں محاذ قائم کیا جائے - سانڈرس نے کہا کہ " میں ایسا حکم نہیں دے سکتا - کیونکہ لوگ یہی کہیں گے کہ چونکہ جرمنی کا آدمی تھا اس لئے اس نے ترکی کا اتنا حصہ ملک کا چھنوا دیا "

مصطفےٰ کمال نے کہا کہ " میں خود اپنی ذمہ داری پر کرونگا - تم فکر نہ کرو " اور اس نے حلب کا راستہ اختیار کیا -

یہاں پہنچکر اس نے پھر از سر نو فوج کو مرتب کیا - اور خلیفہ کو تار دیا کہ " انور کو نکال کر موجودہ نظام حکومت فوراً بدل دینا چاہئے " اسکا کوئی جواب تو نہ ملا - لیکن یہ خبر اس کو پہنچ گئی کہ انور طلعت اور جمال بھاگ کر بحیرۂ اسود کی طرف چلے گئے ہیں - اور رؤف دفوزی کی مدد سے دوسری وزارت ترتیب دی گئی ہے -

اس طرف کرنل لارنس نے مصطفےٰ کمال کو لکھا کہ وہ ترکی حکومت پر زور ڈالے کہ ہم سے علیحدہ صلح کی گفتگو کرے مصطفےٰ کمال نے کہلا بھیجا کہ " میں جنگ کرونگا - صلح کے لئے تیار نہیں ہوں "

۲۶ - اکتوبر کو انگریزی فوج نے دوبارہ حملہ کیا - لیکن اس جنگ میں مصطفےٰ کمال نے ایسی غیر معمولی جرأت و ہمت سے کام لیا کہ جو دمصور اور تیمور کے دور سالوں کو اس نے دم میں ختم کر دیا - اور انگریزی فوجیں پسپا ہوگئیں - لیکن اس

جنگ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تھا کہ صلح کی اطلاع آگئی۔ اور سانڈرس مصطفےٰ کمال کو چارج دیکر واپس گیا۔

مصطفےٰ کمال باوجود اطلاع صلح کے فوجی تنظیم میں لگا ہوا تھا۔ تاکہ اگر پھر جنگ کی نوبت آئے تو وہ اس کے لئے تیار پایا جائے۔ لیکن اسی وقت عزت پاشا کا تار آیا کہ توفیق پاشا جو انگریزوں کا دوست ہے وزیر اعظم ہونیوالا ہے اس لئے فوراً یہاں پہنچو۔ تمہاری مدد کی سخت ضرورت ہے۔" یہ خبر پاتے ہی مصطفےٰ کمال سیدھا قسطنطنیہ روانہ ہوگیا۔

نوٹ:۔ اس کے بعد سلسلہ کے لئے دیکھئے ماہ نومبر ۳۴ء کا نگار اور اس کے بعد کے پرچے۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوئم

کی کتابت شروع ہوگئی ہے اور اس جلد میں اسوقت تک کے تمام استفسار و جواب شامل کردیئے جائیں گے تاکہ تیسری جلد کی ضرورت نہ رہے اسکا حجم غالباً ایک ہزار صفحہ سے کم نہ ہوگا قبل اشاعت اسکی رعایتی قیمت چار روپیہ معہ محصول رکھی گئی ہے۔

مینیجر نگار

بہار

مؤلفہ الیاس احمد ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ منصف سہارنپور

گلدستۂ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "درزبان شاعراں" "حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قائم ہوسکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو علم ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک ۱۲؎ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔

ملنے کا پتہ:۔ مینیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ۔ یو۔ پی

جھانسی کی رانی

تاریخ حکومت برطانیہ ہند میں لارڈ ڈلہوزی کا زمانہ اتنا مہتم بالشان زمانہ گذرا ہے کہ اگر ہم اسے اساس حکومت سے تعبیر کریں تو غالباً غلط نہ ہوگا۔ پنجاب، برہا، سکم، ستارہ، جلپور وغیرہ تمام ریاستوں کا اسی کے زمانہ میں برٹش راج سے الحاق ہوا۔ اور جھانسی کی مرہٹہ ریاست بھی اسی نے ہمیشہ کے لئے ختم کی۔

ہندوستان میں "جھانسی کی رانی" اتنا مشہور اور زبان زد فقرہ ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو جو اس سے واقف نہ ہو۔ لیکن شاید یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مرہٹہ تاریخ میں "جھانسی کی رانی" کیا اہمیت رکھتی ہے۔ اور اس نے کس جرأت و ہمت سے کام لیکر اپنے وطن پر اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ یہ ڈرامہ مسٹر فلپ کاکس کا لکھا ہوا ہے اور جارج ایلن اینڈ انون لندن نے اسے شائع کیا ہے۔ ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے اس کے ترجمہ کی اشاعت کی اجازت دیکر ہمیں اس ادبی خدمت کا موقعہ دیا۔

نیاز

افراد تمثیل

ماما صاحب:۔ رانی لکشمی بائی کا باپ

لالہ لاہوری مل و لالہ ٹیکی چند:۔ راجہ گنگا دھر راؤ کے دو وفادار

راؤ آپا۔ ایک مرہٹہ خادم

گنگا بائی۔ گنگا دھر راؤ کی پہلی رانی

میراں بائی۔ رنواس کی رقاصہ

جے پی گرانٹ۔ لارڈ ڈلہوزی کے عہد میں گورنمنٹ آف انڈیا کا سیکرٹری

نرسنگھ:۔ گنگا دھر راؤ سابق راجہ جھانسی کا دیوان

انند راؤ:۔ گنگا دھر راؤ کا متبنیٰ ولیعہد

رانی لکشمی بائی۔ راجہ گنگا دھر راؤ کی بیوہ رانی

میجر ایلیس۔ ۱۸۵۳ء میں بندھیلکھنڈ کا انگریزی پولیٹکل افسر

جے اے ڈورین / فریڈ جے ہیلیڈے } ۱۸۵۳ء میں گورنر جنرل کی اگزیکٹو کونسل کے دو ممبر

کرنل جان لو - ۱۸۵۴ء میں گورنر جنرل کی اگزیکٹو کونسل کا ممبر

ملٹری سیکرٹری - فوجی مشیر متعینہ گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ ۱۸۵۴ء

لارڈ ڈلہوزی - ہندوستان کا گورنر جنرل ۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء

بخشش علی - ۱۸۵۷ء میں جھانسی کا داروغہ جیل

جمعدار لال بہادر - ہندوستانی فوج کی بارھویں رجمنٹ کے باغی سپاہیوں کا لیڈر

رسالدار لال محمد - ۱۴ بے قاعدہ رسالہ کے باغی سواروں کا لیڈر

جنرل سر ہیو روز - انگریزی فوج کا سپہ سالار

دیگر افراد - محافظ سپاہی، پہلوان، نٹ، بھان متی، خادمائیں، اہل شہر، اکابر شہر، مرہٹہ و پٹھان سپاہی، لشکری، شاگرد پیشہ، اور گورے سپاہی

۱۸۵۳ء

پہلا ایکٹ - پہلا منظر

۲۴ - دسمبر ۱۸۵۳ء وقت سہ پہر - قلعہ جھانسی کے مغربی سمت رانی لکشمی بائی کا خانہ باغ ایرانی وضع کا - ہر طرف امن و سکون ہے - دو طرف قلعہ کی بلند دیوار پردہ کا کام دیتی ہے - تیسری طرف داہنے ہاتھ کو جہاں زمین کچھ بلند ہے - املی کے درختوں کے آغوش میں راجہ کا محل ہے - بائیں طرف قلعہ کی دیوار کے قریب ایک زینہ ہے جو مہادیو جی کے مندر کو جاتا ہے - یہ مندر باغ کے بائیں سمت نظروں سے پوشیدہ قلعہ کی دیوار کی آڑ میں ہے - زینہ کی سیڑھیوں کا سلسلہ مندر کے ایک گوشہ میں ختم ہوتا ہے - اور یہ زینہ صرف رنواس کی گذرگاہ ہے - باغ کے وسط میں فوارہ چھوٹ رہا ہے - ایک طرف ایک خوبصورت چوبی تخت ہے جس پر ایک قیمتی زرکار شامیانہ تنا ہوا ہے - تخت پر نہایت بیش قیمت گدے اور گاؤ تکیے بچھے ہوئے ہیں - تخت کے پائیں دو تین تپائیاں نظر آتی ہیں -

رانی لکشمی بائی کا باپ ماما صاحب اور نرسنگھ وزیر اعظم بائیں طرف زینہ سے داخل ہوتے ہیں یہ دونوں ادھیڑ عمر کے ہیں - ماما صاحب تنا ور و تنومند سپاہیانہ وضع میں نظر آتا ہے - نرسنگھ ضعیف الجثہ ہے اور اس کی کمر کسی قدر جھکی ہوئی ہے - چہرہ پر ایک قسم کی متانت بلکہ مکاری برستی ہے - دونوں شمالی ہندوستان کے ہندوؤں جیسا سفید لباس پہنے ہیں - سر اور پاؤں ننگے ہیں - یہ مہادیو جی کے مندر سے پوجا کر کے

نکلے ہیں۔ باغ میں خراماں خراماں چلتے ہوئے کہیں کہیں رُک جاتے ہیں۔ آپس میں باتیں ہو رہی ہیں)

ماما صاحب:۔ میں تو صاف کہتا ہوں۔ جب تک رانی کی صحبت میں گنگا بائی رہیگی۔ اس وقت تک جھانسی راج کے متعلق ہماری کوئی تمنا پوری نہیں ہو سکتی۔ ایشور جلائے وہ کونسا منحوس دن تھا جب ہم نے گنگا بائی کو لکشمی کا سہیلی بننے دیا۔ اور حقیقت مجھ سے ہی حماقت ہوئی۔ کاش میں جانتا کہ شادی بیاہ کے بعد بھی لڑکیوں کی نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر گنگا بائی کا اثر نہ ہوتا تو مجال تھی کہ لکشمی مجھ سے، اپنے پتا سے اس طرح پھر جاتی۔ اور مجھ سے ایسا برتاؤ کیا جاتا۔ اگر مہاراجہ زندہ رہتے تو میں لکشمی کو ٹھیک بنا دیتا۔ لیکن کیا کروں مجبور ہوں۔ ابھی ابھی مندر میں جب ہم پوجا کر رہے تھے۔ پرماتما جانے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا راجہ جی ہمارے پاس کھڑے ہوئے ہیں۔

نرسنگھ:۔ بات یہ ہے کہ آجکل رانی سوگ میں ہیں۔ اور ان کو دل بہلانے کے لئے ہر وقت سہیلیوں کی ضرورت رہتی ہے ورنہ ایسی تدبیریں کی جا سکتی تھیں کہ گنگا بائی کو اس کے میکے بھیجدیا جاتا۔

ماما صاحب:۔ (اظہار رشک کیساتھ سر ہلاتے ہوئے) لیکن اب ہم کیا کر سکتے ہیں۔ لکشمی روز بروز ہاتھوں سے نکلی جاتی ہے۔ تم نے تو دیکھا ہوگا کہ کل وہ کتنی برہم ہوئی تھی کہ میں مہاراجہ کی وصیت کے مطابق اس کے نائب فرمانروا تسلیم کئے جانے پر کیوں زور نہیں دیتا۔ اس نے صاف صاف کہدیا کہ میں نے اور وزیر نے کیساتھ ساز باز کر رکھی ہے تاکہ وہ اپنی جائز پوزیشن حاصل نہ کر سکے۔

نرسنگھ:۔ عورت کے دل کی تھاہ کو پہنچنا اور ریگستان میں پانی ڈھونڈھ نکالنا۔ دونوں برابر ہیں۔ چاہئے تو یہ تھا کہ جو لوگ ریاست کے معاملات سمجھتے ہیں انھیں پر تمام انتظامات چھوڑ دیئے جائیں۔ مگر رانی صاحبہ یہ چاہتی ہیں کہ ریاست کا تمام نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔

ماما صاحب:۔ (رنجش کی) سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ یہ جو کچھ ہے سب گنگا بائی کا کیا دھرا ہے۔ وہ ہر وقت ملکہ وکٹوریہ اور رانی اہلیہ بائی کے گیت گاتی رہتی ہے۔ جب عورتیں اپنی ہی صنف کے ہیرو اس طرح کھڑے کرتی رہیں گی تو ہم مردوں کا خدا حافظ ہے

{ عین اسی وقت راج کے دو اور وزیر لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹی چند داہنی طرف سے نکل کر ہندوانہ طریقہ سے ماما صاحب اور نرسنگھ کو سلام کرتے ہیں۔ یہ متمول طبقہ کے دو ادھیڑ برہمن ہیں۔ اور سفید لباس میں ملبوس }

لاہوری مل:۔ اچھا ہوا آپ لوگ یہاں مل گئے۔ میجر ایلس صاحب یہاں آگئے ہیں۔ اور قلعہ کے افسروں سے باتیں کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں کے جیلخانہ میں قیدیوں نے جو لنگا ناز ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ اس سے سرکار انگریزی سخت متردد ہے۔ اور اس نے میجر صاحب کو بھیجا ہے تاکہ تفتیش حالات کر کے رپورٹ کریں۔

ٹی چند:۔ ہم دونوں نے خیال کیا کہ یہ موقعہ اچھا ہے۔ میجر صاحب سے معلوم کر لیا جائے کہ ہم نے کمار انند راؤ کی متبنیت تسلیم کئے جانے کے متعلق کلکتہ میں اپیل کی تھی۔ اسکا کیا حشر ہوا۔ ہم لوگ یہی کہنے یہاں آئے ہیں۔

نرسنگھ:۔ (خوش ہو کر) شکریہ! دونوں بھائیوں کا شکریہ۔!! آپکا خیال بہت درست ہے۔

ماما صاحب:۔ (جوش کیساتھ داہنی طرف کو ہٹکر) ۔اچھا تو چلو۔دیکھیں میجر صاحب کیا کہتے ہیں۔اب تک کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہوگا۔

[چاروں جلدی جلدی قدم بڑھاکر داہنی طرف نظروں سے غائب ہوجاتے ہیں۔بائیں جانب سے کمار اننداراؤ ولیعہد متبنیٰ اور راؤ آپا مرہٹہ داخل ہوتے ہیں۔اننداراؤ ایک چست چالاک اور قبول صورت سات سال کا لڑکا ہے۔سفید لباس پہنے ہے۔دونوں ہاتھ میں ہاتھ پکڑے زینہ سے اُترتے ہیں۔باغ میں داخل ہوتے ہی اننداراؤ کودتا پھاندتا الگ ہوجاتا ہے۔]

آنندراؤ:۔ راؤ آپا آؤ۔اور دو دو ہاتھ تلوار کے نکالیں۔آؤ! لپک کر آؤ۔مجلسراے میں چلیں۔اور رانی صاحبہ کو اچانک جا گھیریں۔

راؤ آپا:۔ اچھا کنور صاحب۔چلئے۔تشریف لے چلئے!

[اننداراؤ داہنی طرف دوڑتا جاتا ہے۔اور راؤ آپا پیچھا کرتا ہے۔بائیں طرف کے زینہ سے رانی لکشمی بائی باغ میں داخل ہوتی ہے۔ساتھ میں گنگا بائی بھی موجود ہے۔رانی صاحبہ سفید رنگ کی قیمتی ساڑھی پہنے ہوئے ہیں۔جسم پر بیش قیمت سفید کپڑے کی چولی ہے۔سر اگرچہ ساڑھی سے ڈھکا ہوا ہے۔لیکن سوگ کیوجہ سے منڈوا دیا گیا ہے۔پاؤں برہنہ ہیں۔جسم پر کوئی زیور نہیں ہے۔یہی حالت گنگا بائی کی ہے۔مگر اس کا سر منڈا ہوا نہیں ہے۔رانی بمقابلہ گنگا بائی کے زیادہ کشیدہ قامت، جوان اور حسین ہے۔رفتار و گفتار حرکات و سکنات سے شاہی شان و شوکت ظاہر ہوتی ہے۔دونوں مندر میں پوجا کر کے باہر آئی ہیں۔رانی لکشمی بائی آگے آگے اور گنگا بائی پیچھے ہے۔]

رانی:۔ (طنزیہ لہجہ میں) گنگا بائی! جو تمنا میرے دل میں ہے اسے اور کوئی دیوتا تو کیا خود مہادیو جی بھی شاید پوری نہیں کر سکتے۔اس دنیا میں جہاں مردوں کی حکومت ہے۔کسی عورت کا جنم لینا کس قدر تکلیف دہ بات ہے۔ایک عورت جانتی ہے کہ اسکا کیا حشر ہوتا ہے۔وہ جانتی ہے کہ اس میں کس قدر زبردست طاقتیں ہیں۔باایں ہمہ وہ اس چیز کی جستجو میں نہیں نکل سکتی جو اسے آگے قدم بڑھانے کے لئے اشارہ کر رہی ہے۔

(مسند پر جاکر بیٹھ جاتی ہے اور پاؤں سمیٹ لیتی ہے اور گنگا بائی ایک تپائی پر بیٹھ کر رانی کے پاؤں دابنے لگتی ہے)

گنگا بائی:۔ اگر مہارانی کی خواہش یہی ہے تو انسان تو کیا دیوتا لوگ بھی آپ کی خواہش پوری ہونے سے نہیں روک سکتے۔

رانی:۔ بہن ایک مہاتما کی خواہشِ آزادی سے ایک بے یار و مددگار عورت کی آرزو سے مختلف ہوتی ہے دنیا سے بچنے کے لئے مرد تو مذہب کے دامن کی پناہ لے لیتے ہیں۔(ٹھنڈی سانس بھر کر) مگر ہم عورتوں کو مذہب کی اس لئے ضرورت ہے کہ اس کے ذریعہ سے ہم کو ایسی الہامی ہدایات حاصل ہوتی رہیں۔جو گرد و پیش کے تمام آلام و مصائب کے بھنور سے ہماری

کشتیٔ حیات کو نکال کر ساحل مراد تک پہنچادیں۔ (جوش میں) جب کبھی مجھے اس بات کا خیال آتا ہے کہ اہلیہ بائی نے کس طرح تیس برس تک مسلسل کوشش کرکے، ریاست اندور میں امن و امان بحال رکھا۔ اور دھرم شاستر کا جو علم اسے حاصل تھا اس سے کام لیکر وہ قلمرو نے ہولکر میں کس طرح امن و امان اور خوشحالی قائم رکھ سکی۔ تو میں شرم و غیرت سے زمین میں گڑ جاتی ہوں۔ کیونکہ میں بھی اسی طرح جھانسی راج کو بچانا چاہتی ہوں مگر میرے تمام منصوبوں کو خاک میں ملایا جارہا ہے۔

گنگا بائی:۔ مہارانی! اگر کسی چیز کے بچانے کی ضرورت ہے تو وہ جھانسی راج ہے۔ میرے سورگباش پتاجی کہا کرتے تھے کہ راجہ رامچندر راؤ کے زمانہ میں جتنے مالگذار تھے سب راج کے قرضخواہ تھے۔ اور حالت یہ ہوگئی تھی کہ تمام ریاست قرضوں کے بوجھ اور لوگوں کی لوٹ مار سے مٹی جارہی تھی۔ جب سے انگریزوں نے ہماری ریاست کا ایک بڑا علاقہ دبالیا ہے۔ اس وقت سے ریاست کو ساہوکار لوگ بھی قرض دیتے ڈرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ریاست میں امن و امان تو ہے نہیں پھر کس بھروسے پر قرضہ دیا جائے۔

رانی:۔ گنگا بائی! تمہیں خوب معلوم ہے کہ سورگیہ مہاراجہ کی طویل علالت کے زمانہ میں مجھے کس قدر امید تھی کہ جلد یا بدیر میں نائب السلطنت بنادی جاؤں گی۔ اور اگر وزیروں نے یہ کہہ کہہ کر میری امیدوں کو خاک میں نہ ملایا ہوتا کہ مہاراجہ خود کام کرنے کے قابل ہیں۔ تو میں کبھی کی اپنے شوہر کی جانشین ہو جاتی۔ اور اب کہ مہاراجہ سورگ کو سدھار گئے ہیں اور ہم نے انند راؤ کو متبنیٰ کر لیا ہے۔ تو یہ مکار وزیر کہتے ہیں کہ جب تک انند راؤ کی متبنیت کو گورنر جنرل تسلیم نہ کرلے اس وقت تک ریاست میں کسی جدید انتظام کا اعلان نہیں کیا جاسکتا۔ (بیٹھ جاتی ہے اور زیادہ جوش سے بولتی ہے) ان مردودوں کی حماقت اور خود غرضیوں نے مجھے پاگل بنادیا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ ان جھوٹے مکاروں کی زبانیں گُدی سے نکال لوں۔ کیونکہ وہ اب بھی یہی کہے جاتے ہیں کہ انند راؤ کو متبنیٰ اور مجھے نائب السلطنت نہ بنانے سے وہ راج کی خدمت کر رہے ہیں۔ مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ انہوں نے انگریزوں سے ساز باز کرلی ہے تاکہ انگریز جھانسی راج کا الحاق کرلیں۔ اور یہ لوگ مزے کریں۔

گنگا بائی:۔ صبر کرو۔ میری بہن صبر کرو۔ مانا کہ انگریز غاصب، ملک گیر اور بے اصولے ہیں۔ لیکن وہ بیوقوف نہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ بندھیلکھنڈ کے رجواڑے بھروسہ کے قابل نہیں۔ اور ان کے درمیان جھانسی کی ایک وفادار مرہٹہ ریاست کا وجود خاص قدر و قیمت رکھتا ہے۔

رانی:۔ (اٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے) لیکن اس بات کا اطمینان بھی تو ہو جائے۔ کوئی اور گورنر جنرل ہوتا تو فکر کی بات نہ تھی۔ لیکن اس گورنر جنرل (ڈلہوزی) کا منہ ایک بے پایاں خلیج کی طرح کھلا ہوا ہے۔ ستارہ کی قدیم ترین مرہٹہ ریاست کو تو وہ نگل گیا۔ اور اب سننے میں آرہا ہے کہ وہ ناگپور کے بھونسلا خاندان کی مرہٹہ ریاست کو بھی کھا جانے والا ہے۔ اور بہانہ یہی ہے کہ آخری مہاراجہ نے کوئی وارث تخت و تاج نہیں چھوڑا۔ اور پھر پنجاب کو دیکھو۔ سکھم کی ریاست کو دیکھو۔ برہما کو دیکھو۔ یہ خونخوار انگریزی دیوان سب کو کس طرح ڈکار لئے بغیر ہضم کر گیا ہے۔ مجھے تو جھانسی کی طرف سے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

گنگا بائی:۔ اس میں شک نہیں۔ یہ انگریز بڑے چالاک ہوتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی فیاضیوں کی نمایش کرتے رہتے ہیں

اس لئے میرے خیال میں وہ جھانسی راج کو آزاد و خود مختار رکھنا زیادہ پسند کرینگے۔ تاکہ ہمارے اوپر یہ احسان رہے کہ وہ دیکھو ہم رجواڑوں کے کتنے دوست ہیں۔ خصوصاً ان کے جو اپنی ریاستوں کا انتظام ایسا اچھا رکھتے ہیں جیسا سورگباشی مہاراجہ جھانسی نے اپنے عہد کے آخری زمانہ میں رکھا تھا۔ اور اسی بنا پر وہ آنند راؤ کی تبنیت کو تسلیم کریں گے۔ اس معاملہ میں آپ زیادہ تشویش نہ کریں۔ نتیجہ اچھا ہی نکلے گا۔ اور دشمنوں کے کان بہرے۔ اگر خلاف ہوا تو ہر جبہ باد آباد گنگا بائی آپ کے قدموں سے کبھی علیحدہ نہیں ہو سکتی۔ (جھک کر بالائیں کرتی ہے)

رانی:۔ (گنگا بائی کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے)۔ بہن ہم دونوں ایک ہی شوہر سے لطف صحبت اٹھا چکے ہیں۔ اور خوب جان گئے ہیں۔ جیسا کہ جلد یا بدیر تمام عورتوں کو معلوم ہو جاتا ہے کہ عورتیں مردوں کے نزدیک صرف کھلونا ہوتی ہیں اس لئے آئندہ سر پر بُری پڑے یا بھلی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ دینا چاہئے۔ اور جس طرح دیوی سروپ اہلیا بائی نے اپنی تمام زندگی ریاست اندور کی خدمت اور سلامتی کے لئے وقف کر دی تھی۔ اسی طرح ہم کو بھی اپنی تمام قوتیں اور اپنی تمام دعائیں اپنی اس (چاروں طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) چھوٹی سی محبوب ریاست جھانسی کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے صرف کر دینا چاہئے۔ ان زمینوں۔ ان عمارتوں۔ ان درختوں۔ اور ان پانیوں پر ہاتھ پاؤں مارے بغیر انگریزوں کو کیوں قبضہ کرنے دیا جائے؟ کیا جس قدر ان چیزوں کی محبت میرے اور تمہارے دلوں میں ہے۔ اسی قدر انگریزوں کے دلوں میں بھی ہوگی؟ کیا ان کے دلوں میں بھی مرہٹہ سورماؤں کی یاد جنہوں نے یہ دلفریب اور زرخیز علاقہ مغلوں اور راجپوتوں سے چھینا تھا۔ اسی طرح قائم رہ سکتی ہے جیسے ہمارے دلوں میں؟ کیا رعایا کی ضرورتوں، ان کی امیدوں اور ان کے خطروں کو بھی وہ اسی طرح محسوس کرینگے جیسے کہ ہم۔ جنہوں نے سو برس سے زیادہ عرصہ سے بندیلکھنڈ کو اپنا وطن بنا رکھا ہے؟ میرے پتا اور وزیروں سے زیادہ ان سوالوں کا جواب اور کوئی نہیں جان سکتا۔ باینہمہ وہ باتیں بنا بنا کر معاملہ کو کھٹائی میں ڈال رہے ہیں۔ اور راج کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ (سخت جوش میں) گنگا بائی! میرا دل بار بار کہہ رہا ہے کہ اگر میں خود اٹھ کر کوئی کام نہ کروں گی تو جھانسی راج ہاتھوں سے نکل جائیگا۔

{ اس وقت "ہو! ہو!" کی آواز سنائی دیتی ہے اور فوراً داہنی طرف سے آنند راؤ ڈھال تلوار سے مسلح اور اس کے پیچھے راؤ آپا لکڑی کی تلوار لئے ہوئے آتے ہیں۔ دونوں رانی کے سامنے شمشیر زنی کرتے ہیں۔ راؤ آپا دبتا جاتا ہے اور بالآخر ایک جگہ گویا ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔ آنند راؤ فتحمندانہ حیثیت سے راؤ آپا کے سینہ پر پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر "آنند کمار کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ رانی اور گنگا بائی بھی خوش ہو کر تالیاں بجاتی اور "آنند کمار کی جے" کے نعرے لگاتی ہیں۔ }

رانی:۔ (فرط مسرت سے) واہ بیٹا واہ! شاباش!! میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ تم اس قدر محنت سے تلوار چلانا سیکھ رہے ہو۔ ہر مرہٹہ سردار کا فرض ہے کہ وہ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہے۔ اچھا اب میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں مہاتما جی کی سچی پرتگیا سکھا دوں۔ (آنند راؤ رانی کے پاس آتا ہے) بائیں ہاتھ میں تلوار پکڑ کر سیدھا سامنے کی طرف پھیلاؤ۔ اور اپنا داہنا ہاتھ

سینہ پر رکھو۔ دیکھو اس طرح (ہاتھ رکھ کر دکھاتی ہے) اور اب یہ الفاظ دہراؤ:۔
"تلوار دھنی پتا کھانڈوبا اور تمہاری جی پر میرا ایمان ہے۔ یہ دونوں شیوجی کے روپ ہیں۔ جو شر کا مٹانے والا۔ شفا بخشنے والا اور زندگی کو پاک کرنے والا ہے۔ میں ہمیشہ شیواجی اور شمبھاجی اور بڑے بڑے پیشواؤں کے نقش قدم پر چلونگا۔ جو غریبوں کی دستگیری کرتے تھے۔ بھوکوں کو کھانا کھلاتے تھے اور مغروروں کا سر توڑتے تھے۔ میں ایک سچا مرہٹہ بننے کا حلف اٹھاتا ہوں۔ ظالموں سے لڑونگا۔ ستمگاروں کو سزا دونگا۔ اور دھرم کی پرچھشا کروں گا۔ میں عاجزوں اور بیکسوں کی فریاد سنونگا۔ اور میرا دروازہ ان لوگوں کے لئے کبھی بند نہ ہوگا جو متقی اور پرہیزگار ہیں اور دھرم کے مقدس طریقہ پر آزادی کے طلبگار۔"

{ انند راؤ رانی کے الفاظ دہراتا ہے۔ عین اس وقت داہنی طرف سے ماما صاحب، نرسنگھ۔ لالہ لاہوری مل اور لالہ ٹی چند داخل ہوتے ہیں۔ انند راؤ کی پرتگیا سنتے ہیں اور پھر رانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ }

ماما صاحب:۔ بیٹی! میجر ایلیس جو سرکار انگریزی کی طرف سے بندھیلکھنڈ میں پولیٹیکل ایجنٹ ہیں۔ گھنٹہ بھر ہوا کہ یہاں آئے ہیں۔ وہ ہمارے افسروں کے ساتھ فوجی استحکامات اور قلعبندیوں کا معائنہ کر رہے ہیں۔ اور ہم ابھی اُن کے پاس سے آرہے ہیں۔ جیل کے قیدیوں نے پھر گڑبڑ مچائی ہے۔ ایسا نہ ہو بغاوت کر بیٹھیں۔ اس لئے احتیاطی تدابیر کی سخت ضرورت ہے۔

رانی:۔ میں بار بار دریافت کر چکی ہوں کہ آخر جیل میں آجکل اتنے آدمی کیوں ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ مگر کوئی شخص قابل اطمینان جواب نہیں دیتا۔

لاہوری مل:۔ مہارانی! پرماتما کی کرپا سے آپ کے راج میں ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی نظر آتی ہے۔ اس لئے چاروں طرف کے بدمعاش یہاں جمع ہو گئے ہیں۔ جہاں کھانے کو ملتا ہے وہیں بھوکے کتے جمع ہو جاتے ہیں۔

گنگا بائی:۔ (دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر غضبناک انداز سے) تو لالہ جی! یہ قصور کس کا ہے کہ کتے بھوکے ہیں؟ کیا ہمارا قصور نہیں۔ نہ ہم بدنظمی کے مرتکب ہوتے نہ لوگ فاقوں سے مجبور ہو کر چوری اور ڈکیتی پر آمادہ ہوتے۔

نرسنگھ:۔ گنگا بائی! انصاف کرو۔ ہم لوگ تو انتظام کرنے والے کے آلۂ کار ہیں۔ راجہ حکم دیتا ہے اور ہم اسکو بجالاتے ہیں۔ اگر حوصلہ ہے تو فرمانروا کو الزام دو۔ ہمارا اس میں کیا قصور ہے۔

رانی:۔ (اول آہستہ آہستہ اور پھر لہجہ تند اور جوشیلا ہو جاتا ہے)۔ گنگا بائی جو کچھ کہتی ہے وہ بالکل سچ کہتی ہے۔ جھانسی راج کا انتظام انگریزوں کے ہاتھ میں جانے سے پہلے ریاست کی آمدنی روز بروز گھٹتی جاتی تھی۔ اور ریاست کا بال بال قرض میں بندھ گیا تھا۔ لیکن اس وقت ہمارے کسان ہم سے محبت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگر ان کی فصلیں خراب ہوگئیں یا ان کے گھر جلا دیئے گئے تو راجہ ان کی مالگذاری معاف کر دیگا۔ اور دوسرے طریقوں سے بھی ان کی مدد کریگا۔ مگر اب انگریزوں نے زمینداروں کو نمبردار بنا کر راجہ اور پرجا کے درمیان ایک طبقہ کھڑا کر دیا ہے۔ جو کسانوں سے لگان وصول کر کے خزانہ میں داخل کر دیتے ہیں۔ اس طرح

راجہ اور پرجا کا براہ راست تعلق جاتا رہا ہے۔ اور اس سے بھی بدتر یہ بات ہے کہ لگان ایک مدت دراز کے لئے مقرر کردیا گیا ہے اور اس میں بھی تشخیص لگان بسا اوقات غیر منصفانہ ہوئی ہے۔ اب خواہ قحط پڑے یا خشک سالی ہو۔ مویشی مرجائیں یا مال چوری ہوجائے۔ مگر بیچارے کاشتکاروں کو قرض لینا پڑتا ہے۔ نہ صرف اس لئے کہ اپنے نقصانات کی تلافی کریں۔ بلکہ اس لئے بھی کہ جابرانہ لگان ادا کرکے زمیندار کی جیب اور ریاست کا خزانہ بھریں۔ پھر دیوان جی! آپ ہی بتائیں کہ جیلخانہ بھرپور نہ ہو تو کیا ہو؟ آجتک وہ بات کبھی سننے میں نہ آئی تھی جو آپ اب کھلے خزانہ کہہ رہے ہیں۔ یعنی جھانسی تو ڈاکوؤں اور ساہوکاروں کی جنت ہے۔ (دفعتاً مندر کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے اور ہاتھ اٹھاکر کہتی ہے) اے ہماری قوم کے دیوتاؤ! اور دیویو! گواہ رہنا کہ نائب السلطنت بننے ہی میرا سب سے پہلا کام ان آلام و مصائب کا علاج کرنا ہوگا۔ جن میں آجکل ہماری غریب رعایا گرفتار ہے۔

(چند لمحہ سکوت طاری ہوجاتا ہے۔ جسے رانی کے باپ کی کھنکار اور آواز توڑتی ہے)

ماما صاحب:۔ بیٹی ہم تم سے یہ کہنے آئے تھے کہ میجر ایلیس کے نزدیک گورنر جنرل کی طرف سے آنند کمار کی تبنیت تسلیم کرلیا جانا یقینی نہیں ہے۔ میجر صاحب نے ہم سے بیان کیا ہے کہ ان کے افسر بالادست میجر مالکم نے ان کو بذریعہ خط تنبیہ کردی ہے۔ کہ تبنیت کے معاملہ میں سرکار انگریزی کی طرف سے ہرگز کوئی وعدہ نہ کرنا۔ اس معاملہ کا فیصلہ براہ راست آکر خود لارڈ ڈلہوزی کریں گے۔

نرسنگھ:۔ اور حضور اس قدر عرض تو میں بھی باادب کرسکتا ہوں کہ میجر ایلیس جھانسی راج کے ہمیشہ دوست اور خیر خواہ رہے ہیں۔ اور اب سے دس برس گذرے کہ انہی کی کوششوں کی بدولت جھانسی راج کا نظم و نسق ہم لوگوں کے ہاتھ میں آیا تھا۔ پھر جب ایسا شخص ریاست کے متعلق کھٹکا رکھتا ہے تو معاملہ واقعی تشویش انگیز ہے۔ میجر صاحب فرماتے ہیں کہ کرنل لو اور گورنر جنرل کی کونسل کے دیگر ممبروں کا گورنر جنرل کی عدم موجودگی میں آنند کمار کا حق تسلیم کرنے سے انکار کردینا یہ معنی رکھتا ہے کہ جو شخص ستارہ۔ پنجاب۔ سکیم۔ برہما اور بہت سے دیگر علاقوں کو ہضم کرچکا ہے وہ غالباً جھانسی کو بھی نہیں چھوڑے گا۔ الغرض مجھے تو جھانسی کا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔

رانی:۔ اور آپ لوگوں نے میجر صاحب سے کیا کہا؟

ماما صاحب:۔ بیٹی ہم لوگ کیا کہہ سکتے تھے۔ خالی تولی دھمکیاں بیکار ہیں۔ ہم سے بس یہی ہوسکتا ہے کہ عرضیاں گذرانتے جائیں۔ اور بھلائی کی امیدیں رکھیں۔

نرسنگھ:۔ مہارانی! ہم نے میجر صاحب سے التجا کی ہے کہ وہ جھانسی راج کو بچانے کے لئے حتی المقدور کوشش کریں۔ اور باتوں باتوں میں کنایتاً یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ جو لوگ اس آڑے وقت میں ریاست کے کام آئیں گے شاہی خاندان ان کی خدمات کا ضرور خیال رکھیگا۔ میجر ایلیس نے بھی ازراہ عنایت فرمایا کہ دو تین روز میں وہ اس معاملہ کے متعلق میجر مالکم سے پھر ملاقات کریں گے۔ لیکن وہ کسی قسم کا وعدہ نہیں کرسکتے۔ مگر ان کا خیال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں لارڈ ڈلہوزی پر مقامی افسران

کے کہنے سننے کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ (اطمینان سے ہاتھ ملکر) بہرحال اگر بُرا وقت آ ہی گیا تو انہوں نے وعدہ کرلیا ہے کہ وہ اس بارہ میں ضرور کوشش کریں گے کہ آپ کو اور انند کمار اور دیگر متعلقین اور متوسلین کو گذارہ کے لئے ایک معقول پنشن دیجائے۔

رانی:- کیا میرے پناجی اور میرے بہادر افسر ایسا ہی کر سکتے ہیں؟ کیا خوشامدیں کرنے اور ناک رگڑنے کے بعد وہ اسی نتیجہ پر قناعت کرنے کے لئے آمادہ ہیں۔ (آواز کسی قدر بلند کر کے) سُنئے! اور کان لگا کر سنئیے! کہ آج سے میں اور صرف میں انگریزوں کیساتھ جھانسی راج کی ترجمانی کروں گی۔ کیونکہ میں ہی وہ ہُوں جسے سورگیہ مہاراج نے نائب السلطنت اور ولیعہد انند راؤ کا سرپرست نامزد کیا تھا۔ آپ لوگوں کی غلامانہ پالیسی سے میں بھر پائی۔ نہ اس سے کبھی پہلے کام چلا تھا۔ نہ اَب چلے گا۔ انگریز تم لوگوں کو نفرت وحقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اور تم خود اس بات کو خوب جانتے ہو۔ اب تم مجھ عورت ذات کو کام کرنیکا موقعہ دو۔ کہتے ہیں کہ انگلستان میں ایک بہت بڑی ملکہ راج کرتی ہے۔ اور تمام مرد اسکی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس خاص وجہ سے بھی وہ مجھ سے کوئی تعارض نہ کریں۔ میں آپ لوگوں کو جتائے دیتی ہوں کہ آئیندہ سے مجھے ایک عاجز اور بے دست وپا ہندو بیوہ نہ سمجھا جائے۔ بلکہ نام اور کام دونوں لحاظ سے جھانسی کی رانی سمجھا جائے۔ دیوان صاحب! فوراً منادی کرادیجئے کہ لوگ شام کیوقت قصر شاہی کے صحن میں دیوانخانہ کے سامنے جمع ہوں۔ تاکہ انند کمار کے بارہ میں اعلان کر دیا جائے۔ اگر انگریزوں نے اس کی متبنیت کو تسلیم نہ کیا تو ان سے نہ صرف جھانسی کی رعایا، بلکہ تمام ہندوستان نفرت کرنے لگیگا۔ اور پناجی! آپ میجر ایلیس کو ساتھ لیکر قصر شاہی میں تشریف لائیں۔ ہم اُن سے اپنے ارادوں کا اظہار کرینگے۔ اگر جھانسی کو ہمارے ہاتھ سے نکلنا ہی ہے تو پھر کیوں نہ بہادر مرہٹوں کی طرح جان پر کھیل کر دیا جائے؟ لالہ جی! تمام پہلوانوں، شمشیر بازوں اور بازیگروں کو بھی محل میں جمع ہونیکا حکم دیدیجئے۔ دُنیا کو دکھا دینا چاہیئے کہ جھانسی والے اَب بھی لڑنا مرنا خوب جانتے ہیں۔ راؤ آبا! درختوں کے پیچھے ہماری پالکی کھڑی ہے اسے طلب کرو۔ اور تم سب لوگ یہ بات کان دھر کر سُن لو کہ جو حکم میں دُونگی اُسے ماننا پڑے گا۔ کسی چھوٹے بڑے کی تفریق نہ ہوگی۔ اگر کسی شخص نے میرے حکم کی تعمیل میں قصور کیا یا مجھے راج کا مالک نہ سمجھا تو وہ سزا پائے گا۔؟

[ایک بڑی شاندار اور آراستہ پالکی آتی ہے۔ سوار ہونے سے قبل رانی ہاتھ اٹھا کر "کمار انند راؤ کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ جس میں سب حاضرین شریک ہو جاتے ہیں۔ گنگا بائی پالکی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف ہو لیتی ہے۔ ماما صاحب اور وزراء سلام کرتے ہیں۔ رانی کے بعد ماما صاحب انند راؤ کو پکڑ کے چاروں طرف گھماتا ہے اور اسے اپنے کاندھے پر بٹھا لیتا ہے۔ لڑکے کا منہ وزیروں کی طرف ہوتا ہے۔ اس کے بعد ماما صاحب "جھانسی راج کی جے" کا نعرہ لگاتا ہے۔ سب وزراء بھی دو تین مرتبہ یہی نعرہ لگاتے ہیں۔]

(باقی)

مسئلۂ خلافت و امامت

"نگار" بابت مارچ ۳۵ء کی اشاعت میں "خلافت و امامت" کے عنوان سے ایک مقالہ شایع ہوا ہے۔ جس کو کسی ہندو اہلِ قلم جناب "ہرنام" کی کاوشِ دماغی کا نتیجہ ظاہر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس طرح سے دیکھنے والے پر بظاہر یہ اثر پڑتا ہے کہ ایک بے تعلق غیر مسلم کے خیالات ہونے کی بنا پر بحث میں غیر جانبداری کیساتھ خالص تحقیقی نقطۂ نگاہ کو پیشِ نظر رکھا گیا ہوگا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ محترم موصوف باوجود ہندو ہونے کے "شیعیت" کیساتھ جذباتی ہمدردی رکھتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے گو بظاہر اُن کا اسم گرامی "ہرنام" ہے۔ لیکن شاید وہ اپنے اس مضمون میں اس حقیقت کو چھپانے میں کامیاب ہوسکے کہ دل کی گہرائیوں سے وہ حضرت علیؓ کی امامت کو ایک مذہبی کے تمام جذباتی رنگ کیساتھ تسلیم کرچکے ہیں۔ تحریر کا رنگ قدم قدم پر اُن کی اس شکست پر غمازی کرتا ہے۔ بالخصوص جہاں اُن کا "دل تھراتا ہے۔ قلم لرزتا ہے۔ جی چاہتا ہے مورخوں کے منہ پر ہاتھ رکھدیں، کس طرح دیکھیں اور کیونکر لکھیں کہ کس کس نے فرار کیا" (صفحہ ۴۴)

بہرحال جو کچھ بھی ہو اُن کی تحقیقی کاوش کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ شاید اس مبحث پر قلم اُٹھاتے وقت موصوف نے واقعات پر "فلسفۂ تاریخ" کی روشنی میں نفسیاتی اعتبار سے کوئی نظر نہیں ڈالی۔ نیز "فلسفۂ نبوت" اور عام اخلاقِ انسانی کے فلسفہ کے پہلو سے بھی اس سوال پر تفصیلی غور نہیں فرمایا۔ ممکن ہے کہ میری یہ حقیر کوشش کسی حد تک حقیقت کے چہرہ کو بے نقاب کرنے میں مدد دے۔

افسوس ہے کہ میں یہاں تفصیل کیساتھ مقالہ نگار کے استدلال کے ہر ہر جزو پر نظر نہیں ڈال سکتا۔ میں جو کچھ کروں گا وہ ایک ایسے مورخ کے اجمالی تبصرہ کے مترادف ہوگا جو واقعات کو منطقی علل و استنتاج کے ساتھ ساتھ دنیا کے عملی فلسفہ کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ بہرحال میں مسلمان ہوں اور پھر اہلِ سنت۔ اس لئے میں حتی الوسع کوشش ضرور کروں گا کہ اپنی تحریر میں جذباتی رنگ نہ آنے دوں۔ لیکن پھر بھی کسی بے راہ روی کا پہلے سے معذرت خواہ ہوں۔

بزمی

فلسفہ کے تمام عمیق مسائل طے ہوسکتے ہیں۔ ریاضی کے دقیق سے دقیق نظریے حل کئے جاسکتے ہیں۔ نظام بطلیموسی

کی جگہ نظام فیثا غورث لے سکتا ہے۔ نیوٹن کے نظریہ کشش کو انیشٹن بدل کر رکھ سکتا ہے لیکن اگر بلند نظری اور بے لوث تحقیقی نگاہ سے ایک لمحہ کے لئے بھی اعراض کر لیا جائے تو نہ یہ مسائل طے ہو سکتے ہیں اور نہ مسلمانوں میں ساڑھے تیرہ سو برس گذر جانے کے باوجود خلافت و امامت کا مسئلہ سلجھ سکتا ہے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نبی کریم کی سب سے بڑی حیثیت ایک اخلاقی مؤدب کی حیثیت ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں لئے جا سکتے کہ آپ کی اس حیثیت سے "سیاست ملکی" خارج ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ دنیا میں عام طور پر اخلاقی درس دینے والے مصلحین کی زندگی میں سیاست بہت کم داخل ہوتی ہے۔ لیکن رسول عربی کا مسئلہ ان سب سے جدا ہے آپ کی تعلیم کا کوئی جزو اسوقت تک حقیقی معنی میں مکمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومت و سیاست کی اعانت اس کیساتھ شامل نہ ہو۔

پھر یہ کوئی ایسی حقیقت نہیں ہے جس کو اہل سنت مسلمان تعصب کی بناء پر کہتے ہوں۔ بلکہ یوروپ کے بے تعلق مستشرقین بھی متفقہ طور پر اس رائے کی تائید کرتے ہیں۔ اگر گولڈ زیہر - فان کریمر - نولڈکی - دی ساسی - کاترمیر - نکلسن اور براؤن جیسے مسلّمہ فاضل مصنفین کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے تو قدم قدم پر اس حقیقت کا علم ہوتا ہے کہ ——— محمد کی تعلیمات میں "چرچ" اور "اسٹیٹ" دو جدا جدا چیزیں نہیں ہیں۔

غور کیجئے کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ مان لیا جائے کہ نبی کریم سیاست سے بالکل علیحدہ رہ کر اخلاقی تعلیم دینا چاہتے تھے تو پھر قرآن و حدیث کی اُن سینکڑوں ہدایات کی کیا تاویل کی جائیگی جن میں خالص سیاسی مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً جزیہ - ذمّی - حربی - جہاد - حد زنا و سرقہ وغیرہ وغیرہ۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (سورہ المائدہ - آیۃ ۳)

کی آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ اگر نبی کریم کے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کے پروگرام میں حکومت و سیاست داخل نہ ہوتی تو اس آیت میں "الیوم" کا مفہوم ہی کچھ باقی نہ رہتا۔ اس لئے کہ اگر فتح مکہ کے بعد سے نبی کریم کی سیاسی حیثیت کا مسلّم ہو جانا آپکے "درس" کی تکمیل میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا تو پھر "الیوم" کا لفظ بھی کچھ زیادہ بامعنی نہیں رہتا۔

پھر اخلاقی اور معاشرتی اصلاح (سوشل ریفارم) کو سیاست کے ساتھ ساتھ رکھنے کا نظریہ کوئی ایسا نظریہ نہیں ہے جس کو عقل باور نہ کر سکے۔ دنیا کا بڑے سے بڑا مصلح اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ معاشرتی اصلاح اسوقت تک ناممکن ہے۔ جب تک ملکی سیاست کے ارباب حل و عقد اس میں دستگیر و معاون نہ ہوں۔ گاندھی ہندوستان کا بلند ترین سیاسی رہبر سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ اس حقیقت کو تقریروں اور تحریروں میں آشکارا کر چکا ہے کہ "میرا حقیقی مشن معاشرتی اصلاح ہے۔ لیکن وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں نہ ہو۔"

حقیقتاً وہ لوگ اسلام کا صحیح مفہوم نہیں سمجھتے جو یہ کہتے ہیں کہ اسکو سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام صرف

ریاضت کرنے یا گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنیکا ایک نظام نہیں ہے - بلکہ اس کے برخلاف وہ ایک ایسا عملی پروگرام ہے - جو انسان کو زندگی کے ہر شعبہ میں صحیح مسلک پر کاربند رکھنا چاہتا ہے - ظاہر ہے کہ اس مقصد کا صحیح حصول اسوقت تک نہیں ہو سکتا - جب تک کہ ملکی نظام پر صحیح معنی میں پورا پورا اختیار نہ ہو -

پھر اگر یہ باور بھی کر لیا جائے کہ نبی کریم کا مقصد سیاست سے بالکل علیحدہ تھا اور یہ بعد کی بدعت ہے تو پھر وہ جماعت جو حضرت علی کو نبی کریم کا صحیح جانشین قرار دیتی ہے - اسکا کیا جواب دیگی کہ خود حضرت علی نے بھی مسند خلافت پر متمکن ہونے کے بعد اس کے خلاف آواز بلند نہیں کی - بلکہ اس کے علی الرغم اپنی سیاسی اہمیت کے قیام و بقاء کے لئے جنگ جمل میں صف آرائی کی - طلحہ و زبیر کو قتل کرایا - معاویہ کے مقابلہ کے لئے میدان صفین میں پڑاؤ ڈالا - اور پھر نہروان میں تقریباً تین ہزار[1] کلمہ گو اہل عرب کو تہ تیغ کرایا - میں پوچھتا ہوں کہ ان تمام مقتولین کے خلاف اگر "بغاوت" کا الزام نہ تھا جو خالص سیاسی الزام ہے تو پھر حضرت علی کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ محتاج بیان نہیں - اگر ان کی حیثیت ایک معبر بڑے "پیر" سے زیادہ نہ تھی تو آجکل کے مجتہد کی طرح انہوں نے ان مواقع پر صرف خاموشی کا اظہار کیوں نہ کیا ؟ یا زیادہ سے زیادہ اُن سے اپنی برأت کا اعلان کر کے خاموش کیوں نہ ہو گئے ؟

بہر حال خلافت و امامت کے مسئلہ میں اگر بے تعصبی کیساتھ ذرا سے غور سے بھی کام لیا جائے تو یہ حقیقت بے نقاب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ نبی اکرم کا صحیح جانشین وہی ہو سکتا ہے جو ایک طرف تو اخلاقی فضیلت میں دنیا کا مکمل ترین انسان ہو اور دوسری طرف سیاسی حل و عقد میں دنیا کا مہذب ترین فرمانروا -

اب دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے اعتبار سے صحابۂ کرام کے گروہ میں سے نبی کریم کا صحیح جانشین کون ہو سکتا تھا اگرچہ دنیا کا عام اصول تو یہ ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے - اسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے - اور اس لئے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر کی اہلیت میں تو کوئی شک ہونا ہی نہ چاہیئے - جبکہ دنیا کا ہر بلند نظر مورخ ان حضرات کی اخلاقی پاکیزگی سیاسی بلند نظری - اور عام معاشرتی رفعت و برتری کا بھی قائل ہے -

لیکن یہاں پہنچکر ہم کو جس پُر خار وادی میں داخل ہونا پڑتا ہے وہ یہ ہے - "کیا نبی کریم حضرت علی کو اپنے بعد اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے" ؟

حضرت علی ایک متقی ، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ آپ کے چچیرے بھائی تھے - ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے - بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے - اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے

---

[1] - ملاحظہ ہو - الکامل المبرد مطبوعہ مصر جلد سوم صفحہ ۱۰۵ - فان کریمر وغیرہ مستشرقین یورپ نے اس کتاب کو حضرت علی کی خلافت کے واقعات میں نہایت ہی مستند مرتبہ دیا ہے -

اوصاف بیان فرمائے ہیں۔ لیکن اگر ان اوصافی الفاظ کی منطقی اور لغوی تحلیل کر کے یہ نتیجہ نکالا جائے کہ نبی کریم آپ کو اپنا جانشین بنانیکے خواہشمند تھے۔ تو منصب نبوت کو سمجھنے میں اس سے بڑھ کر اور کوئی بنیادی غلطی نہیں ہو سکتی۔ غور تو کیجئے کہ جس شخص کو محمد عربی کے الہامی نبی ہونے پر ایمان ہو وہ یہ سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر فی الواقع آپ الہامی طور پر حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علی رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہ فرما دیا؟ جو بے خوف اور نڈر پیغمبر اپنے عزم و ثبات کے مقابلہ میں ساری دنیا کو چیلنج دے سکتا ہے۔ اُن کے بت خانوں کو چکنا چور کر سکتا ہے۔ شراب کے قرابوں کو توڑ کر پھنکوا سکتا ہے۔ اہلِ عرب کے نسبی فخر کو پاؤں کے نیچے کچل سکتا ہے۔ کیا اس کی اس اخلاقی کمزوری کا کسی حیثیت سے بھی اعتراف کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ محض چند لوگوں کے ڈر سے اپنے جانشین کا اعلان کرتے ہوئے ڈرتا رہے؟ ہر وہ شخص جس کو الہام اور وحی پر ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح عقیدہ ہو وہ یہ باور نہیں کر سکتا کہ دنیا دارانہ مصلحتوں کے ماتحت ایک عظیم المرتبت نبی اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک "خلافت" جیسی عظیم حقیقت کے اظہار سے جان چُراتا رہے؟

علاوہ ازیں اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور بالواسطہ طور پر حضرت علی کو اپنا قائم مقام بنانیکی رہبری کرتے رہے تو اس سے رسول کی پوزیشن جس درجہ نازک ہو جاتی ہے وہ زیادہ توضیح کی محتاج نہیں ہے۔

اگر ابو بکر اور عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے۔ اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشق رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لختِ جگر صاحبزادیوں کو اس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں۔ اس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لُٹا دیتے ہیں ——— غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر وہ رسول کی بارگاہ میں صرف اس لئے نظروں سے گرے ہوئے ہیں کہ اُن کے مقابلہ میں رسول کا چچیرا بھائی اور اسکا داماد ہے ——— تو پھر اسکا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "مبیر حمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟

لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

اب ہم بحث کے اُس رُخ کی طرف آتے ہیں۔ جہاں یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ "حضرت علی تمام صحابہ سے زیادہ خلافت کے مستحق تھے۔" اس حقیقت کو بے لوث تحقیقی نگاہ سے جانچنے کے لئے ایک بہترین طریقہ تو یہ ہو سکتا ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ مستشرقین یورپ ان کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔ ہم یہاں صرف نکلسن کے الفاظ کو نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ جو تقریباً تمام ذی رتبہ مستشرقین کی آراء کی طرف سے نمائندگی کر سکتے ہیں:-

"حضرت علی میں حکمران ہونے کے علاوہ اور تمام صفات موجود تھیں۔"[۵۷]

---

[۵۷] - لٹریری ہسٹری آف عرب۔ مصنفہ نکلسن صفحہ ۱۹۱ -

اس کے بعد ہمارے سامنے جو چیز ابوبکر و عمر کے مقابلہ میں حضرت علی کے شرف و فضیلت کا صحیح معیار پیش کر سکتی ہے وہ ان دونوں کے عہد خلافت کا مقابلہ ہے۔

خلفاء کی زندگی کا یہ پہلو اگرچہ ہماری بحث کا فیصلہ کن جواب ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ چونکہ یہ مقابلہ بے انتہا غیر مبہم اور واضح ہے اس لئے "مویدینِ امامت" نے اس میدان میں اپنی شکست کو یقینی سمجھتے ہوئے اپنی رزمگاہ کے دو اور میدان تلاش کئے ہیں۔ یعنی ایک تو یہی کہ آیا خلافت کے مفہوم میں سیاست داخل ہے یا نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ نبی کریم کے اقوال سے حضرت علی کی بے انتہا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن چونکہ پہلے مسئلہ پر ایک اجمالی تبصرہ کیا جا چکا ہے اسلئے اب ہمارے سامنے صرف دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ خود نبی کریم کے اقوال سے حضرت عمر و ابوبکر کے مقابلہ میں حضرت علی کی کیا فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

اس سلسلہ میں "مویدینِ امامت" "اَنَا مَدِینَۃُ العِلمِ وَعَلِیٌّ بَابُہَا" کی حدیث کو نہایت شدت کیساتھ پیش کرتے ہیں۔ لیکن اس کے مقابلہ میں حضرت عمر کے متعلق صحیح بخاری کی ان احادیث کو ملاحظہ فرمایا جائے:۔

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ خواب میں میرے سامنے کچھ لوگ پیش کئے گئے جو کرتے پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی کا کرتہ سینہ تک تھا۔ کسی کا اس سے نیچے۔ پھر عمر میرے سامنے لائے گئے اُن کا کرتہ اتنا لمبا تھا کہ اس کا دامن زمین پر گھسٹتا جاتا تھا۔ لوگوں نے پوچھا "اس کی تعبیر" آپ نے فرمایا۔ "عمر کی دینداری" [۱]

اسی قسم کی ایک دوسری حدیث ہے جس میں آپ نے خواب میں ایک گلاس سے کچھ دودھ پیا۔ اور باقی حضرت عمر کو دیدیا۔ اور لوگوں کو اس کی تعبیر "علم" بتلائی۔ [۲]

حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اس سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے لوگ گذر چکے ہیں جو اگرچہ پیغمبر نہ تھے لیکن ان پر خدا کی جانب سے الہام ہوتا تھا۔ اگر میری امت میں سے کسی شخص کو یہ مرتبہ حاصل ہے تو وہ عمر ہیں [۳]

حضرت ابن عباس سے مروی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر کی وفات کے وقت حضرت علی کو یہ کہتے سنا ہے کہ "مجھے یقین تھا کہ خدا تجھ کو تیرے دونوں ساتھیوں (رسول کریم و ابوبکر صدیق) کے ساتھ رکھیگا۔ کیونکہ میں نے اکثر نبی کریم کو یہ کہتے سنا ہے:۔ "کُنتُ اَنَا وَ اَبُوبَکرٍ وَعُمَرُ" و "فَعَلتُ اَنَا وَ اَبُوبَکرٍ وَعُمَرُ" و "اِنطَلَقتُ اَنَا وَ اَبُوبَکرٍ وَعُمَرُ" [۴]

ممکن ہے کہ پہلی حدیث کو محض اس لئے زیادہ قابلِ وثوق نہ سمجھا جائے کہ وہ حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے۔ لیکن دوسری حدیث کے رواۃ کو تو یقیناً اس سے بلند ہونا چاہئے۔

---

[۱] صحیح بخاری۔ کتاب الایمان۔ [۲] صحیح بخاری، کتاب العلم۔ [۳] و [۴] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی۔

اس سلسلہ میں بخاری کی وہ حدیث بھی قابلِ تذکرہ ہے جس میں رسول کریم سے ایک عورت نے پوچھا ہے۔ "آپ کے بعد میں مسایل کس سے پوچھوں گی"۔ آپ نے فرمایا "ابوبکر سے"۔ ۱؎

ایک موقعہ پر رسول کریم نے حضرت علی کے متعلق یہ فرمایا تھا۔ "علی دنیا اور آخرت میں میرا بھائی ہے"۔ اس سے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ نبی کریم اس طرح آپ کو اپنا جانشین بنا رہے تھے۔ حضرت علی واقعتہً آپ کے بھائی تھے۔ اور اس لئے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ کہتے۔ "آمنہ دنیا اور آخرت میں میری ماں ہیں"۔ یا "عبداللہ دنیا اور آخرت میں میرے باپ ہیں"۔

حضرت ابوبکر کی جاں نثارانہ اور فداکارانہ جذبہ کی ایک بہت بڑی مثال ان کا وہ کارنامہ ہے جس کے متعلق قرآن میں مذکور ہے:-

"ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ، یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ لَا تَحْزَنْ، اِنَّ اللہَ مَعَنَا"۔

یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے۔ اگر کج بحثی کے ساتھ تاویل بعید کو کام میں نہ لایا جائے تو اس کے معنی میں کوئی اشکال نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ "خدا بخش لائبریری پٹنہ" میں قرآن کا ایک قلمی نسخہ ہے۔ جس پر گو کاتب کا نام درج نہیں ہے لیکن کسی شیعہ کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ اس میں دو سورتیں زیادہ ہیں۔ جن میں سے ایک کا نام "نورین" ہے اور دوسری کا نام "ولایت"۔ نیز ۳۳ آیات بھی حسب ضرورت بڑھا دی گئی ہیں۔ ان سورتوں اور آیات کو قرآن میں بڑھا دینے کے بعد "مصنف" نے شیعیت کے تمام مشتبہ مسایل کو قرآن میں داخل کر دیا ہے۔ اور اس اضافہ کے متعلق یہ خیال کیا گیا ہے کہ چونکہ قرآن کے یہ حصے اہلِ تشیع کی صحیح حمایت میں تھے اس لئے اہلِ سنت نے ان کو اصل قرآن سے نکال دیا۔ (نعوذ باللہ)۔ بہرحال اس قرآن میں مذکورہ بالا آیت کے مفہوم کو حضرت ابوبکر کی مذمت میں تبدیل کرنے کی خاطر اس طرح لکھا گیا ہے:-

"یَقُوْلُ لِصَاحِبِہٖ، وَیْلَکَ، لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا۔"

ڈوبتا آدمی تنکے کے سہارے کو غنیمت سمجھتا ہے۔ چنانچہ بعض اوقات حضرت علی کی امامت کو ثابت کرنے کے لئے ان کے سابق الاسلام ہونے کو پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن اول تو یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ تاہم اگر مختلف مستند اقوال کو یکجا جمع کرنے سے کوئی یقینی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ تو وہ صرف یہ ہے کہ آپ نوجوانوں میں سب سے پہلے مسلمان تھے۔

بہرحال اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ آپ سب سے پہلے ہی اسلام لائے۔ تب بھی یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ محض اس کی وجہ سے آپ کو دیگر تمام صحابہ سے افضل قرار دیا جائے۔ اس لئے کہ گو اس میں اختلاف ہے کہ اسلام لانے کے وقت آپ کی عمر کیا تھی۔ لیکن جس روایت میں سب سے زیادہ عمر بتلائی گئی ہے وہ سولہ برس ہے۔ اگر اسی روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔

۱؎ - صحیح بخاری۔ کتاب فضائل اصحاب النبی۔

تب بھی یہ عمر وہ ہے جب انسان میں عقل و شعور کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے۔ اور بہت جلد نئی باتوں پر یقین کر لیتا ہے۔ اور اس لئے اگرچہ حضرت علی کی مذہبی رفعت شان اور جلالت و مرتبت میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن مقابلۃً اُن کے اسلام کو حضرت ابوبکر و حضرت عمر جیسے پختہ کار شرفائے قریش کے اسلام کے مقابلہ میں زیادہ قابلِ اہمیت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اس کے علاوہ دوسرا سبب جس کی بناء پر ان کی یہ سابقت فی الاسلام مقابلۃً اتنی اہم نہیں رہتی جتنی بیان کی جاتی ہے۔ یہ ہے کہ وہ رسول کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ اور اس لئے ظاہر ہے کہ ان کی اس "سابقت ایمانی" میں قریبی عزیز ہونے کی وجہ سے "وصول الی الحق" کا وہ بے لوث جذبہ کارفرما نہیں ہو سکتا جو ابوبکر و عمر جیسے غیر متعلق اشخاص میں پایا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں رسول کے بھائی ہونے کی وجہ سے قدرتی طور پر رسول کا پیغام سب سے پہلے آپ کے کانوں تک پہنچا ہوگا۔ پھر اس کو حُسنِ اتفاق کی مثال کہیں تو کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اس میں فخر کی کوئی بات نہیں۔ فخر البتہ یہ ہے کہ رسول کا پیغام سنتے ہی فوراً "آمنا" کہہ دیا جائے۔ حقیقتاً حضرت علی کو یہ فخر پہنچتا ہے۔ لیکن اس میں حضرت ابوبکر بھی برابر کے شریک ہیں۔

ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا:۔
"اِنَّ هٰذَا اَخِیْ وَ وَصِیِّیْ وَ خَلِیْفَتِیْ فِیْکُمْ"

لیکن اس سے خلافتِ علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار "لیڈر" سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقعہ کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہیے۔ کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ان کو اس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے۔

پھر جو طبقہ حضرت علی کی اُلوہی امامت کا قائل ہے وہ اسی طرح حضرت حسن کی اُلوہی امامت کو بھی مانتا ہے۔ اگر اس عقیدہ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو پھر میں پوچھتا ہوں کہ امام حسن کے اس "انتقام" کو سامنے رکھتے ہوئے جو آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے لیا۔ اُن کی اخلاقی فضیلت کا کیا معیار قائم کیا جائیگا؟ [1]

میں اس سلسلہ میں زیادہ تفصیلی بحث کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اتنا اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ "شیعیت" کی جانب سے حضرت علی کی الہامی امامت کو ثابت کرنے کے لئے جتنے دلائل پیش کئے جاتے ہیں وہ حقیقتاً اسلام کے بنیادی اصول سے کوئی دور کا تعلق بھی نہیں رکھتے۔ اس جھگڑے کا آغاز محض بعض مقامی پیچیدگیوں سے ہوا تھا۔ جن کو اسوقت کامیاب

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ الکامل للمبرد جلد سوم مطبوعہ مصر صفحہ ۱۱۶۔

بنانے کی خاطر مذہبی رنگ دیا گیا - اور جن کو اب غلطی سے مستقل مذہبی عقائد میں داخل کر لیا گیا -

عربوں کی فطری "خاندانی عصبیت" کے ماتحت نبی کریم کی وفات کے بعد بنو ہاشم کے ہر فرد نے اپنے موروثی جذبہ کے ماتحت اپنے خاندان کے ایک ممتاز فرد کو خلافت کا مستحق سمجھا اور اس کے لئے انہوں نے حضرت علیؑ کا نام پیش کیا - اس میں ان کو ناکامی ہوئی - پھر خلافتِ راشدہ کے ختم ہوتے ہی بدقسمتی سے حضرت معاویہ نے جس سلطنت کی بنیادیں دمشق میں استوار کیں - وہ خالص "بدوانہ" ذہنیت رکھتی تھی - ایران ہمیشہ سے ایک بلند اور مہذب حکومت رہی ہے - جنہوں نے ہمیشہ عربوں کو اپنے سے فروتر سمجھا ہے - لیکن جب اسلامی فتوحات نے ایران کو دمشق کے پایۂ تخت سے متعلق کر دیا - تو اہلِ ایران کی عیرتِ قومی اور حمیتِ ملی کے لئے یہ چیز سخت ناقابلِ برداشت تھی کہ وہ عربوں کے جور و استبداد کے سامنے اپنی گردنوں کو خم ہوتا دیکھیں[1] گو وہ زمانہ کی ناسازگاری کے ہاتھوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو واپس نہیں لے سکتے تھے - لیکن اپنے جذبات کے ماتحت عربوں سے انتقام لینے کے معمولی سے معمولی موقعہ کے منتظر تھے - اسلام نے خلافت کے مسئلہ میں جس بلند معیار کو قائم کر دیا تھا وہ اگر چالیسویں صدی ہجری میں حضرت علی کی شہادت کے بعد معاویہ کے بیرحم ہاتھوں سے تباہ نہ ہو چکا ہوتا تو وہ وقت کی ضروریات کے ماتحت مختلف ارتقائی دوروں سے گذرنے کے بعد آج دُنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ جمہوریت کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتا - لیکن خلافت کے مسئلہ میں اس "انتخابی نظام" سے دُنیا قریب قریب ناواقف تھی - ایران میں "وراثت" کا قانون نافذ تھا - انہوں نے عربوں سے بدلہ لینے کا یہ بہت اچھا موقعہ دیکھا - کہ حضرت علی کی الہامی نبوّت کی آڑ میں خاندانِ اموی کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیں - چنانچہ بالآخر ۹ - جون ۷۴۷ء کی صبح کو خراساں کے ایک گوشہ سے ابومسلم نے عباسیوں کا سیاہ جھنڈا بلند کر دیا - اور گو عباسیوں کے دَورِ حکومت میں ایران پوری طرح مطمئن نہ ہو سکا - لیکن جب چنگیز خاں کے حملہ کے بعد ایران میں ایک مستقل خود مختار حکومت کی بنیاد قائم ہوئی تو ایرانیوں کو دل کے پھپھولے پھوڑنے کا کافی موقعہ ملا - چنانچہ خاندانِ صفویہ اٹھا اور اس نے صحیح معنوں میں عربوں سے اس طرح انتقام لیا کہ سارے ملک کو بنوکِ شمشیر شیعیت کے رنگ میں رنگ دیا -

یہی حال عبداللہ ابن میمون القدّاح کی اس عظیم الشان تاریخی سازش کا ہے جس کے بعد مصر میں تقریباً دو سو برس تک بنو فاطمہ کے جھنڈوں کے نیچے شیعیت پرورش پاتی رہی -[2]

---

[1] اس سلسلہ میں فردوسی کے مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ فرمایئے - جو بتلاتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے باوجود جب قومی اور ملّی جذبہ کے ماتحت وہ ایرانیوں کے مقابلہ میں عربوں کا ذکر کرتا ہے تو کتنا "پُرشور" نظر آتا ہے :-

زشیر شتر خوردن و سوسمار — عرب را بجائے رسید است کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو — تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

[2] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: مسلم تھیالوجی مصنفہ میکڈانلڈ -

المختصر ان واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت محتاجِ تشریح نہیں رہتی کہ خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہے جو آج درخورِ اعتنا کہا جا سکے - اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ - فقط

سید ابو سعید بزمی بھوپالی - بی اے

(نگار) :- "ہرنام" کے مضمون "مسئلہ خلافت و امامت" کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے - بعض نے نہایت سطحی و معمولی - بعض نے ایک حد تک تحقیقی و استدلالی - لیکن اس وقت تک کوئی مقالہ ایسا وصول نہیں ہوا - جس میں تمام جزئیات سے اسی تفصیل و ترتیب سے بحث کی گئی ہو جو ہرنام صاحب کے مضمون میں پائی جاتی ہے - بہرحال ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں - مقالہ نگار نہ صرف انگریزی کے فاضل ہیں - بلکہ عربی علوم کے بھی فارغ التحصیل طالب علم ہیں - میں نے "مولوی" اس لئے نہیں کہا کہ اسوقت تک ان میں وہ جراثیم پیدا نہیں ہوئے ہیں جو ایک انسان کو اس اعجوبہ روزگار چیز میں تبدیل کر دیتے ہیں جس کو اگر ہم "مولوی" کے علاوہ کسی اور نام سے پکاریں تو نہ اس کی ہیئت ظاہری سمجھ میں آسکتی ہے اور نہ اسکا بطون ———— لیکن بہرحال ایک پابند مذہب شخص ہیں - اور گروہ اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں - اس لئے ظاہر ہے کہ وہ ایک شخص ثالث کی حیثیت سے اس پر گفتگو کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے - کیونکہ اس نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کو دیکھنا شیعہ و سنی دونوں کو پسند نہیں آسکتا - بہرحال اس مضمون میں جس اصول کو سامنے رکھا گیا ہے وہ بھی مسئلہ خلافت پر کافی روشنی ڈالنے والا ہے - اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کرینگے اور سب سے آخر میں اپنی رائے پیش کرینگے -

آئندہ اگر کوئی اور صاحب اس مسئلہ پر لکھنا شروع کریں تو انھیں ہرنام کا مضمون پڑھ کر یہ غور کر لینا چاہئے کہ اس کے استدلال کی بنیاد کن امور پر ہے - یعنی ایک یہ کہ جو روایات انھوں نے اہل سنت کی کتابوں سے پیش کی ہیں وہ واقعی ان کتابوں میں پائی جاتی ہیں یا نہیں - اور دوسرے یہ کہ ان واقعات و روایات سے وہی نتیجہ نکلتا ہے یا نہیں جو ہرنام نے پیدا کیا ہے - اگر نتیجہ واقعی وہی نکلتا ہے اور روایات بھی اہل سنت کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ وہ روایات صحیح ہیں یا نہیں - اور اگر صحیح نہیں ہیں تو اکابر اہل سنت نے کیوں ان کو اختیار کیا - یہ تو بحث کا وہ ضروری پہلو ہے جس کو ترک کیا ہی نہیں جا سکتا - اب رہا مسئلہ کا نفسیاتی پہلو سو اس کو وہی شخص چھو سکتا ہے جو دونوں جماعتوں میں سے کسی سے تعلق نہ رکھتا ہو - سو اس کو مجھ پر چھوڑ دیجئے -

نیاز

آفتاب کی کرشمہ سازیاں

آبشاروں کا نظارہ کرنے والے مثلثی شیشوں کے دیکھنے والے اس امر کی شہادت دے سکتے ہیں کہ آسمان پر دکھلائی دینے سے پہلے نہ معلوم کتنے قوس قزح ان کی نگاہوں سے گذر چکے ہیں۔ لیکن پچھلے زمانہ میں انسان ترقی و تہذیب کے میدان میں بچہ کی طرح تھا اس لئے اسکا یہ خیال کہ:۔

"قوس قزح فی الاصل وہ راستہ ہے جس پر سے مرنیوالوں کی روحیں ملائے اعلیٰ کی طرف جاتی ہیں"

اس کی تسکین کے لئے کافی تھا۔ اس کے بعد یہ دیکھ کر کہ وہ بارش کے موسم ہی میں اکثر دکھائی دیتی ہے۔ اُس نے اپنا خیال کسی قدر بدلا اور یہ کہنا شروع کیا کہ:۔

"قوس قزح کا نمود پیغام الٰہی ہے کہ اب بارش نہ ہوگی"

لیکن یہ خیال صرف اس ملک کے انسانوں میں پیدا ہوا۔ جہاں وقت بے وقت بارش ہوا کرتی تھی۔ یا جہاں بارش کثرت سے ہوتی تھی۔ مگر شعریت پسند یونانیوں کا خیال دوسرا تھا۔ ان کے خیال میں "قوس قزح اصل میں وہ راستہ تھا۔ جس پر سے خدا کے پیغامبر گذرا کرتے تھے"!

جب ارسطو نے اس قسم کے خیالات کو سنا تو بول اٹھا کہ "یہ شاعرانہ اعتبارات ہیں ورنہ قوس قزح روشنی۔ نمی اور قطرات آب کے امتزاج کا دوسرا نام ہے"

مگر اسکا بیان دُنیا کے لئے ناقابلِ قبول ٹھہرا۔ کیونکہ روشنی و رنگ کا تجربہ اس وقت تک ناممکن تھا۔ اور لوگوں نے گذشتہ اقوال ہی پر اعتبار کرنا مناسب سمجھا۔

کہا جاتا ہے کہ چودھویں صدی میں ایک عظیم المرتبہ راہب کو قوس قزح کا صحیح علم ہوگیا تھا۔ مگر یہ خیال صرف عقیدۃً تھا۔ ورنہ تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ اندلس میں الدغل نے اس سے بہت پہلے قوس قزح کی عقدہ کشائی کردی تھی۔ اور اپنی تحقیقات سے یورپ کو آشنا کردیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ باوجود اس خیال کے موجود ہونے کے کہ:

"جہاں قوس قزح کی کمان ختم ہوتی ہے۔ اگر کوئی پہنچ جائے تو اس کو ایک سونے کا پیالہ ملیگا"

اسحاق نیوٹن وغیرہ تجزیہ رنگ میں مصروف تھے۔ جس کا نتیجہ مابعد زمانہ میں یہ نکلا کہ شاعرانہ خیال میں سرگرم رہنے والے اپنی جگہ رہ گئے اور تحقیقات کرنے والوں نے وہ جواہرات حاصل کر لیئے جو قوس کے رنگین طول وعرض میں پوشیدہ تھے۔ اور تمام دُنیا کو سمجھانے کے لئے یہ مثال پیش کی کہ:۔

"فرض کرو ایک مقابلہ کی دوڑ کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ میدان کے وسط میں ایک "قوس نما" لوہے کی کمان اس طرح بنائی جائے کہ سب سے چھوٹا آدمی اس میں سے آسانی سے گذر جائے اور تمام دوڑنے والوں کے لیئے یہ شرط ہو کہ ان کی وردیاں قد کے لحاظ سے الگ الگ رنگ کی ہوں۔ یعنی سب سے چھوٹے آدمی کی بیجنی یا نیلی ہو۔ متوسط کی پیلی اور قدآور کی سُرخ۔ اور جو سب سے پہلے "حلقہ قوس" سے گذر جائے وہ قابل انعام ٹھہرے۔"

اس شرط کے بعد دوڑ شروع ہو۔ تم غور کر سکتے ہو کہ اس دوڑ کا کیا رنگ ہوگا۔ تمام دوڑنے والے حلقہ مذکور سے گذر جانے کے لئے دوڑینگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وردیوں کے اختلاط سے جو لہر رونما ہوگی وہ قوس قزح کی مکمل تصویر تو نہیں۔ لیکن دُھندلا سا خاکہ ضرور پیدا کر دے گی۔

مشاہدات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب قوس قزح کی طرف دیکھا جائیگا تو سورج عقب میں ضرور ہوگا۔ جس کی شعاعوں کو ابخرات آلودہ ہوا سے گزرنا ہوتا ہے۔ مگر پانی کی بے شمار باریک باریک بوندیں ان کو روکتی ہیں۔ مگر وہ ان سے لڑ بھڑ کر ہماری نگاہوں تک پہنچ ہی جاتی ہیں۔ اس تصادم کی وجہ سے جو لہر پیدا ہوتی ہے وہ شعاعوں کا عکس حاصل کر کے قوس قزح کا دائرہ بنا دیتی ہے

موجودہ تحقیقات سے یہ بات مان لی گئی ہے کہ سفید رنگ (اگر اسکو رنگ کہہ سکتے ہیں) تو ایسا رنگ ہے۔ جو تمام رنگوں پر محیط ہے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ تھوڑی سے تھوڑی روشنی بھی چھوٹی اور بڑی لہروں پر مشتمل ہوتی ہے جن میں سے ہر ایک لہر جب نگاہ تک پہنچتی ہے۔ تو قوس رنگین بن جایا کرتی ہے۔ اسی کو "شکستگی نور" اور "انعکاس رنگین" بھی کہہ سکتے ہیں۔

بعض وقت جب روشنی کو قدرے کثیف فضا سے گذرنا پڑتا ہے تو چھوٹی کرنیں بیجنی رنگ لئے ہوتی ہیں۔ اور پہلے گذر جاتی ہیں۔ سب سے بڑی کرنیں جو نگاہوں کو سُرخ معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں گذرتی ہیں۔ انھیں تبدیلیوں کا دوسرا نام مشرقی ممالک میں غروب آفتاب کے وقت شفق ہے۔ اور مغربی ممالک میں "شعلہ سما"۔

اسی طرح اور بالکل اسی طرح ابخرات آلودہ ہواؤں میں ننھی ننھی بُوندیوں کے اثر سے تبدیلیاں بھی ہوتی ہیں۔ بعض تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم آسمان کو نیلگوں کہتے ہیں۔ اور بعض کی وجہ سے قوس قزح کے متعدد دائرے نظر آنے لگتے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ:۔

"جب ابخرات آلودہ ہواؤں سے شعاع گذرتی ہے تو وہ ذرات ہوا جو بوندوں سے بڑے ہوتے ہیں اُن نیلی شعاعی لہروں کو جذب کرکے ہماری نگاہوں تک واپس کر دیتے ہیں ۔ اور اسی وجہ سے ہم کہتے ہیں کہ آسمان نیلگوں ہے۔"

بجنسہ جب پانی کی بوندیں شعاعی لہروں کو روک کے اُن کے زاویہ خاص سے منعطف کر دیتی ہیں ۔ اور بلحاظ طول و عرض ان کو ہماری نگاہوں تک واپس کر دیتی ہیں ۔ اگر روشنی کی قوت زیادہ ہوتی ہے تو قوس قزح کا ایک دوسرا دائرہ مرکزی دائرے کے نیچے بن جاتا ہے ۔ اسی طرح "کرشمہ نور" کی نیرنگیوں کی بدولت ایک سے زیادہ دائرے بن سکتے ہیں ۔

ان کو الف کی موجودگی میں قوس کی رنگین کمان تک پہنچکر "سونے کا پیالہ" حاصل کرنا بالکل بے معنی ہے ۔ کیونکہ اسکا وجود ہے ۔ لیکن اس کی کوئی انتہا نہیں ۔ اس لئے کہ ہم سے کچھ فاصلہ پر ابخرات آلود ہواؤں کا وجود ممکن اور اس سے روشنیوں کا گذرتے رہنا یقینی ہے ۔ پس قوس پر قوس کی رنگینیوں کا بننے اور بگڑتے رہنا بھی لازمی ہے ۔

قوس قزح کی طرح ہالوں کا بھی وجود ہے ۔ جو "شکستگی نور" کی وجہ سے سورج ۔ چاند اور دیگر بڑے ستاروں کے گرد دیکھے جاتے ہیں ۔ لیکن ہالۂ قمر کا سمجھ لینا بہ نسبت سورج یا دیگر ہالوں کے مشکل نہیں ہے ۔ کیونکہ ہالۂ قمر کی مثال کہر والی راتوں میں ان قندیلوں کے گرد مل سکتی ہے جو سڑکوں کے کناروں پر جلتی ہیں ۔ لیکن ہالہ جب متشکل ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ پانی کی بوندیں روشنی کو روکتی ہوں ۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ یہی بوندیں روشنی کو منتشر بھی کر دیتی ہیں ۔ اور منعکس بھی ۔ منتشر اس طرح کہ بوندیں جس قدر طول و عرض میں خود منتشر ہوتی ہیں اسی قدر "جذب نور" میں انتشار و بُعد پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور منعکس اس طرح کہ بوندیں اپنی شفاف آغوش میں شعاعوں کو جذب کرتی ہیں جس سے بالکل اسی طرح انعکاس پیدا ہو جاتا ہے ۔ جیسے آئینہ کو سورج کے سامنے رکھ کر کسی اور طرف عکس ڈالتے وقت رونما ہوتا ہے ۔

جہاز ران چاند کے ہالوں کو دیکھ کر طوفان یا بارش کی آمد کا خیال کرتے ہیں ۔ کیونکہ چاند اپنی منتشر روشنی کے ذریعہ اُن پانی کی بوندوں کو خبر دیتا ہے ۔ جو بادلوں کے بننے سے پہلے ہوا میں پوشیدہ رہتی ہیں ۔

"شکستگی نور" ہی کی وجہ سے سورج کے گرد بھی ہالوں کا وجود موسم سرما میں نظر آتا ہے ۔ کیونکہ اس موسم میں چھوٹے چھوٹے برف کے ذرات یا منجمد آبی قطرے فضا میں موجود رہتے ہیں ۔ موسم گرما میں ان کا وجود کمیاب ہوتا ہے ۔ لیکن سورج کے ہالوں کا معائنہ بغیر کسی آلۂ شعاعی کے بہت مشکل ہے ۔

ہالوں کے علاوہ فضا میں ایک اور چیز موجود پائی جاتی ہے جسکو "گرد رقصاں" کہہ سکتے ہیں ۔ اور یہ بھی شکستگی شعاع کا ایک کرشمہ ہے ۔ اس "گرد رقصاں" کی وجہ سے بھی بہت سے ہالوں کا وجود ہوتا ہے چنانچہ ۱۸۸۳ء میں جب کراکٹو (Krakatoa) کوہ آتش فشاں کے پھٹنے کی وجہ سے کئی ہفتہ تک گرد سے فضا تاریک رہی تو بہت سے رنگین حلقے سورج کے گرد دیکھے گئے ۔ اس قسم کے حلقوں کو ازمنۂ ماضی میں شگون بد سے تعبیر کیا جاتا تھا ۔ اور اب بھی کسی حد تک اسکا خیال عوام میں باقی ہے ۔ لیکن سنجیدہ طبقہ اب ان نشانات و ارتسامات کو فضا و نور کے معصوم کھیل کے سوا کچھ نہیں تصور کرتا ۔

حافظ ۔ غازی پوری

باب المراسلۃ والمناظرہ

اختر ریحانہ کی آپ بیتی

نیاز صاحب، تسلیم!

مئی کے نگار میں آپکا نوٹ پڑھا۔ آپ لکھتے ہیں "اختر ریحانہ سے" لیکن اس کے فوراً ہی بعد "جناب ابو رشید صاحب سے" سوچتی رہی کہ ایک طرف تو یہ طرزِ خطاب اور دوسری طرف ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو مجھ سے ہمدردی نہ رکھتا ہو! حیرت!! خیر۔ مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ جبکہ میری زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہیں جو اسی قسم کے متضاد تجربات سے خالی ہوں۔

نیاز صاحب! آپ کی تحریر سے ایک خاص قسم کا عتاب ٹپکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں کیوں آپ کے لئے وجہ تغضب بنی۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے لیکن خدا کی قسم میں نے آپکو جو کچھ لکھا تھا وہ صرف میرے دل کی تڑپ تھی۔ جو بے ساختہ قلم سے نکل پڑی تھی۔ میرے فرشتوں کو بھی یہ گمان نہ تھا کہ آپ اسے شائع کر دینگے۔ مجھے اب تک اسکا قلق ہے لیکن کیا کروں۔ زندگی میں اگر ایسی حماقتیں سرزد نہ ہوں تو قسمت کو کون روئے۔

نیاز صاحب! آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنا نقاب چاک کر کے دوسری جنس کو تلافی کا موقع دوں۔ لیکن خدارا مجھے یہ بتلا دیجئے۔ کہ کیا ان "ہمدردوں" کے لئے ہندوستان کے سولہ کروڑ کمزور بے زبان مخلوق میں صرف ایک اختر ریحانہ ہی ہمدردی کی مستحق رہ گئی ہے۔ للہ ان سے پوچھئے کہ وہ اپنے شہر۔ اپنے محلے۔ اور اپنے گھر میں اُن بیسیوں تڑپتی ہوئی لاشوں کی طرف نظر کیوں نہیں کرتے جو صرف انھیں کی بے اعتنائیوں اور کم نگاہیوں کا شکار بنی موت کی سسکیاں لے رہی ہیں۔؟ ——— وہ ہزاروں شوہر جنھوں نے اپنی نظرِ التفات کا جائز یا ناجائز مرکز دوسری عورت کو بنا کر ایک معصوم مورتی کو رُلا رکھا ہے۔

وہ بے شمار نوجوان جو سینکڑوں جھوٹے وعدوں کیساتھ عورت کا سب کچھ لوٹ کر بے اعتنائی کے ساتھ احباب کی مجلسوں میں بیٹھے سرگرم عشرت ہیں۔ وہ ہزاروں "بلند ذوق" لڑکے جو مقصود حاصل کرنیکے بعد والدین کی اطاعت اور اخلاق کی پاکیزگی کی آڑ میں اپنے شکار کو تڑپتا چھوڑ چکے ہیں۔ وہ بیسیوں بلند حوصلہ طلبہ جو ادیبانہ انداز سے تقریر و تحریر میں اپنے ایمان کو لوٹ چکنے کے بعد "تعلیمی مشغولیت" کے پردے میں شادی سے ہمیشہ کے لئے انکار کر چکے ہیں —— ہاں تو یہ سوسائٹی کے "ہونہار سپوت" اگر تلافی کے خواہاں ہیں تو اٹھ کر اپنی غلطیوں کا جائزہ کیوں نہیں لیتے؟

نیاز صاحب! میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں۔ لیکن قاضی عبد الغفار صاحب کی "لیلیٰ" کی طرح اس لئے نہیں کہ میں کسی ایک مرد سے متعلق ہو کر کئی بچوں کی ماں کیوں نہ بنی۔ بلکہ صرف اس لئے کہ آخر یہ مرد مجھے اپنی طرح کا انسان کیوں نہیں سمجھتے؟

نیاز صاحب! کتنے ہیں ایسے ادیب۔ انشا پرداز۔ لیڈر۔ ایڈیٹر۔ اور اخبار نویس جو پند و نصائح کے دفتر کے دفتر دن رات کھولتے رہتے ہیں۔ جو بلند سے بلند سوسائٹی کے مہذب رکن بنے پھرتے ہیں۔ جو لوگوں کی نظروں میں عزیز ہیں۔ حالانکہ ان کے چنگل کا ہر ناخن بے گناہ لڑکیوں کے خون سے رنگین ہے۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی فعل ہے۔ جو ان کے لیڈرانہ فرائض سے علیحدہ ہے۔ ان کی ان دونوں زندگیوں کو نہ ملاؤ۔ مجھے اس کلیہ کے ماننے میں کوئی تامل نہیں ہے۔ لیکن للہ جب اس کے ماتحت مردوں کو سوسائٹی کے طعن سے نجات مل سکتی ہے۔ مولانا عبد الماجد کی "مولانائیت" بدستور قائم رہ سکتی ہے۔ مولانا عرفان اور مولانا شوکت علی کی لیڈری میں کوئی فرق نہیں آتا۔ تو پھر کیا اختر ریحانہ کی بہنیں انسان نہیں ہیں۔ کہ میونسپلٹی کے قوانین۔ پولیس کے سپاہی۔ تھانیداروں کی قہر آگیں نگاہیں۔ اور لیجسلیٹو اسمبلیوں کے "قوم پرست" اراکین کے "اصلاحی بل" انھیں کے لئے وقف ہوں!

نیاز صاحب! آپ لکھتے ہیں۔ "نگار کے صفحات کو جولا نگاہ عشق نہیں بنایا جا سکتا"۔ یعنی؟ کیا یہ نگاہ گرم مجھ پر ہے؟ حیرت!! کیا آپ کے نزدیک میں اب بھی اتنی نادان ہوں کہ عشق کو نہ سمجھ سکی؟ میرے خیال میں بزمی صاحب نے اپنے مضمون میں جو سب سے بڑی چیز چھوڑ دی ہے وہ یہی ہے کہ —— لوگ کسبی کو صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ اسے چند چاندی کے ٹکڑوں اور جھوٹے آنسوؤں سے مرعوب کر کے اپنی کنیز نہیں بنایا جا سکتا۔ اور برخلاف اسکے ایک "معصوم" لڑکی جھوٹی محبت ہی کے فریب میں آکر گردن ڈالدیتی ہے۔

نیاز صاحب! میں کہنا تو نہ معلوم کیا کیا چاہتی ہوں۔ لیکن ڈرتی ہوں —— آپ سے ادیب سے —— اپنی زندگی کا ایک ورق بھیج رہی ہوں۔ اس کے بعد آپ مجھے مُردہ سمجھیں۔ استفسار حال کرنے والے

"ہمدرد" میری تلاش میں سرگرداں نہ ہوں —— دنیا کے کسی گوشہ میں پڑی اپنی لاکھوں بہنوں کی طرح زندگی کے دن کاٹ رہی ہوں۔ کاش برقی صاحب اس ٹوٹے ہوئے ساز پر مضراب نہ لگاتے۔

اختر ریحانہ کی زندگی کا ایک ورق

مجھے اُن سے شرم آتی تھی۔ میں ان سے چھپی چھپی پھرتی تھی۔ مگر جب ان کو موقع ملتا وہ میری کتاب میں خط چھپا جاتے۔ آخر میری خاموشی کو دیکھ کر ایک دن ایک مختصر سا پرچہ رات کو سوتے وقت وہ میرے پاس پھینک گئے۔ لکھا تھا "جب میری زندگی کی بہار مجھ سے بیزار ہے۔ میری تمناؤں کی دیوی مجھ سے کنارہ کش ہے۔ تو پھر میں کیوں زندہ رہوں۔ صبح آپ میری لاش دیکھیں گی"۔ مجھے اس وقت کیا خبر تھی کہ اس قسم کے دعوے محض مکر و فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میں گھبرا کر اٹھی۔ کمرہ میں ٹہلتی رہی۔ پھر چپکے چپکے ان کے کمرہ کی طرف گئی۔ وہ کرسی پر سر پکڑے بیٹھے تھے۔ میں واپس چلی آئی۔ کئی دفعہ گئی اور واپس آگئی۔ بالآخر بارہ بجے کے قریب میں دل سخت کر کے ان کے کمرہ میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "کیا ارادہ ہے؟" اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ کھڑے ہو گئے۔ ایک کاغذ کھول کر کہنے لگے "سنکھیا ہے۔ ریحانہ تم سمجھتی ہو گی ...." بہت سے ادیبانہ جملے دُہراتے رہے۔ میں دم بخود میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ اٹھے۔ کواڑ بند کیے اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے۔ "میری معبودہ ...." میں بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ ان کی ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ بالآخر .... میں واپس آئی تو اپنی کائنات انھیں سونپ چکی تھی۔

لیکن چند دن بعد ہی مجھے دُنیا بدلتی نظر آنے لگی۔ مجھے ان کے طرزِ عمل پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی لیکن انہوں نے بات ٹال دی۔ لیکن جب میں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تو میرا دماغ کھولنے لگا۔ میں نے اُن سے شکایت کی۔ بولے۔ "یہ زندگی کی رومانیت ہے۔ تم مجھ سے بدگمان کیوں ہوتی ہو"۔ لیکن اب آندھی اُتر چکی تھی۔ بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے تھے۔

...... میں نے اس زندگی کو چھوڑا یا اس نے مجھے۔ یہ ایک لچر سی گفتگو ہے۔ لیکن ہاں مجھے اس حادثہ کی خبر نہ تھی۔ اس دن ۔۔ "صاحب" سے سخت گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن تھانیدار صاحب تشریف لائے۔ فرمانے لگے۔ "آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں اس وقت تک جواب دینا نہیں چاہتی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتلا دیں کہ آپ کے اس سوال کا

مدعا کیا ہے"؟

بولے۔ "میں پوچھتا ہوں تم کون ہو۔ کہاں سے آئی ہو۔ تمہارے ساتھ کون ہے"؟

اُس نے سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ اس کی آواز میں بتدریج خشونت پیدا ہو چلی تھی۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا۔ میں نے سمجھا شاید میری موت کی ساعت قریب آگئی ہے۔ میں سکتے کے عالم میں اسکا مُنہ تکنے لگی۔ وہ پھر بولا:۔

"اچھا عیاشی کرنا ہے تو"........ "میں جاؤ۔ یہاں رنڈیاں نہیں رہ سکتیں۔ چوبیس گھنٹے میں یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ کوتوالی میں بیٹھی نظر آؤ گی"۔

میرے حواس گم ہو گئے۔ میرے لئے زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح ڈانٹی جاؤں۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "لیکن آپ مجھے سمجھ کیا رہے ہیں"؟

بولا۔ "جو کچھ آپ ہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ میں نے جو کچھ کہدیا ہے اس سے آپ کیلئے مفر نہیں ہے"۔

اس کے بعد میں نے پہلی ٹرین سے "ب" کو تو ضرور چھوڑ دیا۔ لیکن میرے لئے غور و فکر کی ایک بالکل نئی شاہراہ کھُل گئی۔ راستہ بھر اسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہی کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ سوچتی تھی کہ آج یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ بھی علانیہ طور پر اپنی متاع کو بازار میں نہیں چُنا۔ لیکن پھر بھی میرے اُوپر یہ عتاب۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے کہا "دُنیا کے بڑے بڑے انسان غیر شادی شدہ ہیں"۔ بولے "مگر عورت کے لئے یہ جائز نہیں"۔ میں نے کہا "کیوں"؟ بولے "اسی لئے کہ وہ عورت ہے"۔ میں نے کہا۔ "تو عورت کا سب سے بڑا جرم اسکا عورت ہونا ہے"؟ بولے "ہاں"۔

اس پر میں کیا کہتی۔ وہ خفا ہو کر چلے گئے۔ اور میں دیر تک سناٹے میں بیٹھی رہی۔

اختر ریحانہ

نگار) آپ نے جن واقعات و حالات کو اپنے "ورقِ زندگی" کے نام سے پیش کیا ہے۔ اُن کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں کہنا سوائے اس کے کہ اگر آپ کی موجودہ معاشرت و معیشت حقیقتاً نتیجہ ہے اس اوّلین فریب کا جو جھوٹی محبت کے جھوٹے آنسوؤں کے پردہ میں آپ کو دیا گیا تو میں کیا ساری دُنیا کو آپ سے ہمدردی ہوگی۔ درآنحالیکہ دُنیا میں ایسے واقعات بھی مل سکتے ہیں کہ مرد نے جس عورت کو گلے کا ہار بنایا اسی نے ناگن بن کر اُس کو ڈس لیا۔ لیکن سوال اس وقت تو صرف یہ ہے کہ اب جبکہ اپنی موجودہ زندگی کی تلخیوں کو آپ اچھی طرح محسوس کر رہی ہیں۔ کیوں اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں؟ اگر اس سے مقصود مرد سے انتقام ہی لینا ہے۔ تو مجبوری ہے۔ ورنہ محض سوسائٹی کے رسم و رواج کو بہانہ بنانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہزاروں

یہ رواج اس سے قبل ٹوٹا جا چکا ہے - اور آیندہ بھی برابر ٹوٹتا رہیگا - اگر واقعی کوئی عورت محبت کا سچا رشتہ جوڑنے کیلئے تیار ہے، رہا آپکا تلخ تجربہ سو دنیا میں یہ کوئی نیا تجربہ نہیں - عورتوں سے پوچھئے تو وہ سو مثالیں اس کی مردوں میں سے پیش کردینگی - اور مرد سے دریافت کیجئے تو وہ بھی ہزاروں مثالیں عورتوں سے پیش کردیگا - لیکن باینہمہ استواری عہد وفا کا خیال دنیا سے مٹ نہیں سکتا - اور مٹے کیونکر جبکہ آپکا مجھ سے کٹکر کسی دوسرے سے مل جانا اسکا امکان بھی رکھتا ہے کہ آپ پھر اس سے کٹکر مجھ سے مل رہیں ؎

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی   بیا کہ عہد وفا نیست استوار، بیا

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی اذیت و تکلیف کو بہت زیادہ اہم سمجھتا ہے - اور کبھی اس بات کو نہیں دیکھتا کہ دنیا کا کوئی تلخ واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تلخ تر کوئی اور پہلے نہ گذر چکا ہو - قدرت کا ترکش تیروں سے بھرا ہوا ہے - اور اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کون تیر کتنا سم آلود ہے - آنکھ بند ہے اور تیر پر تیر چٹکیوں سے چھوڑے جاتے ہیں - پھر یہ بھی اتفاق ہے کہ جس کو واقعی بہت زیادہ تڑپنا چاہئے - اس کو وہ صرف چھوتے ہوئے گذر جاتا ہے - اور جو یونہی پہلے سے خراب و خستہ ہے اسکا دل چھلنی کرکے رکھ دیتے ہیں - الغرض یہ ضرور نہیں کہ آپ کا دل سچی محبت کا طلبگار ہو تو اس کو مکر و فریب سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑے اور میں کہ یکسر مکر و فریب ہوں - مجھے کوئی سچی محبت کرنیوالے کبھی ملے ہی نہیں - اس لئے اگر واقعی آپکو کسی مرد کی بیوفائی کی طرف سے سخت صدمہ پہنچا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ مرد کی پوری جنس کو ایسا ہی نامعقول سمجھنے لگیں - کیونکہ اگر اس قسم کی دلیل سے کام لیا گیا تو پھر مردوں کو بھی عورت کی تمام صنف کو مکار و بیوفا سمجھنے کا حق حاصل ہوگا - درآنحالیکہ آپ اور وہ دونوں ایسا سمجھنے میں غلطی کرینگے -

ہر چند یہ ایک حد تک درست ہے کہ عورت کی لغزش کو ایک مرد مشکل سے معاف کرتا ہے - اور خود اپنی لغزش کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اسے بھلادے - گوارا کرلے - لیکن اگر آپ غور کرینگی تو معلوم ہوگا کہ مرد کا تفوق اسی کا مقتضی ہے اور مظلوم کا احتجاج ایک ظالم کیخلاف ہمیشہ بے معنی ہوا کرتا ہے - میں یہ نہیں کہتا کہ مرد کا یہ سلوک عورت کیساتھ درست ہے - لیکن وہ درست ہو یا نادرست اسکا علاج عورت کے پاس کچھ نہیں - اور اسے یہ تمام مظالم برداشت کرنا پڑینگے - جب تک وہ ہر چیز میں مرد کے برابر نہ ہوجائے - اور مرد سے بے نیاز ہوکر وہ دنیا میں اتنی ہی ترقی نہ کرلے جتنی مرد نے کی ہے - خیر یہ تو وہ باتیں ہیں جو خواہ مخواہ آپ کی تحریر کو دیکھکر زبان سے نکل گئیں - اصل مدعا تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے - اور اس میں آپ نے اپنا کیا فائدہ سوچا ہے -

سب سے پہلے تو میں آپ کی اس غلطی کو رفع کرنا چاہتا ہوں کہ ابو رشید کی جس تحریر کا جواب میں نے مئی کے رسالہ میں دیا ہے - اس سے آپکا کوئی تعلق نہیں - وہ ایک بالکل علیحدہ مسئلہ ہے - اور صرف اس لئے کہ باب المراسلۃ میں

آپ کی تحریر کے بعد ہی وہ بھی درج کر دیا گیا۔ آپ کو برہم ہونے کی ضرورت نہیں۔

آپ کو دوسری شکایت یہ ہے کہ میرے جواب میں آپ نے عتاب و سرزنش کا انداز محسوس کیا۔ درآنحالیکہ یہ بالکل خلافِ حقیقت ہے۔ باور کیجئے کہ آپ کیا دُنیا کی ہر عورت خواہ وہ کسی طبقہ و درجہ سے متعلق ہو۔ انفرادی طور پر میری برہمی کے حدود سے بہت بلند ہے۔ اور آجتک میری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گذرا کہ کسی عورت کی طرف سے جذبۂ غضب و انتقام کی پرورش میں نے اپنے دل میں کی ہو۔ میں عورت سے محبت نہیں بلکہ اسکی پرستش کرتا ہوں۔ اور اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ نوعِ انسانی کی نجات صرف عورت ہی کی اصلاح پر منحصر ہے۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ فرطِ تاثر سے کوئی بات ایسی مُنہ سے نکل جائے جسے آپ زیادہ سے زیادہ "واسوخت" کہہ سکیں۔ لیکن غصہ و برہمی کا اظہار تو مجھ سے اس وقت بھی ممکن نہیں جب وہ اوروں کے نزدیک فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کیا تھا جو ہمدردی لوگوں کو پیدا ہوئی ہے آپ اس کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بہتر ہے آپ قبول نہ کیجئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو چیز آپ کو پسند نہیں وہ دُنیا کی اور تمام عورتوں کے لئے کیوں پسند فرماتی ہیں۔ اور آپ کیوں ساری دُنیا کی عورتوں کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے کُڑھ رہی ہیں۔ جبکہ آپ کے یقین ہے کہ نہ مرد کبھی اپنی ریاکاری سے باز آنیوالا ہے اور نہ عورت، باوجود اتنی تعلیم و فراست کے فریبِ محبت میں مبتلا ہونے سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ یاد رکھئے جس وقت تک عورت میں یہ احساس باقی ہے کہ مرد کوئی ایسی چیز بھی دے سکتا ہے جو عورت کے پاس نہیں ہے اور جب تک مرد کو عورت کی اس کمزوری کا علم ہے۔ یہی ہنگامہ قائم رہیگا اور سچ پوچھئے تو کائنات کی رونق اسی پر قائم ہے۔ اگر آج دُنیا میں کوئی مرد یہ کہنے والا باقی نہ رہے کہ "میں تم پر جان دیتا ہوں" اور کسی عورت کی زبان سے یہ سننے میں نہ آئے کہ "میں تمہاری ہوں" تو آپ ہی بتایئے کہ آپ کا جی ایسی خشک دُنیا میں لگ سکتا ہے جہاں صرف پیغمبر ہی پیغمبر بس سکیں۔ رہ گیا سوال مکر و فریب کا۔ دغا یا عدمِ خلوص کا۔ سو اس کے متعلق اب کیا کہوں سوائے اس کے کہ یہ الفاظ بھی ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں۔ اور ہمیں نے ان کو ایک خاص مفہوم دے رکھا ہے۔ ورنہ فطرت کا تو یہ حال ہے کہ اگر وہ ایک قزاق کی خون آلود تلوار کو دیکھ کر قہقہہ لگاتی ہے۔ تو ایک بیکس و مظلوم کی آہ و زاری سنکر بھی مسکرانے سے باز نہیں رہتی۔ ہماری سوسائٹی ہے۔ ہمیں نے کچھ قوانین اسکے وضع کر لئے ہیں۔ پھر اگر ہم ہی ان کو توڑ دیں تو شکایت کی کونسی بات ہے۔ یہ شکست و ریخت۔ یہ تعمیر و تخریب تو برابر اسی طرح جاری رہیگی۔ اور قدرت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ کرۂ ارض میں "کروبیانِ ملاءِ اعلیٰ" کو بسا کر اپنی تفریح کھو بیٹھے۔ اگر وہ "نحن نسبح بحمدک" سے خوش ہوتی تو باوجود اس علم اور پیشین گوئی کے کہ انسان بجز فساد اور خون بہانے کے دُنیا میں اور کچھ نہ کریگا۔ کیوں اس کو دُنیا کی آبادی کے لئے منتخب کرتی۔ آپ کو معلوم ہوگا جب خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجنے کا مقصد ظاہر کیا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ اس کے مستحق تو ہم ہیں۔ جو رات دن تیری حمد و ثناء

میں مشغول رہتے ہیں۔ نہ کہ انسان جو بجز فتنہ و فساد کے کچھ نہ کریگا۔ اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ "اِنّی اعلم ما لا تعلمون" یعنی تم اسکو کیا جانو۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے ــــ معلوم نہیں مفسروں نے اسکو کیا سمجھا۔ اور کیا بیان کیا ہے۔ لیکن میں اس "کیوں" کا مفہوم صرف یہی قرار دیتا ہوں کہ دُنیا کی رونق اور کائنات کی چہل پہل فتنہ و فساد ہی پر قائم ہے۔ معصیت و عدوان ہی سے وابستہ ہے۔ اور "سبوحٌ قدوسٌ" سنتے سنتے شاید خدا کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ "دیکھوں تو سہی مجھ سے سرتابیاں کرنیوالے کیا کیا دلچسپ حرکتیں کرتے ہیں"۔ اور ہو سکتا ہے کہ اپنے عمانِ عفو و کرم کے مقابلہ میں "دریائے معاصی کی تنک آبی" کا تماشہ دیکھنا منظور ہو ــــ بہرحال اگر آپ یہ چاہیں کہ دُنیا میں جتنے مرد ہیں وہ جُنید و بایزید ہو کر رہ جائیں تو ناممکن ہے۔ جبکہ ہر عورت رابعہ بصری ہونے کیلئے تیار نہیں۔ جب تک عورتوں میں کلیوپیٹرا پیدا ہو سکتی ہے۔ ان کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مردوں میں نیرو کی پیدائش پر اعتراض کریں۔ اس لئے یہ شکوہ و شکایت بالکل بیکار بات ہے۔ اگر آپ عورتوں کی مظلومیت کی تلافی مردوں سے چاہتی ہیں تو اسکی ترکیب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے ہاتھ میں تسبیح دیکر رات دن نمازیں پڑھوایا کریں۔ کیونکہ اس بھیس میں وہ بہت زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ عورتوں میں "لقمۂ تر" بننے کی صلاحیت کو کم کریں۔ تاکہ مرد اُن کو آسانی سے نگل نہ سکے۔ اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ یا تو آپ "اخلاق" کا مفہوم بدلکر اسکو اتنا پست و ادنیٰ کردیں کہ عورت بجائے "لقمۂ تر" کے "لقمۂ   " بن جائے اور مرد کے لئے اس میں کوئی دلکشی و دلچسپی باقی نہ رہے۔ یا پھر میدانِ عمل میں آکر اتنی ترقی کرلیں کہ مرد کے ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بٹھادیں اگر یہ زیادہ مشکل ہے تو وہی سہی۔

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ آئندہ آپ کسی قسم کی خط و کتابت نہ کرینگی۔ اور یہ بھی تقاضا ہے کہ آپ کو مُردہ سمجھ لیا جائے۔ سو معاف فرمائیے مجھے اس سے اتفاق نہیں۔ کیونکہ آپ کو مُردہ سمجھنے سے دُنیا کی زندہ دلی ختم ہو جاتی تو بھی خیر کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن جب یہ ہونا نہیں تو پھر کیوں اس شگونِ بد کو گوارا کیا جائے۔ علاوہ اس کے میرے بعض احباب دہلی کے، آپ کی تحریروں میں ادبِ انشاء کی خاص کیفیت محسوس کرتے ہیں اور وہ آسانی سے اپنے صوبہ کے اس فخر کو زائل ہوتے ہوئے منظور نہ کرینگے۔ رہ گیا میں۔ سو ہرچند اس لحاظ سے کہ "دعوتِ آب و ہوا" کی جرأت نہیں رکھتا۔ نہ مستحقِ خطاب ہوں نہ رائے زنی کا اہل۔ تاہم اسکا کیا علاج کہ ہنوز آنکھوں میں دم باقی ہے۔ اور جی یہی چاہتا ہے کہ "ساغر و مینا" کو کم از کم دیکھتا ہی رہوں۔ اگر ان کو ہاتھ سے چھو نہیں سکتا ــــــ چنانچہ، آپ کی تحریر دیکھی تو بے اختیار یہ چند سطریں قلم سے نکل بھی گئیں۔ ورنہ اس عمر میں کہ انسان "حسن و عشق" کی باتوں کو بھی "ریاضی و معاشیات" کے اصول سے دیکھنا چاہتا ہے اور اس موسم میں کہ گرمی نے یکسر دماغ کا توازن درہم و برہم کر رکھا ہے۔ میرے لئے ناممکن تھا کہ تھوڑی دیر کے لئے بھی "قدرِ خود بشناس" کی حد سے گذر کر اُن حدود میں پہنچ جاؤں۔ جہاں کی ہر چیز باوجود آشنا ہونے کے بھی اب نا آشنا سی معلوم ہوتی ہے ــــ پھر اگر آپ کو اتنی رعایت بھی منظور نہیں تو مجبوری ہے۔

ورنہ ضرور، کبھی کبھی اپنے جذبات کے رُجحان سے مطلع فرماتی رہیئے۔ دُنیا سے اس قدر مایوس و متنفر ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ ممکن ہے کوئی ایک ہی شخص آپ کی ہدایت پر عمل کرنے کیلئے تیار ہوجائے۔ اور اسی کے ساتھ مجھ پر بھی خشونت و برہمی کا الزام قائم نہ کیجئے۔ کیونکہ باوجود ویرانیوں کے بھی دل میں ہنوز وہ کیفیت باقی ہے کہ علی الاعلان نہیں تو کم از کم چپکے سے آپ کے کان میں اُس کے متعلق یہ کہنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ:-

خرابہ ایست ولیکن درد ہوائے خوش ست

ایک مطبوعہ کارڈ اس رسالے کے اندر ملفوف ہے

آپکو سوائے اسکے کچھ نہیں کرنا کہ صرف اپنے دستخط ثبت فرما کر ڈاک میں ڈلوا دیجئے - آپکا نمبر خریداری خود ہم نے کارڈ میں درج کر دیا ہے - اگر

مکتوبات نیاز

کی خریداری منظور ہے تو نمبر (۲) کو کاٹ دیجئے ورنہ نمبر (۱) کو

ادب و انشاء کے لحاظ سے ان خطوط کو جو مرتبہ حاصل ہے اُس کے اظہار کی ضرورت نہیں - اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی ہیں جو "نگار" میں شائع نہیں ہوئے - یہ کتاب ۲۸ پونڈ کے دبیز کاغذ پر مجلد شائع کی گئی ہے - اس میں نیاز فتحپوری کی تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کے بلاک بھی - ضخامت ۴۸۲ صفحات ہے -

منیجر نگار

بابُ الاستفسار

نورِ محمدی اور پلِ صراط

(جناب مرزا محمد مہدی صاحب۔ جبل پور)

عام طور پر مسلمانوں میں مشہور ہے کہ قیامت کے دن تمام آدمی ایک پُل سے گذریں گے جس کا نام صراط ہے۔ اور وہ بال سے زیادہ باریک تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ پھر جو اچھے بندے ہیں وہ اُس سے محفوظ گذر جائیں گے۔ اور جو گناہگار ہیں وہ نیچے جہنم میں گر جائیں گے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ قربانیاں کرتے ہیں انھیں جانوروں پر سوار ہو کر اس پل سے گذرینگے۔ بہت سے واعظوں کو بھی یہی بیان کرتے سنا گیا ہے۔ اور مولود کی اکثر کتابوں میں اسکا ذکر موجود ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے۔ اسکی کیا حقیقت ہے اور کیا واقعی قرآن پاک یا احادیث میں اسکا ذکر ہے؟ اسی طرح نور محمدی کے متعلق میلاد کی کتابوں میں عجیب و غریب باتیں بیان کی گئی ہیں۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ سب احادیث سے ثابت ہیں؟

(نگار) آپ کیا پوچھتے ہیں کہ ان جاہل مولویوں اور کم عقل واعظوں نے کس کس طرح اسلام کو بدنام کیا ہے۔ اور ان کی گندہ تصانیف نے بانی اسلام پر کیا کیا تہمت تراشی ہے۔ ایک صراط پر کیا موقوف ہے۔ اور ہزاروں باتیں ایسی ہیں۔ جن کا پتہ نہ کلام پاک میں ہے اور نہ تعلیمات اسلامی میں۔ لیکن آج وہ عام مسلمانوں کے نہایت اہم عقاید میں شامل نظر آتی ہیں۔ جس زمانہ میں رسول اللہ مبعوث ہوئے ہیں۔ عرب میں موسوی۔ عیسوی اور زردشتی مذاہب کے اثرات ہر جگہ پائے جاتے تھے۔ اور ان کی روایات عام طور پر بیان کی جاتی تھیں۔ چونکہ عرب خود بُت پرست تھے۔ اور وہ کسی الہامی کتاب

رکھنے کے مدعی نہ تھے۔ اس لئے ان مذاہب سے بڑی حد تک مرعوب و متاثر ہوئے تھے۔ اور ان کے خاندانوں میں ایک زمانۂ نامعلوم سے ان مذاہب کی بہت سی روائتیں منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں۔

جب ظہور اسلام ہوا اور اس نے عربوں کی ذہنیت کو ان تمام اساطیری خرافات سے پاک کرنا چاہا تو اسکو بہت دقتیں پیش آئیں۔ کیونکہ صدیوں سے جو باتیں ذہن میں مرتسم چلی آتی تھیں ان کا دفعتہً محو کرنا آسان نہیں تھا۔ تاہم اس نے اساس و بنیاد کی طور پر ایک ایسی چیز (کلام مجید) پیش کر دی۔ جو اس نوع کے لغویات سے پاک تھی۔ اور ہر چند ابتدائے عہدِ اسلام میں لوگوں کو اس کے حقیقی مفہوم پر بحث و تحقیق کا موقعہ نہیں ملا۔ تاہم اس نے ایک ایسے صاف و سادہ مذہب کی داغ بیل ضرور ڈالدی۔ جو انسان کی عملی زندگی اور اس کے تمدنی تعلقات کے لحاظ سے نہایت ہی پائدار اور بلند مستقبل اپنے اندر رکھتا تھا۔ لیکن افسوس ہے کہ نہ رسول اللہؐ نے اتنی عمر پائی کہ وہ اس بنیاد کو مستحکم کر جاتے۔ اور نہ آپ کے بعد خلفاء کو اندرونی سازشوں اور سیاسی جھگڑوں کیوجہ سے اس کی فرصت نصیب ہوئی۔ یہانتک کہ مذہب اسلام نام ہوگیا حکومت اسلام کا۔ اور قرآن کی جگہ لے لی احادیث نے۔ جو لاکھوں کی تعداد میں رسول اللہؐ کے نام سے گڑھی اور روایت کی جاتی تھیں۔ پھر ان احادیث میں سے ایک حصہ تو ایسا ہے جو صرف سیاسی مصالح کے بناء پر وضع کیا گیا۔ اور ایک حصہ وہ ہے جس میں دل کھولکر دیگر مذاہب کی اُن تمام روایتوں کو لے لیا جو عرب خاندانوں میں رائج تھیں۔ اور تھوڑا سا تغیر کر کے ان کو "اسلامی چیز" کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔ انھیں میں سے وہ احادیث بھی ہیں جو صراط (عوام کی زبان میں پُل صراط) اور نور محمدی کے متعلق آپ کو میلاد کی کتابوں میں نظر آتی ہیں۔ اور یہ دونوں خیال صریح ایرانی روایات سے ماخوذ ہیں۔ لفظ صراط عربی لفظ نہیں ہے۔ بلکہ فارسی لفظ "چنوات" کا معرّب ہے۔ اوستا میں ایک لفظ ہے "چنواتو پرتوس" جس کے معنی ہیں "نیک و بد شمار کرنیوالے کا پُل"۔ یہی لفظ مخفف ہو کر فارسی میں چنوات ہوا اور عربی میں صراط۔

زردشتیوں میں اس پل کے متعلق جو روائت پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ مرنے کے بعد انسان کی روح کو ایک پُل سے گذرنا پڑتا ہے۔ اور اس کے بعد اس کے نیک و بد اعمال کا احتساب ہوتا ہے۔ پہلوی کتاب و نکارت کی ایک عبارت ملاحظہ ہو:۔

"میں تیری عبادت نیک خیال اور نیک عمل کیساتھ کرتا ہوں تاکہ میں روشنی کے راستہ میں رہوں۔ دوزخ کے عذاب میں مبتلا نہ ہوں۔ اور پُل چنوت کو عبور کر کے اس جگہ پہنچ جاؤں جو نکہتوں سے معطر اور رحمتوں سے معمور ہے۔"

اوستا میں بھی آپ کو یہی خیال نظر آئیگا۔ چنانچہ نیک عورتوں اور مردوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ:۔

"انھیں بھی میں تم جیسے آدمیوں کی دعاؤں کے ذریعہ سے لے جاؤں گا اور تمام برکتوں کے ساتھ پُل چنوات تک

اُن کی رہنمائی کروں گا۔" (لیسنا ۔ ۴۶ ۔ ۱۰)

اس نوع کا عقیدہ نہ صرف قدیم ایرانیوں میں بلکہ تمام آریہ قوموں میں پایا جاتا ہے ۔ اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جہاں جہاں وہ پہنچے یہ اعتقاد اپنے ساتھ لے گئے ۔ چنانچہ ناروے اور سویڈن کی قدیم روایات میں ایک چیز " بفروست " نظر آتی ہے ۔ جسے عام طور پر " دیوتاؤں کا پل " کہتے ہیں ۔ اور اس سے مراد اُن کی غالباً قوسِ قزح ہے ۔ یہی خیال ادنیٰ تغیر کے ساتھ یونانیوں میں بھی آیا ۔ چنانچہ وہ قوسِ قزح کو دیوتاؤں کا قاصد کہا کرتے تھے ۔ غرض صراط کے متعلق جو روایات مسلمانوں میں رائج ہو گئی ہیں وہ یکسر ایرانی روایات ہیں اور قولِ رسول سے انھیں کوئی واسطہ نہیں ۔

کلام مجید میں کم و بیش چالیس جگہ لفظ صراط استعمال کیا گیا ہے ۔ لیکن آپ کو کوئی ایک آیت بھی ایسی نہ ملیگی جس میں ان خرافات کی تصدیق کی گئی ہو ۔ قرآن میں صراط کی صفت میں زیادہ تر لفظ مستقیم استعمال ہوا ہے ۔ اور کہیں حمید اور سوی کے الفاظ ۔ اور کسی ایک جگہ بھی راہِ عمل کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں لیا گیا ۔ پس یہ تو ہو سکتا ہے کہ عربی زبان میں قبل بعثت نبوی لفظ صراط فارسی زبان کے لفظ چنوات سے معرب کر کے لے لیا گیا ہو ۔ اور اسی کے ساتھ ایرانی روایات بھی اس کے متعلق رائج ہو گئی ہوں ۔ لیکن کلام مجید میں لفظ صراط صرف راہ یا راستہ کے معنی میں لیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ایرانی روایات کا عدم شمول اس بات کو بھی ظاہر کرتا ہے کہ اُن کی کوئی حقیقت و اصلیت نہیں ہے ۔

نورِ محمدی کا ذکر کلام مجید میں کسی جگہ نہیں ہے ۔ البتہ احادیث و روایات ضرور اسکے متعلق موجود ہیں کہ وہ کس طرح آدم سے منتقل ہو کر رفتہ رفتہ جناب آمنہ تک منتقل ہوا ۔ لیکن یہ احادیث بھی بالکل غیر صحیح و موضوع ہیں ۔ اور رسول اللہ سے ان کو منسوب کرنا درست نہیں کیونکہ اس میں بھی وہی آرین روایات کی جھلک پائی جاتی ہے ۔ پارسیوں کی مذہبی کتاب اوستا میں بھی جمشید کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے اسی طرح کی ایک روایت پائی جاتی ہے ۔ یہ جمشید وہی ہے جسے " یم کھشیت " بھی کہتے ہیں اور جسکے معنی " یم نورانی " کے ہیں ۔ یم یا جم کا ذکر سنسکرت لٹریچر میں بھی پایا جاتا ہے ۔ چنانچہ رگ وید میں اسکو سب سے پہلا آدمی بیان کیا گیا ہے ۔ ایرانی لٹریچر میں جم کے باپ کا نام " ویوہنوت " درج ہے اور ہندوستانی روایات میں ویوسوت جو سورج کا دوسرا نام ہے ۔ اور ہندوؤں کا سورج بنسی خاندان اسی کی یادگار ہے ۔ اوستا کی روایت میں بھی اس نور کے نسلاً بعد نسل منتقل ہونیکا ذکر بالکل اسی طرح پایا جاتا ہے ۔ جیسا اسلامی روایات میں ۔ یعنی وہ نور پہلے جمشید کی پیشانی میں چمکا ۔ اس کے بعد فریدوں میں منتقل ہوا اور پھر کیساسپ میں ۔

الغرض نورِ محمدی کے متعلق جو روایات پائی جاتی ہیں وہ بھی خرافات میں داخل ہیں اور رسول اللہ کے قول سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ۔ آپ کو اگر واقعی اسلام کا صحیح مفہوم معلوم کرنا ہو تو احادیث کو بالکل نظر انداز کر دیجئے اور صرف کلام مجید کا مطالعہ کیجئے ۔ کہ وہی اصل چیز ہے اور وہی اصل بنیاد ہے تعلیمات اسلامی کی ۔

جذباتِ عدم

ایک لمحہ:-

بیخودی گھُل مل رہی ہے رفتہ رفتہ ہوش میں — جاگتا ہے اک تصوّر ذہن کے آغوش میں
اک تصوّر زندگی کے اک حسیں لمحہ کا خواب — خواب، جس سے ماند پڑ جائے طلوعِ ماہتاب

وہ مرے محراب در سے اس طرح گذرے ندیم! — جیسے اک اُجڑے ہوئے مندر میں داخل ہو نسیم
آہ اُس شاعر کا گھر، جو ہو پرستارِ جمال — ہوں، زمزمہ پا، نمازیں عشق کی جس کے خیال!
معبدِ ویراں نہیں تو اور کیا ہے ہمنشیں — ایسا معبد جس کو کہیئے، اک مناجاتِ حسیں
جس کے ہر ذرّے کو ہو اک دیوتا کا انتظار — جس کی ویرانی کا مطلب ہو خدا کا انتظار

شام کے حیراں دھندلکوں میں تھا اک ادراکِ راز — اور خموشی سے ٹپکتی تھی محبّت کی نماز
میرے گھر کی شمع، میرے عشق کی غمّاز تھی — ناتواں سی روشنی میں درد کی آواز تھی
روبرو بیٹھے تھے وہ میرے، اور اُن کی ہر نظر — کر رہی تھی مجھ کو اسرارِ بقا سے باخبر
آہ ادراکِ الوہیت کا حسنِ لازوال — مٹ چکا تھا دل سے اس دنیا کا ہر فانی خیال

او زمانے میرا وہ لمحہ بھی تیرے پاس ہے
اپنے روحانی خسارے کا مجھے احساس ہے

خامشی:-

خامشی اک غیر مرئی حسن ہے تخئیل کا — جلوۂ صد رنگ، حسنِ صوت کی تحلیل کا

کیا تخیل آفریں ہے رسم و راہِ خامشی
فلسفہ کیا ہے؟ جلالِ بارگاہِ خامشی

عقل کی صناعیوں کو جانچتی ہے خامشی
فکر کی گہرائیوں کو جانچتی ہے خامشی

خامشی قدرت کا وہ ایمائے غور و فکر ہے
لمحہ لمحہ جس کا اک دریائے غور و فکر ہے

خامشی سرگوشیوں کا اک طلسمی ساز ہے
ایک بھولی، بسری اور بھٹکی ہوئی آواز ہے

خامشی، ذی روح، پُراسرار، زندہ خامشی
آشنائے لذتِ گفتار، زندہ خامشی

میری پنہاں قوتوں کا امتحاں ہے خامشی
میرے ادراکِ نہاں کی رازداں ہے خامشی

خامشی سے معنیٔ حسن آفریں لیتا ہوں میں
فکر کی کشتی کو جوئے نور میں کھیتا ہوں میں

دیکھتی ہے خامشی کے حسن کو چشمِ خیال
خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں اسرارِ جمال

خامشی کی گونج میں ہے ایک روحانی صدا
جس میں میں گم ہو گیا ہوں، کھو گیا ہوں، بارہا

کیا بتاؤں تجھ کو اے ہمدم! کہ کیا ہے خامشی
خامشی تو ہے مگر جانِ نوا ہے خامشی!

کچھ نہیں کھلتا کہ خاموشی ہے یا آواز ہے
شاہدِ فطرت کی یہ بھی اک ادائے ناز ہے

بادل اور کہسار:-

کوہسار اور بادلوں کے جمگھٹے، شام اور شفق
ڈوبتے سورج کا رومان آفریں جام اور شفق

بادلوں میں کیف و رعنائی کی تصویروں کے نقش
مستیوں کے خال و خد، صد رنگ تصویروں کے نقش

روح پرور رنگ، دلکش سائے، نورانی غبار!
کچھ حقیقت، کچھ تصور کا طلسمِ سحر کار

ہلکی ہلکی تیرگی میں دھیمی دھیمی سرخیاں
سرخیوں میں حیرت افزا داستانوں کا جہاں!

چھن رہا ہے بادلوں سے رنگ و ظلمت کا غبار
نور کے چھینٹوں کے اندر جیسے پھولوں کی پھوار

دور کا کوئی افق ہے چشمِ دل کے سامنے
سرخ آنچل جس پہ پھیلائے ہیں اپنے شام نے

رقص میں مشغول ہیں پریاں، گھٹائیں اوڑھ کر
شعریت سر دھن رہی ہے جن کے ہر انداز پر

ذہن میں لہرا رہے ہیں کچھ سہانے خواب سے
چھو رہے ہیں بربطِ تخیل کو مضراب سے!

آ رہی ہے دھیمے دھیمے مست گیتوں کی صدا
بج رہا ہے آنکھ سے اوجھل، کہیں اک ساز سا

جس کو سنکر رفتہ رفتہ جھومتا جاتا ہوں میں
خواب میں جیسے کسی کو چومتا جاتا ہوں میں

جانِ تغزّل:-

ہوش کھو دیتا ہوں، اور وجد میں آجاتا ہوں
وسعتِ حُسنِ تصوّر میں سما جاتا ہوں

تم تماشائی بنے تھے، تو تماشا بھی بنو۔
مر کے میں، اب تمہیں دیوانہ بنا جاتا ہوں

ڈوب جاتا ہوں خیالات کی گہری رَو میں
اور کسی دوسرے عالم میں چلا جاتا ہوں

چاندنی راتوں میں، وہ اُن کی ملاقات کا کیف
رخصت! اے ہوش! کہ بیہوش ہوا جاتا ہوں

بے حقیقت نظر آنے لگے شکوے اپنے
تیری گفتار کے دھارے پہ بہا جاتا ہوں

آہ! انسان ہوں۔ پھنس جاتا ہوں باتوں میں، اگر
چوٹ لگتی ہے تو پھر ہوش میں آجاتا ہوں

نبضِ کونین پر انگلی تو ذرا رکھنا عدم!
دُنیا بجھتی ہے کہ میں آپ بجھا جاتا ہوں؟

اضداد کی آویزش، یہ فطرتِ دُنیا ہے
ساحل سے ہر اک طوفاں ٹکرا کے گذرتا ہے

جلوے کی حقیقت ہم، معلوم کریں کس سے
جو اہلِ نظر ہے وہ حیرانِ تماشا ہے

دیوانے گذشتہ اور آئندہ کو کیا جانیں
اس حال سے وابستہ، ماضی ہے نہ فردا ہے

دلدوز حقائق سے اچھے ہیں حسیں دھوکے
رنگین فریبوں میں تسکینِ تمنّا ہے

تقدیر، زبردستی ہے کاتبِ قدرت کی
تدبیر، بشر کا اک معقول تقاضا ہے

محویّت و سرشاری، مدہوشی و بے خبری
نادان تماشائی! تُو آپ تماشا ہے

طغیانیٔ غم دل میں اور ضبطِ فغاں، توبہ!
نادان عدم! شاید جل بجھنے کا سودا ہے

ایک مکتوب

ایک عزیز دوست کے نام:-

وہ دَورِ زیست کہ جس سے گذر رہا ہوں میں
وہ تجرباتِ دل افگن جو کر رہا ہوں میں

گِلا ہے۔ نطق و تکلم میں آ نہیں سکتے
کہ لفظ بارِ معانی اُٹھا نہیں سکتے:
بہت سی سادہ و معصوم و دلربا خوشیاں
ہزار دلکش و شاداب و بے بہا خوشیاں
ہوا تھا جس سے محبت کا افتتاح کبھی
تھی جن کے دم سے درخشاں مری ہر ایک گھڑی
گئی ہیں ایسی، کہ اُن کا نشاں نہیں ملتا
نشاطِ رفتہ کا رنگیں سماں نہیں ملتا

کسی نے شوق سے رودادِ آرزو بھی سُنی
مری فسردہ نگاہوں کی گفتگو بھی سُنی
سکوت کا وہ تکلّم، جو ہے زبانِ دل کی
وہ خامشی جو ازل سے ہے ترجمانِ دل کی
وہ التجائے نظر، جس کو عشق کہتے ہیں
وہ اشک، جن میں محبّت کے درد رہتے ہیں
مشاہدہ کیا اُس نے تمام باتوں کا
مرے اُداس دنوں کا، خموش راتوں کا
اور اب بھی حال سے میرے، وہ ناشناس نہیں
نہیں، کہ اسکو مرے دردِ دل کا پاس نہیں
ہے احترام مرے عشق کا اُسے دل سے
خدا و بندہ یہ دو جزو ہیں محبّت کے
مگر بایں ہمہ ربط و نیاز و صدق و صفا
ہمارے عشق کی رسوائیاں ہیں رنج فزا!

عزیز دوست! یہ دُنیا عجیب دُنیا ہے
کہ حق کو بھی یہاں بدنامیوں کا کھٹکا ہے
دلوں کو ملتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں
گلوں کو کھِلتے ہوئے کون دیکھتا ہے یہاں
وہ چیز جس کا خدا احترام کرتا ہے۔
زمانہ اس کا ہمیشہ سے نام دھرتا ہے

زمانہ مار چکا مجھ کو، کرچکا پامال
ہے سامنے، مگر، اپنی بقا کا اَب تو سوال
دَبا ہوں جتنا، اَب اُتنا مجھے اُبھرنا ہے
جدید شان سے، تجدیدِ زیست کرنا ہے
کہوں گا اُس کو، علی الرّغم اہلِ دہر، خدا!
زبانِ خلق کی مجھ کو نہیں ہے اَب پروا
میں بے شعوریٔ دُنیا پہ مُسکراؤں گا
کہ ہو کے دہر میں بدنام، جھوم جاؤں گا
جہاں کی عقل کا کیا دخل میرے کاموں میں
مرے حسین دنوں میں، لطیف شاموں میں
جنونِ عشق پہ میں ناز کر کے چھوڑوں گا
جہاں کو اَب نظر انداز کر کے چھوڑوں گا

عدم

رباعیات آسی

اک سمت نظر فریبیِ جرم و قصور
اک سمت شرابِ طاعتِ حق کا سرور
یہ دام گہِ خیال یعنی دُنیا
آسی ہمیں اک نہ اک میں پھانسے گی ضرور

اس سے دورِ شباب کی رونق ہے
اس سے بے لطفیوں کا چہرہ فق ہے
توبہ کس مُنہ سے کر رہا ہے ظالم
تیرے اوپر گناہ کا بھی حق ہے

دامانِ ثباتِ عیش سیتا ہوں میں
سینا مجھے چاہیئے کہ جیتا ہوں میں
اللہ رحیم اور شیطان رجیم
اچھا تو پھر اب شراب پیتا ہوں میں

انسان خودی کا اپنی کیا مالک ہے
ہر چیز کی اس کے اک بلا مالک ہے
بھیجا تھا اسے خدا نے بندوں کی طرف
بندوں نے کہا کہ جا خدا مالک ہے

اس جود کو اور اس سخا کو دیکھا
اس لطف کو اور اس عطا کو دیکھا
جس کا بندا نہیں بجز تیرے کوئی
دیکھا واعظ ترے خدا کو دیکھا

دِل خوش ہو تو آہ بھی جگر سے نکلے
ہنستے ہوئے اشک چشمِ تر سے نکلے
پیتا ہے تو پی کے شب کو توبہ کر لے
سورج کیا جانے کل کدھر سے نکلے

نغمہ بھی حرام نوحہ خوانی بھی حرام
مے ہی نہیں مستیِ جوانی بھی حرام
اس جینے سے فائدہ ہی کیا ہے آسی
کہدے کوئی کاش زندگانی بھی حرام

سرگرمِ غرور و کبریا ہیں لاکھوں
آمادۂ دعوئ انا ہیں لاکھوں
آیا ہے عجیب یہ دور اُلٹا آسی
بندا نہیں ایک بھی خدا ہے لاکھوں

بگڑے نہ غریب بادہ نوشوں کا بھی حال
اور حکم بھی ہوں نہ واعظوں کے پامال
اب بھی جو حرام کرنے والا ہے کو
عقبیٰ میں حرام کر دے دُنیا میں حلال

اے حضرتِ زاہد معلّے القاب
دیجئے مرے اک سوال کا مجھ کو جواب
دوزخ میں رہیں گے جب شرابی سارے
تو کون پیئے گا جا کے جنت میں شراب

ہو جاتا ہوں پست جب اُبھرتا ہوں میں
مغروریِ نفسِ بد سے ڈرتا ہوں میں
ہوتا ہے خلوص توبہ جس دن دل میں
اس روز گنہ ضرور کرتا ہوں میں

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	فہرست مضامین اگست سنہ ۳۵ء	شمارہ ۲

ملاحظات		۲
پارسی اہل کتاب ہیں	محمد طاہر رضوی ام - اے	۹
جھانسی کی رانی		۲۰
مسئلہ آبادی اور ہندوستان	عبدالرحیم شبلی بی، اے	۳۲
بچہ	سید محمد احسن بی اے۔ حیدرآبادی	۴۱
سوا سو سال قبل دکن کی شاعری	سید تمکین کاظمی	۴۶
انقلاب کا اثر روسی زبان پر	ڈاکٹر محمد نصیر الدین	۵۶
تاریخ کا ایک گمشدہ ورق		۶۰
باب المراسلۃ والمناظرہ		۶۵
باب الاستفسار		۷۰
مطبوعات موصولہ		۷۴
منظومات	نصرت - کیفی	۷۸-۸۰

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	اگست ۳۵ء	شمارہ ۲

ملاحظات

افسانۂ روح و روحانیت

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں کہ بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے، اور ہر عقیدہ کیلئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے، لیکن اگر اُن دلایل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقاءِ روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سنیں یہ معلوم کر لینا مناسب ہے کہ بقاءِ روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں۔

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے، یعنی انسان میں جس چیز کو احساسِ تشخص، حافظہ، اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہیگا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقاءِ روح کے ساتھ حشرِ اجساد کے بھی قائل ہیں یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہو جانے والی

روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دنیا میں بسر کی ہے۔

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوع انسانی ــــ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی، تو وہ اپنے مردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور اُن کو اپنے پسماندگان کے ساتھ وہی تعلق باقی ہے جو ان کی زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علحدہ علحدہ چیزیں ہیں اور جب روح جسم سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کی ہستی کسی نہ کسی طرح قائم رہتی ہے چنانچہ اسی بنا پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھدی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہونچے۔ (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی عہد وحشت اور اسی اعتقاد جاہلانہ کی یادگار ہیں)

خیر، اگر عہد قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھتا تھا تو جائے حیرت نہیں کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغاز حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہوگیا ہے، روح کے بقا کا قایل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کرم یا (Cell) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1] اس پیوند کے بعد بیشمار خلایا بنتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقت معینہ کے بعد وہ اس دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ پھر حیات دنیاوی میں بھی بیشمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے ماتحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجود حیات نہیں پایا جا سکتا یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے، لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہو سکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بیشمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کا پیوند ہو کر حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پاکر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کرکے نشوونما کا باعث ہوتا ہے۔

خلایا میں پائی جاتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فائدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کیجائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی۔ جب انسانی وجود عبارت ہے دوبے روح خلایا کے اتصال سے، تو پھر روح انہیں کہاں سے آگئی۔ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بیجان پیدا ہوا، لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کرکے مرا، اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بیجان ہوگیا۔ لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علحدہ کوئی دوسری چیز ہے، تو بتایا جائے کہ اس مُردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کو اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ محض حیات کا وجود، وجود روح کے لئے ضروری نہیں اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے، کیونکہ دیگر ذیحیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور اُن میں نہیں۔ ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے۔ لیکن انسان کا حافظہ، اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قایم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعوی کس حد تک درست ہے۔ انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذیحیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے، گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں جب وہ رحم مادر میں تھا، یا جب دنیا میں آنے کے بعد اس نے گھٹنوں چلنا سیکھا تھا، اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔ اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی محو ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی نہ پہلے کچھ تھا نہ بعد کو کچھ ہوگا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کے اور مخلوقات کا اسے علم تھا، اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علٰحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں، آسمان سے اوپر بہشت ہے جہاں سے فرشتے اوپر سے نیچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ زمین سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں، ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کے ان بیشمار دنیاؤں میں، صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھیں کی روحوں کو بقاء دوام کے خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ پھر اور کروں کو جانے دیجئے، خود اسی زمین کے اور تمام مخلوقات کو لیجئے۔ کیا وجہ ہے کہ انسان کی روح کو بقا حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضائے الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی۔ ایسا کرنے سے اسے کون باز رکھ سکتا ہے اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لیجاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟ روح کا یہ سفر کس ذریعہ سے ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے۔ کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی، گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا جمگھٹا ہوگا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کر سکیں گے، اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقایق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کر رہی ہے اور ۲۴ گھنٹہ میں پوری ایک گردش کر لیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب تارے کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے نظامہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے۔ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہو کر باہم گرملنا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جا سکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن مع اپنے جسم کے اٹھایا جائیگا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے

اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہو جاتا ہے۔ لیکن آج یہ امر پایۂ تحقیق کو پہونچگیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے کم ازکم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھدیا یا زمین کے اندر دفن کرکے ختم کر دیا۔ خدا جانے کتنی بار نوعِ انسانی جانوروں کی غذا بنکر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی۔ الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں، اور جانوروں کے اجزا شامل ہیں اس لئے اگر حشرِ اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کونسا کیمیائی طریقہ ہوگا جو لکھوکھا سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزا کو پھر فراہم کر سکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزا فراہم کرکے میرا اصلی جسم طیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی ہیولیٰ میں نشو و نما، بیماری ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈالدیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بنکر غائب ہو جاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہوکر آپ کے کمرہ کو گرم کرتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بنجاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے۔ فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے، ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور قوت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے، اس عمل سے بچ رہے اگر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے، تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کر سکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور اُن میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو اُن کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے ۔۔۔ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قائم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تُلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قائم ہے، ہم صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہو جاتے ہیں، اور جب اس کا بالکل تصرف ہو جاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے، خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات، و حیوانات کی۔ اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہوکر یکجا ہونا اور اصلی صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقارِ روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بنا پر پیدا ہوا ہے جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا بھی تھا، اول اول جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن اسکے سردار و بزرگ دفعتہً مرجاتے ہیں تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ یہ واقعی ہمیشہ کیلئے

فنا ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد اس نے انھیں خواب میں بھی دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں اور اس سے
اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں۔ پھر یہ عقیدہ برابر اسوقت تک
قائم رہا جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے
ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اسکا
یقین بھی ہے۔ ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں لیکن مجھے اس میں کلام ہے ــــ اس سے قبل نگار کے صفحات پر میں
عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقاید جن کا تعلق مابعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات
وقیاسات ہیں، حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک
سے ہے یا اُن تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ــــ اور یہاں ان دونوں میں سے
کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے۔ وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قایل ہیں اور حقیقی سکون و
آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں، اُن سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دنیاوی زندگی ناپایدار و مُکلف ہے
اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج
کرتے ہیں، تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج وغیرہ
کرتے ہیں ــــ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اُخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں اگر انھیں یقین ہوتا تو
وہ ایک لمحہ کے لئے اس دنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں
بہشت کی راحتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے
والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملیگی، میں کہتا ہوں کہ
اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت
تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا۔ اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا
ورنہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقائے روح کے قایل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے اُن روحانئین کے بیان
کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہمکلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ
یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں، اور آئندہ ماہ کی اشاعت میں بالتفصیل بیان کریں گے کہ ان مدعیان روح و روحانیت نے
کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں سے نامہ و پیام کرنا کہا جاتا ہے وہ کتنا بڑا مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلہ روح یا حیات بعد الموت منجملہ اُن چند مسایل کے ہے جو صرف انسانی تمنا کی پیداوار ہیں اور اُن عقاید سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کیجا سکتی بلکہ جو سراسر اصول فطرت و نظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذاہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے، تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قایم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جارہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے طیار نہیں ہوسکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں، لیکن اگر مذاہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہے جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے، تو ان کے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قایم کریں اور اُن عقاید پر زور نہ دیں جو ان کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے، اس لئے مذاہب عالم کا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے اور ڈماکریسی و مشینری کی ترقی کے ساتھ ایک دن اس کو بالکل ختم ہوجانا ہے، کیونکہ اسوقت تک سب سے زیادہ دشمنی مذہب کے ساتھ انھیں دو چیزوں نے کی ہے اور ان کی ترقی کا کھلا ہوا نتیجہ مذاہب کا زوال ہے

مجموعۂ استفسار و جواب

اس کی ایک جلد سال گزشتہ شایع ہوچکی ہے۔ باقی حصہ کو دو جلدوں میں شایع کرنے کا خیال تھا، لیکن بعد کو میں نے سوچا کہ کیوں نہ ایک ہی جلد میں اس کو ختم کر دیا جائے، چنانچہ کام شروع کر دیا گیا اور ایک چوتھائی حصہ کتاب کا چھپ بھی گیا ہے ـــــ اب سوال یہ ہے کہ اس صورت میں قیمت چار روپیہ سے کسی طرح کم نہ ہوگی اور ممکن ہے کہ بیک وقت اتنی رقم دینا ناظرین نگار کو دشوار ہوجائے اس لئے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ قارئین کرام باقی حصہ کو دو روپیہ فی جلد کے حساب سے دو جلدوں میں لینا چاہتے ہیں یا چار روپیہ کے حساب سے ایک ہی جلد میں۔

منیجر نگار

پارسی اہل کتاب ہیں

حضرت زرتشت پیغمبر برحق اور نبی مرسل تھے

(مسلسل)

علمائے مغرب نے اکثر و بیشتر اپنی کتابوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زرتشت نے کسی نئے دین یا نئے اُصول کی تعلیم نہیں دی اور زرتشتی عقیدہ کے مطابق بدی کی قوت خداوند عالم کے مدمقابل یا خدا کی حیثیت ہرگز نہیں رکھتی ہے[1]۔ پروفیسر فارنل لکھتے ہیں :۔ "ہمیں کسی جگہ سے بھی اس کا پتہ نہیں چلتا ہے کہ زرتشتی گروہ نے کسی وقت بھی اہرمن کا کسی صورت میں احترام کیا ہو بلکہ مزدا پرستوں کے نزدیک اہرمن کی مخالفت اُصول مذہب میں داخل ہے[2]"

اسی طرح کتاب "تعالیم زرتشت" میں مرقوم ہے کہ بدی کی قوت[3] (اہرمن) حقیقت میں انسانی فطرت کے اُس رُخ کو کہتے ہیں جس سے خباثت اور بُرائی و بدکاری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کا وجود بالذاتہ مطلقاً نہیں ہے۔

کیا مسلمانوں کا عقیدہ بھی فرشتوں اور شیاطین کے متعلق بالکل اسی قسم کا نہیں ہے[4]۔

کسقدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ عیسائی باوجود اپنی تثلیث کے اہل کتاب باقی رہیں اور رکھے جائیں[5] مگر زرتشتی خدا کی توحید پر ایمان رکھتے ہوئے بھی محض اسی بنا پر کافر کہلائیں کہ اُن کے پیغمبر یا اُن کی الہامی کتاب کے متعلق کوئی قطعی آیت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ ہمارے ناظرین کو شاید یہ گمان ہو سکتا ہے کہ عیسائیوں کی جماعت بعد کے زمانہ میں تثلیث کی قایل ہوئی اور اُن کا عقیدہ حضرت عیسیٰ کی الوہیت یا ابنیت کے متعلق حضرت محمد عربی صلعم کے

---

[1] تاریخ قدیم (کیمبرج سیریز) جلد اول صفحہ ۲۰۸ - [2] اوصاف خداوندی ص ۱۲۳ - [3] دینیات زرتشتی (مولفۂ دہالا) صفحہ ۳۰۴- [4] موعظۂ اسلام (مولفۂ ارنلڈ) صفحہ ۲۰۸ - اسلام و دین زرتشت (مولفۂ خواجہ کمال الدین) صفحہ ۸۸- [5] تفصیلی بحث کے لئے "تثلیث کی اصلیت" (مطبوعہ کرسچین لائف پبلشنگ کمپنی لندن ۱۸۸۳ء) ملاحظہ فرمائیے۔

زمانۂ نبوت میں تھا لہٰذا اس سلسلہ میں مناسب ہوگا کہ ہم خود قرآن سے اس بات کو ثابت کر دیں کہ عیسائی جیسے اسوقت ہیں ویسے ہی اُسوقت بھی تھے اور قرآن مجید نے صاف صاف کھلے الفاظ میں باوجود اُن کے عقیدۂ باطل کے اُنھیں اہلِ کتاب کہکر مخاطب کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:۔

"اے اہلِ کتاب تمھیں چاہئے کہ اپنے مذہب کی حد سے باہر قدم نہ رکھو اور خدا کے خلاف کچھ نہ کہو بلکہ سچ بولو۔ مسیح ابن مریم تو خدا کے صرف رسول ہیں اور روح اللہ جو بحکم خدا مریم کے اندر داخل کی گئی تھی پس تم خدا اور اُس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور تثلیث کا ذکر چھوڑ دو کہ اسی میں تمھاری بہتری ہے۔ خدا تو بس ایک ہی ہے۔ اُس کی شان سے بعید ہے کہ کوئی اُس کا بیٹا ہو۔ جو کچھ دنیا میں ہے سب کچھ اُسی کا ہے اور وہی تمھارا سب سے بڑا محافظ ہے۔"

(سورۂ ۴ - آیۃ ۱۶۹)

بہرطور اب ضروری ہے کہ ہم اپنے اصلی بحث کی طرف پھر رجوع کریں۔ پیغمبر ایران کو یقین کامل تھا کہ نیکی کو انجام کار بدی پر غلبہ حاصل ہوگا ورنہ خدا کے انصاف میں فرق آجائے گا۔ اسی طرح زرتشت کا عقیدہ تھا کہ ہماری آیندہ زندگی یعنی حیات بعد الموت ایک ایسا عالم ہوگا جہاں خدا اپنے نیک بندوں کو اُنکے اعمال کی جزا اور بروں کو اُن کے افعال کی سزا دیکر اپنے عدل و انصاف کا بہترین مظاہرہ فرمائے گا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایسی ہی تعلیم کا نتیجہ تھا جو آج بھی زرتشت کے ماننے والے خدا کے آخری انصاف کو مدِنظر رکھکر نیکی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش میں مصروف اور بری راہ سے محفوظ رہنے کی سعی کرتے ہیں[1]۔

دیگر الہامی مذاہب کی طرح زرتشتی بھی فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں[2]۔ اگرچہ اس سلسلہ میں اُن کا اعتقاد غلو کی حد تک پہونچ گیا ہے۔ ہم ڈاکٹر ہولٹن ایک مغربی عالم کا خیال اس خصوص میں نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو خالی از دلچسپی نہیں[3]۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"مذہب اوستا میں توحید کے متعلق جو کچھ عقیدہ ہے وہ ایک حد تک عیسائیوں کے خیال سے ملتا جلتا نظر آتا ہے یعنی "رومن کیتھلک" اور "گریک ارتھوڈکس" فرقے بھی پارسیوں جیسا عقیدہ رکھتے ہیں۔ توحید اگرچہ اپنی جگہ پر قائم ہے مگر خدا کے ماتحت فرشتوں کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کئے گئے جن سے لوگوں کو غلط فہمی ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ اُمورِ خداوندی میں ملائکہ کی بھی شرکت ہے، حالانکہ واقعہ ایسا نہیں بلکہ جس طرح ہم لوگ دنیاوی

---

[1] اسلام اور توحید مولفہ خواجہ غلام حسین مطبوعہ حیدرآباد ملاحظہ ہو۔ [2] یسنا۔ باب ۳۰۔ آیۃ ۹ باب ۳۱۔ آیۃ ۴۔ اسکے ساتھ ہی مشہور جرمن مستشرق الکزنڈر کوہٹ کی معرکۃ الآرا تصنیف "فرشتوں اور شیطانوں کا مسئلہ مذہب یہود میں" جہاں وہ اس عقیدہ پر پارسی خیال کی روشنی میں تفصیلی بحث کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے۔ [3] گنجینۂ مُغاں صفحہ ۱۰۰۰۔

معاملوں میں حکومت اعلیٰ کو براہ راست مخاطب نہ کر کے ماتحت حکام سے چارہ جوئی کرتے ہیں اسی طرح پارسی بھی (مثالاً) جب عقل و فراست کا خواستگار ہوتا ہے تو فرشتہ ہوما کا نام لیتا اور فتح و ظفر کے سلسلہ میں وریترفا گوما کو یاد کرتا ہے درانحالیکہ اس کا اصلی مخاطب اہورامزدا ہی کی ذات ہوتی ہے اور ان ملائکہ کو وہ محض ذریعہ اور واسطہ سمجھتا ہے"

یہاں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ پارسیوں کی مذہبی تاریخ طرح طرح کے انقلابات کا شکار رہی ہے۔ اور اس بنا پر مذکورۂ بالا عقیدہ کی کچھ زیادہ حیرت انگیز نہیں۔ یونانیوں نے جسوقت ایران فتح کیا پایۂ تخت استخر کی تباہی کے ساتھ جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے زرتشتی ادبیات بھی کلیتہً برباد ہوئیں اور صدیوں بعد تک بزمانۂ تسلط یونانی ایرانیوں کا مذہب سخت خطرہ میں رہا[۱]۔ عوام کے مذہبی معلومات کا دارو مدار محض علمائے مجوس کی ذات پر منحصر تھا جنھوں نے صرف اپنی یادداشت سے کام لیکر ساسانیوں کے زمانہ میں اپنی دینی کتابیں کسیقدر ترتیب دیں۔ ظاہر ہے کہ اصل اور نقل میں زمانہ کے رد و بدل اور خیالات کے اختلاف کی بنا پر کسقدر فرق پیدا ہو سکتا ہے چنانچہ غیر شرعی رسومات اور عقاید کی بنیاد دور اصل ساسانیوں کے زمانہ میں پڑی اور آج خود بہتیرے پارسی حضرات انکو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں[۲] پھر بھی باوجود اس کے کہ پارسی آگ کے احترام میں مبالغہ کو راہ دیتے ہیں، آفتاب کے رُخ کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر عبادت کرتے ہیں۔ اور خدا کا تقرب حاصل کرنے کے لئے فرشتوں کا توسط ڈھونڈتے ہیں تاہم اُن کے ارکانِ دین اور اُصولِ مذہب میں ان ہزاروں سال کے بعد بھی کسی طرح کا فرق نظر نہیں آئے گا۔ اپنی شریعت کے آج بھی وہ پابند اور پاکبازی و نیک عمل کے اسوقت بھی وہ قایل ہیں۔ زرتشت کے تین مشہور اُصول نیک خیال۔ نیک اقوال اور نیک افعال۔ کی پیروی آج بھی اُن کی جماعت مستعدی سے کر رہی ہے[۳]۔ اور پروفیسر مولٹن کے قول کے مطابق حقیقت میں یہ نتیجہ ہے اوستا کی اُس تعلیم کا کہ ہر شخص اپنے اعمال کے مطابق انجام کار جزا و سزا پائے گا۔ اگر نیک اعمال کا پلہ بھاری ہو گا تو انعام کا مستحق سمجھا جائے گا اور بُرے کاموں کی سزا بھگتنی پڑے گی[۴]۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ صداقت۔ ایمانداری۔ پاکبازی۔ اخلاص۔ دریا دلی۔ اور غربا پروری و ہمدردی میں اس مخصوص قوم کو دیگر اقوام عالم پر عجب طرح کی فوقیت حاصل رہی ہے اُن کی ایک مذہبی کتاب میں مرقوم ہے کہ وہی شخص متقی کہا جا سکتا ہے جو اپنے دنیاوی کاروبار میں نہ محض یہ کہ سچا اور ایماندارانہ رویہ اختیار کرتا ہے بلکہ محتاجوں

---

[۱] رالنسن مشہور انگریز مورخ کی تصنیف "ساتویں عظیم الشان سلطنت" صفحہ ۵۸-۵۵ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یونانی دربار بھی دورِ حکومت کے اختتام پر کس طرح شاپور اردشیر بانیِ خاندان ساسانی نے مجوسی علماء کے ذریعہ مذہبی کتابوں کی تدوین کی جو اسوقت تقریباً نابید ہو چکی تھیں۔ [۲] گنجینۂ مغاں (مولفہ مولٹن) اور دینیات زرتشتی (مولفہ دہالا)۔ [۳] تصنیفات ڈاکٹر دہالا۔ پروفیسر جیکسن اور ڈاکٹر ملٹن ملاحظہ فرمائیے۔ [۴] گنجینۂ مغاں صفحہ ۱۷۹۔

پر روپیہ خرچ کرتا اور اپنے عزیز و اقارب سے نیک برتاؤ لازم جانتا ہے۔ محنت و مشقت کرتا اور اپنے گھر کو آتش اور مویشی سے رونق دیتا ہے۔ اسی طرح کیشِ زرتشتی عورتوں کے لئے عصمتِ نفس اور اطاعتِ شوہر انکا بہترین وصف قرار دیتا اور مردوں کو عورتوں کے ساتھ عمدہ برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ چنانچہ اس تعلیم کا نتیجہ بھی ظاہر ہے کہ آج پارسی قوم کے زن و مرد باوجود اس کے کہ زمانہ اس قدر ترقی کر چکا ہے خوش و خرم زندگی بسر کرتے اور خانگی جھگڑوں سے ایک حد تک بچے رہتے ہیں۔ بد اطواری اور طلاق اس جماعت میں مفقود ہیں۔ لارڈ ایمپتھل نے (جو کسی زمانہ میں مدراس کے گورنر تھے) ایک بار فرمایا تھا کہ "پارسیوں کے اندر اُن کے آبا و اجداد کے مفتخر جذبات کی پابندی ایک حد تک کامیابی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے ابتک مکروہ پیشوں کے اختیار کرنے سے اپنے تئیں بچائے رکھا ہے۔ یہ اُنھیں کی زندگی کا عدیم المثال واقعہ ہے کہ اُن کی جماعت کی کسی عورت نے آج تک "کسب" سے روزی حاصل نہیں کی"[۱]۔ اسی طرح دائرۃ المعارف دین و اخلاق میں ایک مغربی عالم یوں رقمطراز ہے[۲]: "یہ فخر امتیاز پارسیوں ہی کو حاصل ہے کہ اُن کی عورتوں میں مشکل سے کوئی ایسی ملیگی جو آوارگی اور بدچلنی کی شکار ہوئی ہو"۔

خواجہ کمال الدین مرحوم نے خوب فرمایا ہے کہ پارسیوں کا شمار اُن برگزیدہ اقوام میں کیا جاسکتا ہے جن کے پیشِ نظر زندگی کے عمدہ اور پسندیدہ اُصول ہوں[۳]۔ اور بلاشبہ حضرت زرتشت کے تعلیمات کا باوجود اسقدر عرصۂ دراز گزر جانے اور زمانہ میں گوناگوں انقلاب ہو جانے کے اپنی اصلی حالت میں نہ محض اُصولاً بلکہ عملاً بھی قائم اور باقی رہجانا ہی اُن کی بزرگی اور بلند نظری کی بہت بڑی دلیل ہے۔ آج ہمدردی بنی نوع انسان کے سلسلہ میں پارسیوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے، جو اپنے لاکھوں روپئے ہر سال محض خیرات خانوں۔ مدرسوں۔ یتیم خانوں۔ شفاخانوں اور مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر میں نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی بے دریغ خرچ کرتے اور عوام الناس کو بلا امتیاز مذہب و ملت آرام و آسائش پہونچاتے ہیں۔

اپنے اصل موضوع سے الگ ہو کر ہم ذرا دوسری طرف متوجہ ہوتے اور ناظرین کی دلچسپی کے لئے تاریخ عالم کے ایک اہم باب سے بحث کرتے ہیں۔ دارائے اعظم شاہنشاہ ایران قدیم کے متعلق اکثر و بیشتر مورخین کا خیال ہے کہ اُس نے زرتشت کی وفات کے بعد مذہب کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس دارائے اعظم کا ذکر قرآن مجید اور دیگر صحفِ آسمانی میں بھی پایا جاتا ہے۔ قرآن میں

---

[۱] لارڈ موصوف نے اپنی ایک تقریر میں بمقام لندن مارچ ۱۹۰۸ء میں اس خیال کا اظہار فرمایا تھا اور جسے مسٹر ہانجی کو پرنے اپنی کتاب "حلم در دینِ زرتشت" میں نقل کیا ہے۔ [۲] جلد نہم صفحہ ۳۴۴۔ [۳] اسلام و دینِ زرتشت صفحہ ۱۱۔

ذوالقرنین (دو سینگ والے) کا ذکر آتا ہے[1]۔ کہ خدا نے اُنھیں ہر چیز پر قادر کیا تھا اور اُنھوں نے شمال اور مشرق و مغرب کے دور دراز مقامات کا سفر کرکے بے گناہ اور مظلوم قوموں کو ظالموں کے پنجہ سے رہائی دی تھی۔ بعض مقامات جہاں اُن کا گزر ہوا بحر اسود اور درمیان "دو کوہ" کے قرب و جوار میں بتائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ دو وحشی اقوام (یاجوج و ماجوج) سے محفوظ رہنے کی غرض سے اُنھوں نے مذکورہ بالا دو پہاڑوں کے درمیان ایک "سد" تعمیر کیا تھا (جسے لوگ غلطی سے سدِ سکندری بھی کہتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کو لوگوں نے سکندر یونانی سمجھا)۔ یہ باتیں انجیل مقدس میں بھی "دانیال کے خواب" میں مذکور ہیں لیکن وہاں اس "سینگ دار بھیڑ" (میش) کی تشریح بھی کر دی گئی ہے کہ وہ بادشاہ میڈیا اور فارس تھا[2]۔ ظاہر ہے کہ یہ بادشاہ سوائے دارائے اول کے کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا کیونکہ اُس کا زمانہ ۴۸۵-۵۲۱ سال قبل مسیح گزرا ہے اور "دائرۃ المعارف یہودیان"[3] کے مطابق اسی دارا نے ایرانی سلطنت کو پائدار بنا کر آرمینیا۔ کوہ قاف۔ ترکستان اور وسطِ ایشیا کو اپنے قبضہ و اختیار میں لایا تھا[4]۔ انجیل میں اس بادشاہِ اعظم کے متعلق ذکر ہے کہ اُس نے اپنے اخراجات سے یہودیوں کا معبد تعمیر کیا اور اُن کے ساتھ نہایت دریا دلی کو راہ دیا[5]۔ اسی طرح دارا کے اجداد میں سرِدش اعظم (سائرس) بھی یہودیوں کے ساتھ رواداری اور رحم و کرم کے لئے معروف گزرا ہے[6]۔ اُس کا دور ۵۲۹-۵۹۴ سال قبل پیدائش مسیح تھا اور عہدِ عتیق کے تذکروں میں سرِدش کو بھی "خدا کا چرواہا"۔ "برگزیدۂ باری"[8] - اور "نجات دہندہ بنی اسرائیل"[9] کے معزز القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر نے اُسے کفار کی سرکوبی کے لئے قوت عطا فرمائی تھی[10] اور وہ یہووا کا سچا پیرو اور ماننے والا تھا[11]۔ چنانچہ اسی بنا پر ڈاکٹر ہاگ رقمطراز ہیں کہ جن مہذب و معزز القاب سے سرِدش کو جو دینِ زرتشتی کا پابند تھا انجیل مقدس میں یاد کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کیشِ زرتشت اصلاً یہودیت سے زیادہ مختلف نہیں۔ اور یہ حقیقت کہ سرِدش اعظم بت پرستی سے علیحدہ تھا نہ محض پارسیوں کی مذہبی ادبیات سے ظاہر ہوتی ہے بلکہ ہیروڈوٹس جیسے معروف یونانی مورخ کے بیان سے بھی اس کی پوری تصدیق ہوتی ہے[12] —— دارائے اعظم کے متعلق دائرۃ المعارف برطانیہ[13] میں مرقوم ہے کہ اُس نے ایرانی سلطنت

---

[1] سورۃ ۱۸- آیۃ ۹۸-۸۳ — [2] دانیال - باب ۸- آیۃ ۳ و ۲۰ — [3] جلد چہارم - صفحہ ۴۴۱ - ذونوفون کی تالیف سائیروپیڈیا بھی ملاحظہ فرمائیے — [4] دائرۃ المعارف یہودیان - جلد چہارم صفحہ ۴۴۲ — [5] عذرا - باب ۶- آیۃ ۵- زکریا - باب یکم — [6] لغات الانجیل جلد یکم - صفحہ ۵۴۱ — [7] اشعیاء - باب ۴۴- آیۃ ۲۸ — [8] اشعیاء - باب ۴۵- آیۃ ۱ — [9] دائرۃ المعارف الانجیل - جلد یکم — [10] کتاب الاشعیاء - باب ۴۵- آیۃ یکم — [11] دائرۃ المعارف الانجیل - جلد یکم — [12] مقالات ہاگ صفحہ ۴ و ۵ — [13] جلد ششم صفحہ ۸۲۵ (طبع نہم)

کے حدود کوہ قاف اور آرمینیا تک بڑھا کر وحشی اقوام کو اُن اطراف میں زیر کیا تھا۔ پھر اسی بادشاہ کے بارے میں مستند تواریخ سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اُس نے دین زرتشتی کو استوار اور پائدار بنایا۔ پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دارا نے بنی اسرائیل کے خدا کی پرستش میں اپنی زندگی گزاری[1]۔ کیا ان باتوں کے بعد بھی دین زرتشتی کے مذہب الٰہی ہونے میں کسی طرح کے شبہ کی گنجایش باقی رہتی ہے۔

ملا باقر مجلسی ایک مشہور و معروف شیعی عالم اپنی کتاب حیات القلوب میں تحریر فرماتے ہیں[2] کہ کسی شخص نے حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق دریافت حال کیا آپ نے فرمایا کہ اُن کا نام ایاش تھا اور وہ خدا کے ایک برگزیدہ بندے تھے[3]۔ پھر اسی کتاب میں ایک دوسرے مقام پر امام جعفر صادق کا قول نقل ہو کہ خدا نے ذوالقرنین کو اُنکی قوم پر حکمران بنا کر بھیجا اور مشرق و مغرب کی پوری دُنیا اُن کے ماتحت فرمائی۔ اور جب وہ یاجوج و ماجوج نامی وحشی اقوام کے نزدیک پہونچے تو اپنی قوم کی حفاظت کے لئے درمیان میں ایک دیوار تعمیر کر دی۔

یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحر اسود اور مذکورۂ بالا "دیوار" پر تاریخی نظر ڈالی جائے اور انجیل مقدس کے بیان کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھا جائے۔ انجیل میں یاجوج و ماجوج کو وحشی اقوام بتایا گیا ہے جو انتہائے شمال اور شمالی و مشرقی ممالک میں جاگزیں تھیں[4]۔ دائرۃ المعارف یہودیان میں اُنھیں اسکاتھین اقوام میں شمار کیا گیا ہے جو کوہ قاف اور بحر خضر کے قریب بستی تھیں اور اس کی تصدیق دائرۃ المعارف برطانیہ سے بھی ہوتی ہے[5]۔ قرآن شریف میں جس بحر اسود کا ذکر ہے وہ یہی موجودہ زمانہ کا بحر اسود ہے کیونکہ زمانہ قدیم میں یہی اُن وحشی اقوام کا مسکن تھا جو اسکاتھین کے نام سے مشہور تھیں۔ تفسیر جلالین میں یاجوج و ماجوج کو شمالی ایران کی دو وحشی قومیں بتایا ہے اور "دیوار" کی تاویل ترکستانی پہاڑوں سے کی گئی ہے۔ تفسیر بیضاوی میں دو "دیواروں" سے آرمینیا اور آذربائجان کے دو پہاڑ مراد لئے گئے ہیں[6]۔ تقریباً کل مسلمان مصنفین کی اس غلط فہمی کے سبب کہ ذوالقرنین اُنکے خیال میں سکندر یونانی تھا مذکورۂ بالا سد جو درحقیقت دارائے اعظم کا تعمیر کردہ تھا سدِ سکندری مشہور ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ مستند تواریخ سے اس کا پتہ چلتا ہے کہ دارائے اول شاہنشاہ ایران ہی نے آرمینیا اور آذربائجان کے درمیان سکونت رکھنے والی اقوام کو وحشی اسکاتھین کے ظلم سے ۵۱۲ء قبل مسیح میں نجات دلائی تھی۔ دارا کے مشہور

---

[1] دائرۃ المعارف برطانیہ جلد ۷ صفحہ ۸۲۵۔ دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۴ صفحہ ۴۱م۔ دائرۃ المعارف الانجیل جلد یکم۔ [2] جلد اول منحہ منطی (دایکی پورٹیہ کیتھنو) ص ۹۶۔ [3] داریوش (دارا) اور ایاش میں شباہت لفظی بھی دلچسپ نظر آتی ہے۔ [4] حزقیل۔ باب ۳۸ آیتہ ۲۔ یوحنا۔ باب ۲۰۔ آیتہ ۸۔ تاریخ ایام۔ باب یکم۔ آیتہ ۵۔ [5] دائرۃ المعارف یہودیان جلد ۶۔ ص ۱۹۔ [6] جلد دہم ص ۴۳۶ (طبع نہم)
[7] تیسیر القاری فی شرح صحیح بخاری۔ (باب ذوالقرنین) جلد سوم بھی ملاحظہ فرمایئے۔

عالم کتبوں سے بھی اس کا حال معلوم ہوتا ہے کہ وہ زرتشت کے مذہب کا سختی کے ساتھ پابند تھا اور محض اسی بنا پر اُسنے موحد یہودیوں کے ساتھ ہمیشہ روا داری کا برتاؤ جاری رکھا۔[1]

بہرکیف اب ہم دوبارہ اپنے اصلی موضوع کی طرف رجوع کرتے ہیں اور قرآنی تعلیم اور عقاید زرتشتی کے مقابلہ کے بعد اس حقیقت کے اظہار میں ذرا بھی تامل نہیں کر سکتے کہ پارسی اپنے مذہبی خیال میں اسلام اور اسکے اُصول سے مخالفت نہیں رکھتے۔ "خدا نے صحیح اور غلط راستوں کی تمیز بہت آسان کردی ہے۔ جو شخص بھی خدا پر ایمان لایا اور شیطان سے متنفر ہوا اُس نے یقیناً ایسی مضبوط رسی پکڑی جو ہرگز کبھی ٹوٹنے والی نہیں"[2]۔ پارسی خدا سے محبت اور شیطان سے نفرت پر اسدرجہ غلو سے کام لیتے ہیں کہ عوام الناس نے اُنکو دو خداؤں کا پرستار تک سمجھنے میں دریغ نہ کیا۔

ڈاکٹر ہاگ فرماتے ہیں کہ زرتشتی اُصول اور عیسائی و موسائی تعلیمات میں اکثر و بیشتر حیرت انگیز یگانگت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اُسی ذات کو لیجئے جو کل بُرائیوں اور بدکاریوں کی باعث سمجھی جاتی ہے یا پھر عقیدۂ حیات بعد الموت پر غور کیجئے۔ یہ چیزیں ہر سہ مذاہب میں بالکل یکساں خیال کے ماتحت نظر آتے ہیں[3]۔

بالکل اسی طرح دین محمدی میں بھی بہت سی باتیں پارسی عقاید سے ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں۔ زرتشتیوں نے جس پاکبازانہ زندگی کا عملاً ثبوت دیا ہے اُس سے اُن کے پیغمبر کی اعلیٰ و ارفع تعلیم کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے اور یقیناً یہی طرز معاشرت باعثِ نجات اُخروی ہے۔ "یہ تحقیق کہ اللہ اُن ہی لوگوں کو جو ایمان رکھتے اور اعمال صالح کرتے اُس باغ میں داخل فرمائے گا جس کے نیچے دریا بہتے ہیں"[4]۔

حیات بعد الممات کے متعلق جسٹس سید امیر علی مرحوم اپنی مشہور تصنیف "روح الاسلام" میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس طرح کا عقیدہ درحقیقت یہودیوں کے یہاں اوائل میں مطلق رائج نہ تھا بلکہ جب یہودی اور زرتشتی دونوں اقوام یکجا ہوئے (غالباً سرشِ اعظم اور دارائے اول کے زمانہ میں) تو آپس کے میل جول سے یہ خیال بھی اُنکے درمیان پھیلا۔ اسی طرح مرحوم شمس العلماء جمشید جی جیونجی مودی نے بھی علمائے مغرب کی سند سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ عیسائی اور یہودی جو ملائکہ اور شیاطین کے متعلق عقیدہ رکھتے ہیں وہ حقیقتاً نتیجہ ہے ژند اوستا کی قدیم و جدید تعلیمات کا[5]۔

---

[1] دائرۃ المعارف برطانیہ۔ جلد ششم صفحہ ۸۳۵۔ دائرۃ المعارف یہودیان جلد چہارم۔ اور دائرۃ المعارف الانجیل جلد اول۔ کتاب لغات الانجیل جلد اول صفحہ ۵۵۸۔ [2] قرآن سورۃ دوم۔ آیۃ ۲۵۶۔ [3] مقالات۔ صفحہ ۵۔ [4] قرآن سورۃ ۲۲ آیۃ ۲۳ [5] مضمون "معرفت النسان" (مقالات مودی صفحہ ۱۹۰-۱۷۳)۔

ہم مختصراً بتا چکے ہیں کہ زرتشتی گروہ مسلمانوں کی طرح یہ عقیدہ بھی رکھتا ہے کہ جب خدائی مخلوق عالمِ ہیجان و انتشار میں ہوتی ہے تو خدا اُن کی ہدایت کے لئے اپنا کوئی نبی یا رہبر بھیجتا ہے۔ دنیا کے آخری دور میں جو ہادی نمودار ہوگا، اُس کا نام سوشیانس ہوگا اور اُسی کے بعد پھر قیامت رونما ہوگی۔ یہ عقیدہ مسلمانوں کے مہدی یا مسیح موعود سے ملتا جلتا ہے[1]۔

اوستائے مقدس کے سب سے قدیم حصّہ "گاتھا" میں دو طرح کی دُنیا کا ذکر ہے۔ ایک تو ہماری موجودہ زندگی والی دُنیا اور دوسرے وہ جس کا دور مرنے کے بعد شروع ہوتا ہے یعنی آخرت کا عالم[2]۔ جہاں ہمارے اچھے اور بُرے اعمال کی سزا ملے گی[3]۔ موت کے بعد دو فرشتے جو انسان کے نیک و بد افعال کا حساب لکھتے ہیں روح کو اُس عالم میں پہونچا دیں گے۔ مسلمانوں میں بھی کراماً کاتبین کے متعلق قریب قریب یہی عقیدہ ہے[4]۔ اچھائی اور بُرائی جب میزانِ انصاف میں تُل جائے گی تو ارواحِ انسانی کو پُلِ چنوات پر سے گزرنا ہوگا[5]۔ جو نیک بندے ہیں اُن کی اعانت خود پیغمبر زرتشت فرمائیں گے اور وہ بہ آسانی پُل سے گزر کر نجاتِ ابدی پائیں گے[6]۔ بدکاروں اور بدعقیدہ لوگوں کو چنوات کی باریکی اور تلوار کی دھار جیسی تیزی سے زحمتِ شدید پہونچے گی اور وہ پُل پر سے گزر نہ سکیں گے بلکہ گر کر ہمیشہ کے لئے قعرِ مذلت میں رہ جائیں گے[7]۔ اسلام میں بھی صراط کے متعلق تقریباً یہی خیال ہے۔ جنت ایک ایسی جگہ ہے، جہاں سکون و آرام کے سوا پریشانی و غم کا نام نہیں[8]۔ جہنم وہ مقام ہے جہاں فقط بے چینی اور غم و الم ہی کا عالم طاری ہے[9]۔ اگر کسی نیکوکار کافر کے بُرے اعمال نہایت کم درجہ پر ہونگے تو اُسے جہنم میں نہ ڈالا جائے گا بلکہ ایک درمیانی مقام بہشت و دوزخ کے بیچ اُس کا مسکن ہوگا[10]۔ اسی طرح وہ لوگ بھی (یعنی ایماندار) جن کے نیک و بد اعمال برابر درجے کے ہوں گے بہشت میں داخل نہ کئے جائیں گے بلکہ وہاں سے علٰحدہ ایک دوسری جگہ انھیں عطا کی جائے گی[11]۔ مذکورہ بالا خیال قرآن کے "اعراف" سے ایک حد تک ملتا ہوا نظر آتا ہے[12]۔

---

[1] وینکرد - جلد اول صفحہ ۲۹ - (ترجمہ پشوتن سنجانا) - جلد چہارم صفحہ ۲۴۷ - جلد ششم صفحہ ۳۷۹ - قرآن سورہ ۱۶ - آیۃ ۳۶ - روح الاسلام (مؤلفہ سید امیر علی) وغیرہ وغیرہ - [2] یسنا - باب ۲۸ - آیۃ ۲ - باب ۴۳ - آیۃ ۳ - [3] یسنا - باب ۳۰ آیۃ ۱۰ - باب ۴۵ - آیۃ ۷ - مینوخِرد - باب ۲۱ - آیۃ ۱۰ - [4] قرآن سورہ ۸۲ - آیۃ ۱۲ - ۱۰ - [5] یسنا باب ۲۱ - آیۃ ۱۴ - بندہشن - باب ۱۲ - آیۃ ۷ - [6] یسنا باب ۴۶ - آیۃ ۱۰ - [7] یسنا - باب ۵۱ - آیۃ ۱۳ - مینوخرد - باب ۲ - آیۃ ۱۲۳ - [8] یسنا - باب ۱۱ - آیۃ ۱ - وِسپرد - باب ۷ آیۃ ۱ - [9] یسنا باب ۳۰ - آیۃ ۴ - دادستانِ دینک - باب ۲۷ - آیۃ ۵-۷ - [10] شایست ولایست - باب ۶ - آیت ۲ - [11] یسنا - باب ۴۸ - آیۃ ۴ - [12] سورۃ الاعراف ملاحظہ فرمائیے۔

مسلمانوں کی طرح زرتشتیوں کا بھی خیال ہے کہ آخرت میں بداعمالی کی سزا دائمی نہ ہوگی بلکہ ہر شخص ایک وقت معین تک اپنی برائیوں کی سزا بھگت کر ابدی آرام وسکون کے مقام پر پہونچ جائے گا۔[1]

تخلیق کائنات کی داستان بھی پارسیوں کے یہاں اسی طرح بیان کی جاتی ہے جیسی کہ یہودیوں عیسائیوں اور مسلمانوں کے یہاں مشہور ہے۔ آدم ابوالبشر یا دنیا کا سب سے پہلا انسان کیونکر پیدا ہوا، کتنے دنوں تک زندہ رہا۔ اور نسل انسانی کب اور کس طرح شروع ہوئی کل باتیں جیسی ہمارے یہاں کی روایات میں ہیں وہی زرتشتیوں کے یہاں بھی ہیں۔[2]

ہم کسی گزشتہ باب میں ذکر کر چکے ہیں کہ ژند آستا میں طوفان نوح جیسے واقعہ کا بھی ذکر ہے جو بزمانہ شاہنشاہ جمشید ظہور میں آیا تھا۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ جمشید اسلامی روایات کا سلیمان تھا کیونکہ اس کے قبضہ و اختیار میں بھی اجنہ تھے اور جن کے متعلق مشہور ہے کہ پائے تخت استخر کے عظیم الشان عمارات اور خوبصورت باغات انھیں کے بنائے ہوئے تھے۔[3] لیکن طبری[4] نے حضرت سلیمان کو کیقباد کا ہمعصر بتلایا ہے اور لکھا ہے کہ ان دونوں کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم تھے یہاں تک کہ سلیمان علیہ السلام نے کیقباد کے جانشین کیکاؤس کو افراسیاب کے زیر کرنے میں مدد بھی پہونچائی تھی۔ خود پیغمبر زرتشت کو اکثر علماء نے حضرت ابراہیم سمجھا ہے۔[5] بہر طور کم از کم یہ بات تو پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ مجوسیوں کا ہادی غیر خدا کا پیغام لیکر لوگوں کی رہبری کو نہیں آیا تھا بلکہ حقیقت میں خدا کا بھیجا ہوا نبی تھا۔ شیخ الاشراق (المتوفی ۵۸۵ھ) نے اپنی کتاب "حکمت الاشراق" میں زرتشت کو انبیائے برحق میں شمار کیا ہے۔[6] اور حق تو یہی ہے کہ اولیت کے طرۂ امتیاز کا فخر پیغمبر ایران ہی کو حاصل ہے جنھوں نے ایسے زمانہ میں توحید کی علمبرداری کی جبکہ آریائی ایشیا عناصر فطرت کی پرستش میں محو ہو رہا تھا اور اسوقت تک کسی ہستی کو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی جرأت نہ ہو سکی تھی۔ زرتشت کے سوا کسی دوسرے کا نام اس سلسلہ میں تاریخ عالم بتلانے سے قاصر ہے۔[7] پروفیسر میکس ملر کا خیال ہے کہ آریائی اور ایرانی اقوام کا اختلاف بجود حقیقت

---

[1] داد ستان دینک۔ باب ۱۴۔ آیتہ ۸۔ باب ۳۰۔ آیتہ ۱۵۔ اور دینکرد جلد ہفتم صفحہ ۵۸۴ ملاحظہ فرمائیے۔ خواجہ کمال الدین مرحوم نے اپنی تصنیف "اسلام اور دین زرتشت" صفحہ ۹۸ میں اس مخصوص عقیدہ کے متعلق ہر دو مذہب میں یکساں خیال موجود رہنے پر نہایت تفصیلی بحث فرمائی ہے

[2] معجم البلدان (مولفہ یاقوت) جلد اول۔ کتاب آثار الباقیہ (البیرونی) مروج الذہب (مسعودی)۔ مسئلہ تخلیق انسان (مولفہ جمشید جی مودی)

[3] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول۔ کتاب المعارف (ابن قتیبہ)۔ [4] ترجمہ فارسی (نولکشور) جلد دوم صفحہ ۱۸۹۔

[5] روضۃ الصفا (میرخوند) جلد اول جزو اول۔ [6] ملاحظہ ہو کتاب الکلام (مولفہ مولانا شبلی) جلد اول صفحہ ۱۴۹۔

[7] ملاحظہ ہو روح الاسلام (دیباچہ) مولفہ مرحوم سید امیر علی۔

ایک ہی جماعت کے افراد تھے محض زرتشتی تبلیغِ توحید کے بعد ظہور میں آیا۔[1] یہاں پر مناسب ہو گا کہ علامہ سر محمد اقبال کی معرکۃ الآرا تصنیف "ترقیِ الٰہیات در ایرانِ قدیم" سے اسی موضوع پر چند سطریں نقل کی جائیں۔ موصوف فرماتے ہیں:-

"اُس زمانہ میں جبکہ وید کے اشلوک ابھی وسطِ ایشیا میں نظم کا جامہ پہن رہے تھے اور ایرانی آریا ہر چہار طرف خانہ بدوش ہو کر پھر رہے تھے۔ زرتشت کا ظہور ہوا لوگوں میں یکبارگی اطمینان کی زندگی گزارنے کی عادت پڑی اور زراعت و کاشتکاری میں سب کے سب مصروف ہو گئے۔ حکماء اور فلاسفہ کی جماعت میں زرتشت کا درجہ سب سے بلند و ارفع ہے۔ ایرانیوں کی شاخ آریاؤں سے الگ ہوتی ہی جا رہی تھی کہ زرتشت نے اپنی مذہبی تعلیم سے اُنھیں بالکل ہی جداگانہ قوم بنا دیا"

بدقسمتی سے پیغمبرِ ایران کے زمانہ کا صحیح طور تعین کرنے کے لئے ہمارے پاس مواد موجود نہیں۔ مغربی علماء نے بابلی اور یونانی مورخین کے بیانات پر کیانی اور اخمنی خاندانوں کو جنکی جداگانہ حکومتیں ایران کی تاریخ میں مسلم ہیں ایک ہی سلسلۂ حکمرانان سمجھ کر زمانہ بعد کے لئے غلط فہمی کا دروازہ کھولا۔ عربوں نے اُن ہی کی تقلید کی۔ حالانکہ ایرانی روایات سے اس بات کا پورا پتہ چلتا ہے کہ یہ دو مختلف خاندان تھے جنھوں نے ایران پر یکے بعد دیگرے حکومت کی۔[2] اخمنیوں کی ابتدا سروش اعظم کے عہد سے ہوتی ہے جس نے ۵۵۹ قبل مسیح میں میڈیا۔ فارس (جنوبی ایران) اور بابل پر تسلط حاصل کیا تھا۔ اس خاندان کا اختتام ۳۳۱ میں قبل مسیح ہوا۔ زرتشت کا ظہور شاہ گشتاسپ کیانی کے عہد میں بہت عرصہ قبل ہو چکا تھا اور اُسوقت پورا فارس (ایران) میڈیا والوں کے زیر اثر تھا۔[3] کیانی خاندان کی حکومت شمالی مشرقی خطۂ ایران پر محدود تھی اور ان کا پایۂ تخت باختر تھا۔ اور چونکہ ان کا تسلط پورے ایران پر نہ تھا اس لئے لوگوں نے ایرانی حکمرانوں کے سلسلہ میں کیانیوں اور اخمنیوں کو (جن کا قبضہ سارے ملک پر آخر زمانہ میں ہوا) خلط ملط کر کے ایک کر ڈالا۔[4] اخمنی پکے زرتشتی تھے اور انھوں نے اس مذہب کو تمام ایران میں رائج کیا۔[5] تاریخ میں پیشدادی شاہانِ ایران کے بعد اخمنی خاندان ہی کا نام آتا ہے یا کبھی کبھی یہی اخمنی سلاطین کیانی بھی کہلاتے ہیں۔ البیرونی نے اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔[6] وہ لکھتا ہے کہ تمام وہ کتابیں جو سیر و تاریخ کے متعلق مغربی زبانوں سے ترجمہ کی گئیں اُن میں سلاطینِ ایران و بابل کا حال فریدوں کے عہد سے شروع اور دارائے ثانی پر ختم

---

[1] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۴۳ — [2] تجلیِ ایران قدیم (مولفہ پیتھیا والا) اور تاریخ ایران قدیم (مولفہ کرشاسپ) ملاحظہ فرمائیے — [3] تاریخ عظیم الشان سلطنتیں (مولفہ رالنسن) جلد سوم صفحہ ۲۲۴ — [4] ایضاً صفحہ ۲۳۲ — اور تاریخ ایران جلد اول باب ۱۰ (مولفہ سائکس) — [5] تاریخ عظیم الشان سلطنتیں۔ جلد سوم صفحہ ۲۲۵ — [6] آثار الباقیہ صفحہ ۱۱۴ (ترجمہ انگریزی طبع سخاؤ)

ہوتا ہے لیکن جب ہم ان کی تعداد اور اُن کے نام اور زمانۂ حکومت کا مشرقی روایات سے مقابلہ کرتے ہیں تو بہت اختلاف معلوم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں واقعہ کی اصلیت یہی ہو سکتی ہے کہ لوگوں نے ایرانی سلاطین کے ناموں کو اُن کے بابلی حکام کے ناموں کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔" حمزہ اصفہانی نے بھی تقریباً یہی باتیں بیان کی ہیں ان دو مسلم مورخوں کے علاوہ عہد حاضر کے ایک مغربی عالم ڈاکٹر کیتھ جو قدیم آریائی اور ایرانی تواریخ و تمدن کے بہت بڑے ماہر ہیں تحریر فرماتے ہیں[ک] کہ "زرتشت کا ظہور دارائے اخمنی کے زمانہ میں معین کرنا سخت نادانی ہے" اخمنیوں کے عہد سے قبل کیانیوں کی حکومت ایران پر مسلم الثبوت ہے۔ اور جیسا کہ قبل میں ذکر کیا جا چکا ہے پیغمبر ایران نے اپنی تبلیغ کیانی خاندان کے بادشاہ گشتاسپ کے زمانہ میں شروع کی تھی۔ علاوہ ازیں دارائے اعظم (اخمنی) کے وہ کتبے جو کوہ بیستون اور نقش رستم میں کندہ کئے ہوئے پائے جاتے ہیں اُن میں دارا نے کسی نئے مذہب کے رواج دینے کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تک ایران میں زرتشتی مذہب قائم ہو چکا تھا اور دارا خود بھی اُس کا پابند تھا۔

(باقی)

محمد طاہر رضوی۔ ام۔ اے

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" "حسن و عشق کی مکمل داستان ہے اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں۔ اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہی کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ۔ ضخامت ۳۰۰ صفحات۔

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ۔ یوپی

ک تاریخ۔ باب یکم۔ صفحہ ۶۱۰ — ک رسالہ سہ ماہی تاریخ ہند (مارچ ۱۹۲۵ع)

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

پہلا ایکٹ - دوسرا منظر

(قصر شاہی کا صحن۔ آفتاب غروب ہونے کو ہے۔ صحن کے سامنے شہ نشین ہے جو سنگ مرمر کی عالی وضع کی جالیوں سے گھرا ہوا ہے۔ صحن کے بیچ میں پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے۔ ہندو اور مسلمان زرق برق درباری لباس پہنے دکھائی دیتے ہیں عورتیں بھی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ڈھول اور سنکھ بجتا ہے۔ قصر شاہی کا دروازہ اندر کی طرف سے کھول دیا جاتا ہے۔ جس میں سپاہی پہلوان شمشیر باز اور پھنکیت داخل ہو کر صف بصف قرینے سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ایک توپ دغتی ہے اور مہارانی انندراؤ کا ہاتھ پکڑے مع دیوان اور دیگر وزراء کے شہ نشین پر نمودار ہوتی ہے۔ تمام مجمع تین مرتبہ باادب جھک کر سلام کرتا ہے تیسرے سلام کے بعد دیوان صاحب مع رانی و انندراؤ آگے بڑھتے ہیں۔)

نرسنگھ:- بھائیو اور بہنو! تمھیں یہ افسوسناک واقعہ معلوم ہے کہ ہمارے محبوب اور ہر دلعزیز راجہ گنگا دھر راؤ کا ایک مہینہ ہوا انتقال ہو گیا ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے انھوں نے مرنے سے قبل اپنا ولیعہد اور جانشین متبنّیٰ کر لیا تھا۔ یہ لڑکا رانی صاحبہ اور وزیروں نے منتخب کیا تھا جسے خود آنجہانی راجہ نے دیکھ کر پسند کر لیا تھا۔ اور اس طرح متوفی راجہ کے جنازہ کی آخری رسمیں ادا کی جا سکی تھیں۔ متوفی راجہ صاحب نے یہ بھی ہدایت اور وصیت کی تھی کہ جب تک متبنّیٰ ولیعہد حکومت کرنے کے قابل ہو اس وقت تک ان کی بیوہ رانی لکشمی بائی، جن کا بیحد احترام ہمارے دلوں میں ہے، ولیعہد کی طرف سے ریاست کا نظم و نسق انجام دیں، اگرچہ ابھی تک کمار انندراؤ کی تبنیت گورنر جنرل نے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کی، لیکن رانی صاحبہ کی خواہش یہ ہے کہ اب بلا توقف تم لوگوں کے سامنے وہ شخص پیش کر دیا جائے جو آیندہ تمھارا فرمانروا ہوگا۔ (انندراؤ کی طرف گھوم کر)۔ لہٰذا یہ میرا گرانقدر اور خوش آیند فرض ہے کہ میں کنور انندراؤ کو

تمھارے سامنے پیش کروں جو سورگیہ راجہ گنگادھر راؤ کا متبنیٰ بیٹا اور ولیعہد ہے جس وقت ہماری انگریزی سرکار کی طرف سے تبنیت کو تسلیم کئے جانے کی اطلاع رانی صاحبہ کو یا مجھے بحیثیت دیوان پہونچے گی اسوقت تمام وفادار رعایا اور عہدیداران ریاست کی طرف کنور صاحب کی پذیرائی مناسب طور پر عمل میں آئے گی۔ فی الحال ہم اسیقدر کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے آیندہ فرمانروا کے متعلق عام اعلان کردیں۔ "کنور انند راؤ کی جے!" "کنور انند راؤ کی جے!!"

(مجمع نعروں کی تکرار کرتا ہے، اور رانی آگے بڑھ کر اس طرح خطاب کرتی ہے)

رانی :- میری محبوب رعایا اور محترم دوستو! جو کچھ پچھلے دنوں محلسرا میں ہو چکا ہے اسے دیوان صاحب نے بالکل صحیح طور پر بیان کیا ہے۔ جس پر میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن ممکن ہے کہ میرے بعض تازہ کاموں کی وجہ سے آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کا اضطراب ہو اس لئے ضروری ہے کہ ان کی کسی قدر توضیح کردیجائے آپ میں سے بعض کو تعجب ہوگا کہ میں ایک ہندو بیوہ ہو کر جس کا دھرم شاستر کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے، اپنے محترم شوہر کی وفات کے بعد اس قدر جلد کیوں منظر عام پر آگئی مگر بات یہ ہے کہ اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو میں سوگ کی قدیم رسموں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتی۔ لیکن موجودہ زمانہ سخت خطرات سے پُر ہے۔ ایک عجیب قسم کی بیچینی اور گھبراہٹ ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آئے دن نت نئی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں۔ الغرض موجودہ فضا تغیر و انتشار سے معمور ہے۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو چکا ہے اور اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے ایک نئی بالادست طاقت نے لے لی ہے۔ حال ہی میں ہمارے بعض بہت پرانے حکمران خاندان مٹ چکے ہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ جو سلطنتیں ہندوستان میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں وہ نابود ہو چکی ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ہمیں اپنی چھوٹی سی مگر محبوب ریاست جھانسی کی طرف سے بھی فکر و تشویش لاحق ہو۔ اس لئے میرا یہ کہنا ہرگز قابل اعتراض نہیں ہو سکتا کہ جو حشر ہم سے زیادہ طاقتور اور بڑی ریاستوں کا ہو چکا ہے، اس سے جھانسی کو بچانے کے لئے ہمیں جلد از جلد کوئی تدبیر کرنا چاہئے اور ابتلا و مصائب کے موجودہ نازک دور میں ولیعہد کی وراثت اور حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر میں سرگرم کار ہو جاؤں تو اس سے گویا میرے سورگیہ پتی کی زیادہ عزت و توقیر ہوگی۔ جس طرح دیوی سروپ اہلیا بائی نے سرگرم عمل ہو کر قلمروئے ہولکر کو محفوظ رکھا، اسی طرح خدا کی توفیق و نصرت سے، میں بھی خدمت وطن کرنے کی کوشش کروں گی، اور تا حد امکان جھانسی راج کو بچا دوں گی۔ اسی لئے آج میں آپ لوگوں سے کہتی ہوں کہ آپ صاف صاف بتا دیں کہ آپ سورگیہ راجہ کی اس دور اندیشی کو کہ انھوں نے کمار انند راؤ کو اپنا ولیعہد بنایا، پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں چاہئے کہ اس بارہ میں انگریزوں کے دل میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہ رہنے دیں کہ جھانسی کے لوگ حکمران خاندان کے وفادار ہیں۔ نیز یہ کہ ستارہ یا ناگپور کے حالات خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں لیکن جھانسی اپنے موجودہ حکمرانوں کے ماتحت مطمئن ہے۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں اپنی آزادی و

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

پہلا ایکٹ - دوسرا منظر

(قصر شاہی کا صحن - آفتاب غروب ہونے کو ہے - صحن کے سامنے شہ نشین ہے جو سنگ مرمر کی مغلئی وضع کی جالیوں سے گھرا ہوا ہے - صحن کے بیچ میں پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے - ہندو اور مسلمان زرق برق درباری لباس پہنے دکھائی دیتے ہیں عورتیں بھی ہیں - تھوڑی دیر بعد ڈھول اور سنکھ بجتا ہے - قصر شاہی کا دروازہ اندر کی طرف سے کھول دیا جاتا ہے - جس میں سپاہی پہلوان شمشیر باز اور پھنکیت داخل ہو کر صف بصف قرینہ سے کھڑے ہو جاتے ہیں - اس کے بعد ایک توپ دغتی ہے اور مہارانی انندراؤ کا ہاتھ پکڑے مع دیوان اور دیگر وزراء کے شہ نشین پر نمودار ہوتی ہے - تمام مجمع تین مرتبہ باادب جھک کر سلام کرتا ہے تیسرے سلام کے بعد دیوان صاحب مع رانی و انندراؤ آگے بڑھتے ہیں -)

نر سنگھ:- بھائیو اور بہنو! تمھیں یہ افسوسناک واقعہ معلوم ہے کہ ہمارے محبوب اور ہردلعزیز راجہ گنگا دھر راؤ کا ایک مہینہ ہوا انتقال ہو گیا ہے - لیکن خوش قسمتی سے انھوں نے مرنے سے قبل اپنا ولیعہد اور جانشین متبنٰی کر لیا تھا - یہ لڑکا رانی صاحبہ اور وزیروں نے منتخب کیا تھا جسے خود آنجہانی راجہ نے دیکھ کر پسند کر لیا تھا - اور اس طرح متوفی راجہ کے جنازہ کی آخری رسمیں ادا کی جا سکی تھیں - متوفی راجہ صاحب نے یہ بھی ہدایت اور وصیت کی تھی کہ جب تک متبنٰی ولیعہد حکومت کرنے کے قابل ہو اس وقت تک ان کی بیوہ رانی لکشمی بائی، جن کا بیحد احترام ہمارے دلوں میں ہے، ولیعہد کی طرف سے ریاست کا نظم و نسق انجام دیں، اگرچہ ابھی تک کمار انندراؤ کی تبنیت گورنر جنرل نے باقاعدہ طور پر تسلیم نہیں کی، لیکن رانی صاحبہ کی خواہش یہ ہے کہ اب بلا توقف تم لوگوں کے سامنے وہ شخص پیش کر دیا جائے جو آئندہ تمھارا فرمانروا ہو گا - (انندراؤ کی طرف گھوم کر) - لہٰذا یہ میرا اگرانقدر اور خوش آیند فرض ہے کہ میں کنور انندراؤ کو

تمھارے سامنے پیش کروں جو سورگیہ راجہ گنگادھر راؤ کا متبنیٰ بیٹا اور ولیعہد ہے۔ جس وقت ہماری انگریزی سرکار کی طرف سے تبنیت کو تسلیم کئے جانے کی اطلاع رانی صاحبہ کو یا مجھے بحیثیت دیوان پہونچے گی، اسوقت تمام وفادار رعایا اور عہدیداران ریاست کی طرف کنور صاحب کی پذیرائی مناسب طور پر عمل میں آئے گی۔ فی الحال ہم اسیقدر کافی سمجھتے ہیں کہ اپنے آیندہ فرمانروا کے متعلق عام اعلان کردیں۔ "کنور انندراؤ کی جے!" "کنور انندراؤ کی جے!!"

(مجمع نعروں کی تکرار کرتا ہے، اور رانی آگے بڑھ کر اس طرح خطاب کرتی ہے)

رانی :۔ میری محبوب رعایا اور محترم دوستو! جو کچھ پچھلے دنوں محلسرا میں ہو چکا ہے اسے دیوان صاحب نے بالکل صحیح طور پر بیان کیا ہے۔ جس پر میں مزید اضافہ کی ضرورت نہیں سمجھتی لیکن ممکن ہے کہ میرے بعض تازہ کاموں کی وجہ سے آپ لوگوں کے دلوں میں کسی قسم کا اضطراب ہو اس لئے ضروری ہے کہ ان کی کسی قدر توضیح کردی جائے آپ میں سے بعض کو تعجب ہوگا کہ میں ایک ہندو بیوہ ہو کر جس کا دھرم شاستر کے احکام پر عمل کرنا فرض ہے، اپنے محترم شوہر کی وفات کے بعد اس قدر جلد کیوں منظر عام پر آگئی مگر بات یہ ہے کہ اگر حالات ایسے نہ ہوتے تو میں سوگ کی قدیم رسموں کو ہرگز نظر انداز نہ کرتی۔ لیکن موجودہ زمانہ سخت خطرات سے پُر ہے۔ ایک عجیب قسم کی بیچینی اور گھبراہٹ ملک میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آئے دن نت نئی افواہیں پھیلتی رہتی ہیں۔ الغرض موجودہ فضا تغیر و انتشار سے معمور ہے۔ مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوچکا ہے اور اس کی جگہ دیکھتے دیکھتے ایک نئی بالادست طاقت سنے لے لی ہے۔ حال ہی میں ہمارے بعض بہت پرانے حکمران خاندان مٹ چکے ہیں۔ اور ابھی کل کی بات ہے کہ جو سلطنتیں ہندوستان میں نمایاں حیثیت رکھتی تھیں وہ نابود ہوچکی ہیں۔ پھر کیا تعجب ہے اگر ہمیں اپنی چھوٹی سی مگر محبوب ریاست جھانسی کی طرف سے بھی فکر و تشویش لاحق ہو۔ اس لئے میرا یہ کہنا ہرگز قابل اعتراض نہیں ہوسکتا کہ جو حشر ہم سے زیادہ طاقتور اور بڑی ریاستوں کا ہوچکا ہے، اس سے جھانسی کو بچانے کے لئے ہمیں جلد از جلد کوئی تدبیر کرنا چاہئے اور ابتلاء و مصائب کے موجودہ نازک دور میں ولیعہدی کی وراثت اور حقوق کو محفوظ رکھنے کے لئے اگر میں سرگرم کار ہوجاؤں تو اس سے گویا میرے سورگیہ پتی کی زیادہ عزت و توقیر ہوگی۔ جس طرح دیوی سروپ اہلیا بائی نے سرگرم عمل ہو کر قلمرو ئے ہولکر کو محفوظ رکھا، اسی طرح خدا کی توفیق و نصرت سے، میں بھی خدمت وطن کرنے کی کوشش کروں گی، اور تا حد امکان جھانسی راج کو بچا دوں گی۔ اسی لئے آج میں آپ لوگوں سے کہتی ہوں کہ آپ صاف صاف بتادیں کہ آپ سورگیہ راجہ کی اس دور اندیشی کو کہ انھوں نے کمار انندراؤ کو اپنا متبنیٰ بنایا، پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں چاہئے کہ اس بارہ میں انگریزوں کے دل میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہ رہنے دیں کہ جھانسی کے لوگ حکمران خاندان کے وفادار ہیں۔ نیز یہ کہ ستارہ یا ناگپور کے حالات خواہ کچھ بھی ہوئے ہوں لیکن جھانسی اپنے موجودہ حکمرانوں کے ماتحت مطمئن ہے۔ ہم اپنی اس چھوٹی سی ریاست میں اپنی آزادی و

خود مختاری کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی حفاظت وقیام میں ہم کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کریں گے۔

(رانی کے آخری الفاظ پر ہر طرف سے تعریف کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اور تقریر ختم ہوتے ہی "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوتا ہے مجمع نعرہ کی تکرار کرتا ہے جس سے تمام محل گونج اُٹھتا ہے۔ اسکے علاوہ "انند کمار کی جے" کے نعرے بھی لگائے جاتے ہیں۔ پھر رانی مجمع کا سلام لیتی ہے، انند راؤ کا ہاتھ پکڑ کر چلی جاتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے دیگر وزرا بھی چلے جاتے ہیں۔ صرف دیوان رہجاتا ہے، جو بازیگروں پہلوانوں وغیرہ کو اپنے کرتب دکھانے کا حکم دیتا ہے۔ اور خود بھی چلا جاتا ہے۔ باجہ بجتا ہے اور کھیل شروع ہو جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ایک ترپ دغتی ہے۔ فوراً سب لوگ باادب صف بستہ ہو جاتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے جس میں سے، انند راؤ سادہ لباس میں اور راؤ آپا تلوار ہاتھوں میں لئے داخل ہوتے ہیں۔ اسی وقت رانی صاحبہ، دیوان اور دیگر وزرا بھی شہ نشین پر نمودار ہوتے ہیں راؤ آپا اور انند کمار شہ نشین کی طرف اپنی تلواریں اُٹھا کر سلامی دیتے ہیں۔ سلام کا جواب اوپر سے ملتا ہے۔ بعد ازاں مجمع کی طرف رُخ کر کے سلامی دی جاتی ہے۔ مجمع بھی جواباً تین سلام کرتا ہے اس کے بعد راؤ آپا اور انند کمار دونوں شمشیر زنی کرتے ہیں۔ ہر طرف سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ اس کے بعد پہلوانوں، بازیگروں وغیرہ کے تماشے شروع ہو جاتے ہیں۔ راؤ آپا کا پاؤں پھسلتا ہے وہ گر پڑتا ہے اور انند کمار اُس کے سینہ پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ رانی "کمار انند کی جے" کا نعرہ لگاتی ہے۔ پردہ گرتا ہے اور ہر طرف سے "رانی صاحبہ کی جے" اور "جھانسی راج کی جے" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔)

پہلا ایکٹ ۔۔۔ تیسرا منظر

(اسی دن غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ بعد قصر شاہی کا دربار آراستہ ہے۔ وسط میں تخت رکھا ہوا ہے، داخلہ کا دروازہ دور فاصلہ پر سامنے نظر آتا ہے، پردہ اُٹھتا ہے اور دیوان، ماما صاحب، دو دیگر وزراء اور میجر ایلیس (اس زمانہ کی سُرخ اور نیلی وردی پہنے) نظر آتے ہیں۔ میجر صاحب گدی کے قریب اور اس کے برابر ماما صاحب بیٹھے ہیں۔ دیوان ان کے سامنے کھڑا ہے۔ دوسرے دو وزیر کسیقدر فاصلہ پر آہستہ آہستہ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔)

میجر ایلیس :- دیوان صاحب! میں عجب شش و پنج میں ہوں۔ اگر میرے دل میں متوفی راجہ صاحب کا
احترام نہ ہوتا تو یہاں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا گوارا نہ کرتا اور اب میجر مالکم مجھ سے ضرور جواب طلب کریں گے کہ جب رانی
گورنر جنرل سے کھلم کھلا سرتابی کر چکی تھی تو میں نے اس سے ملاقات کرنا کیوں منظور کیا۔ یہ معاملہ بہت نازک ہو گیا ہے
اور گزشتہ چند سال سے میں ذاتی طور پر جھانسی راج کی فلاح و بہبود میں جو دلچسپی لیتا رہا ہوں اس کا اب مجھے
افسوس ہو رہا ہے۔

نرسنگھ :- میجر صاحب! پرماتما جانتا ہے کہ مجھے اور ماما صاحب کو آپ کی حالت کا بخوبی احساس ہے (ماما صاحب
بھی سر ہلا کر ہاں میں ہاں ملاتے ہیں) اور ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ صبر و استقلال اور اپنی حسب معمول
فیاضی سے کام لیتے رہیں۔ آپ یقین فرمائیں کہ ہم لوگوں نے رانی صاحبہ کو روکنے کی ہر چند کوشش کی مگر انھوں نے
ایک نہ مانی۔ بلکہ اُلٹی ہم کو یہ دھمکی دی کہ وہ لوگوں میں اعلان کر دیں گی کہ ہم جھانسی راج کے الحاق کے بارہ میں
انگریزوں سے ساز باز کر رہے ہیں۔

ماما صاحب :- میجر صاحب! میں آپ سے بہ حلف عرض کرتا ہوں کہ ہم لوگ بالکل مجبور تھے۔ میں نے رانی کو بہت
سمجھایا مگر اُس نے انکار کر دیا۔

میجر ایلیس :- (سوچ کر) آپ کہتے ہیں کہ لڑکے کی صغر سنی کے زمانہ میں وہ ریاست کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں رکھنگی۔

دونوں :- جی ہاں!

میجر :- کیا آپ دونوں صاحبوں کے دشمن بھی ہیں؟

نرسنگھ :- نہیں! کم از کم ہمارے محکمۂ جاسوسی کو تو اس کا علم نہیں ہے۔

میجر :- (معنی خیز طور پر ماما صاحب سے) ہوں! آپ کا کوئی دشمن نہیں ہے۔ تو گستاخی معاف! کیا رانی
صاحبہ کا کوئی دوست ایسا ہے۔ جس سے ان کے بہت زیادہ گہرے تعلقات ہوں؟

ماما صاحب :- بحیثیت رانی کے ان کے مشیر کار ضرور ہونے چاہئیں۔ لیکن بلحاظ وفاداری وہ اپنے مرنے والے شوہر
پر اب بھی جان دیتی ہے گویا وفاداری شوہر کی زندگی میں بھی صرف فرض کی حیثیت رکھتی تھی اور اس میں کوئی جذبۂ
محبت شامل نہ تھا۔

(گھنٹہ بجتا ہے سب چوکنا ہو جاتے ہیں۔ میجر اور ماما صاحب، دونوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور دوسرے
دو وزیر بھی آ کر دیوان صاحب کے قریب کھڑے ہو جاتے ہیں)۔

میجر :- صاحبو! یہ معاملہ بہت ہی نازک ہو گیا ہے۔ واقعی بہت نازک۔ اور نہ معلوم اس کا نتیجہ کیا ہو۔ لیکن آپ
سمجھ لیجئے۔ میں رانی صاحبہ سے تنہا ملاقات نہیں کر سکتا۔ ایسا کرنا گویا انھیں جھانسی راج کا فرمانروا تسلیم کر

اور جو کچھ احکام مجھے دئے گئے ہیں وہ بھی آپ خوب جانتے ہیں۔ پس آپ پوری طرح سمجھ لیجئے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو جب تک آپ لوگ موجود رہیں گے، میں رانی صاحبہ کے سامنے رہوں گا۔ اگر آپ لوگ ہٹ جائیں گے تو میں بھی چلا جاؤں گا۔

(کمرہ میں دور سامنے کی طرف سے ایک جلوس داخل ہوتا ہے۔ آگے آگے دو لڑکے چنور لئے ہوئے ہیں ان کے پیچھے چار عورتیں خاصدان وغیرہ لئے ہوئے ایک کشتی میں شربت کی بوتل اور چند بلوریں گلاس۔ دو آدمی زرکار پردہ تانے آتے ہیں ان کے پیچھے رانی اور گنگا بائی داخل ہوتے ہیں۔ تمام وزرار ماما صاحب اور اہل دربار جھک کر سلام کرتے ہیں میجر ایلیس جس کے ہاتھ میں پروں کی کلغی دار خود ہے جھک کر سلام کرتا ہے۔ رانی گدی کے سامنے ایک تخت پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ رہتا ہے۔ خادم خنجر بکف پردہ کے پاس استادہ ہو جاتے ہیں۔ گنگا بائی بھی رانی کے پاس بیٹھتی ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب! آپ نے ہمارے معزز مہمان کے لئے کیا سامان تفریح بہم پہونچایا ہے؟

نرسنگھ :۔ (پردہ کے قریب آکر)۔ میں نے تو میجر صاحب سے اصرار کے ساتھ عرض کیا تھا کہ گویوں اور ناچنے والیوں کو طلب کر لیا جائے لیکن انھوں نے عذر پیش کر کے انکار کر دیا۔ اور فرمانے لگے کہ دن بھر سخت کام کرتے گزرا ہے۔ خستہ ہو گیا ہوں اس لئے رات کو سویرے ہی سو کر علی الصباح یہاں سے دور کسی ضروری کام کو چلا جاؤں گا۔

رانی :۔ اوئی! میجر صاحب کو جھانسی سے چلے جانے کی اسقدر جلدی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ وہ ہمارے یہاں تشریف لانا ہمیشہ پسند کرتے ہیں اور خود آپ نے ہی تو کہا تھا کہ وہ ہمارے بڑے دوست ہیں۔

(دیوان میجر ایلیس کی طرف دیکھتا ہے جو کچھ پس وپیش کے بعد اٹھ کر پردہ کے قریب آتا ہے)

میجر :۔ رانی صاحبہ! نہیں یہ بات نہیں، میں جھانسی آنے میں ہمیشہ خوش رہا اور خوش رہوں گا۔ لیکن آج کل، جیسا کہ آپ کو بھی معلوم ہے، صورت حالات کسی قدر نازک ہو گئی ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ کمار صاحب کی تبنیت کی منظوری ملنے سے قبل جو میں آپ کے دربار میں حاضر ہو گیا ہوں اس پر مجھ سے ضرور جواب طلب ہوگا۔

رانی :۔ میجر صاحب! میں آپ کو ہرگز پریشان کرنا نہیں چاہتی خصوصاً اس لئے کہ آپ جھانسی راج کے خیر خواہ ہیں۔ میں مرہٹہ قوم کی عورت ہوں اس لئے میں آپ کو حکم سے سرتابی کرنے کی ہرگز ترغیب نہ دوں گی۔ مگر چونکہ اب آپ یہاں موجود ہی ہیں، اس لئے اگر تھوڑا سا رقص و سرود ہو جائے تو کیا مضایقہ ہے؟ اور اس بات سے تو آپ خود واقف ہیں کہ اس ملک کے رہنے والے کسی اہم کام کو ہاتھ لگانے سے پہلے دل و دماغ کی کسی قدر تفریح بہت پسند کرتے ہیں علاوہ ازیں ایسا شغل نہ صرف ہمارے مہمانان عزیز کا حق ہے بلکہ ہماری خودداری بھی اسی امر کی متقاضی ہے۔ بہر حال اگر آپ بہت زیادہ خستہ ......

میجر :۔ (جوش کے ساتھ مگر پھر کچھ سنبھل کر)۔ نہیں رانی صاحبہ ہرگز نہیں! بلکہ میں تو آپ کی خاطر و مدارات کو

اپنے لئے باعث عزت و مسرت سمجھتا ہوں۔ مجھے یہ خیال تھا کہ شاید اسوقت آپ خود ہی اس قسم کے مشاغل تفریح کی طرف مائل نہ ہوں۔

رانی :۔ (حاکمانہ لہجہ میں)۔ میجر صاحب! آج کی تاریخ سے جھانسی راج کی عنانِ حکومت میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لی ہے۔ اور اگرچہ رنڈاپے کا سوگ میں حتی الامکان حسب رواج زمانہ میں مناؤں گی، لیکن راج کے متعلق جو فرائض مجھ پر عائد ہوتے ہیں وہ سب باتوں پر مقدم رہیں گے۔ لہذا آپ میرے آرام و سہولت کا کچھ خیال نہ فرمایئے میرا مرتبہ اس امر کا متقاضی ہے کہ میں جھانسی میں اپنے معزز مہمان کے شایان شان کوئی انتظام کروں اور تاوقتیکہ آپ ہمارے خیر مقدم کو قبول کرنے سے قطعی انکار نہ کر دیں میں گویوں اور اپنے یہاں کی ایک بہترین رقاصہ کو ضرور طلب کروں گی۔

(خفیف سا سکوت۔ میجر ایلیس دیوان صاحب کی طرف دیکھ کر خاموش ہو جاتا ہے۔ ادھر گنگا بائی پردہ کے پیچھے سے میجر کو جھانک کر دیکھتی ہے۔ اور پھر پیچھے ہٹکر آنکھوں ہی آنکھوں میں تمام کیفیت رانی سے بیان کرتی ہے۔ اگرچہ میجر ایلیس کی طرف سے پردہ ہے مگر تمام دربار رانی اور گنگا بائی کو دیکھ رہا ہے)

رانی :۔ دیوان صاحب! میرا بائی کو حکم دیجئے، سازندوں کو فہمایش کر دیجئے کہ زیادہ شور نہ ہو۔ میجر صاحب اور آپ سب صاحب تشریف رکھیں۔ اور مجھے بزم رقص و سرود کی شرکت سے معاف فرمائیں مگر یہ سمجھ لیں کہ آپ صاحب کی تفریح سے میرا دل خوش ہو گا۔

(رانی اور گنگا بائی اُٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ میجر صاحب، وزراء اور دیگر درباری اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد میرا بائی کو جو جھانسی دربار کی سب سے اچھی اور مشہور رقاصہ ہے لیکر آتے ہیں۔ میرا بائی پردہ کے پاس آکر مجرا و بندگی کرتی ہے۔ بعد ازاں رقص شروع ہوتا ہے۔ میجر صاحب خوش ہو کر رقاصہ کو انعام دیتے ہیں۔ گنگا بائی دبے پاؤں پس پردہ آکر چاروں طرف جھانکتی ہے اور پھر رانی کو اشارہ سے بلاتی ہے۔ مگر رقص و سرود کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے)

رانی :۔ لالہ جی! میرا بائی، اور سازندوں کو معقول انعام دیا جائے۔ ان لوگوں نے آج بڑی محنت سے میجر صاحب اور اہلِ دربار کا جی خوش کیا ہے۔

(میرا بائی جھک جھک کر پہلے پردہ کو، پھر میجر ایلیس، دیوان صاحب، دیگر وزراء اور معززین دربار کو سلام کرتی ہے)۔

رانی :۔ اچھا تو اب میں میجر صاحب سے بات چیت کرنے کے لئے تیار ہوں، پتا جی آپ، دیوان صاحب اور

سب لوگ یہاں سے جاسکتے ہیں کیونکہ میں میجر صاحب سے تخلیہ میں گفتگو کروں گی۔

(میجر ایلیس، دیوان اور ماما صاحب جلد جلد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ دیوان کے اشارہ سے سب لوگ ہٹ جاتے ہیں)

نرسنگھ:۔ رانی صاحبہ! یقیناً میں، اور سب لوگ آپ کے حکم کی تعمیل کے لئے طیار ہیں لیکن میجر صاحب نے ہم سے فرمایا ہے کہ ان کا رانی صاحبہ سے تخلیہ میں ملنا ممکن نہ ہوگا۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر انھوں نے یور ہائنس سے تخلیہ میں ملاقات کی تو ان کے اس فعل کو آپ کی نیابت تسلیم کر لینے کے مترادف سمجھا جائے گا۔ اس لئے میجر صاحب مجبور ہیں کہ آپ سے گفتگو کرنے کے وقت جھانسی راج کے تمام وزرا موجود رہیں۔ حضور میری اس ناچیز گزارش کو قبول فرمائیں۔ کیونکہ موجودہ صورت حال ہم سب کے لئے بہت نازک ہے۔

رانی:۔ (بگڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے)۔ اچھا تو یوں کہئے کہ ملکہ معظمہ اور گورنر جنرل کا نمایندہ جھانسی میں صرف اس لئے آتا ہے کہ وہ ریاست کے خلاف ریاست کے ملازموں سے ساز باز کرے۔ اور کیا ان معزز صاحب بہادر کا جھانسی راج سے اظہار محبت اور میرے محترم پتاجی اور لایق وزیروں کے مجھ سے اظہار وفاداری کا یہی طریقہ ہے؟

ماما صاحب:۔ بیٹی شانتی سے کام لو تم نہیں سمجھتیں کہ تمہارا ایسا کہنا ہمارے معزز مہمان پر ظلم کرنا ہے۔ جس طرح ہم لوگ یعنی تمہارے ملازم تمہاری ہر بات کی تعمیل کرتے ہیں، اسی طرح میجر صاحب بھی اپنے افسران بالادست کے احکام کی تعمیل کر رہے ہیں۔ جب تک انگریزی ارباب حل وعقد کمار صاحب کی تبنیت تسلیم نہیں کرلیں گے اسوقت تک میجر صاحب صرف دیوان صاحب اور وزیروں سے تعلق رکھنے پر مجبور ہیں۔ اصول یہی ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان سے جھانسی راج اور دیگر ریاستوں میں امتیاز کرنے کی توقع رکھی جائے۔

رانی:۔ (تلخ لہجہ میں) اچھا اگر میجر صاحب مجھے جھانسی راج کا نمایندہ سمجھ کر ملاقات نہیں کر سکتے تو مجھ سے عورت ذات ہی سمجھ کر بات چیت کریں، دنیا کا کوئی قاعدہ اس امر کا مانع نہیں کہ مرد کسی عورت سے بات چیت کرے اور خصوصاً انگریزوں میں تو کوئی ایسا قاعدہ ہے ہی نہیں کیونکہ یہ لوگ عورتوں سے اسقدر دلچسپی لیتے ہیں کہ بمقابلہ اپنی بیویوں کی دوسروں کی بیویوں کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں۔

میجر:۔ (مصالحانہ لہجہ میں) رانی صاحبہ! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ کی دعوت قبول کرنا میرے لئے بہت کچھ باعث عزت ہوگا۔ لیکن میں یہ خیال نہیں کر سکتا کہ آپ عدول حکمی کی سزا میں میری بے عزتی اور ملازمت سے برطرفی کو گوارا کریں گی۔

رانی:۔ لیکن اگر آپ مجھ سے چند لمحے اس طرح باتیں کرلیں جیسے ایک مرد کسی عورت سے گفتگو کرتا ہے، تو اس کی خبر کس کو ہوگی؟ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جہاں تک میرا تعلق ہے، اس واقعہ کی کسی کو اطلاع نہ ہوگی، خواہ کمار اندر راؤ کی تبنیت کے

بارہ میں آئندہ کچھ بھی ہوتا رہے۔ اور آپ اس بات سے بھی مطمئن رہیں کہ نہ تو دیوان صاحب، نہ دیگر وزراء اور نہ میرے والد اس بارہ میں کوئی گفتگو کریں گے کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ انگریزوں سے بگاڑ نہ ہو۔ (طنزیہ لہجہ میں) یا یوں کہئے کہ وہ زبان سے ظاہر کرتے ہیں۔

(دیوان صاحب، ماما صاحب اور دوسرے دونوں وزیر گھبرا جاتے ہیں اور ندامت سے سرنگوں ہو جاتے ہیں)

میجر:۔ (نرم ہو کر) بہت اچھا رانی صاحب! اگر آپ یہ معاملہ اس طرح رکھنا چاہتی ہیں تو بہتر ہے میں طیار ہوں،
(دیوان صاحب) ۔ چونکہ رانی صاحبہ کا منشا یہی ہے اس لئے آپ ہم کو تنہا چھوڑ سکتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ باہر ایک حرف زبان سے نہ نکلے۔

رانی:۔ اور تو اس کے لوگوں کے بھی کان کھول دئے جائیں کہ اگر کسی قسم کی سرگوشیاں میرے لئے ہوئیں تو سخت سزا دونگی۔

(نرسنگھ ماما صاحب کی طرف آنکھ سے اشارہ کرتا ہے بعد ازاں پردہ کو سلام کرکے چل دیتا ہے۔ دیگر وزراء بھی سامنے کے دروازہ سے اس کے پیچھے پیچھے چلے جاتے ہیں)۔

ماما صاحب:۔ (پردہ کے پاس جا کر) میں سمجھتا ہوں کہ شاید آپ میرا یہاں سے چلا جانا پسند نہ کریں گی۔ کم از کم اپنی رعایا کے خیالات اور محسوسات کا تو آپ کو ضرور خیال ہونا چاہئے۔ کیونکہ وہ لوگ ضرور اعتراض کریں گے کہ سورگیہ راجہ کی بیوہ رانی ایک انگریز سے تنہا ملاقات کرتی ہے۔ دل میں سوچ لو کہ ہمارے دشمن بندیلکھنڈ والے یہ افواہ سنکر کیا کہیں گے کہ جھانسی کی رانی نے ایک انگریز افسر سے تنہا ملاقات کرنے پر اصرار کیا۔ میں امید کرتا ہوں کہ میجر صاحب میری اس آزادی کو معاف فرمائیں گے کہ میری گفتگو میں ان کا نام آیا۔

(میجر صاحب کی طرف دیکھ کر آہستہ سے آداب عرض کرتا ہے)

رانی:۔ پتاجی! چونکہ آپ نے صاف گوئی سے کام لیا ہے اس لئے اگر میں بھی آپ کو صاف گوئی سے جواب دوں تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اور میں امید کرتی ہوں کہ میجر صاحب مجھے اسی طرح معاف فرمائیں گے جیسے کہ آپ کو پتاجی! آپ میری رعایا کے خیالات اور محسوسات کی طرف اشارہ فرماتے ہیں، لیکن آپ کو اسوقت میرے جذبات کا خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے ایک ایسے شخص کے حبالۂ نکاح میں دیدیا جو عمر میں میرے نانا کے برابر تھا۔ اور قوائے جسمانی کے لحاظ سے قطعی بیکار۔ آپ کو اسوقت کچھ خیال نہ آیا جب آپ نے مجھے اوائل عمر کی بیوگی کی مصیبت میں پھنسایا۔ مجھے جو اسوقت بھی جوان ہے، اصور تدار ہے، جس کا ارمان تھا کہ بچوں کی ماں بنے، جو شوہر کی معیت اور محبت کی خواہاں تھی لیکن جو بقصور ان تمام باتوں سے محروم کردی گئی۔

(پردہ ہٹا کر میجر ایلیس کے سامنے آجاتی ہے جو رانی کے حسن و جمال کو دیکھ کر حیران رہجاتا ہے)

پتاجی! اب میں اپنی ذات اور اپنی زندگی کی آپ مالک رہوں گی اور اپنے اغراض و مقاصد اور جھانسی کے لئے جان قربان کردوں گی مجھے راجہ گنگادھر راؤ کی رانی بنا کر آپ اس مرتبۂ اعلیٰ پر پہونچ گئے ہیں جس کی آپ کو تمنا تھی۔ اب اس اعزاز اور منصب کو قائم رکھئے۔ لیکن آیندہ اپنے معاملات طے کرنے کے لئے مجھے آزاد چھوڑ دیجئے۔

(ماما صاحب کسی قدر شش و پنج کے بعد رانی اور میجر ایلیس کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ اور کمرہ سے نکل جاتا ہے۔ رانی ادھر اُدھر دیکھ کر مسند پر بیٹھ جاتی ہے۔ میجر صاحب بھی سرک کر رانی کے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور گنگا بائی اُٹھ کر کمرہ کے ایک گوشہ کی طرف چلی جاتی ہے)۔

رانی:۔ (کچھ سکوت کے بعد حزیں آواز سے) میجر صاحب! کیا ملکہ معظمہ بھی کبھی تنہائی محسوس کرتی ہیں؟

میجر:۔ (سٹ پٹا کر)۔ رانی صاحبہ! اس امر پر میں نے کبھی غور نہیں کیا۔ لیکن قیاس یہی کہتا ہے کہ اور لوگوں کی طرح سے ہماری نیک اور شریف ملکہ وکٹوریہ بھی ضرور کبھی تنہائی محسوس کرتی ہوں گی، اگرچہ ان کی شادی کو اب تیرہ سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اور اپنی اہلی زندگی سے وہ بہت خوش ہیں۔

رانی:۔ کہتے ہیں کہ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ان کے موجودہ شوہر کا انتقال ہو جائے تو کیا آپ کے خیال میں وہ دوسرا نکاح کرلیں گی؟ آپ کے یہاں ازدواج ثانی کا رواج ہے یا نہیں؟

میجر:۔ ہاں رانی صاحبہ ہمارے یہاں اس کا رواج ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ ہماری قوم کی وہ تمام عورتیں جو بیوہ ہو جاتی ہیں دوسرا شوہر کرلیتی ہیں۔ ہماری قوم کی بعض بیوائیں اپنی محبت میں اسقدر صادق ہوتی ہیں کہ وہ بیوہ ہونے کے بعد اپنے شوہر کے نام پر بیٹھی رہتی ہیں۔ اور یونہی زندگی گزار دیتی ہیں۔ ہاں بعض ایسی ہیں جو دوسرا نکاح کرنا پسند کرتی ہیں یا حالات انھیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ لیکن ان کی تعداد اُن سے بہت زیادہ ہے۔ (کسی قدر مسکرا کر) کہتے ہیں کہ کنوارے مرد، جیسا کہ میں ہوں، بیوہ عورتوں کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں اور اسی وجہ سے انگلستان میں یہ مثل مشہور ہے کہ "بیوہ عورتیں خطرناک ہوتی ہیں"۔

رانی:۔ آپ نے یہ تو ضرور سنا ہوگا کہ کلکتہ میں اس معاملہ پر بحث ہو رہی ہے کہ ہندو عورتوں کو دوسرا نکاح کرنیکی اجازت دی جائے۔

میجر:۔ (رانی کی طرف غور سے دیکھ کر)۔ ہاں! میں نے یہ بات سنی ہے اور مجھے اس معاملہ سے دلچسپی بھی ہے۔ اس مسئلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟

رانی:۔ (چھت کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہاں معمولی درجہ کی عورتوں کے لئے تو یہ تجویز بہت مفید ہو سکتی ہے لیکن اونچی ذات کی کوئی ہندو بیوہ، اگر دل میں یہ خواہش رکھتی بھی ہو تو دوسرا شوہر کرنے کی جسارت نہیں کرے گی کیونکہ ایسا کرنے سے ہندو سوسائٹی میں وہ اسقدر حقیر و ذلیل ہو جائے گی کہ لوگ اسے اچھوت کی طرح سمجھنے لگیں گے اور

وہ زندگی پر موت کو ترجیح دینا پسند کرے گی۔

میجر:۔ تو کیا رانی صاحبہ! آپ کے خیال میں ایک اونچی ذات کی ہندو بیوہ کے لئے یہی زندگی مناسب ہے کہ وہ دنیا بھر سے الگ تھلگ رہے!

رانی:۔ میجر صاحب! ہمارے یہاں کے رسم و رواج کا سمجھنا آپ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ ہمارے لئے آپ کے رسم و رواج کا سمجھنا۔ ہندو عورتوں کی پرورش اس عقیدہ کی فضا میں ہوتی ہے کہ بیوی اپنے شوہر کا ایک جزو لاینفک ہے۔ جس کے بغیر اس کی زندگی مکمل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں کسی ہندو لڑکی کو اچھا شوہر مل جاتا ہے تو وہ فرض سمجھتی ہے کہ شوہر کی وفات کے بعد بھی وہ اس کی وفادار رہے۔ اسی وجہ سے ہندو بیوائیں ستی ہو جایا کرتی تھیں۔ مگر چونکہ سرکار انگریزی نے ستی کی رسم ممنوع قرار دیدی ہے اس لئے وہ اپنے شوہر سے دیگر طریقوں پر اظہار وفاداری کرنے پر مجبور ہوتی ہے اسی سبب سے میں خیال کرتی ہوں کہ ہندوؤں میں اونچی ذات کی بیوائیں دوسری شادی کرنا کبھی پسند نہ کریں گی۔

میجر:۔ لیکن ان عورتوں کی نسبت آپ کا کیا خیال ہے جن کی اہلی زندگی مسرور ثابت نہیں ہوئی؟ یا جن عورتوں کے خاوندوں نے ان سے بُرا برتاؤ کیا تھا، کیا وہ بھی اپنے پہلے شوہر کے نام پر وفادار بیٹھی رہیں؟

رانی:۔ ان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے خاندان کی وفادار رہیں، اپنی ذات یا برادری پر جان نثار کر دیں یا اپنے راج کی خدمت کرتے کرتے فدا ہو جائیں (مسند سے اُٹھتے ہوئے)۔ یہی وہ اغراض ہیں جن کی تکمیل کے لئے اب میں زندہ ہوں، اور میجر صاحب! یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لئے میں نے آپ سے تنہا بات چیت کرنے کی خواہش کی۔

میجر:۔ (خود بھی اُٹھتے ہوئے)۔ رانی صاحبہ! تا حد امکان مجھے آپ کی مدد کرنے میں بیحد مسرت ہوگی .... میں آپ کے خیالات و جذبات کو سمجھتا اور ان کو بنظر استحسان دیکھتا ہوں۔

رانی:۔ (جذبات کو روکتے ہوئے) میجر صاحب میرا دل گواہی دیتا ہے کہ میں آپ پر بھروسہ کر سکتی ہوں۔ لہذا میں جو کچھ بھی آپ سے کہوں گی وہ بالکل صاف صاف کہوں گی۔ آج شام جب میں نے آپ سے تنہا ملنے پر اصرار کیا تھا تو میں یہ چاہتی تھی کہ آپ سے دو سوال دریافت کروں۔ پہلا سوال تو یہ ہے کہ جب متوفی راجہ نے انند کمار کی صغر سنی میں مجھے جھانسی راج کے لئے نائب السلطنت نامزد کرنا چاہا تو آپ نے اس کی مخالفت کیوں کی تھی؟

میجر:۔ (سرنگوں ہو کر غور کرتا ہے)۔ اچھا اب میں آپ سے تمام حقیقت آشکار کئے دیتا ہوں بشرطیکہ آپ رازداری کا وعدہ فرمائیں (رانی سر کے اشارہ سے وعدہ کرتی ہے)۔ وجہ یہ تھی کہ میں آپ کے وزیروں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے میرے دل میں اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ آپ کے باپ کے ساتھ مل کر محض اپنے ذاتی اغراض کے لئے جھانسی راج میں سیاہ و سفید کے مالک ہو جائیں گے۔ اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے آپ کو اپنا آلۂ کار بنالیں گے۔

رانی :۔ کیا اب بھی آپ کا خیال وہی ہے ؟

میجر :۔ نہیں رانی صاحبہ! اب میں ایسا نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ اب تو یہ خیال ہے کہ جس طرح اہلیا بائی نے اندور کو بچایا غالبًا اسی طرح آپ بھی جھانسی راج کو بچا سکیں گی۔

رانی :۔ (مذہبی جوش میں آکر) آہ میجر صاحب! کاش میں دیوی سروپ اہلیا بائی کے نقش قدم پر چلنے کے قابل ہوتی وہ اوتار ہے اور میں اس کی پجارن۔ وہ گرو ہے اور میں اس کی چیلی۔

میجر :۔ اور رانی صاحبہ! آپ کا دوسرا سوال!

رانی :۔ (پہلے پس و پیش کرتے ہوئے اور پھر جرأت کے ساتھ) میجر صاحب! آپ ایک قابل اعتماد دوست ہیں۔ لہٰذا مناسب ہوگا کہ ہم دونوں صفائی سے گفتگو کریں۔ (آواز دھیمی کرکے) میں یہ معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ جو مصیبت جھانسی راج پر نازل ہوتی نظر آتی ہے، کیا وہ گورنر جنرل سے لیکر آپ تک، کسی شخص کو کچھ دے دلا کر ٹل سکتی ہے؟ اگر ایسا ہوسکتا ہے تو ازراہ مہربانی بتایئے کہ کتنی رقم کس کو نذر کی جائے۔ (بلند آواز سے) جو کچھ بھی ہو میں نے جھانسی کو بچانے کا تہیہ کرلیا ہے۔

میجر :۔ (اٹھ کر گویا جانا چاہتا ہے)۔ رانی صاحبہ! آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کر رہی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا، اور سرکار انگریزی کے ساتھ رشوتوں سے معاملہ طے نہیں کیا جاتا۔

رانی :۔ (طنزیہ) ممکن ہے میجر صاحب زمانہ بدل گیا ہو لیکن آدمی جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ آجکل انگریزی افسران اپنے لئے روپیہ نہ لیتے ہوں، مگر جس گورنمنٹ کے وہ ملازم ہیں وہ روپیہ کے بجائے ہماری املاک اور جائدادیں غصب کرتی رہتی ہے۔ (کسیقدر نرمی سے)۔ میجر صاحب! معاف فرمایئے میں آپ کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آپ ایک دل شکستہ اور مصیبت زدہ عورت کی ہفوات کو معاف کر دیجئے کیونکہ وہ دنیا کے طور وطریق سے واقف نہیں۔

میجر :۔ (رانی کی طرف متوجہ ہوکر)۔ میں تو آپ سے پیشتر ہی عرض کرچکا ہوں کہ اپنی قابلیت کی حد تک میں آپ کی مدد کرنے کو طیار رہوں۔ اب آپ ہی فرمائیں کہ میں اس سے زیادہ کیا کرسکتا ہوں؟۔

رانی :۔ (دھیمی مگر لجاجت آمیز آواز میں)۔ میجر صاحب! مجھے آپ کی مدد سے زیادہ کچھ اور درکار ہے۔ آپ مجھ سے اس بات کا وعدہ کیجئے کہ میری جھانسی مجھ سے نہ چھینی جائے گی۔ یہ میری جان ہے، یہ میری اولاد ہے، یہی میری زندگی کا سہارا ہے۔ اور خواہ کچھ ہو، میں جھانسی کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دوں گی۔ (قریب آکر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر)۔ میجر صاحب! ابھی آپ کنوارے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ روپیہ نہیں تو ایک صاحب عصمت ہندو بیوہ کا نرم و نازک جسم آپ کو راضی رکھ سکے ـــــ بہرحال اب میں صرف جھانسی کے لئے جیتی ہوں، اور میں اس کے لئے ہر چیز

قربان کرسکتی ہوں۔[1]

(تھوڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ملاکر دیکھتے ہیں۔ اسی اثنار میں کسی پٹاخہ یا کسی چیز کے دھماکے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ دونوں چونک جاتے ہیں اور آواز کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ گنگا بائی دوڑ کر شہ نشین کی طرف جاتی اور فوراً چلاتی ہوئی واپس آکر کہتی ہے "آتشبازی شروع ہوگئی ہے" یہ کہہ کر وہ پھر شہ نشین کی طرف دوڑ جاتی ہے اور وہاں "کمار انند کی جے" کے نعروں میں شریک ہوجاتی ہے جو مجمع کی طرف سے بلند ہورہے ہیں۔)

میجر:۔ رانی صاحبہ! یہ ممکن ہے کہ ہم انگریز لالچی، سخت گیر یا غاصب ہوں، لیکن جب ہم کسی شخص میں جرأت و دلیری کا جوہر دیکھتے ہیں تو اُسے تسلیم کرلیتے ہیں۔ آپ کی قربانی غیر ضروری ہے۔ اگر جھانسی کو بچانے کے لئے کوئی تدبیر ہوسکیگی تو آپ یقین رکھیں کہ میں اسے ضرور انجام دوں گا۔

(جھک کر آداب بجالاتا ہے اور جھکا ہی جھکا اُلٹے پاؤں ہٹکر کمرہ سے چلا جاتا ہے۔)

رانی:۔ (دو تین مرتبہ سلام کرتے ہوئے)۔ سلام! میجر صاحب سلام!! آپ نے میری قربانی کو مسترد کردیا۔ خیر۔ اب دعا ہے کہ شیوجی مہاراج، وشنو بھگوان، اور برہماجی آپ کی مدد کریں اور آپ کی بے غرضانہ کوششوں کو کامیاب بنائیں۔ (میجر کے جاتے ہی وہ شہ نشین کی طرف متوجہ ہوتی ہے) ہائے یہ آوازیں میرے دل میں کیسا ہنگامہ بیم و رجا پیدا کررہی ہیں۔

(پردہ گرتا ہے)

(باقی)

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اُردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کردئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۱۲ر۔

منیجر نگار لکھنؤ

[1] ہوسکتا ہے کہ مصنف نے یہ ٹکڑا صرف "زیب داستان" کے لئے بڑھایا ہو۔ کیونکہ ہمارے پاس "جھانسی کی رانی" کی زندگی کی کوئی ایسی تفصیلی تاریخ موجود نہیں جس سے اس واقعہ کی تصدیق ہوسکے۔ (اڈیٹر)

مسئلہ آبادی اور ہندوستان

ضبطِ تولید پر عمل کرنا ناگزیر ہے

(مسئلہ آبادی)

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ دنیا کی آبادی ہمیشہ سے بڑھتی ہی رہی ہے، لیکن تاریخی طور پر یہ کہنا غلط ہے اگر ہم آبادی کے اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ صدیوں تک یکساں حالت رہی ہے صرف پچھلی صدی سے اس میں اضافہ ہوا ہے، یہاں تک کہ گزشتہ سو سال میں دُنیا کی آبادی نو ارب سے بڑھ کر اٹھارہ ارب ہو گئی ہے۔

اس کی وجہ زیادہ تر یہ خیال کی جاتی ہے کہ گزشتہ زمانہ میں وبائیں، جنگیں اور قحط وغیرہ زیادہ ہوتے تھے جو آبادی کے اکثر حصہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا کرلے جاتے تھے لیکن اب سائنٹفک اور علمی انکشافات اتنے ہوگئے ہیں کہ آبادی کے اس طرح گھٹنے کا زیادہ امکان نہیں رہا۔ بلکہ آسائش و آرام کا وافر سامان مہیا ہونے اور خوراک وغیرہ کی طرف سے نسبتاً زیادہ مطمئن ہو جانے سے اس کے بڑھنے کا زیادہ امکان ہے؟

اس حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اب یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ آیا ہماری مادی اور اقتصادی حالت اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے کافی ہے یا آئندہ چلکر ہمارے ذرائع ایک معتد بہ حصۂ آبادی کو خوراک بہم پہونچانے سے انکار کر دیں گے؟ یہ سوال یوروپ میں آج کل زیرِ بحث ہے اور ہندوستان میں بھی اس کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ مغربی مفکرین نے اُنیسویں صدی کے صنعتی و تجارتی انقلاب کے زمانہ سے ہی اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ اس ضمن میں مالتھس نے ایک نظریہ قائم کیا جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے چوٹی کا مسئلہ شمار ہوتا ہے۔

(مالتھس کا نظریہ)

مالتھس نے آبادی کی رفتار اور سامان خورد و نوش کا بغور مطالعہ کرکے یہ نظریہ قایم کیا کہ اگر رفتارِ پیدائش کا یہی حال رہا تو ایک زمانہ ایسا آئے گا جب آبادی کا اکثر حصہ سامانِ خورد و نوش سے بالکل محروم رہیگا۔ اگر آجکل کی

رفتار پیدائش کو سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان کا ایک جوڑا ایک ہزار سات سو پچاس برس میں دنیا کی موجودہ آبادی کے برابر بچے پیدا کرسکنے پر قادر ہے۔ لیکن خوراک کا اسی نسبت سے ترقی پانا قریباً ناممکن ہے کیونکہ قدرت اس باب میں اتنی فیاض نہیں، چنانچہ اسی خیال کے ماتحت مالتھس نے مجملاً اپنی تھیوری کو یوں بیان کیا کہ:- "اگر آبادی اقلیدس کی نسبت سے ترقی پاتی ہے تو خوراک ریاضی کی نسبت سے بڑھتی ہے"۔ جس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ اگر آبادی ۲-۴-۸-۱۶-۲۴-کی نسبت سے بڑھتی ہے تو خوراک کی نسبت اُس کے مقابلہ میں صرف ۱-۲-۳-۴-۵ ہے۔ گویا خوراک کے لئے آبادی کے قدم بقدم چلنا سخت دشوار ہے اور ایک ایسا وقت آنا ضروری ہے جب اکثر حصۂ آبادی بغیر سامان خورد ونوش کے رہجائے گا یا اگر ایسا نہیں تو بقیہ حصۂ آبادی کو اپنا معیار زندگی بہت پست کرنا پڑے گا تاکہ اس محروم شدہ حصۂ آبادی کا پیٹ پل سکے۔

(زائد از ضرورت آبادی کی نشانیاں)

اب سوال یہ ہے کہ یہ منزل ہندوستان کی معاشی زندگی میں آچکی ہے یا اُس کو آنا ہے یا آنے کا احتمال ہے؟ اس کے لئے ہمیں معلوم کرنا ہوگا کہ زائد از ضرورت آبادی کی نشانیاں کیا ہیں؟ یعنی وہ کیا حالات ہیں جن کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں ملک اس منزل پر آچکا ہے؟

(۱) - ایک علامت تو یہ ہے کہ رفتار پیدائش اور رفتار اموات دونوں زیادہ ہوں خصوصاً بچوں کی اموات آبادی بڑھ رہی ہے اور اُس کے مقابلہ میں سامان خورد ونوش کے بڑھنے کا کوئی زیادہ احتمال نہ ہو اور رفتار اموات اسلئے کہ لوگ اپنی اقتصادی حالت کے آخری نقطہ پر قائم ہیں اور وہ مزید آبادی کے لئے گنجایش نہیں نکال سکتے۔

(۲) - دوسری علامت یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی کم ہو اور آبادی بڑھ رہی ہو۔

(۳) - تیسری علامت یہ ہے کہ آبادی خود اختیاری روک کی بجائے قدرتی موانع کی وجہ سے کم ہو رہی ہو یعنی آبادی کو ایک حد کے اندر لانے میں برتھ کنٹرول کی بجائے قدرتی ذرائع از قسم وبا ور جنگ وغیرہ کارفرما ہوں کیونکہ صرف آبادی کو ایک خاص حد تک محدود کرنا ہی مقصود نہیں ہوتا بلکہ اُس کی قوت عمل کو بھی ایک خاص معیار تک قائم رکھنا ضروری ہے۔ قدرت کے طریق کار عجیب ہیں۔ کیونکہ وہ تو آبادی کے ایک بیشتر حصہ کو خس وخاشاک کی مانند بہا کر لے جاتی ہے لیکن اُس کا اثر باقی ماندہ آبادی پر نہایت خوفناک ہوتا ہے۔ مثلاً بہار میں شدید زلزلہ آیا اور آبادی گھٹ گئی لیکن اُس کے اثرات کتنے بُرے ثابت ہوئے۔ زمین کاشتکاری کے ناقابل ہوگئی۔ کارخانے تباہ ہوگئے ہزاروں عمارتیں منہدم ہوگئیں گویا کروڑوں روپیہ کا سرمایہ اور محنت بالکل ضائع گئی اور اب اُسی حالت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے ایک زمانہ درکار ہے۔ علاوہ اس کے لوگوں کے حوصلے پست ہوگئے اور اب وہ نئے سرے سے انھیں کاموں کو دوبارہ کرنے سے گھبراتے ہیں۔ پس قدرت کے طریق کار سے لوگوں کی محنت برباد ہوجاتی ہے

اور وہ حوصلہ شکنی کے ایسے قعر میں گر پڑتے ہیں کہ ملک کی اقتصادی ترقی ہونی محال ہے۔

(رفتارِ اموات و پیدائش)

اب اگر ہندوستان کو اِن اُصول کے لحاظ سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں زائد از ضرورت آبادی پائی جاتی ہے۔ پہلے رفتارِ پیدائش و اموات کو دیکھئے:۔ ہندوستان کی اوسط پیدائش سنہ ۱۹۱۱ء میں ۳۸ فی ہزار تھی اور سنہ ۱۹۲۰ء میں ۳۲ فی ہزار۔ اسی طرح رفتارِ اموات سنہ ۱۹۱۱ء میں ۳۰ فی ہزار ہوئی اور سنہ ۱۹۲۰ میں ۳۱ فی ہزار کے قریب۔ درانحالیکہ عام حالات میں کسی ملک کی رفتارِ پیدائش و اموات ۲۸ اور ۱۵ فی ہزار سے زائد نہیں ہونی چاہئے (یہ ماہرین اقتصادیات کا اندازہ ہے) اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہماری رفتارِ پیدائش تو معیاری رفتار سے چنداں بلند نہیں لیکن رفتارِ اموات بہت زیادہ ہے۔ جو ثبوت ہے اس بات کا کہ غربت کی وجہ سے ہمارا ملک مزید آبادی کو اپنے اندر جگہ دینے سے قاصر ہے۔ اگر ان اعداد و شمار کا دیگر ممالک کے ساتھ مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہندوستان اس بارہ میں نہایت تیرہ بخت واقع ہوا ہے۔ مثلاً انگلستان کی رفتارِ پیدائش و اموات سنہ ۱۹۲۶ء میں صرف ۱۷ اور ۱۱ تھی۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ ہندوستان کی غربت اور آبادی کا کیا حال ہے۔ یہاں ہزاروں بچے روزانہ پیدا ہوتے ہیں اور ہزاروں ہی مرجاتے ہیں کیونکہ بوجہ غربت اُن کی غور و پرداخت نہیں ہوسکتی اور ہو بھی کیسے؟ ملک میں لاکھوں ایسے اشخاص پہلے سے ہی موجود ہیں جن کو ایک وقت بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ دوسروں کو کھلا سکیں۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں ہزار کے پیچھے دو تین سو بچے ہر سال فنا ہو جاتے ہیں جس کی کچھ وجہ تو صغر سنی کی شادی ہے جس سے بچے کمزور پیدا ہوتے ہیں اور وہ ذرا سی بے پرواہی سے مرجاتے ہیں۔ اسکی اصلاح میں غربت و جہالت سدِ راہ ہیں۔ الغرض ہمارے ملک کی رفتارِ پیدائش و اموات دونوں زیادہ ہیں اور خصوصاً بچوں کی اموات تو بہت زیادہ ہیں اور جس ملک کے یہ حالات ہوں وہ زائد از ضرورت آبادی کا حامل ہوا کرتا ہے۔

(ہندوستان کی فی کس آمدنی)

دوسری نشانی ہم نے یہ بتائی تھی کہ فی کس آمدنی کا اوسط کم ہو اور آبادی بڑھ رہی ہو۔ اس بارہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوستان غیر ضروری طور پر آباد ہے۔

(خود اختیاری رکاوٹیں)

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آبادی خود اختیاری روک کی وجہ سے کم ہو رہی ہے یا قدرتی موانع کی وجہ سے اول تو ہندوستان کی آبادی ایک حیرت انگیز رفتار سے بڑھ رہی ہے لیکن اگر کسی حد تک گھٹ بھی رہی ہے

تو اس کی وجہ خود اختیاری روک نہیں بلکہ قدرتی ذرائع ہیں۔ اب ہم چند خود اختیاری موانع کو لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُن کا اثر آبادی کے گھٹانے پر کس حد تک پڑتا ہے:۔

۱۔ قوتِ تولید

ہندوستان کی عورتوں کی قوتِ تولید دوسرے ممالک کے مقابلہ میں نہایت کم ہے۔ اعداد و شمار کی رو سے اگر ولایتی عورتوں کی قوت تولید ۱۹۶ فی ہزار ہے تو ہندوستانی عورتوں کی صرف ۱۶۰ فی ہزار۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ بحیثیت مجموعی ہماری عورتیں دیگر ممالک سے کم بچے پیدا کرتی ہیں کیونکہ یہاں بچے پیدا کرنے والی عورتیں بہ نسبت دیگر ممالک کے زیادہ ہیں۔ اس لئے ہماری عورتوں کی کم قوتِ تولید کی وجہ سے آبادی کے گھٹنے پر کوئی معتدبہ اثر نہیں پڑتا۔

اس کے علاوہ بعض اوقات اتفاقیہ یا خود اختیاری طور پر بھی قوتِ تولید یا رفتار پیدائش کم ہو جاتی ہے مثلاً اگر شوہر بارش وغیرہ کے نہ ہونے کی وجہ سے سفر پر چلا جائے یا کسی بیماری کے سبب بیوی کے ساتھ مباشرت نہ کر سکے تو آبادی کے گھٹنے کا احتمال ہے۔ اسی طرح طبقہ اعلیٰ یا اوسط میں اب اسقاط حمل وغیرہ کا خیال پیدا ہو رہا ہے لیکن یہ دونوں باتیں اسقدر کم اثر رکھتی ہیں اور اسقدر گاہے گاہے معرضِ عمل میں آتی ہیں کہ ان کا ملک کی آبادی پر کوئی خاطر خواہ اثر نہیں پڑتا

۲۔ معاشری رسوم

ہندوستان میں بعض معاشری رسوم ہیں جن کی وجہ سے آبادی کے گھٹنے کا احتمال ہے لیکن افسوس ہے کہ اُن کا بھی زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ مثلاً عرصہ تک دودھ پلانا۔ ہندو مذہب کی رو سے بعض آدمیوں کیلئے شادی نہ کرنے کا حکم یا برہمچاریہ اور سنیاس کی تعلیم۔ اور ایک سے زیادہ شوہر یا بیویاں کرنے کی اجازت نہ ہونا یہ ایسی باتیں تھیں، جو آبادی کو زیادہ بڑھنے نہ دیتیں، لیکن اس کے مقابلہ میں ہندو مسلم دونوں مذہبوں میں ہر شخص کو شادی ضرور کرنی چاہئے اس لئے طوعاً و کرہاً ہر شخص شادی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے متذکرۃ الصدر باتوں کا اثر بھی زائل ہو جاتا ہے۔ پس معاشری رسوم کی وجہ سے بھی آبادی کم نہیں ہوتی۔

۳۔ برتھ کنٹرول

آبادی کے بڑھنے میں تیسری خود اختیاری رکاوٹ یہ ہو سکتی ہے کہ لوگ اپنے نفس پر ضبط کر کے کم بچے پیدا کریں اور صرف اُسی وقت بچے پیدا کریں جب اُن کو یقین ہو کہ اُن کی خاطر خواہ تربیت کرنے کا بھی سامان مہیا ہو سکے گا، مگر افسوس ہے کہ یہ احساس بھی ابھی ہمارے ہندوستانیوں میں نہیں ہے۔

برتھ کنٹرول کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ دیر کے بعد شادی کی جائے لیکن اس کے برخلاف ہمارے

ملک میں صغر سنی کی شادی کا رواج ہے جو ہماری آبادی کو ایک حد کے اندر رکھنے کے منافی ہے۔

الغرض ہمارے ملک میں خود اختیاری رکاوٹوں کی وجہ سے آبادی نہیں گھٹتی بلکہ قدرتی قوتیں اسکے کم کرنے میں مصروف عمل ہیں۔ مثلاً عام طور پر ہر بیس سال کے بعد ہمارے ملک میں کوئی نہ کوئی آفت یا وبا ضرور آجاتی ہے جس سے آبادی کا اکثر حصہ راہیٔ عدم ہوجاتا ہے۔ پھر ہماری زراعت زیادہ تر بارش کے رحم پر موقوف ہے جو کبھی ہوتی ہے اور کبھی نہیں ہوتی اور اس لئے آبادی کا اکثر حصہ غربت و افلاس میں مبتلا رہنے کی وجہ سے حوادث زمانہ کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔

(رفتارِ پیدائش کی زیادتی)

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوتیں ہیں جو ہماری رفتارِ پیدائش کو بے پناہ طور پر بڑھانے میں ممد و معاون ہیں؟۔ صاف ظاہر ہے کہ رفتار پیدائش رفتارِ شادی پر منحصر ہوتی ہے۔ اور رفتار شادی ہمارے ملک میں بمقابلہ دیگر ممالک خاص طور پر زیادہ ہے۔ اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہمارے مذاہب اس کی پر زور تلقین کرتے ہیں مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ "ہر شخص کو ضرور شادی کرنی چاہئے تاکہ اس کے کوئی لڑکا پیدا ہو جو اس کا کریا کرم کرسکے ورنہ مرحوم کی روح بے چین پھرے گی" (ہندوستان کے مسائلِ آبادی مصنفہ پی۔ کے وٹل)۔ مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے کہ "لا رہبانیۃ فی الاسلام" اسلام میں رہبانیت منع ہے۔

مذہبی تلقین کے علاوہ معاشری رسوم بھی اس بارہ میں ممد و معاون ہیں مثلاً اشتراک خاندانی جسکی وجہ سے لوگ بچے پیدا کرنے پر دلیر ہوجاتے ہیں کیونکہ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ سب بچے اور بیوائیں یکجا پلتے رہیں گے اور کسی ایک شخص پر چنداں بوجھ نہ پڑے گا۔ پھر ایک دوسرے کے طعنوں سے بچنے کے لئے لڑکیوں کی شادی جلد کردی جاتی ہے اور اس سے بھی آبادی کے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ غربت کی وجہ سے لوگ اس خیال سے بھی بچے پیدا کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ہوں اور اُن کو کسی کام سے لگا یا جائے تاکہ ہماری آمدنی میں اضافہ ہو۔

یہ سب قوتیں ہیں جو آبادی کے بڑھانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہیں لیکن دیگر ممالک میں ان میں سے ایک بھی کارفرما نہیں ہے۔

(سامان خورد و نوش)

ایک طرف تو آبادی کا یہ بے پناہ طوفان ہے اور دوسری طرف خوراک کی پیداوار امید افزا نہیں، اور نہ اس کے یکساں طور پر تقسیم کا کوئی انتظام ہے۔ ہمارا ملک زیادہ تر زرعی علاقہ ہے اور زراعت کوئی منفعت بخش پیشہ نہیں ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ زراعتی زمینوں پر اپنا سرمایہ اور محنت دوگنا کردیں تو آپ کو دوگنی پیداوار حاصل نہیں ہوگی برخلاف اس کے دوسری تجارتوں میں سرمایہ کی زیادتی اسی

نسبت بلکہ اس سے زیادہ آمدنی کا باعث ہوا کرتی ہے - اور اسی لئے کسی ملک کا صرف زراعت پر انحصار رکھنا سخت خطرناک ہے -

پھر ہماری زراعت بھی قدیم طریقوں پر کی جاتی ہے جس سے کسی نسبتی افادہ کی امید رکھنا عبث ہے - ہماری زمینیں قوانین وراثت وغیرہ کی وجہ سے جکڑی پڑی ہیں اور بہت سے حصوں میں بٹی ہوئی ہیں، جن کی وجہ سے نہ اُن پر ترقی یافتہ تجربے ہو سکتے ہیں اور نہ اکتشافاتِ عصریہ کے مطابق فلاحت کیجا سکتی ہے - پس آبادی کی نسبت خوراک بہت کم بڑھی ہے اور جو بڑھی بھی ہے وہ یکساں طور پر سب لوگوں میں تقسیم نہیں ہوتی - کیونکہ بوجہ غربت کے لوگوں کی قوتِ خرید کم ہے اور ہر شخص سامان خورد و نوش خریدنے سے قاصر ہے -

(مسئلہ زیر بحث)

پس ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ ایک طرف تو آبادی اپنے تمام ہولناک نتائج کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور دوسری طرف خوراک اپنی تعداد اور یکسانیت کے لحاظ سے کم ہو رہی ہے جس کا اثر موجودہ آبادی پر نہایت خوفناک طریق سے پڑ رہا ہے - اگر ہم کو زندہ رہنا ہے اور مہذب ممالک میں شمار ہونا ہے اور دوسری قوموں کے دوش بدوش ترقی کرنا ہے تو ہمیں وہ کیا ذرائع اختیار کرنے چاہئیں جو ہماری آبادی کو گھٹا دیں اور ہماری خوراک کو زیادہ سے زیادہ اور یکساں طریق پر لوگوں کے درمیان تقسیم کرنے میں ممد ثابت ہوں، تاکہ ہماری حسنِ کارکردگی بڑھے اور ہم اقتصادی اور سیاسی طور پر مضبوط ہوں؟

پہلے ہم اُن ذرائع کو لیتے ہیں جن سے ہمارا سامانِ خورد و نوش بڑھ سکتا ہے اور اُس کو مناسب طور پر تقسیم کرنے کے لئے لوگوں کی قوتِ خرید بھی بڑھائی جا سکتی ہے -

۱- زرعی ترقی

میں نے بتایا ہے کہ ہمارا ملک زیادہ تر زراعتی ہے لیکن اُسکو فروغ دینے کے لئے موثر تدابیر اختیار نہیں کی گئیں - اول تو ہماری کاشتکاری کے ذرائع بہت قدیم ہیں، اور اکتشافاتِ عصریہ کو استعمال نہیں کیا جاتا، اگر اس طرف توجہ کی جائے تو بہت کچھ ترقی کی اُمید ہو سکتی ہے - پھر اس کے ساتھ دیہاتی قرضہ - منڈی کی تنظیم اور رسل و رسایل کے مسائل بھی حل کئے جائیں اور امداد باہمی کے لئے ملک میں بنک جاری کئے جائیں -

۲- صنعتی ترقی

زراعتی اور صنعتی ترقی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے - اگر زراعت ترقی یافتہ ہو تو صنعت خود بخود ترقی کرے گی کیونکہ کارخانوں میں خام اجناس وغیرہ ہی کا استعمال ہوتا ہے - دوسرے لوگوں کی آمدنیاں بڑھانے

کے لئے ضروری ہے کہ صنعتیں جاری کی جائیں کیونکہ جن لوگوں کو زراعت اپنے اندر سمیٹنے کے لئے تیار نہیں وہ صنعت و حرفت کے ذریعہ سے اپنا پیٹ پال سکتے ہیں پھر اگر لوگوں کی آمدنیاں زیادہ ہو جائیں گی تو وہ ہندوستان کی زرعی اور صنعتی اشیاء کے لئے نفع بخش منڈیاں بھی بن سکیں گی ورنہ آج کل تو کارخانہ والوں کو یہی شکایت ہے کہ اُن کی اشیاء نہیں بکتیں اور اس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ لوگوں کی قوت خرید کم ہے اگر صنعتیں جاری ہوں گی تو جب لوگوں کی زراعت بوجہ کمی بارش وغیرہ کے غیر مفید ہو گی تو وہ اس طرف آکر سکھ پائیں گے پس ملک میں کارخانے جاری کرنے ہر طرح سے مفید ہیں اور گورنمنٹ کو چاہئے کہ وہ لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنے کیلئے اُن کو ہر طرح کی مراعات عطا کرے اور اُن کی حوصلہ افزائی کرے۔

(آبادی گھٹانے کے وسائل)

اس کے بعد ہم آبادی کو گھٹانے کے وسائل درج کرتے ہیں:۔

۳۔ غیر ملکی ہجرت

دنیا کی تمام چیزوں میں سے انسان کو منتقل کرنا بہت دشوار قرار دیا گیا ہے خصوصیت کے ساتھ اہل ہند کہ وہ شروع سے ہی ہجرت کے خلاف ہیں اس کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ ہندوستانی گھریلو لوگ ہیں اور وہ اپنے ملک کیا اپنے گاؤں سے باہر بھی قدم رکھنا بدشگونی خیال کرتے ہیں۔ لیکن اب تعلیم اور واقفیت پھیلنے کی وجہ سے لوگ غیر ملکوں کی طرف ہجرت کر رہے ہیں اور اسوقت تیئیس ۲۳ لاکھ کے قریب ہمارے ہندوستانی غیر ملکوں میں موجود ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ برطانوی سلطنت کی بعض نوآبادیوں نے ہندوستانیوں کی آمد کے خلاف قوانین نافذ کر دئے ہیں اور اب ہم لوگ وہاں جانے کے مجاز نہیں۔ تاہم سلطنت برطانیہ کے بعض دیگر مقامات ہماری آبادی کو خیر مقدم کہنے کے لئے تیار ہیں مثلاً "گیانا" جو اپنی موجودہ آبادی سے دس گنا زائد آبادی اپنے اندر سمیٹنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ قانونِ ہجرت ۱۹۲۲ء کی رو سے وہاں ہندوستانیوں کو جانے کی اجازت دیدی گئی ہے لیکن ابھی اُس کا اطلاق عملی صورت میں نہیں ہوا کیونکہ نوآبادی کے سرمایہ داروں کو اُس کی بعض شرائط سے اختلاف تھا تاہم یہ اسکیم ہمارے لئے مفید ثابت ہوگی۔ اسی طرح بعض جزائر میں جانے کے لئے ابھی بہت گنجائش ہے۔

۴۔ صوبجاتی انتقالِ آبادی

۱۹۲۱ء کی مردم شماری کی رو سے ہماری آبادی کا دس فیصدی حصہ (یعنی تقریباً تین کروڑ) اپنے شہروں اور ضلعوں کے باہر پایا گیا لیکن ان تین کروڑ میں سے دو کروڑ ایسے تھے جو اپنے ضلع کے نہایت ہی قریب کے علاقہ میں بود و باش رکھتے تھے۔ معاشرتی بندشوں اور زبان کی مشکلات وغیرہ کی وجہ سے بھی لوگ صوبجاتی انتقال آبادی نہیں کر سکے۔ تاہم بنگال برہما اور بمبئی میں دیگر صوبجات کے لوگ بکثرت موجود ہیں اور اُن صوبوں پر ہمارے

کسی قسم کی قیود یا پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ اگر بعض صوبجات میں اقتصادی یا صنعتی ترقی ہو جائے تو اس طریق سے بھی آبادی کا بوجھ ہلکا ہونے کی بہت کچھ اُمید ہے۔

۵۔ ضبطِ تولید

ضبطِ تولید کا مسئلہ ابھی تک لوگوں نے پوری طرح نہیں سمجھا کیونکہ اُن میں سے اکثر حصہ اس کو اس طرح ٹال دیا کرتا ہے کہ ملک کے سامنے ابھی اقتصادی ترقی کے بے شمار ذرائع ہیں۔ اگر اُن کو موثر طریق پر استعمال کیا جائے تو آبادی کا مسئلہ خاطر خواہ طور پر حل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ "زائد از ضرورت آبادی" کے نہ سمجھنے یا ہندوستان کی جغرافیہ نہ جاننے کی وجہ سے ہے یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک کے ذرائع آمدنی بہت محدود ہیں اور آبادی کے لحاظ سے نہ زراعت کافی ہے نہ صنعت و حرفت اس لئے اس لحاظ سے کسی اقتصادی ترقی کی امید رکھنا عبث ہے۔

"زائد از ضرورت" آبادی کا صرف یہ مفہوم نہیں کہ آبادی کے بالمقابل خوراک کی تعداد کم ہے بلکہ یہ کہ موجودہ آبادی بھی کمزور پیدا ہو رہی ہے اور غربت، اور جہالت کی وجہ سے اُس کی کارکردگی بالکل مفقود ہے جب یہ حالت کسی قوم میں پہونچ جائے تو اُس کو جلد سے جلد اپنی فکر کرنی چاہئے اور جلد سے جلد آبادی کے روک تھام کی تدابیر عمل میں لانی چاہئے یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اقتصادی ترقی الہ دین کے چراغ کی طرح کسی منتر یا جھاڑ پھونک کے ذریعہ بیک لمحہ معرضِ ظہور میں نہیں آجائے گی بلکہ اُس کو پنپنے میں کافی دیر لگے گی اور اس اثناء میں ہمیں بعض دیگر تجاویز کے متعلق لائحہ عمل بنانا ہوگا۔

ضبطِ تولید کے حق میں فیصلہ کر لینا اس قدر مشکل نہیں جتنا کہ وسیلہ تلاش کرنا ہے یعنی ضبطِ تولید کس ذریعہ سے کی جائے؟ پرانا طریق یہ تھا کہ حمل گرا دیا جاتا تھا یا لڑکیوں کو مار ڈالتے تھے لیکن اب قانون اور سوسائٹی دونوں نے ان طریقوں کو مذموم اور قابلِ نفرت قرار دیا ہے اس لئے یہ متروک ہو گئے ہیں۔

ولایت اور دیگر ملکوں میں مانعِ حمل مصنوعی طریق مروج ہیں لیکن یہ خطرہ سے خالی نہیں مثلاً ان کی وجہ سے مرد عورت دونوں میں احساس ذمہ داری مٹ جاتا ہے اور وہ صنفی بے احتیاطیوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، جس سے کھانسی۔ تپ دق۔ بخار۔ یرقان اور دیگر بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ پھر ان سے جثہ بھی کمزور ہو جاتا ہے جو بالآخر قومی دولت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ضبطِ تولید کس طریق سے کیجائے؟ میرے خیال میں اسکی تدبیر صرف یہ ہے کہ لوگوں میں پروپیگنڈا کیا جائے اور اُن کو مسئلہ آبادی وغیرہ کے نظریئے واضح کر دئے جائیں اور اُن کو سمجھایا جائے کہ کسی ذی روح کو پیدا کر کے مناسب تعلیم و تربیت نہ دینا ہلاکت کے مترادف ہے۔ میں نسلِ انسانی کے خلاف نہیں ہوں اور نہ شادی کے خلاف تلقین کر رہا ہوں بلکہ میں چاہتا ہوں کہ وہ غربا جن کی آمدنیاں دس پندرہ روپیہ زیادہ نہیں وہ ایک سے زیادہ شادی نہ کریں اور وہ بھی کافی عمر گزر جانے کے بعد کریں اور پھر

اگر بچہ پیدا کرنے کا خیال ہو تو یہ دیکھ لیں کہ صرف اُتنے پاؤں پھیلانے چاہئیں جتنی چادر ہو۔
آخر کیا وجہ ہے کہ غربار اور جاہل آدمیوں کے بچے بہ نسبت امرار اور تعلیم یافتہ طبقہ کے زیادہ ہوتے ہیں؟
محض اس لئے کہ اُن کو سوائے بیوی بچوں کے کوئی اور سامانِ تعیش میسر نہیں ہوتا جس سے وہ اپنا دل بہلا سکیں۔
پُرانے زمانے میں سنیما۔ سرکس، کھیلیں اور سیر وغیرہ کرنے کے اس قسم کے سامان نہ ہوتے تھے جس قسم کے آجکل
ہیں اس لئے اُن کا منبع مسرت سوائے بیوی بچوں کے اور کچھ نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب چونکہ مسرت حاصل کرنے کے
نئے نئے طریق نکل چکے ہیں اس لئے میں نہیں سمجھتا کہ بیوی کو کیوں صرف آلۂ تولید یا بچے پیدا کرنے کی مشین قرار
دیا جائے اور کیوں نہ اُس سے زیادہ منفعت بخش اور گوناگوں کام کرنے کی اُمید رکھی جائے۔
مجھے تو حساب کے ایک سادہ سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکا اور میں نے اُس کو ہمیشہ غربار کے طبقہ کے
سامنے رکھا۔ کہ اگر آپ کی آمدنی دس روپیے ہے تو آپ اُس کو اکیلے کھا رہے ہیں اور اُس کی مدد سے آپ نے ایک
خاص معیارِ زندگی مقرر کر لیا ہے۔ لیکن اگر شادی کر لی جائے تو آمدنی لازمی طور پر دو آدمیوں کے درمیان تقسیم
ہو جائے گی جس سے آپ کو اپنا معیار زندگی کم کرنا پڑے گا اور چونکہ وہ پہلے ہی بہت کم تھا اس لئے لازماً اُس کا اثر
حسنِ کارکردگی پر پڑے گا اور بہت ممکن ہے کہ آپ کی آمدنی دس روپیہ کی بجائے آٹھ یا نو روپیہ رہ جائے اسی طرح
اگر ایک بچہ پیدا ہو جائے تو اور بھی زیادہ مصیبت واقع ہو جائے گی۔
اگر ایک امیر آدمی شادی کرے تو اُس کی اقتصادی زندگی پر چنداں اثر نہیں پڑے گا کیونکہ اس کا معیار
زندگی اسقدر بلند ہے کہ اگر وہ اس کو گھٹائے تو حسنِ کارکردگی پر زیادہ اثر انداز نہ ہوگا۔ مثلاً اگر کوئی شخص دو تین
سالن نہ کھائے یا دس سوٹوں کی بجائے صرف چھ سوٹ پہنے تو اُس کی حسن کارکردگی وہی رہے گی۔ پس شادی موجودہ
حالات میں غریبوں کے لئے جائز نہیں ہو سکتی البتہ اگر وہ کریں تو بچے تین چار بلکہ زیادہ سال کے وقفہ کے بعد پیدا کریں
اس سے اُن کے نامۂ اعمال میں کسی قسم کا کوئی نقص واقع نہ ہوگا۔ باقی رہا بقائے نسل کا سوال۔ اُس کے لئے اول تو کوئی
ٹھوس دلیل نہیں، تاہم اگر اس کو لازم ہی قرار دیا جائے تو ایک دو بچے کافی ہیں۔
شادی کرنی چاہئے اور ضرور کرنی چاہئے لیکن کسی چیز کا ناجائز استعمال درست نہیں ہے۔ قرآن نے انسان
کی بیوی کو کھیتوں سے تشبیہ دی ہے۔ جتنا بھی زیادہ بیج ڈالو گے اُتنے ہی کمزور اور جلد مرجھانے والے پودے پیدا
ہوں گے پس زیادہ اولاد پیدا کرنا کوئی صفت نہیں ہے ۔۔۔ آج کل فرانس اور جرمنی اپنی آبادی بڑھانے کی فکر
میں ہے اور جرمنی والے تو زیادہ بچے پیدا کرنے والے ماں باپ کو وظیفے اور دیگر قسم کی مراعات دیتے ہیں لیکن انکا
مقصد سیاسی طاقت اور اقتدار ہے، ہمیں زیادہ انسانوں کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اُن کی باطنی خوبیاں درکار ہیں
جو اُن کو قومی پیداوار کے بڑھانے کی طرف مائل کریں۔

عبدالرحیم شبلی بی۔ کام

بچہ

کھانے کے بعد ایک اسقاطِ حمل کا ذکر ہو رہا تھا جو حال ہی میں ہوا تھا۔ خاتون نے تیوری چڑھا کر کہا:۔

یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک قصائی کے لڑکے سے تعلق رکھنے والی لڑکی اپنے بچے کو ایک کھائی میں پھینکدے! کسقدر وحشت انگیز، کس قدر تکلیف دہ واقعہ ہے!"

ڈاکٹر جو شام کا کھانا ہمارے ساتھ کھانے والا تھا نہایت استقلال و خاموشی سے اس واقعہ کی تمام جزئیات کا ذکر کر رہا تھا کبھی وہ بدقسمت ماں کی جرأت پر تعجب کرتا جس نے تنہا اس بچے کو جنا اور اس کے بعد اس کو ہلاک کر کے تقریباً دو میل پیدل چلی گئی۔ اس نے کہا کہ "رات کے سناٹے میں اپنے بچے کو لیکر جنگل میں جانا کتنا سخت کام ہے! ذرا اس کی روح کی دہشت اور قلب کی اذیت کا خیال کیجئے! اُف، زندگی کتنی حقیر کتنی قابل نفرت ہے! مکروہ تعصب ہے، ہاں مکروہ تعصب، ارتکاب جرم سے بدتر پاس عزت کا جھوٹا خیال، مصنوعی احساسات کا ایک پورا لشکر، نفرت انگیز آبرو اور رفتنہ انگیز شرافت ـــ یہی وہ اسباب ہیں جو ایسی حرکتوں پر عورت کو مجبور کر دیتے ہیں۔ حقیقتاً یہ ہے کہ "انسانوں کے فطری اتحاد کو جرم بنا دینا نوع انسان کے لئے باعث شرم ہے!"

خاتون غصہ سے سرخ ہو گئی۔ "تو ڈاکٹر تم بدی کو نیکی پر ترجیح دیتے ہو۔ ایک فاحشہ کو باعصمت عورت سے افضل سمجھتے ہو!

ڈاکٹر جس نے اپنے پیشے کے سلسلے میں بے شمار "زخم ہائے حیات" دیکھے تھے اُٹھ کھڑا ہوا اور زور دیکر کہنے لگا:۔ "آپ بحث کر رہی ہیں اُن باتوں پر جن سے آپ ناواقف ہیں کیونکہ آپ کو کبھی غیر مغلوب نفسانی خواہش پیدا ہی نہیں ہوئی۔ بدقسمت دراصل وہ لوگ ہیں جن کو دغاباز فطرت نے قوی خواہشات عنایت کی ہیں۔ خاموش آدمی جو بغیر قوی احساسات کے پیدا ہوئے ہوں اُن کے لئے نیک رہنا کوئی مشکل نہیں۔ مشکل اُن کے لئے ہے جن کے جذبات طوفانی سمندر کی طرح ناقابل ضبط ہیں۔ ـــ وہ عورتیں جو بدنام نہیں، وہ ہیں جن کی طبیعت میں یہ جوش نہیں ہے اور میں اُن کی عصمت و شرافت کو لایق تحسین نہیں سمجھتا کیونکہ اُن کو کسی طاقت کا مقابلہ ہی کرنا نہیں پڑتا۔ لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ رئیس کی کیتھرائنیں اور امیر زادیاں کبھی باعصمت و شریف نہیں رہ سکتیں۔ اُن کے لئے باعصمت رہنا ناممکن ہے۔

وہ پیدا ہوئی ہیں پیار کئے جانے کے لئے۔ اُن کے اعضا مختلف ہوتے ہیں، اُن کا گوشت دوسرا ہوتا ہے۔ وہ زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ کسی دوسرے جسم کا اتصال اُن میں بہت جلد شوریدگی پیدا کر دیتا ہے۔ اُن کی رگ رگ ترغیب دیتی ہے، پریشان کرتی ہے اور بالآخر اُن کو مغلوب کر لیتی ہے جبکہ آپ کو اُس کا کچھ بھی احساس نہیں ہوتا۔ اچھا آپ ایک باز کو پالئے اور اُس کو وہی بیج کھلایئے جو آپ ایک طوطے کو دیا کرتی ہیں! اگرچہ دونوں پرند ہیں اور دونوں کی چونچیں مُڑی ہوئی ہیں لیکن اُن کے خصائل مختلف نظر آئیں گے۔

کاش آپ کو صرف احساسات کی طاقت کا اندازہ ہوتا کہ کس طرح وہ رات رات بھر آگ میں جلاتے رہتے ہیں۔ جسم بھُن رہا ہے، دل دھڑک رہا ہے اور دماغ عجیب قسم کی اذیت کا شکار ہے۔ ایک واقعہ سُنئے:۔

"ایک عورت جس کو میں ہیلین کے نام سے موسوم کروں گا اُسوقت سے جبکہ وہ بچہ ہی تھی شہوانی جذبات کی حامل تھی۔ اُس کے احساسات اُسی وقت بیدار ہو چکے تھے جبکہ وہ باتیں کرنا سیکھ رہی تھی۔ جب وہ بارہ سال کی تھی تو مجھ سے مشورہ طلب کیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پوری عورت ہے اور خواہشاتِ شہوانی نے اُس کو مستقل طور پر پریشان کر رکھا ہے۔ اس امر کی گواہی اُس کا چہرہ دے رہا تھا۔ اُس کے خفیف سے اُبھرے ہوئے گداز، توی گردن، نرم جسم، لانبی ناک، چوڑے نتھنے، بڑی بڑی سُرمگیں آنکھیں! کون اس کے پُرجوش خون کو ٹھنڈا کر سکتا تھا؟ وہ ساری رات رو کر گزار دیتی۔ بالآخر جب وہ پندرہ برس کی ہو گئی تو اُس کے والدین نے شادی کر دی۔ دو برس بعد اُس کے شوہر کا دق سے خاتمہ ہو گیا۔ اسی کی بدولت وہ نحیف و کمزور ہو گیا تھا۔ اٹھارہ ماہ بعد دوسرے شوہر کا بھی یہی حشر ہوا تیسرے نے چار سال تک ساتھ دیا اور پھر اُس کو چھوڑ کر چلتا بنا۔ یہ بڑا سخت زمانہ تھا۔

جب وہ اکیلی رہ گئی تو اُس نے باعصمت رہنے کی کوشش کی۔ بہر حال ایک دن اُس نے مجھے بلوا بھیجا کہ اس پر تشنج کے دورے پڑ رہے ہیں اور وہ نہایت پریشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ بیوگی اُس کا خاتمہ کر دے گی چنانچہ میں نے اُس سے کہہ دیا کہ وہ کسی سے شادی کر لے۔ وہ ایک ذی عزت عورت تھی۔ باوجود شدید اذیتیں سہنے کے اُس نے میرے مشورے پر عمل نہیں کیا۔ دیہاتی کہتے تھے کہ وہ پاگل ہو گئی ہے رات کے وقت وہ دور دور کے چکر لگاتی تاکہ اُس کا جسم تھک کر چُور چُور ہو جائے۔ پھر وہ غش کھا کر گر پڑتی اور خوفناک تشنج کے دورے ہوا کرتے اپنی والدہ اور دیگر اعزہ کے مکان کے قریب وہ تن تنہا اپنے مکان میں رہا کرتی تھی۔ میں وقتاً فوقتاً اُسے دیکھنے جایا کرتا تھا اور حیران تھا کہ فطرت کی اٹل مرضی اور اُس کی اپنی ہٹ کا آخر انجام کیا ہو گا؟

ایک دفعہ شب کے آٹھ بجے جبکہ میں کھانا تقریباً ختم کر چکا تھا وہ میرے مکان پر آئی، اُس نے کہا:۔

"میں برباد ہو گئی۔۔ میں حاملہ ہوں!— یہ سنکر میں حیران رہگیا"

اس کے بعد یکایک میرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اُس نے اضطراب سے کہا:۔

"ڈاکٹر یہ حمل میرے پاس کے باغبان کا ہے۔ پارک میں ٹہلتے ہوئے مجھے غش آگیا۔ مجھے گرتا دیکھ کر وہ دوڑا
ہوا آیا اور اندر لیجانے کے لئے اُس نے مجھے اپنے بازوؤں میں سنبھال لیا، میں نے کیا کیا؟ مجھے خبر نہیں۔ تم میری
شرمناک بیماری سے واقف ہو۔ اس طویل قصہ کا خلاصہ یہ ہے کہ میں گناہگار ہوں۔ میں زیادہ ضبط نہ کرسکتی تھی۔
اس کے بعد وہ اپنی ہچکیوں کو روک کر بولی کہ "میں نے اسقاط حمل کی کوشش کی، کھولتے ہوئے پانی میں
نہائی، گھوڑوں پر سواری کی جمناسٹک کی۔ دوائیں، شراب اور زعفران استعمال کی مگر لاحاصل۔ تم میرے
والد اور بھائیوں کو جانتے ہو، میں برباد ہوگئی۔ میری بہن کی ایک ذی عزت شخص سے شادی ہوچکی ہے۔ میری
بے عزتی کا اُن پر اثر پڑے گا۔ پھر ہمارے دوستوں، ہمسایوں اور نام کا خیال کرو۔ میری ماں......."
وہ ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس سے سوالات کرنے لگا۔ اس کے بعد
میں نے اُس کو ایک طویل سفر پر چلے جانے کا مشورہ دیا تاکہ وضع حمل گھر سے دور ہو۔ اُس نے کہا:۔ "ہاں۔
ہاں...... بہت اچھا" پھر بغیر یہ سُنے ہوئے کہ میں کہہ کیا رہا ہوں وہ چلی گئی۔
اُسے دیکھنے میں بار با جاتا رہا۔ اُس کو جنون ہوتا جا رہا تھا۔ اُس بچے کے احساس نے جو اُس کے پیٹ میں
پرورش پا رہا تھا، اُس کے دماغ پر ایک تیز تیر کا سا اثر کیا تھا۔ اُس کو ہمیشہ اُسی کا خیال لگا رہتا۔ دن میں نہ وہ
باہر نکلتی اور نہ کسی سے ملتی تھی تاکہ کہیں اس قابل نفرت راز کا افشا نہ ہوجائے۔ روزانہ شب کو وہ آئینہ کے سامنے
لباس اُتار کر اپنے شکم کی بدوضعی کرتی۔ پھر اپنے آپ کو خاک پر گرا دیتی اور اپنی چیخوں کو روکنے کے لئے منھ میں تولیا ٹھونس
لیتی۔ رات میں بیسیوں دفعہ وہ اپنے بستر سے کود پڑتی، موم بتی روشن کرتی اور اُس بڑے آئینے کے سامنے واپس
آجاتی جس میں اُس کے بدنما عریاں جسم کا عکس نظر آتا تھا۔ رنج و غصہ سے وہ اپنی ناف پر گھونسے مارتی تاکہ اُس بچہ
کا خاتمہ ہوجائے جس سے خود اُس کی جان کا خطرہ تھا۔ دونوں کی لڑائی نہایت خوفناک تھی لیکن بچہ نہیں مرا۔ اُسکو
کچل ڈالنے کے لئے وہ فرش پر لوٹتی اور سوتے وقت اپنے جسم پر پتھر رکھتی تاکہ اُس کا دم گھٹ جائے۔ وہ بچے
سے ایسی نفرت کرتی تھی جیسے کوئی اپنے زبردست دشمن سے کرتا ہے۔
بچے سے اپنا پیچھا چھڑانے کی ان ناکام مشقتوں کے بعد، ان غیر فطری کوششوں کے بعد وہ دیوانہ وار
کھیتوں میں ماری ماری پھرتی۔ ایک دن صبح کو دیکھا گیا کہ وہ اپنے پاؤں چشمے میں ڈالے ہوئے بیٹھی ہے اور آنکھوں
میں ایک مجنونانہ چمک ہے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اُس کو سرسام ہوگیا ہے لیکن وہ اصل حقیقت سے ناواقف تھے
اس ملعون بچے کو اپنے جسم سے نکال پھینکنے کے خیال نے اُسکے دل و دماغ کو بیکار کر رکھا تھا۔
ایک مرتبہ شام کے وقت اُس کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا:۔ تم کیسی موٹی ہوتی جا رہی ہو میلین۔ اگر تم
شادی شدہ ہوتیں تو میں یہ سمجھتی کہ بچہ ہونے والا ہے۔

ان الفاظ سے اُس کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ فوراً وہاں سے اپنے گھر چلی آئی اور نیچے باورچی خانے میں جاکر الماری کھولی اور ایک بڑا چاقو نکالا۔ پھر دوبارہ بالاخانے پر گئی موم بتیوں کو روشن کیا اور آئینے کے روبرو ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد اُس نے اُس مقام کو محسوس کیا جہاں بچہ حرکت کر رہا تھا اور پھر چاقو کی ایک ہی ضرب میں اپنا پیٹ اوپر سے نیچے تک چاک کر ڈالا۔

اُس نے اپنے دشمن کو پکڑ لیا جو اب تک اُس کی گرفت سے بچ رہا تھا۔ اُس کی ٹانگ پکڑی اور چیر کر اُس کو آتشدان میں پھینکنا چاہا۔ لیکن وہ نال سے جڑا ہوا تھا جس کو وہ کاٹ نہ سکی تھی۔ آخرکار اُس کا بھی دم نکل گیا اور خون میں ڈوبی ہوئے بچے کی نعش پر گر پڑی۔

پھر بتایئے کیا آپ اُس کو بڑی بدکار خیال کرتی ہیں؟"

ڈاکٹر خاموش ہوگیا اور جواب کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن خاتون نے کوئی جواب نہ دیا۔

سید محمد احسن بی۔ اے حیدرآبادی

(موپاساں)

(نگار) موپاساں کے فسانے اکثر و بیشتر سوسائٹی کے ان مسایل سے متعلق ہوتے ہیں، جن کو دوسرے افسانہ نگار نفسیاتی نقطۂ نظر کی بجائے اخلاق کے اُصول کو سامنے رکھ کر دیکھتے ہیں۔

موپاساں کسی جُرم و معصیت کو سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کی روشنی میں نہیں دیکھتا بلکہ وہ فطرت انسانی کے ماتحت اس کا مطالعہ کرتا ہے، اس لئے وہ ایک مُجرم کو ہمیشہ رحم و عفو کے قابل سمجھتا ہے اور اس کی عقوبت و سزا کا موافق نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ فطرت قانون کے درمیان ہمیشہ جنگ جاری رہنا ہی ثبوت ہے اس امر کا کہ قانون، داعیاتِ قدرت کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا اور جرم و معصیت حقیقتاً ایک بیماری ہے جس پر انسان کو قابو نہیں۔

اس فسانہ میں اس نے عورت، اور اس کی خواہش نفسانی کو سامنے رکھ کر "عصمت و عفت" کا مفہوم متعین کرنا چاہا ہے اور بہ حالات موجودہ جبکہ عورت کی تعلیم و آزادی کا مسئلہ عام توجہ کا مرکز بنا ہوا ہی اس مسئلہ پر خصوصیت کے ساتھ غور کرنا ہر متمدن انسان کا فرض ہے۔

اس دورِ آزادی میں عورت کو سب سے بڑی شکایت یہی ہے کہ اگر مرد جذبۂ شہوانی سے مغلوب ہوکر کوئی ناز یبا حرکت کر بیٹھتا ہے تو سوسائٹی اس کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور عورت اگر اسی کی مرتکب ہو تو اس کو بدترین مُجرم جاکر سوسائٹی سے علٰحدہ کر دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے علمائے تمدن و اخلاق اس کی کوئی تاویل پیش کرسکیں، لیکن جس حد تک اُصول اور فطرت کا سوال ہے، اس کا کوئی قابل

اطمینان جواب مرد کے طرف سے نہیں دیا جاسکتا - موجودہ علماء نفسیات کا خیال ہے کہ دنیا میں جرم و معصیت کو مکروہ سمجھ کر سزا جسمانی سے اس کا علاج چاہنا سخت غلطی ہے اور اس غلطی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ باوجود قانون کی اس دارو گیر کے جرائم کی طرف انسان کا میلان بدستور قائم ہے -

گناہ ایک فطری مجبوری یا نفسیاتی بیماری ہے اور اس کا علاج بھی بالکل فطرت و نفسیات کے اصول پر ہونا چاہئے نہ یہ کہ اظہار نفرت و بیزاری سے مجرم یا گناہگار میں جذبۂ انتقام پیدا کر کے اسکو اور زیادہ معصیت کی طرف مایل کیا جائے -

آجکل نگار میں کسبی کے موضوع پر جو اظہار خیال کیا جا رہا ہے اس کو اس فلسفۂ "جنایات" سے بڑا گہرا تعلق ہے، لیکن افسوس ہے کہ لوگ گفتگو کے وقت اس کو بالکل نظر انداز کر جاتے ہیں اور صرف ان اصولِ اخلاق کو سامنے رکھتے ہیں، جو خود ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں اور یقیناً وقت و ماحول کے لحاظ سے بدلجانے والی چیزیں ہیں -

"حدیثِ حُسن"

مصور جذبات جناب فطرت واسطی کی ولولہ انگیز اور دلکش نظموں کا مجموعہ ہے جس کا ایک ایک شعر کیف جذبات میں ڈوبا ہوا، لطف زبان سے رنگین، حُسن تخیل سے مزین اور ندرت بیان میں معجز نما ہے اور جو عنقریب بازیور طبع سے آراستہ ہو کر دلدادگان ادب کی دلبستگی کا باعث ہوگا -

حدیثِ حُسن

کے مصنف فطرت واسطی تقریب تعارف سے مستغنی ہیں، ارباب ذوق نگار، شاہکار، زمانہ اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں آپ کی سحر اثر نظمیں بارہا دیکھ کر لطف اندوز ہوئے ہیں - اس سے زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں ملک کے دو ممتاز اور مایہ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات ہوں گے، پچاس نظمیں، اور دو تصاویر ہوں گی، بہترین کتابت، دیدہ زیب طباعت اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ شایع ہوگا -

باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے

قیمت صرف عہ رہیگی تاکہ کم مایہ شایقین کا ذوق طلب بھی مجروح نہ ہو جائے - (نوٹ) ۳۱ر اگست ۳۵ء تک زر قیمت پیشگی ارسال کرنے والوں کی خدمت میں "حدیثِ حُسن" سب سے پہلے اور بلا محصول حاضر کیا جائیگا

المشتہر :- منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور - یو - پی

سوا سو سال قبل دکن کی شاعری

نواب بدر الدین خاں تمیز

خاندان شمس الامرا علم وفضل کے اعتبار سے دکن میں بہت ممتاز مرتبہ رکھتا ہے۔ نواب بدر الدین خاں بہادر رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک اسی خاندان کے ایک فرد تھے اور شاعری کا پاکیزہ ذوق رکھتے تھے آپ کا مکمل (مطلا و مذہب) دیوان کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔

اس خاندان کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ابوالخیر خاں (جن کا سلسلۂ نسب حضرت شیخ فرید گنج شکر سے مل کر حضرت عمر پر ختم ہوتا ہے) شیخ بہار الدین خاں کے فرزند تھے جو شکوہ آباد ضلع مین پوری کے باشندے تھے۔ عنفوانِ شباب میں محمد شاہ بادشاہ دہلی سے خان بہادر کا خطاب پایا اور آصف جاہ اول کے ساتھ دکن آئے اور دو ہزار اہوار منصب پانچسو سوار اور تیس ہزار پیادہ کی جاگیر سے سرفراز ہوئے۔

نواب ناصر جنگ شہید جب اپنے والد آصف جاہ اول سے معرکہ آرا ہوئے تو ان کو بھی اپنا طرفدار بنانا چاہا مگر انھوں نے یہ کہکر انکار کر دیا کہ باپ کے ملازم کے لئے اسوقت بیٹے کا ساتھ دینا جبکہ وہ باپ کا مخالف ہو سخت نمک حرامی ہے۔ ناصر جنگ کو اس سے سخت ملال ہوا اور انھوں نے تخت نشین ہونے کے بعد جاگیر ضبط کر لی مگر پھر بحال کر کے شمشیر بہادر کا خطاب دیا۔

نواب ہدایت محی الدین خاں مظفر جنگ بہادر نے تخت نشین ہو کر ان کو برہان پور کی سنددی اور نواب صلابت جنگ بہادر نے پالکی جھالردار اور "امام جنگ" خطاب مرحمت فرمایا۔

ابوالخیر خاں شمشیر بہادر امام جنگ نے ۲۶ ربیع الاول ۱۱۶۴ھ کو بعارضہ فالج برہان پور میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوئے آپ کے دو فرزند تھے ایک ابوالفتح خاں تیغ جنگ ابوالخیر خاں ثانی شمس الدولہ شمس الملک اول شمس الامرا بہادر، دوسرے شیخ ابوالبرکات خان بہادر امام جنگ محمد بہاء الدین خاں ثانی جنھوں نے اپنے والد کی زندگی ہی میں کسی جنگ میں زخمی ہو کر برہان پور میں انتقال کیا۔

ابوالفتح خاں اپنی جاگیر موضع لارشاگر میں رہا کرتے تھے رکن الدولہ کے انتقال کے بعد سرکار نے انھیں دیوان مقرر
کرنا چاہا مگر انھوں نے انکار کر دیا، پائگاہ کے ایک خاص رسالہ کے علاوہ بارہ ہزار فوج بھی تھی ۱۱۹۱ھ میں اصل کے علاوہ
پنج ہزاری منصب، پانچ ہزار سوار، علم، نقارہ اور جھالردار پالکی، شمس الدولہ خطاب مرحمت ہوا۔

انھوں نے ۲۵ ربیع الثانی ۱۲۰۵ھ کو پانگل کے مقام پر انتقال کیا اور حیدر آباد میں درگاہ برہنہ شاہ میں مدفون
ہوئے مرحوم نے اپنے پسماندوں میں ایک فرزند محمد فخر الدین خاں شمس الامرا، امیر کبیر اول چھوڑا جو ۱۵ رمضان ۱۱۹۵ھ
کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور ۱۱۹۹ھ میں بہار الدین خاں اور جنگی، دولائی، ملکی خطاب پایا اور پھر امام جنگ خورشید الدولہ
خورشید الملک شمس الدولہ شمس الملک شمس الامراء ابوالخیر خاں، دس ہزار منصب دس ہزار سوار، ماہی مراتب، علم، نقارہ
پالکی جھالردار، عماری دوہری جھالردار، مورچھل، جواہرات و محلات متفرقہ محاصلی چالیس لاکھ سے سرفراز ہوئے۔

۱۲۱۵ھ میں نواب نظام علی خاں بہادر نے اپنی صاحبزادی بشیر النساء بیگم صاحبہ کو آپ کے عقد نکاح میں دیکر
عزت افزائی کی۔ آپ کو ریاضیات اور فلکیات کا شوق تھا۔ عربی فارسی کے علاوہ فرانسیسی کے بھی ماہر تھے آپ کی
تالیفات سے "ستہ شمسیہ" اور "منتخب البصر" وغیرہ مشہور ہیں اول الذکر کتاب ایک فرانسیسی ماہر ریاضیات
موسیو کلارک کی تصنیف کا ترجمہ ہے جو ریاضی کی اعلیٰ تصنیف ہے عربی اور فارسی کے علاوہ غیر زبان سے جو پہلا
ترجمہ دکن میں ہوا غالباً وہ یہی "ستہ شمسیہ" ہے۔

آپ نے ۱۹ شوال ۱۲۷۹ھ کو انتقال کیا اور برہنہ شاہ صاحب کی درگاہ میں دفن ہوئے۔ آپکے پانچ فرزند تھے۔

۱ - نواب فخر الدین خاں بہادر جو ۱۲۱۷ھ میں پیدا ہوئے اور چودہ سال کی عمر میں ۱۲۳۱ھ میں انتقال کیا۔

۲ - نواب رفیع الدین خاں بہادر نامور جنگ عمدۃ الملک شمس الامراء ثالث امیر کبیر ثانی۔

۳ - نواب سلطان الدین خاں بہادر سیف جنگ محتشم الدولہ بشیر الملک ۱۲ رمضان ۱۲۲۹ھ کو پیدا ہوئے اور
۱۵ ذیقعدہ ۱۲۶۱ھ کو انتقال کیا۔ آپ کے دو فرزند وزیر الدین خاں محتشم جنگ (ولادت ۱۲۵۴ھ وفات ۱۲۹۷ھ)
اور مظہر الدین خاں بہادر رفعت جنگ بشیر الدولہ آسمان جاہ تھے۔

۴ - نواب بدر الدین خاں بہادر رفعت جنگ معظم الدولہ معظم الملک متخلص بہ تمیز۔

۵ - نواب رشید الدین بہادر اقتدار الملک امیر کبیر ثالث۔ نواب بدر الدین خاں بہادر، فخر الدین خاں امام جنگ امیر کبیر
اول کے چوتھے فرزند تھے۔

بدر الدین خاں بہادر ۲۵ صفر ۱۲۲۰ھ کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت نہایت اعلیٰ پیمانہ پر
ہوئی قرآن مجید حفظ کیا اور فنون سپہ گری میں خاصی مہارت حاصل کی۔ ۱۲۴۵ھ میں نواب ناصر الدولہ بہادر نے اپنی
تخت نشینی کی دوسری سالگرہ کے موقع پر رفعت جنگ معظم الدولہ خطاب مرحمت فرمایا۔ ۱۲۴۹ھ میں ۲۲ ذیحجہ کو حمید الدولہ

علی اللہ خاں بہادر کی صاحبزادی سے شادی ہوئی ۱۶ ذیحجہ سے شادی کی دعوتیں شروع ہوئیں اور ہر طبقہ کے لئے علٰحدہ علٰحدہ انتظام کیا گیا۔ ۱۷ ذیحجہ کو مہاراجہ چندولال بہادر کی دعوت کی گئی، اور رات میں امرائے دربار مدعو کئے گئے۔ ۲۲ ذیحجہ کو جلوہ ہوا اور کئی روز تک جشن رہا۔

۱۲۵۶ھ کو بہ تقریب جشن نوروز معظم الملک خطاب عطا ہوا۔ ۲۴ رمضان ۱۲۶۱ھ کو بدرالدین خاں حج و زیارت کے لئے روانہ ہوئے اور ذیقعدہ ۱۲۶۲ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہو کر واپس آئے۔ شمس الامراء بہادر عمدۃ الملک و اقتدار الملک وغیرہ نے آصف نگر تک بڑھ کر استقبال کیا اور عماری میں سوار کرا کر روپیہ نثار کرتے ہوئے واپس لائے۔

آخر ربیع الاول ۱۲۶۹ھ کو انچاس برس کی عمر میں انتقال کیا اور حیدرآباد میں دفن ہوئے مولف تاریخ رشیدالدین خانی نے "حیف معظم الملک" میں تاریخ نکالی ہے۔ ایک خرد سال لڑکی بدرالدین خاں کی یادگار تھی مگر اس نے بھی قبل بلوغ انتقال کیا۔

مولف تاریخ خورشید جاہی لکھتے ہیں کہ "نہایت ذی جرأت، صاحب ہمت، بلند ارادہ حاجی، شاعر خوش فکر خط ظفر خوب لکھتے تھے"۔ مولف تاریخ گلزار آصفیہ نے ان خاص الفاظ سے تعارف کرایا ہے "امیر بیست عالی ہمت صاحب نفس قدسیہ، حافظ قرآن شریف کلام الٰہی، غریب پرور، ترحم شعار برحال افتادگان روزگار، غم خوار، قدردان اہل علم، بہ علوم عقلی و نقلی یکتائے عصر، کشادہ جبیں"۔

مولف تاریخ رشیدالدین خانی کا بیان ہے کہ درگاہ اُجالا شاہ صاحب کے میدان میں بدرالدین خاں بہادر حضور پرنور کے ہمراہ تھے اتفاقاً آپ کا ہاتھی بھڑک گیا اور چنگھاڑیں مارتا ہوا خاصہ کی ہتنی کے پاس پہونچ گیا جس پر بندگان عالی تشریف فرما تھے، بدرالدین خاں بہادر ہاتھی پر سے کود پڑے اور تلوار کھینچ کر سونڈ پر دو وار ایسے کئے کہ ہاتھی منھ پھیر کر بھاگا اور آپ گھوڑے پر سوار ہو کر سواری مبارک کے ہمراہ واپس ہوئے ڈیوڑھی پر آئے تو شمس الامراء بہادر نے سینہ سے لگا لیا اور اس جسارت اور بہادری کی تعریف کی۔

جناب عمر یافعی کے پاس ایک قلمی تذکرہ نقش کا ہے جس میں بدرالدین خاں بہادر تمیز تلمیذ فیض لکھا ہے اس کے علاوہ ہمیں کسی اور جگہ آپ کے تلمذ کا حال نظر نہیں آیا۔ فیض سے تلمذ رکھنا قرین قیاس بھی ہے اس لئے کہ حضرت فیض ہمعصر تھے اور شمس الامراء کے دربار سے بھی تعلق رکھتے تھے۔

بیعت کی نسبت کسی نے کچھ نہیں لکھا مگر وہ خود کہتے ہیں ؂

جب سے بدرالدین ہوا بندہ رفیع الدین کا
تب سے اس کے اور ہی رتبہ ہوا آئین کا

مولف گلزار آصفی کا بیان ہے کہ مولانا رفیع الدین قندہار (دکن) کے باشندے تھے نواب سکندر جاہ بہادر کے

زمانہ میں حیدرآباد تشریف لائے اور ہزاروں آدمیوں کو مرید کیا روزانہ اس قدر ہجوم رہنے لگا کہ آپ کے گھر پر سے آمد و رفت مشکل ہو گئی نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ بہادر کو یہ بھیڑ بھاڑ پسند نہ آئی اور انھوں نے حضور میں عرض کیا کہ مولانا کے مریدوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے اگر یہی جوش و خروش رہا تو وہ دن قریب ہیں کہ حضور اور میں بے کار ہو جائیں گے اور مولانا کی حکومت رہے گی ان کا بلدہ میں رہنا قرین مصلحت نہیں۔ اسی معروضہ کی بنا پر مولانا کو وطن واپس جانے کا حکم ملا اور وہ قندھار تشریف لے گئے۔

یہ لطیفہ بھی قابل ذکر ہے کہ مولانا کے بلدہ سے جاتے ہی نواب اعظم الامرا ارسطو جاہ کے معروضہ کو ان کی شیعیت اور تعصب پر، اعظم الامرا کی موت کے متعلق کہ وہ قضائے الٰہی سے مرے یا مولانا کی بد دعا سے ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے مگر ان کے معروضہ کے متعلق اسقدر ضرور کہیں گے کہ مصلحت وقت یہی تھی اور ایک مدبر وزیر کو یہی کرنا چاہئیے تھا جو انھوں نے کیا ورنہ وہ مذہبی لحاظ سے بالکل غیر متعصب تھے۔ گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ حضرت مغفرت منزل کے عہد میں شمس الامرا بہادر امیر کبیر اول نے مولانا رفیع الدین کو پھر قندھار سے بلوایا اور جان علی خاں کے مقبرے کے باغ میں ٹھہرایا اسوقت مولانا کے دیدۂ ظاہری بند ہو چکے تھے اور عام لوگوں سے ملتے بھی نہ تھے۔ چند روز ٹھہر کر شمس الامرا بہادر کے تمام خاندان کو مرید کیا اور پھر قندھار واپس تشریف لے گئے اور وہاں پہونچتے ہی انتقال فرمایا۔

بدرالدین خاں تمیز کا دیوان بڑی تقطیع کے ۱۵۰ صفحات ۱۵ سطری مسطر پر ہے پورے دیوان کے حاشیہ کی لکیر طلائی ہے، سرورق (لوح) مطلا و مذہب ہے اکثر غزلیں بڑی بڑی ہیں دو غزلہ سہ غزلہ اکثر ہیں۔ چار مخمس ہیں، ایک سودا ایک ہمدم ایک جرأت ایک آفاق کی غزل پر، ایک قصیدہ بھی ہے اور ایک ترجیع بند جس کے (۱۸) بند ہیں اس کا خط نہایت ہی پاکیزہ اور کاغذ بہت ہی عمدہ ہے یہ نسخہ کتب خانۂ آصفیہ میں آخر آبان ۱۳۲۱ف میں داخل ہوا ہے مشہور اساتذہ کی غزلوں کے جواب میں غزل کہی ہے۔ ہر ایک غزل پر "در جواب فلاں" لکھا ہوا ہے۔

میر کی مشہور غزل پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں:-

غزل: جب کہ چمن میں وہ نونہال کیا — خرام ناز سے ہر گل کو پائمال کیا
کبھو نہ ایک بھی اس کے اثر کیا دل پر — اگرچہ ہجر میں نالے ہزار سال کیا

اور ایک میر کی غزل کا جوابی شعر دیکھئے:-

گر زیست اس طرح گئی بس از مرگ دہر میں — تا سب کہیں یہ رو کوئی نیک مرد تھا

سودا کی ایک غزل پر غزل کہی ہے، اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو:-

جب دیا بادہ بصد غصہ دیا ساقی نے — ہاتھ سے اس کے خوشی سے نہ کبھو جام لیا

شاہ نصیر کی دو غزلوں کا جواب لکھا ہے جس کے دو شعر یہ ہیں:۔

تھے جو منعم انکے ہے بس مانڈگوں کا یہ معاش
کھودنا اور گھر کی اپنے خاک پتھر بیچنا

دیکھ کر جلوہ مرے رشکِ مہ پر نور کا
بھول جاویں حضرتِ موسیٰ جھگڑا طور کا

ذوق پر زیادہ مہربانی تھی ان کی اکثر غزلوں پر غزلیں کہی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ ہوں:۔

شور سُن وہ اور بھی برہم ہوا نازک مزاج
نالۂ دل کا مرے اس کو اثر اچھا ہوا

وہ ہے مشکل کشا ہے شرم میری اے تمیز اسکو
میں اپنی مشکلیں سب حیدرِ کرار کو سونپا

ظفر کی غزل پر بھی غزل کہی ہے اس پر لکھا ہے "در جواب مرزا ابوظفر ولیعہد فرزند کلاں اکبر شاہ از دہلی آمدہ"

اس کے ہنسنے سے مرا غنچۂ دل تنگ کھلا
باغ میں کوئی بھی بلبل نہ گل اس رنگ کھلا

سلیماں شکوہ کی غزل کا جواب بھی دیا ہے:۔

بیتاب دل ہمارا شب یار بن تمیز آہ
سو بار گھر میں آیا سو بار گھر سے نکلا

سراج کی غزل کے جواب میں ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

صبر و شکیب تاب و تواں کے اُڑے حواس
اس کے جو تیر ناز نے دل میں اثر کیا

آفاق کی غزلوں کا جواب بھی ہے۔

یہ باد صبا تو نے کیا شغل کیا پیدا
شبنم کو رلا دینا اور گل کو ہنسا دینا

سادہ رو کے رخ پہ شاید خط نمودار اب ہوا
خط جو اس کے پاس سے لے نامہ بر آنے لگا

مہاراجہ چندو لال بہادر شاداں کی غزل کے جواب میں بھی غزل موجود ہے۔

دل میرا تجھ سے بہت صاف تھا ابتک پہ اب
جانب غیر کیا تو جو اشارا، چمکا

ہمدم کی غزل کا جواب بھی ہے:

کسو کا یاد آتا ہے وہ عالم نوجوانی کا
ادا کا، آن کا، انداز کا، نازک میانی کا

ملائیں صورتیں ماٹی میں کیا کیا خوبرو یونگی
کہوں شکوہ کہاں تک آسماں کی ظلم رانی کا

تمیز اس بات کی کیجو بقول مصرعۂ ہمدم
نمود آدم کی ہے ہو بلبلہ جس رنگ پانی کا

تمیز جنگ نے مشاعرہ میں بھی طرحی غزلیں کہی ہیں بعض غزلوں پر مشاعروں کے نام ہیں۔

شگفتہ ہیں گل آب جوئیں رواں ہیں
عجب با موسم خوش یہ برسات لایا

اس غزل پر "بہ غزل طرحی شمس الامراء بہادر" لکھا ہوا ہے ایسی ہی اور غزلیں بھی ہیں۔
مطلع عموماً اچھے کہے ہیں:۔

صنم، صبح، بشکر خدا آن نکلا
جو کچھ اپنے جی میں تھا ارمان نکلا

کل میں جو ں آئینہ اسکا منھ جو تک کر رہ گیا
اس کا بھی غصہ سے کچھ تیہنا پھڑک کر رہ گیا

ایسی کیا تقصیر کی ہے میں نے اے دلبر بھلا
کر رہا جور و ستم ہے اتنا کیوں مجھ پر بھلا

کیوں نگہ پھینکتے ہو دز دیدہ
اس قدر کیوں ہو مجھ سے رنجیدہ

نہ اُٹھے پھر جو وہ شب سوئے پہر کے بجتے
چونک اُٹھے صبحدم اک بار گجر کے بجتے

کس طرح دل سے رہِ کوچہ جاناں چھوٹے
کیونکہ بلبل سے بہاراں میں گلستاں چھوٹے

امید ان سے رکھوں کیا میں آشنائی کی
بتوں کے کوچہ سے آتی ہے بو خدائی کی

لطف زبان ملاحظہ ہو:۔

بحرِ غم میں ڈبو دیا دل نے
نہ کیا وار ہی نہ پار کیا

نہ آہوں کا اثر اس کو نہ کچھ تاثیر نالوں کی
نظر آیا بتِ کافر کا دل کچھ سنگ خارا سا

کیا نصیبوں کا لکھا تجھ سے کہوں آہ تمیز
لیکے قاصد سے وہ مکتوب مرا چاک کیا

ہیں دیکھ کر انھیں جو ہوا غش تو وہ کہے
تم تو ابھی کھڑے بھلے چنگے تھے کیا ہوا؟

وائے قسمت طلبِ بادہ پہ شب ساقی نے
شیشہ کو چور کیا غصہ سے ساغر پھینکا

بعض بہاریہ شعر اچھے کہے ہیں:۔

یہ برق چمکتی نہیں رقاص پری ہے
یہ رعد نہیں، بجتی ہے مردنگ ہوا پر

آمد ہوئی اے بلبل پھر فصل بہاراں کی
رہتا ہے گلستاں میں صیاد خدا حافظ

رات دن اپنا گزرے ہے یوں بکوئے گلرخاں
عندلیباں موسم گل میں پھرے جوں باغ باغ

امڈی ہوئی گھٹائیں بجلی چمک رہی ہے
گلشن میں بادہ پیویں لے بادہ خوار ہم تم

کرتے ہیں میکشی مست اب زیرِ تاک بیٹھے
بدلی سے مت دکھا منھ اے آفتاب اس وقت

بحر طویل میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور بعض غزلیں اچھی کہی ہیں۔

گیا باغ میں صبح جیوں غیرت گل تو دیکھ اس کا رخ اور قامت قیامت
حواس اُڑ گئے بلبل و قمریوں کے گل و سرو کا دل خیاباں سے کھینچا

تمیز اس کو شرم اور مجھے اضطرابی کشاکش ہی میں وصل کی رات گزری
گھڑی رات باقی رہی ہووے گی تب بزور اس کو حجرے میں دالاں سے کھینچا

امیر ابن امیر تھے مطلوب کی گالی کا بھی اثر برا لیتے تھے۔

مجھ کو سر مجلس نہیں دشنام گوارا   کہنا ہو جو تم کو سو کہو کان میں صاحب

کبھی یاران گزشتہ پر بھی آنسو بہاتے ہیں۔

فرہاد و قیس و وامق و مہیار اور نل   ہیہات اُٹھ گئے ہیں یہ کیا یار چار پانچ

فرہاد، قیس، وامق، نل تو مشہور ہیں۔ مہیار بھی ایک ایسا ہی منچلا تھا جس کا "عشاقِ دکن" میں وہی مرتبہ ہے جو مجنوں کا عرب میں فرہاد کا عجم میں۔ بعض شعر نہایت ہی بے ساختہ کہے ہیں۔

آہوں کی مرے دیکھتے ہی شعلہ فروزی   شب کرمکِ شب تاب ہوئی ونگ ہوا پر
اس شب تو ساقیا مہ و انجم کا ہے سماں   بیٹھے جو تیرے گرد ہیں میخوار سو پچاس

آگے مہیار کا ذکر ہو چکا ہے اب اس کی محبوبہ چندر بدن کو مخاطب کرتے ہیں:۔

سُن اے چندر بدن اب اور تو کیا چاہے ہے   دیا مہیار نے جی تیرے اک ارشاد کے ساتھ

ایک غزل میں سراپا بیان کیا ہے:۔

ٹک چشم تصور سے دیکھو تو سراپا کو   اعضائے بدن اس کے سانچے کسی ڈھالے ہیں
مژگاں وہ نکیلے ہیں یا تیر ہیں یا نشتر   یا سیل ہیں یا بلم برچھی ہیں کہ بھالے ہیں
توصیف میں اس رخ کی انشائے ظہوری ہے   وصفِ خطِ نوخط میں طغریٰ کے رسالے ہیں
کیونکر کہوں زلفوں کو کالوں سے ہیں ہم شیری   خونِ دلِ عاشق سے دو ناگ وہ پالے ہیں

معنوی کیفیت کا ایک شعر ملاحظہ ہو:۔

قدم رکھے ہیں زمین پر کب اہلِ کیفیت   کہ ہاتھوں ہاتھ چلے ہے ایاغ مجلس میں

میر سوز نے ایک معرکۃ الآرا غزل کہی ہے:۔

مری جان جاتی ہے یارو سنبھالو   کلیجہ میں کانٹا چبھا ہے نکالو

اسی زمین میں تمیز نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔

نہ لچکے کمر دل دھڑکتا ہے میرا   یہ نازک ہے پہونچا نہ گیندیں اُچھالو
چلا روٹھ کر یار میری طرف سے   کوئی پاؤں پڑ کر ذرا تو منالو
اگر یار غصہ ہوا تو تمیز اب   رہو دم بخود کچھ نہ بولو نہ چالو

کچھ متفرق شعر بلا انتخاب نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی طبیعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ہائے بخت خفتہ کیوں شب آنکھ میری لگ گئی   پھر گیا دروازہ پر سے یار گھبرایا ہوا
نہ رکھیں عالم مستی میں مطلق کچھ خبر اپنی   خدا کے واسطے مستوں کو اے ساقی چھکا اتنا

چشمِ تر میں ہے تصور تری زلف و رُخ کا — ابرِ مژگاں سے مرے برسے ہے باراں شب و روز
گردشِ افلاک سے کیا کیا صفیں برہم ہوئیں — ہے کہاں بزم فریدوں جشن کیکاؤس حیف
ہزاروں ڈھب سے ہم کہتے ہیں انسے حالِ دل لیکن — وہاں کچھ پیش جاتی ہی نہیں ہیں اپنی تقریریں
مگر اسکے شبِ جلا کے حالِ دل میں کہا تو لوگوں سے اپنے ڈر کر — کہا کہ ٹک تو دل تھامے ہوئے نہ اسقدر کر پکار باتیں
ہے شاعروں میں ہمدمِ آفاق و شہرت اب — خوش فکر ہیں یہ بندۂ سرکار اک دو تین
بے حیا غیر، کہائے گا دشنام — تم بھلا اب سے مرا نام تو لو
خبردار اے دلِ غافل کہ دم کا — کیا کچھ قافلہ کچھ چل رہا ہے

ایک قصیدہ بھی کہا ہے جس کی تمہید نہایت ہی اچھی ہے (۵۴) شعر صرف تمہید کے بعد سراپا کے ہیں کل قصیدہ ایک سو شعر کا ہے:۔

چلی صبح ہوتے جو بادِ بہار — تو کچھ نیند سی آگئی ایک بار
نظر آئی اک مہ جبیں خواب میں — کہ خورشید ہو جس کے رُخ پر نثار
کروں حُسن کا اس کے کیا میں بیاں — اسے دیکھ کر دل ہوا بے قرار
مصفّٰی تھے رخسار آئینہ سال — جبیں اس کی تابندہ تھی ماہ وار
مہِ نو کی تفسیر تھیں ابروئیں، — کہے تو وہ تھی تیز دم ذوالفقار
وہ دو چشمِ میگوں تھے دو جام و مل — وہ دو ترک، مردم تھے دو بادہ خوار
جب اس طرح وہ مجھ کو آئی نظر — میں پوچھا کہ تو کون ہے اے نگار
کہا مجھ سے واقف نہیں ہے تو کیا — مرا نام ہے خرمی و دیار
میں آئی ہوں تجھ کو یہ دینے نوید — ذرا خوابِ غفلت سے ہو ہوشیار
میں اس کی گرہ سال کی رکھ خبر — جو نواب ہے آج با اقتدار
کہیں ہیں اسے شمس الامرا، تمام — ہے مانندِ شمس اس کا نام آشکار

باپ کی مدح میں بیٹے کا قصیدہ ایک انوکھی چیز ہے مگر قدما میں یہ طریقہ معیوب نہ تھا ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں

شکر گنج کے خاندان میں ہے تو — نہیں تجھ سا پھر کوئی عالی تبار

آخری دعائیہ شعر یہ ہیں:۔

دعا پر بس اب ختم کر لے تمیز — وہ زندہ رہے تا بہ روزِ شمار
ہے ذاتِ مقدس و یکتائے عصر — کوئی اس کا ثانی نہیں زینہار

سدا خوش رہے آل و اولاد سے سلامت رکھے اس کو پروردگار
ہوا خواہ اسکے جو ہوں، خوش رہیں عدو اس کے ہوویں ذلیل اور خوار

دیوان میں ایک ترجیع بند بھی ہے جس کے (۱۸) بند ہیں:۔

کس خود نما سے آئینہ ساں ہو گیا دوچار کوئی تو آنکھ میں ہے چڑھی شوخ طرحدار
نرگس سا رنگ زرد ہے تن ہے نحیف و زار تاب و تواں کنارہ کشی پر ہیں ایک بار
دل کس کی چشم مست کا سرشار ہو گیا
کس کی نظر لگی کہ یہ بیمار ہو گیا

گلخن نمط ہے گرم مرا سینہ ہم نشیں اخگر کی طرح گرنے لگے اشک آتشیں
ہردم شرارہ ریز ہوا نالۂ حزیں جل گئی متاع صبر و تواں کچھ رہا نہیں
"شعلے بھبو کے اٹھنے لگے دل کے داغ سے"
"آخر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

ہر شئے میں ہر جگہ میں تو ہے یار جلوہ گر رکھتا تمیز تیری تجلی پہ ہے نظر
سنتا ہے رات دن تری آواز کان دھر ہردم ہر آن لو میں تری ہے یقین کر
کیا فرق داغ گل میں اگر گل میں بو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

موجودہ نواب لطف الدولہ بہادر صدر المہام سرکار عالی و والی پائیگاہ خورشید جاہی نواب تمیز کے بھائی کے پوتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ نواب تمیز کے دیوان کے طبع کا انتظام فرما کر خانوادۂ خورشید جاہی کے ایک ادبی کارنامے کو محفوظ فرما دیں گے۔

سید تمکین کاظمی

(نگار) نواب تمیز کا مجموعۂ کلام میں خود کتب خانۂ آصفیہ میں دیکھ چکا ہوں، لیکن اس ارادت و عقیدت کے ساتھ میں نے کبھی اس کا مطالعہ نہیں کیا جس سے جناب تمکین کاظمی نے کام لیا ہے۔ چونکہ یہ مجموعہ وہاں کے ایک امیر سے منسوب ہے اور اب سے تقریباً سوا سو سال کی دکنی شاعری و دکنی زبان کی یادگار ہے، اس لئے اس کی اشاعت مناسب یا ضروری جو کچھ قرار دیجائے، ٹھیک ہے، ورنہ یوں تغزل و شاعری کے لحاظ سے اس میں کوئی بات نہیں پائی جاتی۔ نواب تمیز کے

اکثر اشعار وہی ہیں جو بہ تبدیل الفاظ دوسرے ہمعصر یا متقدم اساتذہ کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں اور اُن سے ہٹ کر جو کچھ انھوں نے کہا ہے وہ تقریباً وہی ہے جو نثر تو اس لئے نہیں ہے کہ کلام موزوں ہے اور شعر اس لئے نہیں کہ محاسن شعر و تغزل میں سے کوئی بات اس میں نہیں پائی جاتی۔

جناب تمکین نے اس مضمون میں نواب تمیز کے اشعار بکثرت نقل کئے تھے اور ان کی کافی داد بھی دی تھی، لیکن میں نے اس "حسن ظن" کے اکثر حصہ کو نکالدیا۔ رہگیا اس مقالہ کا شائع کرنا سو، وہ اس لئے ضروری سمجھا گیا، کہ دکنی شاعری یا دکنی زبان کی تاریخ سے بہر نوع اس کا تعلق ظاہر ہے اور اس بنا پر اس کی اہمیت سے بھی انکار نہیں ہو سکتا۔

"نگار" جنوری ۱۹۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چندر بردائی۔ اور اسکے ہمعصر شعراء۔ جگ نائک۔ سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونہ کلام۔ اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ۔ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور:۔ (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور ان سے پہلے کے بھگت شعرا۔ مقلدین رامانند۔ بھاؤنند رے داس بھگت۔ کبیر۔ گورو نانک دیو۔ میراں بائی۔ ملک محمد جائسی۔ تلسی داس۔ سورداس۔ عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ۔

ہندی شاعری کا تیسرا دور:۔ (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیسوداس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیسوداس کے ہمعصر سندرداس سیناپت یا بادین۔ دیال گر۔ بھوشن۔ متی رام۔ چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعراء اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء۔ ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم:۔ (۱۸۰۰ء کے بعد) للولال۔ سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار۔ بھارتندو بابو ہرشچندر۔ پدماکر۔ بینی پردین۔ سری دھر پھاٹک کی شاعری شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ ہندی شاعری پر اردو کا اثر۔ ہندی کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے اور اردو رسم الخط میں بھی۔ ضخامت کا اندازہ ۳۰۰ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت ۲؎ ہوگی۔ لیکن خریداران سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لی جائے گی۔

منیجر نگار

انقلاب کا اثر روسی زبان پر

دنیا اس وقت جس دور ترقی سے گزر رہی ہے اس میں روس ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے سنہ ۱۷ء کا انقلاب روس کے غربا کے لئے ایک ابر رحمت تھا۔ صدیوں سے روسیوں کا وہ "ذلیل" طبقہ جو تمام دن محنت کرنے کے بعد بھی شام کو پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکتا تھا اس کو انقلاب نے روٹی دلوائی، رہنے کو پست جھونپڑے کے عوض پختہ اور عالیشان مکان دیا اور ہفتہ میں ایک بار اس کی بیوی اور بچوں کی ہواخوری کے لئے موٹر گاڑی کا سامان کر دیا۔ انقلاب کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ بذات خود اتنا دلچسپ واقعہ ہے جیسے الف لیلیٰ کی کوئی کہانی چونکہ موجودہ بحث نفس انقلاب سے نہیں بلکہ انقلاب زبان سے ہے اس لئے اس حکایت لطیف کو کسی دوسری صحبت کے لئے چھوڑتا ہوں۔

روسی ادب، روسی تہذیب کی طرح پرانا نہیں بلکہ سترھویں صدی کی پیداوار ہے جب پیٹر اعظم روسیوں کو پکڑ پکڑ کر ان کی داڑھیاں منڈوا رہا تھا اور ان کو فرانسیسی ناچ کی تعلیم دلوا رہا تھا۔ ان کے نیم مشرقی اور نیم مغربی لمبے کوٹوں کو زبردستی ترشوا کر جاکٹ بنوا رہا تھا اس سے پہلے روسی زبان اپنے اہل زبان کی طرح کوئی خاص وضع قطع نہ رکھتی تھی۔ شمال و مغرب، مشرق و جنوب کے رہنے والے دونوں دو قسم کی زبان بولتے تھے جنکو ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ تاتاریوں کی زبان علیحدہ تھی اور کاسکس (Cossacks) بھی اپنی بھاکا الگ بولتے تھے۔ ایسے غیر طبعی ماحول میں نہ تو قومیت پل سکتی ہے اور نہ کوئی قومی زبان پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے قبل مملکت روس میں کوئی ایسی ہستی پیدا نہ ہوئی جس پر ہماری نظر پڑے اور جس کو ہم روس کا شاعر یا مصنف کہہ سکیں۔ پشکن (Phushkin) (۱۷۹۹ء - ۱۸۳۷ء) روسی علم ادب کا پیٹر اعظم تھا۔ یہ وہ پہلا شخص ہے جس کو ہم روس کا مصنف، شاعر، قصہ گو الغرض جو چاہیں کہیں۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسکی ......شاعری اور نثر نگاری روسی علم و ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کے مختصر افسانے روسی تہذیب و تمدن، روسی جذبات و خیالات کے بہترین آئینے ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ پشکن پر مغربی ادیبوں کا بہت زیادہ اثر پڑا ہے خصوصاً شکسپیر اور بائرن کا۔ اس کے خیالات اکثر جگہ ان شعرا کے کلام

سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں، مگر چونکہ اس کی تمام باتیں خواہ نثر میں ہوں یا نظم میں اس قدر روسی ماحول سے مملو ہیں کہ بالکل اچھوتی معلوم ہوتی ہیں۔ پشکن کا دماغ ایک عالمگیر جذبات کا مخزن تھا۔ اس کے کلام میں قومیت، درد اور حقیقت نگاری کے عناصر خاص طور پر غالب ہیں۔ کبھی کبھی وہ والٹیر (Voltaire) کی طرح مذہب کے نقاب کو اپنے طعنوں سے چاک چاک کر دیتا ہے اور کبھی ایک روسی دہقان کی طرح صلیب کے آگے دوزانو ہو کر "میڈونا" جیسی نظم کہتا ہے۔ پشکن کی بعض نظموں میں قومیت کی لہر دوڑتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس کا دل مفلس اور بھوکے مزدور کو دیکھ کر دکھ اٹھاتا ہے جو جاڑے کی رات میں صرف آگ تاپ کر صبح کر دیتے ہیں اور تمام دن نشتر چبھونے والی سرد ہوا میں برف پر کام کرتے ہیں۔ وہ آرام طلب امیروں کو دیکھ کر کڑھتا ہے جو غریبوں کا خون چوس کر خود لطیف غذائیں کھاتے ہیں اور رنگین شرابیں پیتے ہیں۔ ۱۸۲۵ء میں کسانوں کی "بغاوت" پر پشکن کی نظمیں اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ انیسویں صدی میں رہتا تھا مگر اس کی آنکھیں اسی وقت سے انقلاب کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ الغرض سکندر اول کے دور حکومت میں اگر روسیوں کی کوئی بولتی ہوئی تصویر ہو سکتی ہے تو وہ پشکن کی تصنیفات ہیں۔ پشکن کے بعد نکولس گوگل (Nicholas Gogol ۱۸۵۲-۵۹) روسیوں کا دوسرا مصنف ہے جس کا کلام روسیوں کے اس درد و غم کا سراپا ہے جو اندر ہی اندر ان کی سوسائٹی کو کھوکھلا کر رہا تھا۔ گوگل کے افسانے اس بوجھ کی میزان ہیں جو "اعلیٰ" "ادنیٰ" پر ڈال رہا تھا۔ اس کے افسانے واقعات کے اظہار ہیں۔ ان کو پڑھ کر دل بیٹھ جاتا ہے اور طبیعت اداس ہو جاتی ہے۔ "لبادہ"، "انسپکٹر جنرل" "مردہ ارواح" ایسے افسانے ہیں جن کا جواب دوسری زبانوں میں مشکل سے ملتا ہے۔ ان افسانوں میں ظلم و تشدد کا نقشہ کھینچ دیا ہے اور یہ نقشہ ہم ہندوستانیوں کے لئے بہت مانوس چیز ہے۔ ان افسانوں کا ہر شخص ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ ہمارا ملاقاتی ہے یا ہم اکثر اس کو دیکھتے ہیں اور اس کا ذکر سنتے ہیں۔ گوگل کی زہریلی پھبتیاں جو وہ روس کے تشدد پسند حکام پر کستا ہے روسی زبان کے بہترین شاہکار ہیں۔ ٹالسٹائی (Tolstoi) ہمارے مصنفوں کی فہرست میں تیسرے درجہ پر آتا ہے اگرچہ اس کی عالمگیر شہرت اس کو روسی مصنفوں میں پہلی جگہ دلاتی ہے۔ اس کے ناول اور دیگر تصنیفات دنیا کی قریب قریب ہر زبان میں ترجمہ ہو چکی ہیں۔ "انا کرنینا"، "اصلاح"، "کاسک" "جنگ و صلح" اس کی غیر فانی کتابیں ہیں جو اس کو ڈوما، روسو، گیٹے، وکٹر ہیوگو وغیرہ بے مثل مصنفوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہیں۔ ٹالسٹائی میں گوگل کے خلاف صبر و تحمل کا مادہ زیادہ ہے۔ جہاں گوگل طعنہ زنی کرتا ہے وہاں ٹالسٹائی صبر و استقلال سے کام لیتا ہے۔ اور انسانی کمزوریوں پر ایک خدا ترس انسان کی طرح پردہ ڈال دیتا ہے۔ ٹالسٹائی کے بعد روسیوں میں اس پایہ کا مضمون نگار کوئی نہیں رہا گرچہ اس کے بعد اور انقلاب ۱۹۱۷ء کے قبل تک چیخو (Chekov) انڈریو (Andreyew) کورولنکو (Korolenko) کپرن (Kuprin) وغیرہ کے نام آتے ہیں ان میں شاید سب سے

زیادہ نازک مزاج اور رحم دل کوروننکو ہے۔ اس کی ہر تصنیف میں زندگی اور آلام زندگی کا رونا ہے۔ آسمان اور زمین کا تعلق ایک دوسرے سے امن پسند اور ہموار ہے مگر اندھے انسان نے آکر ان کی ہمواریوں کو مٹا دیا ہے اسکے افسانے تمامتر پکار ہیں مدد کے لئے کہ کوئی آئے اور اس اُلجھے ہوئے انسان کو آزادی اور امن کا راستہ دکھائے متذکرہ بالا مصنفوں کے دور میں روسی زبان نے ایک خاص خصوصیت حاصل کر لی حقیقت نگاری روسی مصنفوں کا تمغۂ امتیازنہ ہو گیا روسیوں کو اشیا سے چونکہ بہت زیادہ تعلق تھا اور ہے اس لئے روسی تہذیب میں اشیائی باتوں کا بھی دخل ہو گیا مثلاً روسی، انقلاب سے پہلے، خدا کا قایل اور مذہب کا فریفتہ تھا۔ روسی مصنفوں کا بھی یہی حال ہے کہ خدا اور خدا ترسی کی باتیں ان کے ہر ورق میں سنائی دیتی ہیں۔ ٹالسٹائی کو اگر صرف اس کی تصنیفوں سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ کوئی بہت بڑا ریش و بروت والا اقدس آب پاپائے اعظم ہے جو پہاڑ کی چوٹی سے وعظ و تلقین کا نعرہ لگا رہا ہے۔ اس کی زبان سے محبت و رحم کا دریا اُبل کر تمام دنیا کو سیراب کرنا چاہتا ہے۔ کتاب ختم کرنے کے بعد اس کا پڑھنے والا کچھ دیر کے لئے معصوم صفت ضرور ہو جائے گا۔ روسی کتابیں پڑھنے کے بعد معاً یہ خیال آتا ہے کہ اسکے پڑوس کے رہنے والے جرمن اور فرانسیسی بھی اس زمانہ میں سوچتے اور لکھتے تھے مگر ان کے خیالات اسقدر خدا اور مذہب سے کیوں دور ہیں؟ یہاں پر کچھ دیر کے لئے اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ روس میں اسوقت ہزار میں دس آدمی پیٹ بھر کر کھاتے تھے وہاں بھوک اور مانگ کی ایک لہر دوڑ رہی تھی جو دل کے دھڑکن کو آہستہ کر دیتی تھی اور دماغ کو مفلوج۔ ایسی حالت میں جبکہ مفلسی منہ تاک رہی ہو اور معدہ کھانا مانگتا ہو سوائے خدا اور مذہب کے کہاں پناہ مل سکتی ہے؟ جب امیروں کے دروازے غریبوں پر بند ہو جاتے ہیں تو غریب اپنی تنگ کوٹھری میں جا کر تاریکی میں اپنے دل کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتا ہے اور خدا کو بلاتا ہے۔ اس کے آگے روتا ہے، گڑگڑاتا ہے، پھر پیغمبروں کی دہائی دیتا ہے پھر ولیوں کی، آخر میں ٹھنڈی سانس لیتا ہے اور اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ اسوقت روسی زبان کے جاننے اور لکھنے والے بھوکے تھے اور ننگے۔ ان کا دکھ معدودے چند کے آرام کا سبب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیف کے ہر ورق میں ناکام غصہ، بھوک اور پیاس، خدا اور فریاد ہے اور آخر میں سُرخ آنکھوں کی غضبناکیاں اور دانت پیسنے کی آواز ان کے قلم کی نکلی ہوئی باتیں ایسی دھمکیاں ہیں جن کو پڑھ کر جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوتی ہے۔

پھر ۱۷ء کا انقلاب آیا۔ غریبوں نے لاٹھیاں اُٹھائیں، کمر کس کر باندھا اور اپنے کاندھے سے بادشاہ اور بادشاہ کے بوجھ کو اُتار کر پھینکدیا جو صدیوں سے ان کی ریڑھ کی ہڈیوں کو توڑے ڈالتی تھی اسکے بعد طوائف الملوکی اور غارتگری کا زمانہ آیا۔ روس کی سرزمین پر انسان کے بدلے بھیڑیئے پھیل گئے جو ایک دوسرے کو چیرنے لگے صدیوں کی دبی ہوئی چنگاری بھڑک اُٹھی۔ شہر اور دیہات میں جمی ہوئی برف سُرخ ہو گئی ۔ انسان کا خون بھی

بہ کر جم گیا۔

ایسے مارکٹائی کے دن اور خوف وہراس کی راتوں میں پرانے لٹریچر کے پرانچے اڑ گئے۔ پشکن اور ٹالسٹائی کا رنگ ان کے ساتھ چلا گیا۔ روسی ادب نے خدا ترسی اور پارسائی کے لبادہ کو اتار کر رکھ دیا۔ اب دل کھول کر باتیں ہونے لگیں وہ اگلی سی چھپی اور دبی ہوئی اشارہ کنایہ کی باتوں کی ضرورت نہیں رہی۔ انسان آدمی کی طرح رہنے لگا۔ غلامی اور بیکاری افسانہائے ماضی ہوگئیں۔ خوشی اور فارغ البالی کا دور آیا۔ اب تو یہ حال ہو گیا ہے کہ روسی لٹریچر کی نظیر دنیا کی کسی زبان میں نہیں ملتی۔ لینن، ٹراٹسکی، گارکی، سولوگب وغیرہ کی تصنیفوں کو دیکھئے تو عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی ہر بات صاف، مختصر اور نہایت آزاد ہے۔ میرے خیال میں ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی قوم نے اتنی آزادی سے قلم نہیں اٹھایا ہوگا۔ ان کے خیالات اتنے بے باک اور نڈر ہو گئے ہیں کہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ وہی قوم جو صرف اٹھارہ سال قبل صدیوں پرانی رسموں میں بری طرح جکڑی ہوئی تھی یکا یک اسقدر آزاد کیونکر ہو گئی؟ یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دماغ صدیوں سے نہایت آزاد ماحول میں پرورش پا رہے تھے۔ ان کی بات بات پر عقل سلیم کی دلیلیں، جگہ جگہ پر صاف اور لطیف استعارے، قدم قدم پر ہنسی کی ہلکی سی لہر، خیالات میں اتنی آزادی کہ، مذہب بوڑھی عورتوں کی جہل بکواس، خدا بائبل کا دقیانوس خدا اور یسوع انسان کا بیٹا ہو کر رہ گیا ہے۔ طرز گفتگو میں اتنی قوت اور دلائل اتنے عام فہم اور حقیقت پر مبنی کے سوائے ماننے کے اور کچھ بن نہیں پڑتا۔ سچ تو یہ ہے کہ روسی زبان جس سرعت سے ترقی کر رہی ہے اگر یہ حالت زیادہ نہیں صرف بیس سال تک اور قائم رہ گئی تو انسان کو اپنے دماغ میں نئی چیز اور نئے خیال کو سمجھنے کے لئے ایک اور خانہ کا اضافہ کرنا پڑے گا۔ ڈانٹے (Dante) کا دوزخ اور اعراف قرون وسطی کے یوروپین اقوام کے لئے جیسے بالکل بعید از وہم و قیاس بات تھی، اسی طرح روسی علم ادب ہماری اولاد کے لئے ایک نئی شاہراہ عقل و دلیل کے لئے کھول دے گا جس کی زمین بھی نئی ہوگی اور آسمان بھی نیا۔

ڈاکٹر محمد نصیر الدین

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوئم

کی

طباعت شروع ہو گئی ہے

مینیجر نگار

تاریخ کا ایک گمشدہ ورق

انطانی اور کاہنۂ مصر

روم کی ہزیمت خوردہ فوجیں ساحلِ فنیقیا تک واپس آگئی ہیں اور بحر ابیض کے سفید ریتیلے ساحل پر خیمہ ڈالے پڑی ہوئی ہیں۔ اہلِ لشکر اپنی گزشتہ شکست و ناکامی کی وجہ سے ملول ہیں اور مستقبل کے متعلق فکرمند۔

ان کا سردار انطانی، لشکر کے ہنگامہ اور سپاہ کے شور و غوغا سے گھبرا کر، اپنے رفیق ہتیو مصری کے ساتھ قریب کی اس پہاڑی کی طرف جا رہا ہے، جس کی بلندی اس سے قبل خدا جانے کتنی شکست خوردہ فوجوں اور کتنے فاتح لشکروں کو اپنے دامن سے گزرتی ہوئی دیکھ چکی ہے۔ اس پہاڑی کے ایک طرف سمندر ہے اور دوسری طرف وہ دریا جو آج دریائے کلب کے نام سے مشہور ہے لیکن اُسوقت اُس کو ولیقوس کہتے تھے۔

اب سے چند ماہ قبل انطانی اپنی فوجوں کو لیکر اسی پہاڑی کے نیچے سے گزرا تھا تاکہ وسط ایشیا پر حملہ کرکے وہاں کے ممالک کو اپنا اور اپنی حلیف کلیوپٹرا ملکۂ مصر کا مطیع بنائے، لیکن آرمینیا، فارس اور مابین النہرین نے ایسی پامردی سے مقابلہ کیا کہ انطانی شکست کھا کر پھر بحر ابیض تک واپس آگیا اور یہاں مصری فوجوں کی کمک کا انتظار کرنے لگا۔ انطانی کی ہزیمت و ناکامی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب وہ اس مہم پر روانہ ہوا تو پچاس ہزار سے زیادہ سپاہ اس کے ساتھ تھی اور جب واپس آیا تو صرف دس ہزار رہ گئی تھی اور اب بھوک پیاس کی حالت میں بحر ابیض کے ساحل پر پڑی کراہ رہی تھی۔

انطانی پہاڑی پر چڑھ رہا تھا اور جب تھک جاتا تو کسی چٹان پر بیٹھ جاتا اور دونوں ہاتھوں پر ٹھوڑی کو رکھ کر روئے سمندر کی طرف دیکھنے لگتا کہ شاید افقِ بعید پر مصری جہازوں کے بادبان نظر آجائیں --- کبھی اس کی نگاہیں دھوکا بھی دیجاتیں اور جن چیزوں کو وہ بادبان سمجھتا وہ صرف سمندری چڑیوں کا جھنڈ ثابت ہوتیں۔

انطانی اسی فکر و تردد کے عالم میں ایک چٹان پر بیٹھا ہوا تھا کہ ایک کوے کی آواز سے چونک پڑا۔ اس نے سر اٹھا کر اپنے رفیق کو ڈھونڈا جو اس کے پاس بیٹھا ہوا تھا، لیکن اسوقت وہ چند قدم دور آگے کھڑا ہوا تھا اور سامنے

کی ایک چٹان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

انطانی اُٹھا اور اس کے پاس جاکر کھڑا ہوگیا اور وہ بھی ان نقوش کو غور سے دیکھنے لگا جو چٹان پر نظر آتے تھے۔

یہاں اس وادی میں، اس دریا کے کنارے، اس وسیع و بسیط سمندر کے سامنے اور انھیں مہیب چٹانوں کے پاس سے خدا جانے کتنے لشکر انطانی سے پہلے گزر چکے تھے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے فاتحانہ انداز سے سربلند گزرے اور کتنے شکست خوردہ و سرنگوں ـــ وہ بڑے بڑے زلزلہ افگن سردار، وہ بڑے بڑے جسم پر رعشہ طاری کردینے والے سپہ سالار۔ جنھوں نے ساری دنیا میں اپنی جرات و بہادری کا سکہ قائم کر رکھا تھا، آج ابدیت کے بحرِ ذخار میں ڈوب کر فنا ہو چکے ہیں، اور اُن کی نشانیوں میں سے اب سوائے برباد شدہ زمینوں، تباہ و ویران بستیوں، اور سنسان خرابوں کے کچھ نظر نہیں آتا۔ ان چٹانوں پر انھیں فاتحین عالم کے نام منقوش تھے اور جس چٹان کے پاس انطانی اور اس کا رفیق کھڑا ہوا تھا اس پر ریمیسس ثانی فرعون مصر کا نام کندہ تھا۔ انطانی نے اپنا سر اظہار احترام میں جھکایا اور بولا کہ "کسے خبر ہے کہ مری یادگار ان چٹانوں پر کیا ہوگی ایک فاتح سپہ سالار کی سی یا ہزیمت خوردہ نکبت زدہ انسان کی سی"۔

وہ یہ کہتا ہوا دوسری چٹان کی طرف بڑھا اور پھر تیسری چٹان کی جانب اس پر سلما نصر اور سنجاریب (شاہان اشوریا) کے نام منقوش تھے، جو سات صدی پیشتر ادھر سے گزرے تھے۔ ان کا نام دیکھ کر انطانی ماضی کی تاریخ میں غرق ہوگیا اور اسی کے ساتھ خود اپنی زندگی کے تمام ایام ایک ایک کرکے اُسے یاد آنے لگے ـــ سب سے پہلا وہ دن جب مصر کی نوجوان ساحر ملکہ (کلیوپیٹرا) سے اس کی نگاہیں دوچار ہوئی تھیں۔ پھر وہ دن جب محبت کا اولین شعلہ اس کے سینہ میں بھڑکا، اس کے بعد وہ دن جب اس نے اپنی بیوی کو طلاق دیکر، کلیوپیٹرا کا طوق غلامی اپنی گردن میں ڈالا۔ پھر وہ دن جب اس نے اسکندریہ میں کلیوپیٹرا کے ملکۂ مصر و قبرص اور فرمانروائے افریقہ و سوریا ہونے کا اعلان کیا اور سب سے آخر میں وہ دن جب سلطنت روما نے اس کو ملت فروش اور غدار وطن قرار دیکر اسکے استیصال کا فیصلہ کیا ـــ وہ انھیں خیالات میں محو تھا کہ کسی کے پاؤں کی آہٹ آئی۔ اس نے گردن اُٹھا کر دیکھا کہ ایک بڑھیا عورت لکڑی کے سہارے سے آہستہ آہستہ اوپر کی طرف چڑھتی آرہی ہے۔ جب وہ انطانی کے قریب پہونچی تو ٹھہر گئی اور تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد دفعتہً ایک قہقہہ لگایا اور بولی:۔

"اے انطانی، تو اس ویران و وحشتناک مقام پر کیوں آیا ہے۔ کیا روما کو تباہ کرنے اور شرق و غرب میں جنگ کی تباہیاں پھیلانے کے بعد یہاں اس لئے آیا ہے کہ سانپوں کو اُن کی بانبیوں سے نکال کر پریشان کرے، گدھوں کے گھونسلوں میں آگ لگا کر انھیں آشیاں برباد کرے، بھیڑیوں اور لومڑیوں کے بھٹ کھود کر ان کو آزار پہونچائے، کیا دنیا میں اب کوئی انسان تیرے ظلم کا نشانہ بننے کے لئے باقی نہیں رہا"۔

انطانی حیران تھا کہ یہ کون عورت ہے جو اس طرح بیباکانہ گفتگو کر رہی ہے اس نے اپنے رفیق کی طرف مخاطب ہو کر کہا:-

"اے ہیتیو! یہ بڑھیا کون ہے۔ کیا تم پہچانتے ہو؟"

—"نہیں، میں اس سے بالکل ناواقف ہوں"۔

یہ سنکر بڑھیا غصہ سے لال ہوگئی اور چیخکر بولی کہ "اے کمینے، اے منافق ادھر دیکھ میری آنکھ میں آنکھ ڈالکر کہہ کہ تو مجھے نہیں پہچانتا۔ اے ذلیل کتے، کیا میں وہ دن بھول سکتی ہوں جب تو نے میرے اکلوتے بیٹے کو اس سردار سے قتل کرا کے میری دنیا کو ویران کر دیا۔

یہ سنکر انطانی کی حیرانی کی انتہا نہ رہی اس نے پوچھا:-

"اے بڑھیا تو کون ہے، تیرا بیٹا کون تھا اور تو میرے رفیق پر کیوں یہ الزام قائم کرتی ہے"

بڑھیا— "اے انطانی، مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں، کیونکہ تجھے تو دھوکا دیا گیا تھا، میں تو اس مکار سے مخاطب ہوں جسے تو اپنا رفیق کہتا ہے، ادھر میرے پاس آ اور اپنے رفیق کے کمینہ پن کی داستان تو بھی سُن لے— میں ایک کاہنہ ہوں اور مسلسل چالیس سال سے ہیکلوں اور معبدوں میں گھوم پھر کر زندگی بسر کر رہی ہوں، مصر و فینقیا کا کوئی مقام ایسا نہیں جہاں کے لوگ مجھے نہ جانتے ہوں اور میری پیشین گوئیوں کو غلط باور کرتے ہوں میرا ایک بیٹا تھا، اکلوتا بیٹا، جسے میں اپنے علم کے اسرار سکھا رہی تھی اور وہ تمام راز جو صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں اس کو بتا رہی تھی— ناگہاں اس کی نگاہ ایک نوجوان لڑکی پر پڑی اور وہ اس سے محبت کرنے لگا، یہ لڑکی بھی اس سے مالوف ہوگئی اور دونوں میں نکاح کا عہد و پیمان ہوگیا۔ یہ دونوں لطف و مسرت کی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک اور شخص اس لڑکی کا نہیں بلکہ اس کی دولت کا خواہاں پیدا ہوگیا اور میرے بیٹے کی ہلاکت کا سبب بنا۔ وہ شخص یہی تیرا رفیق ہے، جو میرے سامنے اور تیرے پہلو میں کھڑا ہوا ہے"۔

انطانی نے ہیتیو کی طرف دیکھ کر پوچھا، "کیا یہ صحیح ہے" لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بڑھیا نے کہا کہ "اے انطانی کیا اس کا یہ سکوت اس امر کا ثبوت نہیں کہ جو کچھ میں کہہ رہی ہوں وہ بالکل صحیح ہے اور اس میں تردید کا حوصلہ نہیں"

انطانی— "پھر کیا ہوا؟"

بڑھیا— "اس کے بعد یہ ہوا کہ اسکندریہ میں یہ تیرے پاس پہونچا اور مخبری کی کہ مصریوں کی ایک جماعت تیرے خلاف سازش کر رہی ہے"۔

انطانی— "یہ صحیح ہے لیکن وہ سازش کرنے والے میرے ہاتھ نہیں آئے"۔

بڑھیا۔ "ہاتھ کیا آتے جبکہ حقیقت کچھ نہ تھی اور یہ دغاباز صرف اس لئے جھوٹ بول رہا تھا کہ میرے بیٹے کو تیرے ہاتھ سے ہلاک کرا کے اس لڑکی کو حاصل کرے۔ پھر کیا تجھے یاد نہیں کہ اسی سازش کے الزام اور ملکہ سے محبت کرنے کے جرم میں تو نے میرے جوان بیٹے کے قتل کرنے کا حکم دیا۔ وہ چیخ چیخکر اپنی بے گناہی کا اعلان کر رہا تھا لیکن کوئی سننے والا نہ تھا، وہ آسمان و زمین کو گواہ بنا کر کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن اسکی بات کا یقین کرنے والا کون تھا۔ یہ مکار، منافق تجھے ابھار رہا تھا یہ کہہکر کہ وہ سازش میں شریک ہے، تیری غیرت میں ہیجان پیدا کر رہا تھا یہ یقین دلا کر کہ وہ ملکہ سے محبت کرتا ہے اور ملکہ اُس سے، درانحالیکہ میرے بیٹے نے سوائے اُس ایک لڑکی کے کسی اور سے محبت کی ہی نہیں اور آخر کار اسی کی محبت میں اس نے جان دی۔

پھر جس وقت تو نے قتل کا حکم دیا میں وہیں تھی، جس وقت جلاد کی تلوار نے میرے بیگناہ بیٹے کے سر کو تن سے جدا کیا میں وہیں موجود تھی۔ کیا تو سمجھ سکتا ہے کہ مجھ پر اس وقت کیا گزر رہی تھی تو کیا سمجھ سکتا ہے، تیرا بیٹا اگر کبھی تیرے سامنے اس طرح ذبح کیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ اولاد کی محبت کیا چیز ہے اور دنیا میں ان ماں باپ سے زیادہ زہر آلود غم کسی کا نہیں جن کے اکلوتے بیٹے نے اُن کے سامنے دم توڑا ہو۔

اس واقعہ کے بعد میں یہاں چلی آئی اور یہاں کے تاریک غاروں میں درندوں کے پاس حشرات کے ساتھ رہنا اختیار کیا اور اے انطانی یقین کر کہ شقاوت میں وہ انسان سے کم اور عدل و انصاف میں اس سے زیادہ ہیں۔ خیر یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، لیکن اے انطانی اب کاہنہ مصر کی وہ باتیں بھی سن لے جو تجھ سے متعلق ہیں۔

ملکہ کلیوپیٹرا جسے تو عورت سمجھتا ہے حقیقتاً خدا کا عذاب ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک شخص اس سے چھو جانے کے بعد قسمت سے کوڑھ میں مبتلا ہونے سے بچ جائے۔ کیا تجھے پامپیس کا حال معلوم نہیں، کیا تو سیزر کے حشر سے ناواقف ہے اور کیا تو اس سے بیخبر ہے کہ اس کی وجہ سے کتنے ملک ویران ہو گئے اور کتنی جانیں ہلاک، پھر ہوشیار ہو جا کہ آج کے بعد سے تجھے بھی کوئی مسرت و راحت نصیب نہیں ہونا، اور اس حال میں تجھے مرنا ہو کہ نہ تیرے دوست تیرے پاس ہوں گے نہ اہل وطن، نہ تیرے عزیز تیرے قریب ہوں گے اور نہ تیری وہ محبوب ملکہ جس کی محبت میں تو نے اپنے وطن سے غداری کرنے میں بھی دریغ نہ کیا۔ تیری لاش پڑی ہوگی اور اس پر کوئی آنسو بہانے والا نہ ہوگا، تو تڑپ رہا ہوگا اور کوئی ایک ہاتھ بھی تجھے سنبھالنے کے لئے آگے نہ بڑھیگا۔"

یہ کہکر اسنے اپنے لباس کے اندر سے چھپا ہوا خنجر نکالا اور خونخوار شیرنی کی طرح ہینیو کی طرف جھپٹکر اسکے سینے میں ایسی سختی سے پیوست کر دیا کہ سانس لینے کی بھی مہلت نہ دی۔ خنجر اس کے دل کے اندر ڈوب گیا تھا۔ سینے سے خون کی دھار جاری تھی اور بڑھیا ایسی خوش تھی گویا دنیا کی دولت اس کے ہاتھ آ گئی ہے۔

اس نے مبہوت و متحیر انطانی سے مخاطب ہوکر کہا کہ :-

"مجھے گمان بھی نہ تھا کہ کبھی میں اپنے بیٹے کے قاتل سے انتقام لے سکوں گی۔ اس لئے اے انطانی میں تیری شکر گزار ہوں کہ اپنے ساتھ تو اس کو بھی لے آیا اور اس طرح میری زندگی کا تنہا مقصود پورا ہوگر رہا۔ اچھا اے ناعاقبت اندیش اندھے عاشق، اب میں تجھ سے رخصت ہوتی ہوں، اس خائن کی لاش کو یہیں چھوڑ جانا کیونکہ آج رات میں نے یہاں کے بھیڑیوں اور گدھوں کو دعوت دی ہے اور جو کچھ میں نے تیرے متعلق کہا ہے اسے بھی یاد رکھنا، کیونکہ ممکن ہے پھر میں تجھ سے نہ مل سکوں"۔

یہ کہکر بڑھیا وہاں سے دفعتاً غائب ہوگئی اور انطانی اسی طرح مبہوت و متحیر کھڑا رہا۔

پھر اس کے بعد جو کچھ ہوا اس سے ہر تاریخ داں واقف ہے۔ انطانی پر بعد کو ایک ایسا وقت آیا کہ اس نے خودکشی کرنا چاہی لیکن اس کی شجاعت نے اجازت نہ دی، اس نے جنگ کے دوران میں اپنے آپ کو موت کے منھ میں ڈال دیا لیکن اس نے قبول نہ کیا۔ اور۔۔۔ پھر جب وہ مرا تو اس حال میں کہ نہ کوئی دوست پاس تھا، نہ عزیز، نہ کوئی رونے والا تھا، نہ اُٹھانے والا۔۔ یہاں تک کہ کلیوپٹرا بھی اُس سے دور تھی

یہ واقعہ ہے ۳۰؁ء قبل مسیح کا۔

مکتوبات نیاز

دنیائے ادب و انشا میں بالکل نئی چیز

اس میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو نگار میں شائع نہیں ہوئے، کتاب مجلد، ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر شایع ہوئی ہے اور جناب نیاز کا تازہ ترین فوٹو معہ ایک اصل خط کے بلاک کے بھی اس میں شامل ہے۔

قیمت علاوہ محصول ۸؍ محصول ڈاک ۶؍

مینجر نگار

باب المراسلۃ والمناظرہ

کسبی

آج اتفاق سے نگار بابت جون ۳۵ء نظر سے گزرا۔ فہرست مضامین میں سب سے زیادہ جس عنوان نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی وہ "کسبی" تھا۔ چونکہ میں صاحب مضمون سے ایک حد تک موافق ہوں اس لئے اس پر مزید لکھنا نہیں چاہتی لیکن میرے پیش نظر اسوقت جناب اڈیٹر صاحب کی مندرجہ ذیل تحریر ہے۔ اس سے پہلے بھی میں نگار میں اسی قسم کی تحریر پڑھ چکی تھی اور آج اسی تحریر نے مجھے یہ چند بے ربط جملے لکھنے پر مجبور کیا۔ آپ لکھتے ہیں:۔

"مردوں کا اپنی بیویوں سے چھپکر زنانِ بازاری کی صحبت ڈھونڈھنا اکثر وبیشتر اسی بنا پر ہوا کرتا ہے کہ ان کے بعض ذوق گھروں میں پورے نہیں ہوتے اور وہ مجبور ہوتے ہیں کہ اپنی اس خواہشِ تفریح کو دوسری جگہ پورا کریں۔ یہ مسئلہ پیشہ ور عورتوں کو برا بھلا کہنے سے حل نہیں ہو سکتا البتہ اگر خود گھروں کی عورتوں میں ایسا سلیقہ پیدا ہو جائے کہ وہ مردوں کی رعایت ذوق کا لحاظ رکھ سکیں تو بیشک ایک حد تک ادارہ فحاشی کا انسداد ہو سکتا ہے۔"

معلوم ہوتا ہے قابل اڈیٹر صاحب نے یہ تحریر لکھتے وقت اپنی جنس کی فطرت کا پورے طور سے موازنہ نہیں کیا ورنہ آپ ہرگز یہ الفاظ لکھ کر فرقۂ اناث کو موردِ الزام نہ بناتے۔ میں نے بیسیوں ایسی مثالیں دیکھی ہیں جہاں بقول ڈیٹر صاحب "مردوں کی رعایتِ ذوق" کا پورا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کا انسداد نہیں ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر گھروں میں گھر کی حسین اور سلیقہ شعار بیوی پر ایک معمولی صورت شکل اور بھدے اخلاق والی عورت کو ترجیح دیجاتی ہے۔ شریف اور روشن خیال بیوی اس کے انسداد پر کمربستہ ہوتی ہے۔ جب شنوائی نہیں ہوتی تو رنج وغم میں گھلتی ہے طرح طرح کے

باغیانہ خیالات اس کے دل میں پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ بھولے پن سے سوچتی ہے کہ ایک بری عورت کا مرد برا راستہ اختیار کرے یا ایک نا قابل بیوی سے شوہر برگشتہ ہو لیکن ایک شریف اور ہر طرح سے قابل شوہر بیوی کا خاوند کیوں ایسا راستہ اختیار کرے۔ وہ اسے مرد کا ظلم تصور کرتی ہے۔ انتقام پر آمادہ ہونا چاہتی ہے اس کے دل میں خطرناک خیالات موجزن ہوتے ہیں۔ پائے استقلال ڈگمگانے کو ہوتا ہے کہ شرافتِ قدیمی قدم تھام لیتی ہے۔ عمدہ تربیت برے خیالات پر غالب ہوتی ہے اور وہ اپنے خیالات پر تاسف کرتی ہوئی آئندہ کو ان سے باز رہنے کی دعا کرتی ہے۔

اس کے سامنے اپنی جنس کی بے بسی اور کم مائیگی کا نقشہ کھنچ جاتا ہے جب بڑی بوڑھیاں لے کہتی ہیں کہ "سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں"۔ اب وہ الرجال قوامون کے صحیح مفہوم کو سمجھ لیتی ہے۔
تجربہ نے ایک نہیں بلا مبالغہ بیسیوں ایسی مثالیں دکھا دیں جہاں اندر ہی اندر بیویوں کا خون چوسا جاتا ہے اور وہ بیچاری اُف نہیں کرتیں آخر اپنے آپ کو ایک "جزو ناتوان ہستی" سمجھ کر خاموش ہو رہتی ہیں۔
آخر ایسا نہ کریں تو کیا کریں۔

بعض بھائی عورتوں کی تعلیم اور آزادی کے اسدرجہ مخالف ہیں تو کیوں صرف اس لئے وہ ڈرتے ہیں کہ کہیں خدانخواستہ پھر انھیں عورتوں کی طرف سے ترکی بہ ترکی جواب نہ ملے۔ اور انکی "تفریحات" میں خلل پڑے۔ لیکن انھیں معلوم ہونا چاہئے کہ عمدہ تربیت اور اعلیٰ عادات کی لڑکیاں اگر آزادی کی اخیر حد تک بھی پہونچ جائیں تو بھی ان "تفریحات" کے خیال کو دل میں لانا گناہ سمجھیں گی جن کے آج کل قریب قریب سب بھائی عادی ہیں۔

میں جناب اڈیٹر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ مردوں کو راہ پر لانے کے لئے مظلوم فرقہ کو تدبیر بتائی۔ لیکن وہ تدبیر ایک کسبی کے معاملہ میں ہے۔ مہربانی کرکے فرمایئے کہ اس عورت کے بارے میں وہ کونسی تدبیر کارگر ہوگی جو بیوی سے صورت شکل تعلیم اخلاق غرض ہر لحاظ سے کم درجہ ہو۔

(نگار) محترمہ، مجھے پورے طور پر اپنی جنس کی فطرت کا علم ہے اور میں اچھی طرح واقف ہوں کہ مرد، عورت پر ظلم کرنے میں کس قدر دلیر و جری واقع ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس حقیقت سے بھی بے خبر نہیں کہ اس کا علاج صرف عورت ہی کے ہاتھ میں ہے۔ مرد سے اس کی توقع رکھنا کہ وہ اپنی حرکتوں سے باز آجائے بالکل ایسا ہی ہے جیسے قزاق سے یہ امید رکھنا کہ وہ الحاح و زاری سے متاثر ہو کر قزاقی چھوڑ دے گا۔
سب سے پہلے آپ اس امر پر غور کیجئے کہ مرد اس باب میں کیوں اس قدر جری ہوا ہے۔ اس کا کھلا ہوا سبب

صرف یہ ہو کہ عورتیں اسکی دست نگر ہیں، محتاج ہیں، وہ اگر کھانے کو نہ دے تو بھوکی رہیں، پہنے کو نہ دے تو ننگی پھریں اور ظاہر ہے کہ ایسی بیدست و پا اور اسدرجہ مجبور ہستی کیا اپنی وقعت قائم رکھ سکتی ہے اگر مرد یہ جان لے کہ بیوی اس کی محتاج نہیں ہے اسمیں خود اتنی اہلیت موجود ہے کہ وہ اس سے بے نیاز ہو کر اپنی زندگی بسر کر سکتی ہے تو قیامت تک اس کے اندر یہ جذبۂ انانیت پیدا نہیں ہو سکتا، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ ایک دولتمند بیوی کا شوہر کتنا مطیع و فرمانبردار شوہر ہوا کرتا ہے اور ہر وقت اسی فکر میں رہتا ہے کہ کوئی بات ایسی نہ ہونے پائے "جو اُن کو بری لگے" اور اسکا "آذوقۂ شوہرانہ" بند ہو جائے۔

اسی طرح اُن تعلیم یافتہ عورتوں کے شوہروں کو لیجئے، جو ملازمت یا کسی اور پیشہ کے ذریعہ سے اپنی معاش خود حاصل کر رہی ہیں۔ یہاں بھی آپ کو "جبر شوہرانہ" کی کوئی مثال نظر نہ آئے گی ۔۔۔ الغرض یہ مسئلہ بالکل نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھنے کا ہے اور جب تک نفسیاتی طور پر اس کا علاج نہ کیا جائے گا، محض دامن پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگنے یا پانی پی پی کر کوسنے کاٹنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔

اگر عورتیں پوری تعلیم اور پوری آزادی حاصل کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں تو اُن کو صبر و شکر سے مردوں کے تمام مظالم برداشت کرنا چاہئے اور انھیں کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ حرف شکایت زبان تک لائیں ۔۔۔ میں نے تعلیم کے ساتھ آزادی کا بھی ذکر کیا ہے۔ یعنی اگر وہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی پابستہ و پرشکستہ رہیں تو بھی کوئی نتیجہ نہ ہوگا، کیونکہ جب تک مرد کے احساس آزادی کے پندار کو اسی قسم کے احساس سے نہ توڑا جائے گا وہ کبھی گردن نہیں جھکائے گا۔

آپ نے یہ بالکل صحیح و درست لکھا ہے کہ مرد حسین و خوش سلیقہ بیویوں کو چھوڑ کر دوسری ایسی عورتوں سے ملتفت ہو جاتے ہیں جو نہ خوبصورت ہیں نہ سلیقہ مند۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ بیوی اپنی چیز ہے اور دوسری عورت، پرائی ۔۔۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ کسی چیز کے ملجانے یا اس پر کامل اقتدار حاصل کر لینے کے بعد وہ اس کی طرف سے بے پرواہ ہو جایا کرتا ہے اور جو چیز دسترس سے دور ہے یا جس کے ہاتھ سے نکل جانے کا ہر وقت اندیشہ ہے اس کے جانے وہ بیتاب رہتا ہے ۔۔۔ ایک کسبی میں مرد کے لئے سب سے بڑی کشش یہی ہے کہ وہ اسکی نہیں ہے ۔۔۔ اُسوقت بھی نہیں ہے، جب وہ اس کے لئے یکسر "ہاں" ہوتی ہے۔ پھر بتایئے کہ آپ شریف بیویاں فطرت انسانی کی اس بدتمیزی کا کیا جواب اپنے پاس رکھتی ہیں۔

آپ کی کمزوری کا تو یہ عالم ہے کہ آپ خط میرے پاس بھیجتی ہیں اور اس میں اپنا نام اور پتہ تک درج نہیں کرتیں، آپ مردوں کی ستمرانیوں کا شکوہ کرتی ہیں اور یہ بھی کہتی جاتی ہیں کہ "اگر شریف لڑکیاں آزادی کی آخیر حد تک پہونچ جائیں تو بھی ان تفریحات کے خیال کو دل میں لانا گناہ سمجھیں گی جن کے مرد عادی ہیں"۔ ایسی صورت میں

آپ کیا توقع مداوا کی رکھ سکتی ہیں ۔۔۔ آپ یقیناً اپنے دل میں اس کو گناہ ہی سمجھئے لیکن خدا کے لئے زبان سے اظہار نہ کیجئے، جب تک مرد کو آپ یہ باور نہ کرا دیں گی کہ آپ بھی اسی کی طرح بالکل آزاد ہیں اور آپ بھی اُسکو اسی طرح جلا سکتی ہیں جس طرح وہ جلاتا رہتا ہے، اسوقت تک کبھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گا۔ قیام محبت کے لئے سب سے ضروری چیز جذبۂ رقابت کا اشتعال ہے اور یہی وہ چیز ہے جو کسی بیوی یا غیر عورت کی محبت میں اُسے مبتلا رکھتی ہے۔ پھر اگر آج مرد کو اپنی بیویوں کی طرف سے بھی وہی بے اطمینانی پیدا ہو جائے جو دوسری عورتوں کی طرف سے پیدا ہوتی ہے تو باور رکھیئے کہ وہ کبھی گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتا۔ لیکن نہ آپ ایسا کریں گی نہ مرد آپ کا ہو کر رہیگا تعلیم کے معنے یہ نہیں ہیں کہ عورتیں گھروں میں پڑے پڑے قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھا کریں، بلکہ اس کا حقیقی مقصود آزادی ہے۔ آزادی خیال کی، فکر و ضمیر کی، اور احساسِ خودداری۔ وہ خودداری جو انسان کو خود اپنی قوت پر اعتماد کرنا سکھاتی ہے ۔۔۔ اس لئے اگر عورتوں میں تعلیم کا رواج ہوا اور پردہ باقی رہا تو اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا، اسی طرح اگر پردہ ٹوٹا اور وہ بھی اس حد تک کہ آپ بازار سے جا کر کپڑا یا ترکاری خرید کر لے آئیں، تو بھی بالکل بے نتیجہ بات ہوگی، کیونکہ ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں ہے جو مرد کے جذبۂ رقابت میں اشتعال پیدا کر سکے ضرورت اس امر کی ہے کہ عورتیں پڑھیں اور بے پردہ ہو جائیں، بے پردہ ہوں اور سوسائٹی میں آزادانہ چلیں پھریں، ہنسیں بولیں، یہاں تک کہ مرد یہ محسوس کرنے لگے کہ جس نگاہ سے وہ غیر عورت کو دیکھتا ہے اسی نگاہ سے غیر مرد اس کی عورت کو بھی دیکھ رہا ہے۔ پھر دیکھئے کہ اس کی یہ بے پروائیاں کہاں چلی جاتی ہیں اور وہ کس درجہ بے چین ہو جاتا ہے۔ آپ اس پر یہ اعتراض کریں گی کہ مغرب کی عورت نے یہی زندگی اختیار کی تو کیا نتیجہ ہوا کہ یہاں کچھ اور ہوگا۔ آپ کا یہ فرمانا بالکل صحیح و درست ہے، لیکن کم از کم آپ یہ تو ضرور محسوس کرتی ہوں گی کہ وہاں کی عورت اُن مصائب میں مبتلا نہیں ہے جن میں یہاں کی عورتیں گھری ہوئی ہیں۔ اگر مرد دوسری عورتوں سے ملتفت ہو کر بیوی کو پریشان کر سکتا ہے تو وہ بھی دوسرے مردوں سے مل کر اُس کو جلا سکتی ہے اور چونکہ وہ خود اپنی معاش حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہے اس لئے اُسے مطلق پرواہ نہیں ہوتی کہ مرد اگر اسے چھوڑ دے گا تو وہ کیا کرے گی اور یہی وہ آزادی ہے جس نے مردوں کی جابرانہ حکومت کا وہاں خاتمہ کر دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اخلاق اور علی الخصوص ایشیائی اخلاق کے نقطۂ نظر سے عورتوں کی یہ بیباکی نہایت مذموم بات ہے اور شریف لڑکیاں کبھی اس کو گوارا نہیں کر سکتیں، اس کا کیا علاج کہ جس سوسائٹی نے یہ اُصول اخلاق وضع کئے ہیں وہ مرد کی اس بیہودگی کو اتنا معیوب نہیں سمجھتی اور عورت کی عدم وفاداری پر داستان کی داستان اور دیوان کے دیوان طیار ہو جاتے ہیں۔ پھر سوسائٹی کی یہ ناجائز رواداری یا دشمنی جو فی الحقیقت مرد ہی کے احساس تفوق کی پیدا کی ہوئی چیز ہے، اگر دور ہو سکتی ہے تو اس طرح نہیں کہ مرد سے التجا کی جائے یا اس کے جذبۂ رحم و کرم

کو اُبھارا جائے، بلکہ اس کی صورت صرف یہ ہے کہ عورت، مرد کے اس پندار کو فنا کرے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب وہ مرد کی غلامی سے آزاد ہو جائے اور مرد کو یہ باور کرا دے کہ وہ اس کی محتاج نہیں ہے۔

اول تو میں اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ عورت آزاد ہونے کے بعد لازماً اخلاقی پستی میں مبتلا ہو جائیگی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیں کہ اخلاق پر یقیناً اثر پڑنا ضروری ہے اور آوارگی میں اضافہ ہونا لازم تو بھی کوئی حرج نہیں کیونکہ اگر چند نفوس کی قربانی سے کسی جماعت کے اکثر افراد کو فایدہ پہونچتا ہے تو اس قربانی کو گوارا کرنا چاہئے۔

بہرحال ہندوستان میں مرد عورت کے باہمی تعلق کا مسئلہ اب اس حد سے گزر گیا ہے کہ اس کے لئے کسی جدید نظریہ کے وضع کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ زمانہ فیصلہ کر چکا ہے کہ جب تک عورت آزاد ہو کر میدان عمل میں نہ آئیگی وہ ہمیشہ ایسی ہی ذلیل بنی رہیگی اور اگر کسی قوم یا جماعت کی عورتیں اس فیصلہ پر عمل کرنے کے لئے طیار نہیں ہیں تو ان کو کوئی حق شکوہ و شکایت کا نہیں ہے۔ نہ مذہب کا واسطہ دلانے سے کام چل سکتا ہے، نہ اخلاق کی دُہائی دینے سے — مرد برابر اسی طرح ظلم کرتا رہیگا اور عورت کو برداشت کرنا پڑے گا۔

محبوب عاشق کے قدموں پر

ہدیہ میں عظیم الشان رعایت

عمل سفلی عہ ہر مذہب والا عامل بن سکتا ہے مسلمان کیلئے مناسب نہیں عمل علوی عہ صرف مسلمانوں کیلئے مخصوص ہو کامل ۲۰ سال کا تجربہ ہے کبھی سرمو خطا نہیں کئے جب تلاش تھی ہزاروں روپیہ برباد کئے اب میں خدا کو حاضر و ناظر جانکر بے کم و کاست قلیل ہدیہ پر ان کا اعلان کرتا ہوں تاکہ سب امیر و غریب فائدہ اُٹھا سکیں۔ جن بھائیوں کو میری گزارش پر اعتبار ہو اور ساتھ ہی ایک حلفنامہ اس اقرار کا ارسال کریں کہ اپنی ذات کے سوائے کسی دوسرے کو نہ بتائیں گے طلب فرمائیں عمل ؏ اس عمل کے پڑھنے میں صرف پندرہ منٹ صرف ہوتے ہیں اس کا عامل ایک سال اس پر قابض رہتا ہے دوسرے سال کے لئے پھر دوبارہ پندرہ منٹ صرف کرکے عمل پڑھنا ہوتا ہے اسی طرح تمام عمر اس سے کام لیا جا سکتا ہے ہدیہ عہ عمل علوی یہ ایک آیت قرآنی باموکل کا عمل ہے اسم سیاہ مرچوں پر ۱۱م مرتبہ پڑھی جاتی ہے ۷ دن میں انشاء اللہ مطلوب آپکے قدموں پر سرنگوں ہوگا ہدیہ صرف عہ عمل برائے ترقی روزگار عمل ترقی تجارت ترقی معاش ملازمت اور ہر قسم کی ترقی کے لئے عجیب و غریب عمل ہے ہفتہ میں صرف چہارشنبہ کو پڑھا جاتا ہے۔ پڑھنے میں صرف آدھ گھنٹہ صرف ہوتا ہے اسکی برکت سے روزی روزگار میں اسقدر ترقی ہوتی ہے کہ اللہ کی قدرت کا کرشمہ نظر آتا ہے عہ نذرانہ ہے عہ میں صرف دس آدمی پڑھنے کی اجازت لے سکتے ہیں عمل عداوت یہ عمل دو شخصوں کے درمیان عداوت ڈلوانے کے لئے مجرب ہے۔ جائز ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ورنہ گنہگار ہوں گے ہدیہ عہ عمل یہ عمل دشمن کی تباہی و بربادی کے لئے بہترین ہے جائز ضرورت کیلئے طلب کیا جائے ہدیہ عہ، ان تمام عملوں میں نہ کسی قسم کا خوف نہ خطرہ نہ اپنے مکان سے کہیں باہر جانے کی ضرورت۔ عمل بذریعہ وی پی طلب کریں یا منی آرڈر ارسال کریں بذریعہ رجسٹری عمل ارسال کئے جائیں گے۔ فضل شاہ عامل گلی راجان دہلی

باب الاستفسار

سیرۃ نبوی۔ توحید۔ مذہب حنیفی

(جناب محمد اسلم صاحب۔ اکبر پور)

مندرجۂ ذیل سوالات پر اظہار رائے چاہتا ہوں:۔

(۱) سیرۃ نبوی کے مطالعہ کا بہترین ذریعہ کیا ہے اور موجودہ کتب سیر میں کس پر اعتماد کلی ہو سکتا ہے۔

(۲) کیا درس توحید صرف اسلام کی خصوصیت تھی اور اُس سے قبل یہ تعلیم کسی نے نہیں دی۔

(۳) مذہب حنیفی سے کیا مراد ہے۔

(نگار) ایک انسان کی سیرت کے دو حصے ہوا کرتے ہیں، ایک کا تعلق تاریخ وجغرافیہ سے ہے اور دوسرے کا نفسیات سے۔ یعنی ایک تو اس تحقیق سے متعلق ہے کہ وہ کب پیدا ہوا، کب مرا دوران حیات میں اس نے کیا کیا، کہاں کہاں رہا اور دوسرے یہ کہ اس کا نفسیاتی میلان کیا تھا اور اسکے زندگی کے کن واقعات سے ہم اسکے طبیعی رجحان کا پتہ چلا سکتے ہیں۔

ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر جس وقت ہم سیرۃ نبوی پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک حصہ پر تو بحث کے یقینی ذرایع موجود ہیں، لیکن اُس کے دوسرے حصے کی نسبت اختلاف ہو سکتا ہے اور ہے۔

رسول اللہ کا نفسیاتی میلان کیا تھا، فطرت کی طرف سے وہ کیا رجحان لیکر آئے تھے، آپ کا ذہنی ودماغی اقتضاء کیا تھا، اس باب میں نہ کتب تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہے اور نہ احادیث کی ورق گردانی کی، کیونکہ قرآن پاک سامنے موجود ہے اور اس کے ایک ایک لفظ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کا نصب العین کسقدر بلند آپ کا خلق کتنا پاکیزہ اور آپ کا عزم کسدرجہ راسخ ومستحکم تھا۔ اگر آج دنیا سے اسلامی تاریخ وسیر کی تمام کتابیں نیست ونابود ہو جائیں تو بھی سیرۃ نبوی کی ان خصوصیات کے ثابت کرنے کے لئے قرآن پاک کے اوراق کافی ہیں، البتہ آپ کی سیرۃ کا دو

حصہ جو اقوال و افعال کی جزئیات یا معیشت و معاشرت کی تفصیلات سے متعلق ہے، کامل تحقیق و یقین کے ساتھ مرتب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے لئے ہم کو احادیث و کتب تاریخ کی جستجو کرنا پڑے گی اور یہ دونوں ذریعے زیادہ موثوق نہیں ہیں، کیونکہ احادیث کا بہت کم حصہ قابل اعتبار ہے اور تاریخ کی کتابوں میں سے کوئی کتاب ایسی موجود نہیں جو آپ کی زندگی میں یا اس کے بعد ہی مرتب کی گئی ہو۔

احادیث کا حصہ کیوں قابل اعتبار نہیں۔ اس کے نسبت ہم بارہا نگار کے صفحات میں اظہار خیال کر چکے ہیں، اس لئے تکرار کی ضرورت نہیں، البتہ تاریخی حیثیت سے جو کتابیں لکھی گئیں ان کا ذکر اس جگہ ضروری ہے، رسول اللہ کی زندگی تین زمانوں میں تقسیم ہے۔ ایک زمانہ ولادت سے بعثت تک، دوسرا بعثت سے ہجرت تک اور تیسرا ہجرت سے وفات تک۔

چونکہ آپ کی بعثت ۴۰ سال کی عمر میں ہوئی اس لئے ظاہر ہے کہ عمر کا بڑا حصہ تو اس حال میں گزرا کہ اسکی طرف لوگوں کو توجہ کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ یہ کس کو معلوم تھا کہ یہ امی آیندہ چلکر اتنا بڑا دعویٰ کرنے والا ہے، رہگیا زندگی کا دوسرا دور سو وہ چونکہ انتہائی کشمکش، حد درجہ پریشانی و اضطراب اور حالت امید و بیم میں بسر ہوا، اسلئے جو چند معاون و انصار آپ کے پیدا ہو گئے تھے ان میں بھی یقین کامیابی کا نہ تھا کہ وہ رسول اللہ کے مستقبل میں کسی خاص اہمیت کا اندازہ کرکے اُن کے ذاتی حالات و کوائف کی طرف توجہ کرتے۔ البتہ ہجرت کے بعد جو زمانہ آیا وہ بیشک کامیابی کا دور تھا جس نے رسول اللہ کی رسولانہ حیثیت کو مستحکم کر دیا اور چونکہ وہ بھی صرف لڑائیوں ہی میں بسر ہوا تھا اس لئے سب سے پہلا تاریخی مواد بھی ہم کو "مغازی" ہی کا ملتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی خالص تاریخی نقطۂ نظر کو سامنے نہیں رکھا گیا اور اس کی حیثیت بھی "ایام عرب" کی اُس بطل پرستانہ لٹریچر کی سی ہے جو بعثت نبوی سے قبل جاہلیت میں بھی پایا جاتا تھا۔

مسلمانوں کی اولین فتوحات کے بعد ہی عرب کے پیشہ ور قصہ خوانوں نے (جنھیں وہاں قُصّاص کے نام سے موسوم کرتے تھے) تمام اسلامی دنیا میں یہ رزمیہ داستانیں بیان کرنا شروع کر دیں اور ان میں رسول اللہ کی ہستی کو جنھوں نے اپنے آپ کو صرف "انا بشر مثلکم" کی حیثیت سے پیش کیا تھا اسی رنگ میں ظاہر کیا جو انجیل کی روایات اور ایرانی افسانوں میں پایا جاتا تھا، یہاں تک کہ آپ کے واقعاتِ زندگی نہ صرف ولادت یا بعد ولادت کے بلکہ اس سے قبل کے بھی گھڑ کر مشہور کئے جانے لگے۔ چنانچہ نور محمدی کا پیدا کیا جانا، ارواحِ انبیاء اور جن و ملک کا اس کو سجدہ کرنا، ہزاروں سال تک اس کا طیور فردوس کے پپوٹوں میں رہنا اور پھر بہت سے پیمبران عظام سے صلباً بعد صلب منتقل ہو کر جناب آمنہ کے شکم مبارک میں آنا، ولادت کے وقت ایوان کسریٰ کا جنبش میں آ جانا، بتوں کا اوندھے منھ گر جانا، فرشتہ کا آپ کے سینہ کو چاک کرکے دل کو آلائش سے پاک کرنا، پشت پر مُہر نبوت

ہونا، آپ کے سایہ کا معدوم ہونا، ہاتھ میں کنکریوں کا بولنا، استن حنانہ کا آپ کے فراق میں رونا، چاند کے دو ٹکڑے کردینا، ہر مجمع میں آپ کا سب سے بلند نظر آنا، جنگ میں فرشتوں کے پرے کے پرے امداد کے لئے آنا وغیرہ وغیرہ سیکڑوں باتیں اس قسم کی مشہور کی گئیں جس سے مقصود یہ تھا کہ یہود، نصاریٰ اور اہل ایران کے لٹریچر میں جو عجیب وغریب روایات ان کے اکابر کے متعلق پائی جاتی تھیں، اسلامی روایات کسی طرح اُن سے کم نہ رہیں۔ اکابر پرستی کا یہ جوش ہمیشہ ہر قوم میں اس طرح کا لٹریچر فراہم کردیتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام بھی اس سے خالی نہ رہا۔ لیکن فرق اتنا ہوا کہ اسلام میں یہ لٹریچر اسی جگہ ختم ہوکر نہیں رہگیا بلکہ اس نے بعد کو ایک اور انداز اختیار کیا جسے داستان گوئی اور تاریخ کی ملی جلی صورت کہنا چاہئے اور جس کا بہترین نمونہ وہب بن مُنبہ کی کتاب المغازی ہے۔

مدینہ میں سیرۃ رسول کے مطالعہ و تدوین کی طرف خاص توجہ کی گئی اور غالباً عروۃ بن الزبیر (۲۳-۹۴ھ) سب سے پہلے شخص تھے جنھوں نے اسے تاریخ کے رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی انھوں نے سیرۃ نبوی کے متعلق بہت سی روایتیں فراہم کیں اور اس طرح گویا سیرۃ و حدیث دونوں کو ملاکر ایک ایسے فن کی بنیاد ڈالی جسے صحیح معنے میں بیاگرفی تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس کی داغ بیل ضرور کہنا چاہئے۔

اسی طرح حضرت عثمان غنی کے صاحبزادہ ابان نے بھی مکہ میں بیٹھکر سیرۃ نبوی کے متعلق فراہمی روایات کا کام شروع کیا جنھیں ان کے شاگرد عبدالرحمان بن المغیرہ نے کتابی شکل میں منتقل کیا۔ اور یہ کام ایک مستقل فن کی حیثیت سے علم المغازی کہلاتا تھا جس نے نہ صرف مکہ و مدینہ بلکہ بصرہ میں بھی لوگوں کی توجہ اپنی طرف مائل کرلی تھی۔

عروۃ کے شاگردوں میں زہری پہلے شخص تھے جنھوں نے رسول اللہ کی سیرۃ کو مغازی کے رنگ سے کچھ ہٹکر پیش کیا تھا اور اگر وہ کتاب باقی رہتی تو ممکن ہے سیرۃ کی کتابوں میں جو روایتی مبالغے پائے جاتے ہیں وہ اتنے نہ ہوتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ ابن اسحاق نے جو زہری کے شاگرد تھے ضرور اپنے اُستاد کی اس کتاب سے فائدہ اٹھایا ہوگا اور انھوں نے جو سیرۃ رسول مرتب کی تھی اس میں علاوہ خود اپنی تحقیقات کے زہری کے مجموعہ سے بھی استفادہ کیا ہوگا، لیکن افسوس ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب بھی پوری محفوظ نہ رہ سکی اور اگر ابن ہشام نے اُن کے اقوال اپنی سیرۃ رسول میں نقل نہ کئے ہوتے تو ہمارے پاس کوئی ذریعہ اس سے استفادہ کا نہ تھا۔ زہری کا انتقال ۱۲۴ھ میں ہوا ابن اسحاق کا ۱۵۱ھ میں اور ابن ہشام کا ۲۱۳ھ میں۔ اس لئے یہ کہنا غالباً نادرست نہ ہوگا کہ ہرچند سیرۃ نگاری کی ابتدا ۲۳ھ میں ہوچکی تھی لیکن اس کی پوری تشکیل دوسری صدی ہجری کے آخر میں ہوئی اور سب سے زیادہ قدیم و معتبر کتاب اس موضوع پر ابن ہشام کی ہے۔

ابن ہشام نے اس موضوع پر بہت متنوع و کثیر اطلاعات فراہم کی ہیں اور ہرچند بہ لحاظ درایت یا اسناد انکی جمع کی ہوئی تمام روایات قابل اعتماد نہیں لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ سیرۃ نبوی پر سب سے پہلی کتاب جسے بیاگرفی

کہہ سکتے ہیں، ابن ہشام ہی کی ہے۔ اسی عہد کے ایک دوسرے مورخ محمد عمر الواقدی ہیں (جن کا انتقال ۲۰۷ھ میں ہوا) جنھوں نے سیرۃ نبوی کی خدمت تین طریقوں سے کی ہے ایک کتاب المغازی کے ذریعہ سے، دوسرے سیرۃ لکھ کر اور تیسرے طبقات کی تالیف کرکے اور ہر چند یہ تینوں تصانیف ملکر نہایت بسیط سیرۃ بنتی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ تنقیح روایات صحت اسناد اور نقد درایت کے لحاظ سے علامۂ واقدی کا یہ کارنامہ ابن ہشام کی تصنیف کو نہیں پہونچتا۔

اس کے بعد صدیوں تک اس موضوع پر کسی نے توجہ نہیں کی اور اس کے بعد بھی جو کچھ جس نے لکھا اس کا ماخذ ابن ہشام اور واقدی ہی کی تصانیف تھیں۔ یہ تو حال ہوا عربی کی کتابوں کا۔ اب رہ گئیں وہ تصانیف جو اُردو میں کی گئیں، سو ان کا ذکر فضول ہے کیونکہ ان میں سے اکثر تو اس قابل بھی نہیں کہ انھیں سیرۃ کے نام سے منسوب کیا جائے اور جو چند ہیں وہ بھی نقایص سے پاک نہیں۔ حد یہ ہے کہ دارالمصنفین کے سیرۃ نبوی جس کی ابتدا مولانا شبلی نے کی تھی اور اختتام سید سلیمان ندوی کے ہاتھوں ہوا ہے وہ بھی اس قابل نہیں کہ اسے صحیح معنے میں بیاگرفی کہہ سکیں کیونکہ اس میں بھی بکثرت غیر منقح روایات سے استناد کیا گیا ہے اور دور از عقل و خلاف حقیقت باتوں کی کمی نہیں۔

انگریزی میں یقیناً بعض تصانیف بیاگرفی کے اُصول پر لکھی گئی ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کے مصنفین اس دشمنی سے اپنے دل کو صاف نہ کرسکے جو اسلام اور بانی اسلام کے ساتھ ان کو چلی آرہی ہے۔ الغرض مسلم و غیر مسلم مصنفین میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس نے پوری طرح دیانت و امانت سے کام لیکر اس خدمت کو انجام دیا ہو۔ درانحالیکہ ایک مورخ یا سیرۃ نگار کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ حُسنِ اعتقاد و تعصب دونوں سے پاک ہو۔

دین حنیف جسے آپ کہتے ہیں، وہی ہے جس کا دوسرا نام دین ابراہیمی ہے اور رسول اللہ سے قبل بھی اہلِ عرب اپنے مورث اعلیٰ جناب ابراہیم اور ان کے عقیدۂ توحید سے واقف تھے۔ ابن ہشام نے بہ حوالہ ابن اسحاق ان موحدین و مصلحین کے سلسلہ میں ورقہ ابن اسد، عبید اللہ ابن جحش، عثمان ابن الحویرث اور زید ابن عمر کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ یہ لوگ دین حنیف کے پابند تھے اور اس کی تبلیغ بھی کرتے تھے۔

زید ابن عمر نے اپنے عقاید توحید کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:۔

اربّاً واحداً ام الف رب — ادین اذا تقسمت الامور

عزلت اللات والعزیٰ جمیعا — کذلک یفعل الجلد الصبور

لفظ حنیف عبرانی سے لیا گیا ہے، وہاں اس کے معنے "چھپانے والے، جھوٹ بولنے والے اور منافق" کے ہیں، اور ایام جاہلیت میں وہ لوگ جو بتوں کی پرستش کے خلاف تھے انھیں طعن و تعریض کی صورت سے حنیف کہا کرتے تھے۔ یعنی وہ لوگ جو راہ راست سے ہٹکر گمراہ ہوگئے ہیں۔ لیکن چونکہ موحدین کے نزدیک یہ گمراہی عین مقصود تھی اس لئے خود انھوں نے بھی اس نسبت کو اپنے لئے گوارا کرلیا اور رفتہ رفتہ لفظ حنیف کا مفہوم ہی موحد و غیر بت پرست قرار پا گیا۔

مطبوعات موصولہ

تفسیر قرآن حصہ اول مولفہ پادری جے۔ علی بخش صاحب لاہور، جس میں صرف مکی سورتوں کو یکجا کر کے ان کی شان نزول ظاہر کی ہے اور صحف مقدسہ کے بیانات سے ان کو مطابق کیا گیا ہے۔ چونکہ یہ تفسیر ایک ایسے صاحب کی لکھی ہوئی ہے جو مشنری سے تعلق رکھتے ہیں، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کا مقصود سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن کو انجیل و توریت ہی کا دوسرا ماخذ ثابت کریں اور چونکہ قرآن کا اسرائیلی حصہ تقریباً وہی ہے جو انجیل و توریت میں پایا جاتا ہے اس لئے ایک شخص کو ایسا کہنے میں زیادہ تامل بھی نہیں ہو سکتا۔

اس کتاب کی ترتیب بہت اچھی ہوئی ہے اور انداز بیان بھی شگفتہ نہیں ہے، تاہم اس لحاظ سے کہ ایک عیسائی انتہائی رعایت کے بعد قرآن مجید کے متعلق کیا کہہ سکتا ہے، اس کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تفسیر قرآن کا مسئلہ اسوقت تک لاینحل پڑا ہوا ہے، اور جبکہ خود مسلمانوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی، ہم ایک غیر مذہب والے سے کیا شکایت کر سکتے ہیں۔ اسوقت جتنی تفاسیر کلام مجید کی پائی جاتی ہیں وہ سب عہد حاضر کے اقتضاء کے خلاف ہیں اور ضرورت ہے کہ ایک ایسا شخص اس کی تفسیر لکھے جو سرے سے مذاہب کا مخالف ہو یا پھر یہ کہ تمام مذاہب سے ہمدردی رکھتا ہو مگر مسلمان نہ ہو۔

قرآن مجید کو احادیث کے ذریعہ سے سمجھنے کا مسئلہ ایسا پیچیدہ ہے کہ جب تک اس کا فیصلہ نہ ہو جائے اس کی تفسیر بیکار ہے اور ظاہر ہے کہ قدامت پرست مسلمان اس کا فیصلہ کرنے کے لئے طیار نہیں ہو سکتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ الہام و وحی یا کلام مجید کے کلام الہٰی ہونے کی حقیقت کو بھی پہلے ظاہر کر دیا جائے، لیکن اسمیں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ جو شخص اس باب میں آزادی سے رائے دے گا وہ اسلام سے خارج سمجھا جائیگا اور اسلام سے خارج ہونے والے کی لکھی ہوئی تفسیر مسلمانوں کے نزدیک ایک ایسی مکروہ و مردود چیز ہے کہ اسکو چھونا بھی حرام ہے چہ جائیکہ اس کو پڑھکر اس کے حسن و قبح پر حکم لگانا۔

قرآن مجید کی جس خصوصیت کا میں قایل ہوں، وہ یہی ہے کہ مخالفانہ نقد و نظر کے بعد بھی اس کی اہمیت جوں کی توں باقی رہتی ہے، لیکن افسوس ہے کہ تقلید و روایات کے پابند علماء نے اس کی اس خصوصیت کو

پوشیدہ کر کے ایسی صورت سے اسے پیش کیا کہ سوائے مسلمانوں کے ۔۔۔ اور مسلمان بھی وہ جو صرف معجزہ و خرق عادات کو مذہب سمجھتے ہیں۔ کوئی اور اس کے مطالعہ سے فایدہ نہیں اٹھا سکتا۔

بہر حال پادری صاحب کی یہ کوشش اچھی ہو یا بُری ہم کو گوارا ہی کرنا پڑے گی کیونکہ ہم خود کوئی چیز اس سے بہتر اپنے پاس نہیں رکھتے۔

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور پادری صاحب سے ۵۳ - گوالمنڈی لاہور کے پتہ پر ملسکتی ہے۔

منتخب افسانے مجموعہ ہے ۳۸ افسانوں کا جنھیں مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے غیر زبانوں سے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمہ کی شان چونکہ اخذ و اقتباس کی ہے اس لئے عبارت کا تسلسل اور بیان کی سادگی وہی ہے جو اُردو داں حضرات کو مرغوب ہو

یہ افسانے ملک کے مشہور جراید و رسایل میں شایع ہو کر کافی شہرت و قبول حاصل کر چکے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ نہ صرف زبان و انشار بلکہ تنوع مطالب کے لحاظ سے بھی یہ مجموعہ مطالعہ کے قابل ہے۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی ملک کے مشاہیر اہل قلم میں سے ہیں اس لئے ترجمہ یا زبان کے متعلق اظہار رائے بیکار ہے۔ پھر سب سے بڑی خصوصیت ایک یہ ہے کہ قیمت بہت کم یعنی صرف ایک روپیہ رکھی گئی، کتابت، طباعت پسندیدہ ہے اور کاغذ دبیز۔ ضخامت چھوٹی تقطیع کے ۴۰۵ صفحات کو محیط ہے ۔۔۔ منیجر ہند بک ایجنسی کلکتہ یا تاج کمپنی لاہور سے یہ مجموعہ دستیاب ہو سکتا ہے۔

شکار اُردو میں پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر اتنی جامعیت کے ساتھ لکھی گئی ہے اس کے مصنف نواب قطب یار جنگ مرحوم ہیں، جن کی ساری عمر اسی مشغلہ میں بسر ہوئی۔

اس کتاب میں مصنف نے صرف دوسروں کے تجربات سے فایدہ اُٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ خود اپنے تجربات کو سامنے رکھ کر تمام ان مسایل سے بحث کی ہے جو کسی نہ کسی طرح شکار سے تعلق رکھتے ہیں۔

طیور و وحوش سبھی کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، لیکن شیر کی نسبت جتنا اور جو کچھ لکھا ہے وہ گویا ان کی ساری کوششوں کا ماحصل ہے، انداز بیان نہایت دلچسپ ہے اور وہ لوگ جو شکار سے دلچسپی نہیں رکھتے اُن کے لئے بھی اس کا مطالعہ نیچرل ہسٹری کے طور پر فایدہ سے خالی نہیں۔ اس کی قیمت دس روپیہ ہے جو اسکے محاسن و خصوصیات کے لحاظ سے کسی طرح زاید نہیں اور مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے ملسکتی ہے۔

دیوان مومن معہ شرح مومن کو جو مرتبہ تغزل میں حاصل ہے وہ کم از کم ناظرین نگار سے مخفی نہیں لیکن اس حقیقت کا علم اُن کو نہ ہوگا کہ دیوان مومن جو عام طور پر بازار میں ملتا ہے وہ اغلاط سے پُر ہے اور سخت ضرورت تھی کہ کوئی صاحب ذوق اس کا صحیح نسخہ مرتب کر کے شائع کرے۔

اس لئے ملک کو شکر گزار ہونا چاہئے جناب ضیاء احمد ضیا ام، اے کا جنھوں نے متعدد و مختلف نسخے جمع کرکے ایک صحیح اڈیشن اس کا شایع کیا اور اسی کے ساتھ اس کے مشکل اشعار کی شرح بھی فٹ نوٹ میں دیدی۔

ابتدا میں مقدمہ کے طور پر موتمن کی شاعری پر تبصرہ بھی کیا گیا ہے جو دیکھنے کی چیز ہے۔ فاضل مولف کو موتمن کے ساتھ خاص شغف حاصل ہے چنانچہ وہ اس سے قبل اس کے قصاید کا مجموعہ بھی اسی شان کے ساتھ شایع کرچکے ہیں۔

دیوان میں موتمن کی تصویر بھی شامل کر دی گئی ہے اور عمدہ کاغذ پر مجلد شایع کیا گیا ہے۔ قیمت ڈھائی روپیہ ہے اور شانتی پریس الہ آباد سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

روح الاسلام جناب عبید اللہ خاں صاحب قدسی پروفیسر فارسی سناتن دھرم انٹر کالج بیاور نے تصوف و اخلاق کی مختلف کتابوں سے اسلام کی اصل روح کو اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ جتنی اچھی باتیں اس کتاب میں درج کی گئی ہیں وہ یقیناً تعلیمات اسلام میں داخل ہیں لیکن ان کو صرف اسلام کی خصوصیت کیوں سمجھا جائے۔ جبکہ تمام دنیا کے مذاہب نے یہی تعلیم دنیا کے سامنے پیش کی۔۔ اسوقت ایسی کتابوں کی ضرورت نہیں جو ہمارے دماغوں کو صرف فلسفہ میں اُلجھائے رکھیں بلکہ عملی روح پیدا کرنے والی تصانیف درکار ہیں، جو کیمیائے سعادت اور مذاق العارفین کی فضا سے علحدہ کسی اور فضا میں طیار ہوا کرتی ہیں۔

اس کتاب کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مولوی فضل اللہ خانصاحب بیاور سے ملسکتی ہے۔

سلسبیل مجموعہ ہے جناب آل احمد صدیقی سرور ام۔ اے کی نظموں کا۔ جناب سرور مسلم یونیورسٹی میں انگریزی کے لکچرر ہیں اور شعر و سخن کا نہایت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔

اس مجموعہ میں چند نظمیں کشمیر کے دلکش مناظر سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں اور چند اور مختلف تاثرات کا نتیجہ ہیں۔ ایک طویل نظم مولانا محمد علی مرحوم کے متعلق ہے اور اخیر میں چند غزلیں بھی ہیں۔ سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں، وہ یہ ہے کہ سرور صاحب مستقلاً شعر کہنے کا ارادہ نہیں رکھتے لیکن اگر کبھی یہ ارادہ کرلیا تو ان کا شمار ملک کے اچھے شعراء میں ہوگا۔ وہ اس لئے کہ اگر شوق شاعر کہلانے کا ہوتا تو ابھی وہ یہ مجموعہ شایع نہ کرتے اور یہ اس لئے کہ جب وہ ابتدا ہی میں ایسی اچھی نظمیں کہہ سکتے ہیں تو مشق کے بعد جو ستم بھی کریں کم ہے۔

اس مجموعہ کی قیمت ایک روپیہ ہے اور مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڈھ سے ملسکتا ہے۔

بایوکیمک سائنس ڈاکٹر کاشی رام صاحب کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے جو سائکلوپیڈیا آف ہومیو پیتھک ڈرگس کے بعد شائع ہوئی ہے۔ اس میں بایوکیمک دواؤں کے علامات بتاکر علاج و امراض اور تشخیص ادویہ پر نہایت جامعیت سے بحث کی ہے۔

ہرچند بایوکیمک سائنس، ہومیوپیتھی کی طرح وسیع و مکمل نہیں ہے لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ بعض صورتوں میں یہ دوائیں بھی اکسیر کا کام کرتی ہیں۔ چونکہ اس سائنس میں صرف بارہ دواؤں سے تمام امراض کا علاج کیا جاتا ہے اس لئے یہ علم نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ یہ کتاب ایک روپیہ آٹھ آنے میں بھارت ہومیو فارمیسی لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

تعلقات ہومیوپیتھک ادویہ یہ تالیف بھی ڈاکٹر کاشی رام صاحب کی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کونسی دوا کس کی معاون ہے اور کون کس کی ضد۔ یعنی کس دوا کے بعد کیا دینا چاہئے اور اگر کسی دوا نے مضر اثرات پیدا کئے ہیں تو ان کو کس دوا سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اس کی قیمت ۱۲ر ہے اور یہ بھی بھارت فارمیسی لکھنؤ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

نغمۂ بیداری مسدس ہے جناب حاجی نبی احمد صاحب بریلوی کا جس میں انھوں نے پورے جوش و ولولہ کے ساتھ مسلمانوں کو درس عمل دیا ہے۔ زبان صاف ہے اور انداز بیان پُر زور قیمت دو آنے ہے اور ملنے کا پتہ نظامی پریس بک ایجنسی بدایوں۔

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے، جلد پر دانے پڑکر زخم کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کرجاتا ہے ہلاکتیں بھی ہوجاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے ــ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہو سکتی ــ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر ان کی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا ــ قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹ر ــ بڑا عہ ر ایک شیشی میں محصول ۶ر صرف ہوجاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا ــ ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ــ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے ــ

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

شیاما کے انتظار میں

پھر آج شب کی دیوی، جادو جگا رہی ہے
مدہوشیوں پہ دنیا ایمان لا رہی ہے

پھر چاندنی چلی ہے، مہتاب کی جبیں سے
نغمے برس رہے ہیں، تاروں کی سرزمیں سے

پیمانۂ نظر ہیں، پھر مے اتر رہی ہے
صہبا اثر ہوا ہے، پھر بدمست کر رہی ہے،

بیدار ہے محبت، ہشیار ہیں نگاہیں
پھر مسکرا رہی ہیں، عشرت کی جلوہ گاہیں

سو بجلیاں لئے ہے، ہر حورِ کہکشانی،
تصویر بن رہی ہے، ناہید کی جوانی

پھر کیفیت نظر میں، محسوس ہو رہی ہے
پھر محویت ہے طاری، پھر روح کھو رہی ہے

یہ اس لئے کہ شیاما ملنے کو آرہی ہے
پھر دل کی ہر تمنا، تالی بجا رہی ہے

حسنِ تمام بنکر آئے گی آج شیاما
احساسِ عاشقی پر چھائے گی آج شیاما

نظروں میں مسکرائے، پھر آئے میری شیاما
میری نظر پہ صہبا، برسائے میری شیاما

لیکن میں اس سے پہلے، دنیا نئی بنالوں
میں آج اپنے گھر کو انوار سے سجا لوں

تاروں سے نور لاؤں، مہتاب سے شعاعیں
کشمیر سے فضائیں، فردوس سے ہوائیں

شامِ اودھ سے لاؤں، شامِ اودھ کی باتیں
کاشی سے صبح لاؤں، اور مالوے سے راتیں

میں آج اپنے گھر کو ایوانِ نور کر دوں
دنیا میں آج پیدا، ایک اور طور کر دوں

بیٹھوں میں گھر میں گھر کا پروردگار بنکر
ہر شوق و آرزو کا، آئینہ دار بنکر

یہ اس لئے کہ شیاما ملنے کو آرہی ہے
پھر دل کی ہر تمنا تالی بجا رہی ہے

حسنِ تمام بنکر آئے گی آج شیاما
احساسِ عاشقی پر چھائیگی آج شیاما

فطرت واسطی

غزل

بہار آئی جو گلشن میں بہ قدرِ اعتبار آئی
گلوں کے خندۂ پیہم پہ شبنم اشکبار آئی

خدا جانے یہ میرے آبِ گل میں ہاتھ کس کا ہے
کہ گریہ بے قرار آیا ہنسی بے اختیار آئی

تصور بھی بہ قدرِ ذوقِ دل سب کچھ ہی ہستی میں
قفس میں یادِ گل آئی میں سمجھا بہار آئی

نہ تھا منظور جو مجھ کو جلا کر خاک کر دینا
یہ عمرِ چند روزہ بن کے کیوں برق و شرار آئی

گیا تھا شوقِ دل لیکر مجھے کل اسکے کوچے میں
طبیعت بے قرار آئی، تمنا شرمسار آئی

نظر صیاد کی رنگِ قفس ہے میری آنکھوں میں
میں کیا جانوں خزاں آئی کہ گلشن میں بہار آئی

اُدھر خودداریاں دم بھر انھیں مہلت نہیں دیتیں
اِدھر جانِ حزیں ہونٹوں پہ میرے بار بار آئی

ادب کا پاس محمل تک اسے جانے نہیں دیتا
ہوائے نجد مجنوں کا کہاں لیکر غبار آئی

نہ آنا دیکھ کر ان کا اجل کو شرم رکھنی تھی
ہمارے وقت پر آئی جو روزِ انتظار آئی

ہوا وقتِ سحر کیا مجھ کو ٹھنڈی سانس بھرنے سے
ہوائے نکہتِ گل انکے گیسو کو سنوار آئی

نہ سمجھا جینے والوں نے نہ جانا مرنے والوں نے
نفس کیوں بار بار آئی اجل کیوں ایکبار آئی

نظر اس شکل میں لائی ہے تابِ جلوہ آرائی
اُدھر مستانہ وار اُٹھی اِدھر بیگانہ وار آئی

خمار آلود آنکھیں کھول دیں پھر پینے والوں نے
اذانِ صبحِ مسجد میکدے میں بھی پکار آئی

بڑی راحت تھی ہم کو جب تنِ موہوم خالی تھا
ہمیں بے چین کر دینے کو جانِ بیقرار آئی

ہماری بیخودی معیار ہے احساس کا کیفی
چمن میں جب خزاں آ گئی سمجھیں کہ بہار آئی

کیفی چریاکوٹی

ہندوستانی دواخانہ کی چند مشہور و مفید دوائیں

مصفی

خون کی ہر قسم کی خرابی دور کرنے میں اکسیر ہے گرمی دانے، مہاسے، جھائیں، پھوڑے پھنسیاں، داد، چھاجن، برص، سوزاک، آتشک سب میں یکساں مفید ہے۔ صرف جڑی بوٹیوں کا مرکب ہے اسلئے حفظ ماتقدم کیلئے حالت تندرستی میں بھی استعمال کر سکتے اور بچوں کو بھی دے سکتے ہیں۔ ترکیب استعمال۔ ایک ایک خوراک تھوڑے پانی میں ملاکر صبح دوپہر اور شام پی جاتی ہے۔

قیمت ۳۶ خوراک ڈیڑھ روپیہ (ع۱)

اکسیر سوزاک

نئے اور پرانے سوزاک میں کی پہلی ہی خوراک اپنا اثر دکھاتی ہے سوزش جلن اور پیپ کا آنا موقوف ہو جاتا ہے پرانے سوزاک کے مریضوں کو اسکی ایک شیشی استعمال کرنیکے بعد مصفی ایک دو مہینے استعمال کر لینی چاہئے تاکہ اس مرض کی خطرناک میٹھے اور اثرات سے خون پاک صاف ہو جائے اور پھر یہ موذی مرض عود نہ کرے۔ ترکیب استعمال ایک ایک کیپسول پانی کے گھونٹ سے صبح۔ دوپہر اور شام کو نگل لیا کریں۔ قیمت ۴۲ کیپسول (ع۸)

اکسیر نسواں

رحم سے رطوبت آنے (لیوکوریا) اور حیض کی بے قاعدگی میں نہایت مفید ہے۔ حمل نہ ٹھہرنا یا بار بار ساقط ہو جانا حیض کا درد سے آنا۔ کمر اور پنڈلیوں کا درد۔ رحم کا ضعف اور ورم ان سب شکایتوں میں حیرت انگیز نفع پہونچاتی ہے۔ ہسٹریا میں بھی مفید ہے۔ حاملہ کے لئے اس کا استعمال ممنوع ہے۔

قیمت فی شیشی بارہ آنہ (۱۲؍)

روغن موم

جدید کیمیاوی طریق سے بنایا گیا ہے خالص دیسی موم کا جوہر ہے جو سرد سے سرد موسم میں بھی نہیں جمتا اعصاب کو قوت دیتا ہے، درد، چوٹ جلنے اور موچ آنے میں نہایت مفید ثابت ہوا ہے ــ گٹھیا اور عرق النسا کے درد کو بھی تسکین دیتا ہے۔

قیمت ۲ تولہ کی شیشی دو روپیہ (عہ؍)

شربت صدر

گردن توڑ بخار میں ڈاکٹری دوائیں ۲۵ فیصدی بھی کامیاب نہیں ہوتیں لیکن ہماری یہ دوا ۵۰ فیصدی سے زیادہ موثر ہے۔ ہر قسم کا نزلہ و زکام دور ہو جاتا ہے دق و سل میں بھی مفید ہے۔ منہ سے خون آنے کو روکتا ہے اور ہڈیوں کے بخار کو کھو دیتا ہے۔ دمہ کے صدہا مریض بھی اس کے استعمال سے اچھے ہوئے ہیں

قیمت ۱۶ خوراک ایک روپیہ (عہ؍)

دواء الشفاء

جنون (پاگل پن) کی دنیا میں پہلی اور آخری دوا ہے۔ لاکھوں دیوانے اسکے استعمال سے سیانے ہو چکے ہیں پاگل خانہ آباد کرنے کے سوا یورپ بھی آج تک اس مرض کی کوئی مکمل دوا پیش نہیں کر سکا آپ اپنے دیوانہ کو پاگل خانے بھیجنے سے پہلے ہمارے کارخانہ کی مایۂ ناز دوا، دواء الشفاء استعمال کرکے اور طب یونانی کا کرشمہ دیکھئے عورتوں کے مخصوص مرض (ہسٹریا) (اختناق الرحم) میں بھی نہایت مفید ثابت ہوا ہے۔ قیمت اسّی قرص پانچ روپے (صہ؍)

ملنے کا پتہ:ــ ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۳ دہلی

اصحاب کہف

(ڈراما)

اڈیٹر نگار کے قلم سے (۲۰۰ صفحات پر)

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ جنوری ۱۹۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائے گا صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کر سکتے ہیں ——— منیجر

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین ستمبر ۱۹۳۵ء	شمار ۳

ملاحظات ——— ۲

پارسی اہل کتاب ہیں ——— محمد طاہر رضوی ایم۔ اے ——— ۹

جھانسی کی رانی ——— ۱۹

کسبی ——— سید ابو سعید بزمی ایم۔ اے ——— ۳۶

دولت کی مساوی تقسیم ——— ا ——— ج ——— ۵۲

عورت کی منطق ——— ۵۷

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث ——— عبد المالک آروی ——— ۶۰

باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۷۳

منظومات ——— حافظ، حزیں، فطرت، شمیم ——— ۷۷

نگار

ایڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	ستمبر ۳۵ء	شمارہ ۳

ملاحظات

ادارۂ قومی میں زبان کی اہمیت

اور

اُردو زبان کے مستقبل پر ایک نظر

انسان خواہ وہ کسی مرز و بوم سے متعلق ہو، بہ لحاظ اپنی نوع کے ایک ہی چیز ہے، اور "مستقیم القامۃ، متحرک بالارادہ حیوانِ ناطق" ہونے کی منطقی تعریف، شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر ملک و قوم کے انسان پر صادق آتی ہے۔ لیکن باینہمہ اتحادِ نوعی و توافقِ جنسی، ہر ملک کا انسان دوسرے ملک کے انسان سے بالکل علٰحدہ نظر آتا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک قوم کا آدمی دوسری قوم میں شامل ہو کر لطف و راحت سے زندگی بسر کر سکے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان فی الحقیقت نام اُس کی مخصوص شکل و صورت کا نہیں، بلکہ ایک خاص تہذیب و معاشرت، ایک مخصوص میلانِ طبع اور ایک متعین ذوق کا ہے جو جغرافی ماحول اور طبیعی حوادث کے ماتحت پیدا ہو کر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آتا ہے اور اس اختلافِ ذوق کا نام اختلافِ تہذیب، اختلافِ طبائع، اختلافِ معاشرت، اور اختلافِ

زبان ہے۔ آپ قطب شمالی کے منطقہ باردہ اور خط استوا کے نیچے واقع ہونے والے ممالک کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو دونوں جگہ کے انسانوں میں بہت زیادہ نمایاں فرق محسوس ہوگا کیونکہ یہاں کے جغرافی حالات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں اور یہ اختلاف نہ صرف تہذیب و معاشرت بلکہ ظاہری شکل و صورت میں بھی کافی تغیر پیدا کردیتا ہے۔ الغرض جغرافی ماحول اور حوادث تاریخی کا اختلاف اتنا زبردست محرک اختلاف طبائع کا ہے کہ اس کا مقابلہ ممکن نہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قومی خصوصیات بالکل فطری مجبوریاں ہیں اور ان کو دور کرنا نہ صرف فطرت کا مقابلہ کرنا ہے، بلکہ قومی شیرازہ کو درہم و برہم کر دینا ہے۔

ان اختلافات میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جو بیک وقت ایک قوم کو دوسری قوم سے ممتاز کرنے والی بھی ہے اور افراد قوم کی شیرازہ بند بھی، زبان کا اختلاف ہے کہ اس کو سنتے ہی ہم جان لیتے ہیں کہ فلاں شخص کس ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اگر وہ اپنا ہم زبان ہے تو فوراً جذبۂ ہمدردی و اخوت میں تحریک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے اصلاح زبان و تحفظ زبان کا مسئلہ ہمیشہ تمام قوموں میں نہایت اہم بالشان مسئلہ رہا ہے اور جب کسی قوم کا دور ارتقاء شروع ہوا ہے تو لازماً اس نے اس پر بھی خاص توجہ کی ہے۔

ہم کو اسوقت ساری دنیا سے بحث نہیں صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں کے مقابلہ میں اپنی زبان اور اس کے مستقبل پر سرسری نگاہ ڈالنا مقصود ہے۔ اب سے چند سال قبل ہندوستان کی جمہوری زبان اردو سمجھی جاتی تھی، اسی میں خط و کتابت ہوتی تھی، دفاتر سرکاری میں اسی کا رواج تھا اور ہندو ریاستوں کے کاغذات بھی اسی زبان اور اسی خط میں مرتب ہوتے تھے۔ لیکن جب یہاں کی سیاسیات نے ہندوؤں کے اندر ایک خاص ذہنی انقلاب پیدا کرکے وطنیت کا جذبہ ان میں ابھارا، تو زبان اور رسم الخط کی طرف بھی ان کو توجہ ہوئی اور چونکہ اردو زبان اور اس کا انداز تحریر دونوں بالکل غیر آرین چیزیں تھیں اس لئے وہ ہندی زبان اور ہندی رسم خط کی طرف مائل ہو گئے جو علاوہ خالص قومی و وطنی رنگ رکھنے کے (سنسکرت سے مماثل ہونے کے باعث) انکے لئے مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

پھر اس وقت ہم کو اس بحث میں الجھنا نہیں ہے کہ اردو اور ہندی میں کون قابل ترجیح ہے، یا یہ ہندوؤں کا یہ میلان قابل ستائش ہے یا لائق اکراہ بلکہ صرف واقعات کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ اردو کی حفاظت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی کیا تدابیر ہو سکتی ہیں۔

اس دوران میں اکثر اہل فکر نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا اور وہ لوگ جو ہندوستان میں متحدہ قومیت دیکھنا چاہتے ہیں انھوں نے باہمی مفاہمت کی چند صورتیں بھی پیش کیں مثلاً یہ کہ بجائے اردو ہندی کے اس متحدہ زبان کا نام ہندوستانی رکھا جائے، اردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر (جن سے ہندوؤں کو بوئے خون آتی ہے)

اُن کے لئے زیادہ قابلِ قبول بنایا جائے اور ہندو مسلمان دونوں کو اردو و ہندی رسم الخط سیکھنے پر مجبور کیا جائے وغیرہ وغیرہ - لیکن میں نے ان شوروں کو کبھی اہمیت نہیں دی کیونکہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلافِ مذہب اور اختلافِ معاشرت و تہذیب کی اتنی زبردست خلیج حایل ہے کہ اُس کو پُر کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور چونکہ ہندو قوم ارتقائی حالت میں ہے اس لئے وہ اپنے بڑھے ہوئے حوصلہ کے مقابلہ میں نہ کسی رواداری سے کام لینے پر آمادہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ مسلمانوں کے کسی ایثار کی قدر کر سکتی ہے۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر اُردو میں وید اور گیتا کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اپنی ہندی تحریروں میں سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا استعمال ترک نہ کریں گے، اُن کو نفرت صرف اُردو زبان سے نہیں ہے بلکہ اُردو رسم الخط سے بھی ہے اور وہ کسی ایسی یادگار کو قائم رکھنا نہیں چاہتے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت سے کوئی ہلکا سا بھی تعلق رکھتی ہو۔

اس لئے میرے نزدیک مسلمانوں کی یہ کوشش کہ وہ متحدہ زبان کے اُصول کو تسلیم کر کے رسم خط بدستور اُردو کا قایم رکھیں کبھی ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی، خواہ وہ اُردو کا نام بدل کر بجائے ہندوستانی کے ہندی یا برج بھاشا ہی کیوں نہ رکھدیں۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے متعلق ہندوؤں نے کیا تدابیر اختیار کیں اور کس قدر کامیابی حاصل کی، کسی سے مخفی نہیں۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں "ہندی پرچار" کی سبھائیں موجود نہ ہوں اور ہندو قوم نے ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے مسئلہ کو سیاسی و مرکزی اہمیت دیکر پورے ملک و قوم کی توجہ مبذول نہ کر لی ہو۔ اُن کے تمام اکابر خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا اصلاحِ مذہب و معاشرت سے، طبقۂ امرا سے وابستہ ہوں یا طبقۂ عمال سے، سب اجتماعی حیثیت سے اس طرف متوجہ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندی رسایل و اخبارات اور ہندی تصانیف اپنی اشاعت کے لحاظ سے اُردو کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں - ہندی زبان کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں - والیانِ ریاست ہندی تصانیف پر بیش بہا انعامات دے رہے ہیں، ہندو ریاستوں کے دفاتر و قوانین سب ہندی بلکہ سنسکرت زبان میں منتقل ہو رہے ہیں، خود حکومتِ برطانیہ کے دفاتر و عدالتگاہوں میں ہندی اپنی جگہ پیدا کرتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اگر آپ ڈاکخانے جائیں تو وہاں بھی ہندی فارم آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اُردو فارم باوجود طلب کرنے کے نہیں دیا جاتا — اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے ہندو کتنی منظم و باقاعدہ کوشش کر رہے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو کامیابی نہ ہو۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو دیکھیے کہ وہ اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے کیا کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت کا غالب حصہ وہ ہے جو ہمارے علماء مذہب کے زیر اثر ہے اور ان کو اُردو سے جو دلچسپی ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیم یکسر عربی زبان میں ہوتی ہے، اور وہ بھی ادب و انشاء کی نہیں بلکہ صرف فقہ و حدیث کی اس لئے وہ خود اُردو سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور ایک فقرہ صحیح نہیں لکھ سکتے۔

اب رہگیا دوسرا گروہ جو ہمارا سیاسی رہنما کہلاتا ہے، سو آپ مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ہائے خلافت و تبلیغ وغیرہ کی تمام رودادیں پڑھ ڈالئے، آپ کو کسی ایک جگہ بھی اُردو زبان کی حفاظت و ترقی کا ذکر نظر نہ آئے گا اور کبھی کسی ایک لیڈر کی زبان سے آپ نے یہ نہ سُنا ہوگا کہ مسلمانوں کی ہیئت اجتماعی میں اُردو زبان کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے — اور تو اور، خود ہماری مُسلم یونیورسٹی نے اس وقت تک کوئی ایسا لائحہ عمل پیش نہیں کیا جو اس باب میں ہماری رہنمائی کر سکے۔ الغرض اُردو زبان اسوقت حد درجہ نازک دور سے گزر رہی ہے، اور ہندو مسلم نزاع کے سلسلہ میں اس نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کر لی ہے، اس لئے اگر اس سیاسی جنگ میں ہندوؤں کو کامیابی ہوئی جس کے کُھلے ہوئے اسباب ہر چہار طرف نظر آرہے ہیں تو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کے مستقبل کی تاریکی روشن ہے۔

میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اُردو و ہندی میں قابل ترجیح کون ہے اور نہ اس رائے کا وقت و موقعہ کہ ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل انصاف پر مبنی ہے یا نہیں، لیکن بہ حیثیت مسلمان ہونے کے (مسلمان بہ لحاظ مذہب نہیں بلکہ بہ لحاظ تہذیب و معاشرتِ قومی) میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوں کہ کیا اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کا چھوڑنا ہمارے لئے ممکن و مناسب ہے اور اگر نہیں، تو پھر ہمکو اسکے تحفظ و بقا کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئے۔

میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ عناصر قومی میں زبان کا عنصر نہایت قوی عنصر سمجھا جاتا ہے اور شیرازہ قومی کو یکجا رکھنے میں زبان سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں۔ اس لئے اگر مسلمان بہ لحاظ قومیت ہندوؤں سے مختلف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قومی خصوصیات کو ترک کرنے کی کوشش کریں جبکہ حقیقتاً کوئی قوم اپنی خصوصیات کو ترک کر ہی نہیں سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ بجائے خود کافی بحث طلب ہے کہ ایک ہی ملک کی رہنے والی دو جماعتوں میں اختلافِ قومیت کیسا۔ لیکن قومیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جس میں وطنیت جزو مشترک ہوا کرتی ہے اور دوسرا وہ ہے جو تہذیب و معاشرت سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہندو و مسلمان وطنیت کے لحاظ سے تو یقیناً ایک ہی چیز ہیں اور جس وقت ملک و وطن کی خدمت کا سوال پیش آئے ان دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے، لیکن جس حد تک ذوق و میلان یا تہذیب و معاشرت کا تعلق ہے یہ دونوں بالکل ایک دوسرے

سے علحدہ ہیں اور ہمیشہ علحدہ رہیں گے۔

اس ذوق کے اختلاف کا سب سے بڑا سبب مذہب ہے سامی مذاہب اور خصوصیت کے ساتھ مذہب اسلام کی یہ انفرادیت کہ وہ جہاں کہیں پہونچا تمام ملکی و قومی رشتوں کو توڑ کر اس نے خاص اپنے رشتہ سے لوگوں کو وابستہ کر لیا اور ان کی اندرونی و بیرونی زندگی پر چھا کر ایک مخصوص تہذیب کا عادی بنا دیا اتنی زبردست چیز تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جس شخص نے یہاں اسلام قبول کیا، اس نے گویا اپنی قدیم ہندی تہذیب کو بھی خیرباد کہدیا۔

یقیناً ہندوستان کی مسلم آبادی کا بڑا حصہ وہی ہے جو کسی وقت ہندو تھا، لیکن آج وہ جن خصوصیات کا حامل ہے، وہ ہندو معاشرت، ہندو تہذیب اور ہندو ذہنیت سے اس قدر مختلف ہیں کہ کبھی یہ بات ذہن میں بھی نہیں آتی کہ یہ آبادی کسی وقت ہندو رہی ہوگی۔ مسلمانوں کی بود و باش، ان کی رفتار و گفتار، ان کی وضع قطع، ان کا ذوق ہندوؤں سے بالکل علحدہ ہے اور اقتصادی ذہنیت کا فرق تو خیر ظاہر ہی ہے کہ ایک کماتا ہے بچانے کے لئے اور دوسرا صرف اُڑانے کے لئے۔

اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ ہندو مسلمانوں میں کس جماعت کا کلچر قابل تعریف ہے اور کس کا لائق مذمت بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان میں اتحاد معاشرت و معیشت کی صورت پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے اور چونکہ زبان قومی خصوصیات میں سب سے زیادہ اہم بالشان چیز ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے بالکل ناممکن ہے کہ وہ ہندی زبان یا ہندی رسم الخط اختیار کر لیں اور ہندوؤں سے بھی یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندی پرچار کو چھوڑ دیں بالکل خلاف عقل ہے۔

ان دونوں جماعتوں کی ذہنیتوں کے درمیان اتنا زبردست فرق ہے کہ کبھی مل کر کام کر ہی نہیں سکتیں اور ان کو علحدہ علحدہ اپنی خصوصیات قومی کا تحفظ ضروری ہے، پھر چونکہ مسلمانوں کی جماعت بہ لحاظ اعداد و شمار ہندوؤں سے کم ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کشاکش میں ان کو خطرات کا زیادہ سامنا کرنا ہے اور اگر انھوں نے غیر معمولی جدوجہد سے کام نہ لیا تو ان کی شکست یقینی ہے۔

جو لوگ اخباروں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ ہندو کس سرعت و استحکام کے ساتھ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو ملک میں رائج کر رہے ہیں، اور برخلاف اس کے مسلمانوں کی بے پروائی کا جو عالم ہے اس کا حال تصنیفی و صحافتی اداروں سے پوچھئے۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں لوگوں نے انجمنیں قائم کر لی ہیں لیکن سوائے کبھی کبھی کوئی مقالہ پڑھ دینے کے وہ کوئی اور تعمیری پروگرام اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ اس وقت سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ محکمہ تعلیم کو اردو کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اگر مسلمانوں

کی کوئی سیاسی جماعت اس وقت موجود ہے تو وہ اصولی طور پر ترویج و اشاعت اُردو کو اپنے مقاصد میں شامل کرے۔ علاوہ اس کے انفرادی طور پر ہر مسلمان کو بطور قومی فرض کے اپنی آمدنی کا کوئی ایسا حصہ جسے وہ بہ آسانی نکال سکتا ہے، خریداری کتب و رسایل کے لئے علحدہ کر دینا چاہئے، کیونکہ جب تک کسی قوم کی صحافت اچھی حالت میں نہ ہو، زبان کی صحیح خدمت انجام دینا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ ہر صوبہ میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو زبان کے متعلق محکمہ تعلیم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے اور نصاب کی کتابوں پر نقد و تبصرہ کر کے بتاتا رہے کہ ان میں کیا نقایص ہیں بلکہ اگر ممکن ہو تو وہ خود نصاب کے لئے کتابیں مرتب کرے اور اسی کے ساتھ ایسے آدمی پیش کرے جو صحیح معنے میں اُردو جانتے ہوں اور اُردو کی تعلیم دینے والے ہوں۔ اس کے لئے تمام مرکزی مقامات پر ٹرینگ کالج قائم کر کے فارسی و عربی کی طرح امتحانات مقرر کرنا چاہئے انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ میں شوق و ولولہ پیدا کرنا چاہئے اور سفری کتب خانے قائم کر کے نہ صرف شہروں بلکہ قصبات و دیہات میں بھی کتابوں اور اخباروں کا ذوق پیدا کرنا چاہئے۔

ہمیں یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ لکھنؤ میں بعض پُر جوش بہی خواہان اُردو نے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈالدی ہے جس کا نام "لکھنؤ اُردو اکاڈیمی" ہے۔ یہ چند شعبوں میں منقسم ہے۔ (۱) شعبۂ نقد و مطالعہ، (۲) شعبۂ درس و تعلیم (۳) شعبۂ تصنیف و تالیف

پہلے شعبہ سے مقصود اُردو کلاسکس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے تاکہ زبان کا صحیح ذوق لوگوں میں پیدا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ اُردو ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کتنی وسعت رکھتی ہے۔ اسی کے ساتھ اسکا یہ فرض بھی ہوگا کہ وہ صوبہ متحدہ کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی درسی کتابوں کی جانچ کر کے اُن کے نقایص کی طرف محکمہ تعلیم کو متوجہ کرے۔

دوسرے شعبہ کا اہم مقصد مدارس شبینہ کا قیام، اُردو زبان کے ذریعہ سے مختلف علوم کی ابتدائی تعلیم اور ایک اُردو ٹرینگ کالج قائم کر کے "ماہر اُردو۔ فاضل اُردو۔ کامل اُردو" کی ڈگریاں دینا ہے۔

تیسرے شعبہ کا کام معیاری کتابیں تصنیف کرنا، بہترین تالیفات کی طبع و اشاعت میں مدد دینا اور انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ اور ملک کے نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنا ہے۔

کوشش کیجا رہی ہے کہ جلد سے جلد یہ ادارہ گورنمنٹ سے رجسٹر کرالیا جائے اگر اہل ملک نے بے توجہی سے کام نہ لیا تو اُمید ہے کہ یہ تحریک بہت مفید ثابت ہوگی۔ اسوقت میرے سامنے اس کا تفصیلی لٹریچر موجود نہیں ہے اس لئے اس اجمال سے زیادہ میں اور کچھ عرض نہیں کر سکتا، لیکن جو حضرات اس باب میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈیمی سے خط و کتابت کریں۔

جنوری ۳۶ء کا نگار جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے، ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اور بعض حضرات کے مضامین بھی اس اشاعت کے لئے موصول ہو چکے ہیں، لیکن میں نے اس کو نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کیا کہ ہندی زبان کا پرچار کرنے والے اور برج بھاشا پر جان دینے والے ابتک اس منزل پر بھی نہیں پہونچے جن سے اُردو زبان اب سے بیس سال قبل گزر چکی ہے۔

جس حد تک شمار و اعداد کا تعلق ہے ہندی کتابوں اور ہندی رسائل و جرائد کی ترقی سے انکار ممکن نہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ ہندی لٹریچر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی اُردو لٹریچر سے آگے بڑھ گیا ہے۔

بعض بڑے بڑے اہل قلم ہندی نگاروں کے مضامین موصول ہوئے ہیں، لیکن اپنے معیار کے لحاظ سے وہ اس درجہ پست ہیں کہ اگر آج اُردو کا کوئی رسالہ ایسے مضامین شائع کرنے پر آجائے تو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی اُنھیں نہ دیکھے۔ یہ درست ہے کہ ہندی نے حال ہی میں ترقی شروع کی ہے اور اُردو اس سے بہت زیادہ معمر و پختہ زبان ہے، لیکن میں جس کمی کو محسوس کر رہا ہوں اس کا تعلق امتداد زمانہ سے اتنا نہیں ہے جتنا ذوق جمالیات، ذوق فن سے ہے۔ ہندی کے لکھنے والے اکثر وہ ہیں جو کسی نہ کسی مغربی زبان میں اعلیٰ سند حاصل کر چکے ہیں، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی میں اُس ذوق سے کام نہ لیں جسے انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہندی زبان ہی میں ابھی یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ کسی بلند ذوق کی چیز کو پیش کر سکے اور اس کے انداز بیان میں وہ تنوع ابھی تک پیدا نہیں ہو سکا ہے جو مختلف مباحث کے لئے مختلف اسلوب ادا کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ جنوری ۳۶ء کا نگار بھی جنوری ۳۵ء کے نگار کی طرح کام کی چیز ثابت ہو اور غالباً یہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس میں بہترین مقالے انھیں کے ہونگے جنھیں ہندی زبان کا کوئی حق نہیں ہے۔

زیر طباعت مجموعۂ استفسار و جواب کے متعلق جو خطوط موصول ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ اُسے دو حصوں میں شایع کیا جائے، اس لئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ دوسرا حصہ تقریباً طیار ہے اور اُمید ہے کہ شروع اکتوبر میں شایع ہو جائے۔ اس کی قیمت بھی خریداران نگار کے لئے دو روپیہ اور غیر خریداران کے لئے تین روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ وہ حضرات جو اس کا پہلا حصہ خرید چکے ہیں ان کے لئے دوسرے حصہ کی خریداری کا مسئلہ تقریباً طے شدہ ہے، لیکن جنھوں نے پہلا حصہ بھی نہیں لیا ان کو ضرور اس امر پر غور کرنا ہے کہ دوسرے حصہ کی اشاعت سے قبل پہلا حصہ اُن کو حاصل کرنا چاہئے یا نہیں اور اگر وہ دونوں حصے ساتھ لینا چاہتے ہیں تو ان کو اس کی اطلاع پہلے ہی سے دیدینا چاہئے۔

پارسی اہلِ کتاب ہیں

زرتشتیوں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری

(مسلسل)

تاریخ وسیر کی کتابیں جن کا تعلق اسلام کے دورِ اولین سے ہے صاف صاف اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ زمانۂ ماقبل کے مسلمانوں نے زرتشتیوں کے ساتھ پوری رواداری برتی اور انھیں مثل یہود و نصاریٰ کے زمرۂ اہلِ کتاب میں شمار کیا۔ علامہ شہرستانی اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں دینِ زرتشت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر ایران کی تعلیم میں خدا کی عبادت اور شیطان سے نفرت پر بہت زور دیا گیا ہے اور لوگوں کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے متعلق تاکید کی گئی ہے۔"[1]

مناسب ہوگا اگر اس مقام پر مولانا عبدالحق حقانی جیسے زبردست فقیہہ کا خیال بھی پیروانِ پیغمبر ایران کے متعلق ظاہر کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:- "مجوسی زرتشت ابن پوراسپ کے پیرو ہیں جنھوں نے عہد گشتاسپ بن لہراسپ میں ظہور فرمایا تھا۔ گشتاسپ خود بھی زرتشت کا پیرو تھا۔ اس گروہ کے خیال میں نور اور ظلمت دو مخالف عناصر پر تمامی ہستی کا وجود منحصر ہے۔ خدائے بزرگ و برتر خالقِ کلِ موجودات ہے۔ نہ تو وہ کوئی شریک رکھتا ہے اور نہ اُس کا کوئی معین و مددگار ہے۔ نور اور ظلمت گویا نیکی و بدی۔ امن و پریشانی۔ پاکبازی اور خباثت کی علامت ہیں۔ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ زرتشت اُس کتاب کے مصنف یا مبلغ سمجھے جاتے ہیں جس کا نام زنداوستا ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اُن پر بذریعہ الہام نازل ہوئی تھی اُن کی تعلیم کے مطابق کارخانۂ قدرت کے دو رُخ ہیں ایک تو وہ جو پہلے سے مقدر ہو چکا ہے اور دوسرا انسانی اعمال اور کوشش سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] فارسی ترجمہ موسومہ توضیح الملل صفحہ ۲۰۳ (نسخۂ خطی امپیریل لائبریری کلکتہ) اس کے ساتھ ہی کتاب تنبیہ الاشراف مولفۂ مسعودی صفحہ ۹۳ بھی ملاحظہ ہو۔

دونوں کے درمیان ایک خاص ربط ہے۔ زرتشت کے خیال کے مطابق تمام مصائب کا باعث خود انسان کا عمل ہے۔ دنیاوی سعادت اور نجاتِ اُخروی کے لئے انسان کے اعتقاد اقوال اور اعمال کا پاک ہونا لازمی ہے اور یہی اصلِ ایمان ہے[1]۔ اکثر علمائے اسلام نے زرتشتیوں کا شمار اہلِ کتاب میں کیا ہے[2]۔ عوام میں جو غلط فہمی انکے متعلق پھیلی ہوئی ہے اس کا اصلی سبب محض ہماری کوتاہ بینی اور تعصب پرستی ہے۔ جو ہمیں اس مذہب کے اخلاقیات کا مطالعہ کرنے سے معذور رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ زرتشتی ادبیات زیادہ تر ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے مغربی علماء کی جد و جہد سے زرتشتیوں کی دینی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں اُن کے مذہب پر غور کرنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ اگر ہم زمانۂ سلف کے مسلمان مورخین اور علماء کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کریں تو دینِ زرتشت کی اصلی حالت ہمارے سامنے آئینہ ہو جائے گی۔ دبستانِ مذاہب مولفہ مُلّا محسن کشمیری میں اس مذہب کے عقاید اور مراسم کا اجمالی احوال درج ہے۔ اور اکثر زرتشتی علماء کے متعلق بھی مفصل ذکر موجود ہے۔ مُلّائے موصوف ایک مشہور مجوسی عالم آذر کیوان کے متعلق فرماتے ہیں کہ لوگ انھیں "ذوالعلوم" کہتے تھے۔ ادیانِ عالم پر اُن کو کافی عبور حاصل تھا۔ شمس العلماء شبلی نعمانی نے بھی آذر کیوان کے متعلق اپنے مقالات میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مُوحد اور صوفی تھے اور اکثر مسلمان عالم اُن کے شاگرد تھے[3]۔ اسی طرح ایک دوسرے مجوسی عالم بہرام بن فرہاد کے متعلق دبستان میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ فلسفہ کی ہر شاخ پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور پہلوی زبانوں کی کل کتابیں اُن کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں۔ ایک اور عالم موبد سروش کے متعلق صاحبِ دبستان کا بیان ہے کہ خود انھوں نے اُس سے خدا کے وجود کے متعلق دو سو بیس دلیلیں سیکھی تھیں۔

اب ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ ایسے مذہب کے متعلق کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ شرک اور کفر کی تعلیم دیتا ہے جس میں اس طرح کے خداشناس اور صاحبِ فہم بزرگ پائے جاتے ہوں ــ مشہور مسلم سیاح اور مورخ مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ قرونِ اولیٰ کے خلفائے اسلام نے زرتشتیوں کے ساتھ بالکل اہلِ کتاب کا سا سلوک کیا اور اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کبھی نہ کی خود مسعودی نے عراق۔ کرمان خراسان اور اکثر مقامات کے زرتشتی مرکزوں کو دیکھا تھا جہاں وہ لوگ بلا کسی پابندی اور قیود کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد بھی پیروانِ زرتشت عرصہ تک اپنے وطن میں پُرامن

[1] البیان۔ مولفہ مولانا عبدالحق حقانی صفحہ ۱۵۱-۳۔ (ترجمہ انگریزی)۔ [2] نیکلسن کی تصنیف مطالعات الشعائر اسلامیہ۔ باب دوم۔ صفحہ ۱۶۷۔ اور پروفیسر آرنلڈ کا مقالہ مندرجہ دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد نہم ملاحظہ ہو۔ [3] مقالات شبلی صفحہ ۳۰۸۔

زندگی بسر کرتے رہے[۱]۔ مسلمانوں کے ہاتھ دولت ساسانی کا استیصال محض سیاسی بنا پر ظہور میں آیا۔ اسے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا[۲]۔ ملک پر عربی تسلط ہو جانے کے باوجود وہاں کے نظم و نسق میں تبدیلی تقریباً بالکل نہ ہوئی۔ خراج کی وصولی اور مالیات کے انتظام کے متعلق خود حضرت عمرؓ کے فرمان کے مطابق مشہور ساسانی بادشاہ نوشیروانِ عادل کے اُصول برقرار رکھے گئے[۳]۔ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ کارروائی قصداً عمل میں آئی۔ اس کے اسباب پر ابن الاثیر اور طبری نے بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے[۴]۔

مرحوم مسٹر نریمان ایک پارسی فاضل فرماتے ہیں کہ "خلفائے اسلام نے عقلمندی سے کام لیکر مجوسیوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے برابر سمجھا اور اُن کا شمار اُن اقوام میں کیا جو کسی مستقل اُصول معاشرت کے حامل تھے[۵]" اسی طرح جسٹس سید امیر علی صاحب مرحوم اپنی مشہور عالم تصنیف روح الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔ "خود معلم مذہب اسلام نے اس امر کی اجازت دیدی تھی کہ مسلمان شادی بیاہ کا رشتہ عیسائی۔ یہودی اور مجوسی اقوام سے جوڑ سکتے ہیں" ظاہر ہے کہ اگر مجوسی بھی اہل کتاب میں شمار نہ کئے گئے ہوتے تو اُن کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ پیدا کرنے کی اجازت کیونکر دی جا سکتی تھی۔ اس جگہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کا اشارہ نہایت مناسب ہوگا جس میں مرقوم ہے کہ خود جناب ختمی مرتبت رسول اکرمؐ نے زرتشتیوں کے اہل کتاب ہونے کا صاف اعلان فرما دیا تھا[۶]۔ اور اس سلسلہ میں مصنف کتاب تیسیر القاری فی شرح صحیح بخاری نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ امام شافعی اور محدث عبد الرزاق کا بھی خیال تھا کہ زرتشتی اہل کتاب ہیں۔ صحیح بخاری میں ایک مخصوص واقعہ کا بھی اسی مبحث کے متعلق ذکر ہے۔ کہ ایک بار مشہور صحابی رسول احنف جبکہ زرتشتیوں سے جزیہ وصول کرنے میں مصروف تھے تو چند لوگوں نے اعتراض کیا کہ زرتشتی اہل کتاب نہیں اس لئے اُن سے جزیہ لینا ناجائز ہے اس پر احنف نے کہا کہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم نے اس گروہ سے جزیہ لینا قبول فرمایا تھا۔ بات کچھ بڑھی اور پھر یہ مسئلہ حضرت علیؓ کے سامنے آخری فیصلہ کے لئے پیش ہوا۔ جناب امیر نے فرمایا کہ حکم رسول کے مطابق زرتشتیوں کے ساتھ بھی مثل دیگر اہل کتاب کے سلوک ہونا چاہئے۔ اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اس زمانہ میں جزیہ کی مخصوص رقم صرف انھیں لوگوں سے وصول کی جاتی تھی جن کے متعلق گمان غالب تھا کہ وہ موحد اور کسی پیغمبر الٰہی کے پیرو ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں اُن لوگوں کی حفاظت مسلمانوں پر لازمی تھی اور فوجی خدمات

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۲۰۶۔ [۲] روح الاسلام مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۱۷۰۔ [۳] روضۃ الاحباب ـ تاریخ الفخری۔ [۴] الفخری۔ صفحہ ۱۰۱ [۵] سیرۃ النعمان صفحہ ۱۲۷۔ [۶] ایران و پارسیان۔ جلد اول صفحہ ۸۲۔ اس کے علاوہ آثار خلافتِ راشدہ مولفۂ ولیم میور صفحہ ۲۰۷ بھی دیکھئے۔ [۷] بخاری باب الجزیہ۔ اس کے علاوہ جامع ترمذی جلد اول صفحہ ۵۰۳ (نولکشور پریس) بھی ملاحظہ فرمایئے۔

اُن کے لئے معاف تھیں۔ برخلاف اس کے مشرکین اور کفار سے جنھیں ادیانِ الٰہیہ سے کوئی واسطہ نہ تھا جزیہ قبول نہ کیا جاتا تھا اور وہ اسلامی ممالک کی حدود سے باہر نکالدئے جاتے تھے کیونکہ مسلمانوں کے درمیان اُن کی رہائش خطرناک سمجھی جاتی تھی اور جس کا تجربہ بھی اکثر و بیشتر ہوچکا تھا[۱]۔

علامہ بلاذری کی مشہور تصنیف فتوح البلدان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے رسول عربی صلعم نے مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک فرمایا اور اُن لوگوں سے جزیہ قبول کیا۔ یمن۔ عمان اور بحرین کے ساتھ مخصوص مراعات کا حکم حضرت نے جاری فرمایا تھا۔ پیغمبر اسلام ہی کی تعلیم کے مطابق حبیب ابن مسلم گورنر آرمینیا نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور مجوسیوں کو اُن کی حفاظت کا یقین دے رکھا تھا۔ ملا باقر مجلسی ایک شیعی عالم خلافت جناب امیر علیہ السلام کا ایک واقعہ اپنی کتاب حیات القلوب میں یوں نقل فرماتے ہیں[۲]:۔ ایک دن جناب امیر ممبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا پوچھ لو مجھ سے جو کچھ تم لوگوں کو پوچھنا ہو۔ ایسے میں ہیں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔ یہ سُنکر ایک شخص الشعث بن قیس کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر المومنین یہ تو فرمایئے کہ آپ مجوسیوں سے جزیہ کیوں لیتے ہیں جبکہ اس کا یقین ہے کہ نہ تو وہ اہل کتاب میں سے ہیں اور نہ اُن کے درمیان کوئی پیغمبر مبعوث ہوا۔ الشعث کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بیشک خدا نے مجوسیوں کے درمیان اپنا پیغمبر بھیجا اور اُن پر ایک کتاب نازل فرمائی۔

ایک دوسرے شیعی فاضل مولانا سید محمد ہارون اپنی تصنیف توحید الائمہ میں زرتشتی مذہب کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جہاں تک وحدانیت باری کا تعلق ہے زرتشتی تعلیم کو کل دیگر مذاہب کے عقاید پر بعد اسلام کے فوقیت حاصل ہے۔ قاضی ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے زرتشتیوں سے مثل اہل کتاب کے جزیہ تو قبول فرمایا تھا مگر یہود و نصاریٰ کی طرح اُن سے شادی بیاہ کرنے کی ممانعت فرمائی تھی کیونکہ مجوسی مشرک ہیں۔

اگرچہ ہمارے پاس قاضی صاحب کے اس بیان کی تردید کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے تاہم بفرض محال یہ صحیح بھی ہو تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سرور کائنات کا حکم مانی و مزدک کے پیرووں کے متعلق ہوگا جو ظاہر میں مجوسی ہی خیال کئے جاتے تھے اور جن کی اُس وقت بلاد اسلامیہ میں کثرت تھی۔ یہی جماعت ادبیات اسلامی میں اکثر زندیق کے نام سے بھی یاد کی گئی ہے اور جو درحقیقت خدا کے وجود کے بھی قایل نہ تھے[۳]۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر صاحب کتاب الخراج کے خیال میں زرتشتی گروہ پر شرک کا اطلاق ہوسکتا ہے تو پھر یہود و نصاریٰ اُن سے زیادہ مشرک کہے جاسکتے ہیں ایک طرف تو یہودیوں کی قوم عُزیر کے خدا ہونے کی قائل نظر آئی اور دوسری جانب عیسائیوں میں تثلیث پرستی رائج ہوئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کے باوجود ہر دو گروہ کو

[۱] خلافت۔ مولفہ میور صفحہ ۳۵۵۔ [۲] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۲۷۸ الف۔ [۳] کتاب الفہرست (ابن ندیم) ص ۳۲۷۔

قرآن شریف میں اہل کتاب کہکر مخاطب کیا گیا اور شریعتِ اسلامی نے ان کے ساتھ اکل و شرب - نکاح و شادی جائز قرار دیا -

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب سرور کائنات صلعم نے ایرانیوں کی جانب ہمیشہ بنظر التفات دیکھا اور اکثر و بیشتر موقعوں پر عہد نوشیروانِ عادل میں اپنی ولادت باسعادت کے واقعہ کا ذکر افتخار کے ساتھ فرمایا[۱] - صاحب نزہتہ القلوب آنحضرت سے یہ حدیث بھی نقل فرماتے ہیں کہ بتحقیق خدا نے عربوں کے درمیان سب سے بہتر قوم اہلِ قریش کو بنایا اور عجمیوں (غیر عرب) میں سب سے بہتر مخلوق ایرانیوں کو قرار دیا[۲] - سلمان فارسی کی ارادت اور خلوص و پاکبازی کا خیال فرماتے ہوئے آپ نے اُنھیں اپنے اہل بیت میں شامل فرمایا اور اکثر اہم موقعوں پر اُن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے[۳] -

فتوح البلدان میں مذکور ہے کہ جب رسولِ اکرم صلعم نے مجوسیوں کو اہل کتاب گردان کر اُن سے جزیہ لینا جائز فرمایا تو کچھ لوگ منافقین میں سے یہ کہنے لگے کہ محمدؐ نے اُنھیں اہل کتاب سمجھنے میں غلطی کو راہ دیا - بلاذری کا بیان ہے کہ اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی جسے حضرت نے لوگوں کے درمیان تلاوت فرمائی " اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اپنے افعال پر نظر کرو - غلطی کرنے والا تمھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا - تم خدا ہی کی طرف واپس جاؤ گے اور جس بات کو تم نہیں جانتے ہو وہ تمھیں سمجھا دے گا " (سورۃ پنجم آیۃ ۱۰۴)

یہ تو ایک بدیہی بات ہے کہ قرون اولی کے مسلمانوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ نہایت روادارانہ سلوک جائز رکھا - خود پیغمبر اسلام نے اپنے مسلک کی تبلیغ ہمیشہ نہایت پُرامن طریقہ پر فرمائی - یہانتک کہ کفار کے ساتھ بھی اگر جنگ کی تو محض مدافعانہ - مسلمانوں نے اسلحہ اُسیوقت اُٹھائے جب وہ اس کے لئے مجبور کئے گئے - تبلیغ کے سلسلہ میں اگر کوئی جماعت کسی طرف بھیجی گئی تو اُن لوگوں کو رسول اللہ کی مخصوص ہدایت تھی کہ لوگوں کے ساتھ اخلاق و انکسار کے ساتھ پیش آئیں - اور ہمیشہ امن و امان سے کام لیں - صاحب مروج الذہب لکھتے ہیں[۴] کہ ایک بار خالد بن ولید حضرت کے حکم سے قبیلۂ خزیمہ کی طرف بغرض تبلیغ بھیجے گئے - قبیلہ والوں سے اور خالد سے کسی بات میں تکرار ہوگئی - اور موخر الذکر نے تقریباً ایکسو آدمیوں کو اُسی قبیلہ کے قتل کرا ڈالا - جیسے ہی یہ خبر رسول اللہ صلعم کے پاس پہونچی تو آپ چیخ اُٹھے " یارب ہم خالد کے اس فعل کے ذمہ دار نہیں - ہم اسے

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۱۶۶ - ناسخ التواریخ - جلد دوم - صفحہ ۳۶۵ - [۲] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۲ (ب) - [۳] مجالس المومنین مصنفۂ قاضی نور اللہ شوستری - [۴] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۹۴ الف اسکے علاوہ ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد دوم صفحہ ۱۷ مولفہ مولانا شبلی -

نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تیری پناہ مانگتے ہیں۔" اس کے بعد فوراً ہی آپ نے حضرت علی کو قصاص کا روپیہ دیکر قبیلۂ خزیمہ کے پاس بھیجا اور اُن سے دوستانہ سلوک کرنے کی جناب امیر کو تاکید کی اور جب تک کہ قبیلۂ مذکور نے خالد کو معاف نہ کردیا رسول اللہ نے اُن سے بولنا ترک فرما دیا تھا۔ جناب سرورِ کائنات کے عہد میں جو کچھ معاہدے یہودیوں عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ کئے گئے تھے اُن کی پابندی خلافت راشدہ تک کی گئی اور "ذمیوں" کی جماعتیں اپنے رسومات ادا کرنے میں آزاد رہیں۔[۱] عدالتوں میں قاضی نے اُن کے ساتھ مثل مسلمانوں کے انصاف کیا۔ مثال کے لئے ہم ایک واقعہ عہد جناب امیر کا پیش کرتے ہیں۔ کسی یہودی نے حضرت پر ایک دعویٰ کیا جو سراسر جھوٹ تھا۔ جناب امیر اپنی بریت میں کافی ثبوت قاضی کے سامنے پیش نہ کر سکے چنانچہ فیصلہ بھی امیر المومنین کے خلاف ہوا جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی فرما لیا۔ اگرچہ بعد کو یہودی حضرت کی اس عدالت گستری کو دیکھ کر اپنے دعوے سے باز آگیا اور حقیقت حال کا اقرار کر لیا۔[۲]

جنگ نہاوند کے بعد جب ایرانی اسیروں کی جماعت کے ساتھ آخری ساسانی تاجدار کی بیٹی شاہزادی شہر بانو دربار خلافت میں پیش ہوئیں تو حضرت عمر نے اُن کا حال سُنکر فوراً قید سے رہا فرما دیا[۳] اور جناب علی مرتضیٰ نے خاندان کسریٰ کی شان برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرزند امام حسین کے ساتھ شہر بانو کا عقد فرما دیا۔ چنانچہ الیعقوبی کہتا ہے کہ ان دو بزرگ خانوادوں کے اتحاد سے امام حسین کے بعد بقیہ ائمہ اثنا عشر کا سلسلہ چلا اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ ایران میں لوگوں کا رجحان زیادہ تر بنی فاطمہ کی طرف رہا۔[۴] حسن اتفاق دیکھئے کہ مسلمانوں کی ایک دوسری کثیر التعداد جماعت یعنی احناف بھی تقلیداً ایران کی سرزمین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ ایرانی النسل تھے اور بقول شمس العلماء شبلی نعمانی مرحوم امام صاحب کے دادا بعہد جناب امیر کوفہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔[۵] یہ بزرگ اپنے آبائی وطن سے باہر جا کر بھی اپنی قومی عید (نوروز) کو کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ ایک بار نوروز کے موقعہ پر آپ نے فالودہ تیار کر کے جناب امیر کی خدمت میں پیش فرمایا تھا اور جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی کر لیا تھا۔[۶] خود امام ابوحنیفہ کو ایرانیت سے خاص دلچسپی تھی یہاں تک کہ آپ نے نمازوں میں اکثر سورتوں کے متعلق فارسی زبان میں (بجائے عربی کے) تلاوت کی اجازت دے رکھی تھی[۷] امام صاحب کے نزدیک ایک ذمی کا خون اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جس قدر کہ ایک مسلمان کا خون۔ عدالت کے سامنے مسلمان اور ذمی دونوں کا درجہ برابر تھا۔[۸]

---

[۱] کتاب الخراج (ابویوسف) صفحہ ۷۰۔ [۲] البیان (مولفۂ مولانا عبدالحق حقانی) صفحہ ۲۹۶۔ [۳] الفخری صفحہ ۹۹۔ تاریخ الاسلام مولفۂ عباسی صفحہ ۱۹۴۔ فتوحات عجم (الواقدی) صفحہ ۱۶۸۔ وغیرہ۔ [۴] تریان کی کتاب ایران و پارسیان صفحہ ۲۰ بھی ملاحظہ ہو۔ [۵] سیرۃ النعمان۔ [۶] سیرۃ النعمان۔ [۷] سیرۃ النعمان۔ [۸] سیرۃ النعمان۔

مجوسیوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کے متعلق مصنف الکرار جناب امیر کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت کو جب خبر ملی کہ آپ کا ایک عامل مجوسیوں پر سختی کرتا ہے تو فوراً ہی آپ نے اُسے سختی کے ساتھ ہدایت نامہ تحریر فرمایا اور تنبیہ کی کہ عموماً کل ذمیوں اور خصوصاً مجوسیوں کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کرو۔ حضرت علی نے اپنے لشکر میں بھی اعلان فرما دیا تھا کہ اگر کسی سپاہی نے ذمیوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی کی تو اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

اگر ہم کوشش کریں تو ایسے فرامین کثرت سے ملیں گے جنہیں جناب امیر نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کا حکم فرمایا تھا۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انجمن زرتشتیان بمبئی اور ایران لیگ نے چند اسی قسم کے فرامین کا مجموعہ (عہد نامے) شایع بھی کیا تھا اور جس کے متعلق مسلمانوں کے ایک ادبی ماہوار رسالہ میں تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے اُن کی اصلیت ہی سے قطعی طور پر انکار فرمایا تھا[۲]۔ ممکن ہے کہ صاحب موصوف اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہوں مگر اس حقیقت سے تو انکار کم از کم ہو نہیں سکتا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان ذمی اقوام کے ساتھ بہر طور رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور خلافت راشدہ کا زمانہ اس خصوصیت کے لئے ممتاز ہے۔ کتاب معروف فتوح البلدان میں اکثر ایسے صلحناموں اور معاہدوں کی نقلیں ہمیں ملتی ہیں جو جناب ختمی مرتبت صلعم نے اپنے اکابر صحابہ کے ذریعہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے ساتھ طے فرمایا تھا۔ ان میں رواداری کی خاص شان نمایاں ہے اسی طرح نہج البلاغہ میں جناب امیر کے اُن احکام کی نقل ملیگی جو آپ نے ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے متعلق اپنے عمال کے نام صادر فرمائے تھے۔

بہرکیف جب تک سلاطین اسلام اپنے ہادی و رہبر کے احکام پر عامل رہے ایران کی حالت اچھی رہی اور یہاں کے باشندے۔ مسلم اور غیر مسلم ہر دو خوش حالی سے بسر اوقات کرتے نظر آئے۔ عباسیوں کے عہد میں تو دربار خلافت پر ایرانی اثر غالب آچکا تھا[۳]۔ فارسی زبان گویا درباری زبان کا درجہ حاصل کئے تھی۔ قدیم ایرانی ادبیات کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا تھا[۴]۔ چنانچہ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں[۵] مترجموں کی خاصی تعداد کا ذکر لکھا ہے۔ خلیفہ منصور کے عہد میں بہت سے زرتشتی علمار قدیم ایرانی کتابیں جمع کرنے پر مقرر تھے اور مسعودی کا بیان ہے[۶] کہ اکثر مسلمان فضلار مثلاً ابن ابی الارجاع۔ یحییٰ بن زیاد۔ مطیع بن ایاس وغیرہ نے

---

[۱] معارف (اعظم گڈھ) — [۲] مقالہ نوشتۂ ابوالمحاسن محمود علی صاحب (نگار۔ مارچ ۱۹۲۶ء) اور کتاب "خلافت" (مولفہ میور) صفحہ ۴۶۵۔ ملاحظہ فرمائیے۔ — [۳] رسائل شبلی صفحہ ۲۳۔ دینیات زرتشتی (مصنفہ ڈاکٹر دھالا) صفحہ ۲۹۹ — [۴] صفحات ۲۴۴-۲۴۵ (مطبوعہ فلوگل)۔ [۵] مروج الذہب (ذکر سلطنت القاہر باللہ)

ایرانیوں کی مذہبی ادبیات کے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ بلاشبہ عباسیوں کے زمانہ میں ایرانیوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو جنگ نہاوند و قادسیہ میں اُن کے ہاتھوں سے نکل جا چکی تھیں[۱]۔ ہارون و مامون کے کل وزراء ایرانی یا ایرانی النسل تھے[۲] اور اُن میں کے اکثر مجوسی۔ شمس العلماء شبلی تحریر فرماتے ہیں کہ:۔[۳] مامون الرشید کو زرتشتی علماء سے خاص ارادت تھی۔ ایک مجوسی عالم یزداں بخت مرو سے کسی مذہبی جلسہ میں شرکت کے لئے بغداد آیا تو مامون نے خاص احترام کے ساتھ اُس کا استقبال کیا اور اپنے محل کے قریب رہنے کے لئے جگہ دی۔

ایک مشہور مسلمان عالم لکھتے ہیں کہ[۴] عباسیوں کے عہد میں اکثر مقامات پر مجوسیوں کے معبد پائے جاتے تھے اور پیروان زرتشت سے جس رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اسی امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب مامون نے حکومت کے انتظام کے لئے ایک مجلسِ مشورت قائم کی تو زرتشتیوں کو اپنا نمایندہ بھیجنے کی مخصوص ہدایت کی۔

ایران پر عربی تسلط ہو جانے کے ایک عرصہ بعد پارسیوں (مجوسیوں) کی ایک کثیر تعداد نے ہندوستان کا رُخ کیا اور یہیں آکر آباد ہو گئے۔ اس ہجرت کے کئی اسباب ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ زرتشتیوں کے لئے اُن کے آبائی وطن میں قومی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد پہلی سی بات باقی نہ رہی تھی تاہم وطن چھوڑ کر دوسرا ملک بسانے میں کچھ اور بھی مصلحتیں اُن کے پیشِ نظر تھیں۔ اُن کی تجارت پسند طبیعت نے اُنھیں مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کی پُر امن فضاء کی طرف توجہ کریں۔ ایران کی سرزمین اُن فرمانروایانِ اسلام کے ہاتھوں خانہ جنگی کا شکار ہو رہی تھی جو اپنے رسول اور اُنکی شریعت سے غافل ہو چکے تھے اور جہاں غیر مسلم اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں کی حالت تباہ تھی۔

یہ حقیقت کہ پارسیوں کی وطن سے ہجرت کے بعد بھی ایک کافی تعداد مجوسیوں کی ایران میں بدستور جاگزیں رہی[۵] اور ہندوستانی زرتشتیوں اور اُن کے ایرانی ہم مذہبوں کے درمیان دینی تعلقات برابر قائم رہے جیسا کہ سلسلۂ "روایات"[۶] سے ظاہر ہے اس امر پر کافی دلالت کرتی ہے کہ اس مہاجرت میں مسلمانوں کے مذہبی تعصب کو کم دخل تھا۔

گزشتہ صفحات میں پیغمبر ایران اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ دنیا اب بہت کچھ ترقی کر چکی ہے۔ موجودہ زمانہ تحقیق اور بلند خیالی کے لئے معروف ہے۔ مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے اب کام نہیں لیا جا سکتا۔ علمائے مغرب نے زرتشتی ادبیات کے ترجمہ و تحشیہ کے سلسلہ میں جیسی کاوشیں کیں وہ ہر طرح لائق تحسین و تشکر ہے۔ بلاشبہ اوائل میں اکثر عرب مصنفین نے بھی اس طرف توجہ ضرور کی اور جس کا مفصل پتہ ہمیں ایک روسی

---

[۱] ہند در زمنِ وسطیٰ (لین پول) وغیرہ۔ [۲] الفخری صفحہ ۲۶۵-۲۶۳۔ [۳] الکلام جلد اول صفحہ ۴۳۔ [۴] مقالہ نوشتہ مولوی حمید احمد خاں (رسالہ ہمایوں مئی ۱۹۳۶ء)۔ [۵] گنجینۂ مغاں (مولٹن) صفحہ ۱۲۳-۱۲۲۔ [۶] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۲۰۶۔

عالم کی تصنیف سے ملتا ہے[۱]۔ مگر افسوس ہے کہ مُسلم مصنفین اور مورخین کی کتابیں قومی اور مذہبی تعصبات سے پاک نہیں نظر آتیں۔ ان میں سے اکثر نے زرتشت کی تعلیم کا بالکل مخالف پہلو پیش کیا ہے۔ پھر بھی باوجود ان خامیوں کے ہم اُن کے شکرگزار ہیں کہ ایسی حالت میں جبکہ قدیم ایرانی تمدن و تہذیب سے باخبر ہونے کا ہمارے پاس سوائے شاہنامہ فردوسی کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں اِن فضلائے مشرق نے ہمیں کسی قدر حالات سے مطلع کیا۔ مغربی محققین کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اتنی ہی ہے کہ اس کی قومی روایات پر بنیاد ہے۔ لیکن ہم جب اس بے مثال مثنوی کے بیانات کا مقابلہ مسعودی، طبری، یعقوبی، حمزہ اصفہانی، دیناوری وغیرہ جیسے اہم مورخین کی مصنفات سے کرتے ہیں تو فردوسی کو کسی مقام پر تاریخی واقعات سے منحرف نہیں پاتے۔ مرحوم مولانا شبلی کے خیال میں اہل مغرب کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اُس کے غیر فطری قصص و حکایات کے سبب پست نظر آتی ہے مگر جیساکہ مولانا موصوف نے اس کی رد میں فرمایا ہے خود ہیرڈوٹس یونانی نے جسے لوگ تاریخ نویسی کا باوا آدم جانتے ہیں اپنی تصانیف میں ایسے ایسے ہزاروں یقین میں نہ آنے والے قصص و حکایات کا ذکر کیا ہے[۲]۔ حقیقت امر یہ ہے کہ فردوسی کا مقصد واقعات کو اُن کی اصلی صورت میں پیش کردینا تھا جیساکہ اُس نے اپنی مُلکی اور قومی روایات میں پایا تھا۔ چنانچہ نہ محض یہ کہ نالدیکی۔ موہول۔ براؤن وغیرہ جیسے مشہور مستشرقین نے اس بات کا اظہار کردیا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں قدیم روائتیں نہایت دیانت کے ساتھ نظم کیں بلکہ اس کی تصدیق یوں بھی ہوجاتی ہے جب کہ ہم شاہنامہ کا تقابل ادبیات پہلوی سے کرتے ہیں۔ بقول ابن الاثیر عربی ادبیات باوجود اسکے کہ لغات العرب میں کثرت اور کافی سے زیادہ وسعت ہے شاہنامہ جیسی گراں بہا اور عظیم الشان کتاب کے وجود سے خالی ہیں[۳]۔

بہرطور اب ہم دین زرتشت اور اُس کے پیرووں کے متعلق ایک نئے دور کے آغاز کا کچھ حال بیان کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں نے قومی حکومت کے استیصال کے بعد موجودہ صدی کے اوائل تک انقلابات گوناگوں کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اُن کی ایک کثیر تعداد نے وطن سے منھ موڑ کر ہندوستان کو بسایا۔ مگر اب کہ ایرانی سلطنت کی باگ ایک ایسی ہستی کے ہاتھوں میں آئی جس کے پیش نظر محض ملکی اور قومی ترقی ہے اور جسے مذہبی عصبیت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ہندوستانی پارسی (زرتشتی) اپنے آبائی وطن ایران سے تعلقات کی تجدید میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ حکومت برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان میں ان پارسیوں نے نہایت پُرامن زندگی بسر کی اور یہ ملک ایک طور پر اُن کا وطن بن گیا اُن کے دلوں میں قدیم آبائی مسکن کی یاد پھر تازہ ہورہی ہے

---

[۱] اسلامی ادبیات پر ایرانی اثر (مولفہ آئی ذوسترا مذین) مترجمہ جی۔ کے۔ فریان۔ [۲] شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۲۷۔ [۳] شعرالعجم صفحہ ۱۱

کوشش کی جارہی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ سے ایران کی خدمت کے لئے تیار ہوجائیں اور ممکن ہے کہ آیندہ یہ جماعت پھر اپنے اصلی وطن میں سکونت اختیار کرے۔ اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی کی حکومت یوں تو بالعموم کُل ایرانیوں کے لئے بلاتفریق مذہب باعث رحمت ہے مگر زرتشتیوں کے لئے مخصوص ایسے مراعات ہیں جو انھیں آج تک بعد زوالِ دولت ساسانی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ ایران کی مجلس (پارلیمنٹ) میں نہ محض یہ کہ اُن کا بھی نمایندہ موجود ہے بلکہ بڑے بڑے عہدوں پر آج متعدد مجوسی نظر آتے ہیں اور اُن کے گروہ کو ہر قسم کی دینی و دنیاوی آزادی حاصل ہے۔ یزد و کرمان میں جہاں ان کی کثرت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران و ہندوستان کے زرتشتی سرمایہ سے، مدرسے، یتیم خانے، مریض خانے، مسافر خانے کثیر تعداد میں موجود ہیں اور روز بروز اُن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کی جانب سے جو کدورت تھی اُس میں نمایاں کمی نظر آتی ہے اور خود مسلمان اُن کی دلجوئی میں پیش پیش دکھلائی دیتے ہیں۔

محمد طاہر رضوی ام۔اے

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بےضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے، جلد پر دانے پڑکر زخم کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کرجاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہوجاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے ــــ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوسکتی ــ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر اُن کی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا ــ قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹/ ــ ایک شیشی میں محصول ۶/ صرف ہوجاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا ــ ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ــــ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے ــــ

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنؤ

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

دوسرا ایکٹ۔ پہلا منظر

یکم مارچ ۱۸۵۴ء بوقت سہ پہر گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ کے جنوبی حصہ میں گورنر جنرل کی اگزکٹو کونسل کا اجلاس ہو رہا ہے۔ جس میں گورنر جنرل اور چار معمولی ممبر موجود ہیں۔ کمرہ وسیع، مربع اور بلند ہے۔ پچھلی دیوار میں دو بلند کھڑکیاں ہیں جن سے خانہ باغ نظر آرہا ہے۔ ایک لمبا پنکھا ہاتھ سے کھینچنے والا لٹکا ہوا ہے۔ جس کے نیچے ایک ہلالی میز بچھی ہوئی ہے۔ میز کے پیچھے ایک سُرخ کرسی کسی قدر بلند رکھی ہوئی ہے۔ میز کے داہنے اور بائیں تین تین کرسیاں اور ہیں۔ کمرہ مختلف قسم کے سامان سے آراستہ ہے۔ بلند کرسی کے سامنے وارن ہیسٹنگز کی قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ ہر کرسی کے سامنے بڑی بڑی دواتیں، کاغذ اور پر کے قلم سجے ہوئے ہیں۔ اونچی کرسی لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کی ہے۔ اس کے داہنی طرف گورنمنٹ سکریٹری مسٹر جے۔ پی۔ گرانٹ کی نشست ہے جس کے آگے سرکاری کاغذات کا ڈھیر ہے۔ بائیں طرف کونسل کے سینیئر ممبر مسٹر جے۔ اے ڈورین کی نشست ہے اور اس کی بائیں ہاتھ مسٹر ہالیڈے ممبر کونسل کی کُرسی ہے۔ سکریٹری کے داہنی طرف کرنل جان لو کی کُرسی ہے۔ یہ اینگلو انڈین وضع کے ایک شگفتہ مزاج اور تنومند انسان ہیں۔ اور دیگر انگریزوں سے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں کیونکہ اگرچہ ان کا لباس صحیح انگریزی قطع کا ہے لیکن دیسی کپڑے کا اور یہیں کا سلا ہوا ہے۔ کالر کے بجائے ان کے گلے میں ہندوستانی ریشم کا گلوبند ہے۔ عمر اگرچہ ساٹھ سال کی ہے لیکن کاٹھی اچھی ہے۔ دوسرے انگریز گلمچھے رکھے ہوئے ہیں مگر کرنل صاحب کی داڑھی مونچھ صاف ہے۔ چھوٹا سا چاندی کا حقہ ہاتھ میں ہے اور وہ باتیں کرتے

کرتے کش لگاتے رہتے ہیں۔ لارڈ ڈلہوزی، پستہ قد، نازک اندام مگر نستعلیق وضع کا آدمی ہے۔
چہرہ سے متانت اور امارت برستی ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو مسٹرز ڈورین، ہالیڈے اور گرانٹ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور گپ شپ کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر گرانٹ سرکاری کاغذات کا بھی مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ پنکھا بند ہے۔

ڈورین :۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج پھر مسٹر لو (Low) اپنے آپ کو بیوقوف ثابت نہیں کریں گے۔ میں نے انھیں سمجھا دیا ہے کہ ہز اکسلنسی گورنر جنرل برہما سے نہایت خستہ و پریشان واپس آئے ہیں۔ اور وہ لغو باتیں سننا پسند نہیں کریں گے۔

ہالیڈے :۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ لو کے دل میں کیا سمائی ہے کہ وہ ہمیشہ گورنر جنرل سے جھگڑا کرتا رہتا ہے، میں انھیں ہمیشہ سمجھاتا رہتا ہوں کہ جو بات لارڈ ڈلہوزی کے دل میں سما جاتی ہے وہ اس کو پورا کر کے رہتے ہیں، اسلئے اس معاملہ میں ان کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ مجھ سے زیادہ لارڈ ڈلہوزی کو اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں کہ ہمیشہ اپنے دل کی بات کرتے ہیں اور اب جبکہ جدید قانون کے ذریعہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے کونسلروں کی نہ مانے، تو وہ اپنے دل کی بات آئینی طور پر بھی پوری کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کمبخت تو کچھ دیکھتا ہی نہیں، وہی پرانا راگ الاپے جاتا ہے کہ لارڈ ایلنبرا اور لارڈ ہٹنگ نے یہ کہا تھا اور لارڈ منرو اور لارڈ انفنسٹن نے یہ کیا، بھلا یہ کونسی عقل کی باتیں ہیں۔

ڈورین :۔ مسٹر گرانٹ! اب مسٹر لو کی پنشن میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟ اگر وہ موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہیں تو کیوں اپنی پنشن کے کاغذات پیش نہیں کر دیتے۔

گرانٹ :۔ فوجی پنشن تو ان کو فوراً مل سکتی ہے کیونکہ اب ان کی عمر ساٹھ برس کی ہو گئی ہے۔ رہا معاملہ سول پنشن کا تو جتنے سال وہ محکمہ سول میں کام کریں گے اسی نسبت سے انھیں پنشن کا استحقاق ہو گا۔

ڈورین :۔ اچھا اگر آج بھی انھوں نے حسب معمول وہی باتیں کیں تو میں ان سے بھری کونسل میں صاف صاف کہدوں گا کہ اگر آپ گورنمنٹ کی پالسی سے موافق نہیں ہیں تو مستعفی ہو جائیے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر پوری کونسل نے میری تائید نہ بھی کی تو لارڈ ڈلہوزی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ علاوہ ازیں مجھے کرنل لو کی یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ جب کبھی اختلاف ہوتا ہے تو وہ اپنے اور گورنر جنرل کے درمیان مجھے حکم قرار دیتے ہیں۔ میں علٰحدگی میں کرنل سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ لارڈ ڈلہوزی جیسے ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرا کر میں انگلستان میں اپنا مستقبل خراب کرنا نہیں چاہتا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

ہالیڈے :۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گورنر جنرل پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کا ہمارے لئے موقعہ ہی نہیں۔ وہ اپنی کونسل کو

ایسا سمجھتے ہیں گویا وہ ان کے فیصلوں پر صاد کرنے کی ایک مشین ہے۔ وہ ہماری رائے کو ٹھکرا سکتے ہیں اور فی الحقیقت وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ پھر جو تدابیر بہرصورت کی جانے والی ہیں یا جو کارروائیاں کسی نہ کسی طرح ہونے والی ہیں ان کی مخالفت کرنا کونسی دانشمندی ہے؟

ڈورین :۔ (گھڑی دیکھ کر)۔ اب کام شروع ہونا چاہئے تھا۔ ہزاکسلنسی نے کتنی دیر کے بعد آنے کو فرمایا تھا؟

گرانٹ :۔ (گھڑی دیکھ کر)۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ جونہی ڈاکٹری معائنہ ختم ہو جائے گا وہ فوراً چلے آئیں گے۔ ڈاکٹر صاحبان ہزاکسلنسی کی صحت کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ انھیں یہاں زیادہ دیر تک رہنے کی اجازت نہ دیں گے۔ یہی باعث ہے کہ اس طویل ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت ہوئی

ڈورین :۔ اور کرنل تو ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ انھیں تو یہاں وقت پر پہونچ جانا چاہئے تھا۔

گرانٹ :۔ (طنزیہ لہجہ میں)۔ وہ برابر کے ایک کمرہ میں جھانسی کی رانی سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جونہی وہ یہ خبر سنیں گے کہ گورنر جنرل ایوان کونسل میں آرہے ہیں، وہ بھی یہاں چلے آئیں گے۔

ڈورین وہالیڈے :۔ (تعجب سے)۔ جھانسی کی رانی!

ڈورین :۔ (تحکمانہ لہجہ میں)۔ اور مسٹر گرانٹ! وہ یہاں کس کے حکم سے آئی!

ہالیڈے :۔ کیا ہزاکسلنسی نے حکم دیا تھا کہ آج وہ یہاں موجود رہے؟

گرانٹ :۔ حضرات! اس بارہ میں مجھ سے کچھ نہ دریافت کیجئے۔ کیونکہ آپ کی طرح مجھے بھی اس معاملہ سے کوئی آگاہی نہیں۔ میں اس معاملہ میں آپ کو صرف اس قدر بتا سکتا ہوں کہ جب اس جلسہ میں حاضر ہونے کے لئے میں اپنے دفتر سے چلنے لگا تو میرے پاس ایک رقعہ پہونچا جس میں لکھا تھا کہ جھانسی کی رانی کو آج یہاں لانے کی ذمہ داری کرنل تو اپنے سر لے رہے ہیں کہ شاید آخری فیصلہ کرنے سے پیشتر گورنر جنرل باکونسل جھانسی راج کے بارہ میں کوئی بات چیت کرنا چاہے۔ جب میں گورنمنٹ ہاؤس پہونچا تو معلوم ہوا کہ جھانسی کی رانی آچکی ہے اور برابر کے ایک کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کرنل تو نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ انھوں نے فوجی معتمد سے کہدیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی نقل وحرکت سے اطلاع دیتے رہیں تاکہ اُن کے آنے سے قبل وہ ایوان کونسل میں آجائیں گے۔

ہالیڈے :۔ (دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر) اب تو معاملات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہزاکسلنسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پیچھے لگانے کے لئے ایک عورت کو خفیہ طور پر گورنمنٹ ہاؤس میں لایا گیا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟ (سر اٹھا کر اور بگڑ کر)۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بے غیرت تو گردن مارے جانے کے قابل ہے، اچھا دیکھو میں بھی کیا مزہ چکھاتا ہوں۔

ہالیڈے :۔ (غصہ سے)۔ ایسی گستاخی تو کبھی دیکھی نہ سُنی، کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ بالکل یہی حال تو کا ہے، یقیناً اس کی قضا آئی ہے۔

عین اسی وقت کمرہ کے داہنی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے اور کرنل جان تو مسکراتے ہوئے اور ہاتھ میں حقہ لئے داخل ہوتے ہیں اور ڈورین اور ہالیڈے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بعد ازاں اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے۔

لو:- کیوں کیا معاملہ ہے!! آج تو تم لوگ بہت پھولے ہوئے سے نظر آتے ہو۔ صورتوں پر متانت کی پھٹکار برس رہی ہے ہونھ! خدا کا شکر ہے کہ میرے اجداد میں بعض آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ اور اسی لئے یہ بات مجھے معلوم ہے کہ جب امور سلطنت انجام دینا ہوں تو ماتم زدہ بنکر نہ بیٹھنا چاہئے، ہندوستان کو ان لوگوں نے حاصل کیا ہے جو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ہنستے بولتے اور شگفتہ مزاج رہتے تھے۔ لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ جب تک اعلیٰ حکام کوٹ پتلون سے سجے ہوئے نہ ہوں اور تحصیل کے خزانچیوں کی طرح روکھا منھ بنائے نہ رہیں اسوقت تک داد جہانبانی دی ہی نہیں جا سکتی۔

کرنل صاحب اپنی نشست تک پہونچتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر گردن سینہ پر جھکا لیتے ہیں۔ اور سامنے کی طرف ٹانگیں پھیلا کر خود بخود کچھ بکتے رہتے ہیں۔ دوسرے حاضرین ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

لو:- (آپ ہی آپ) اُفوہ، کسقدر انقلاب ہو گیا ہے۔ جو صورت ڈورین نے آج بنا رکھی ہے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو آج سے بیس برس پہلے مادر زاد دریائے ہگلی میں کود پڑا تھا اور بارکپور سے کلکتہ تک تیرتا ہوا آیا تھا۔ جسے نہ ڈوبنے کا ڈر تھا نہ مگرمچھ کا خطرہ۔ اور یہ سب کچھ محض معمولی شرط کی وجہ سے کیا تھا۔ جب یہ شخص پرنسپ گھاٹ پر پہونچا تو لیڈیاں جمع تھیں، بینڈ بج رہا تھا اور یہ اپنی شرط کی رقم وصول کر رہا تھا۔ اور ذرا ان کا! مسٹر ہالیڈے کا حلیہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ وہی ہیں جو جنرل گف کے ساتھ سکھوں سے لڑے، جن کی شجاعت و بسالت کی داستانیں مراسلات میں بیان ہوئیں، اور آج یہ ایسے مرزا پھویا بنے بیٹھے ہیں کہ انھیں گورنمنٹ ہاؤس میں آواز بلند کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

ہالیڈے:- ہاں تو! سچ کہتے ہو۔

ہالیڈے بےچینی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھ کر کچھ جواب دینا چاہتا ہے۔ لیکن کرنل لو اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

لو:- (سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے)۔ اور تو اور ذرا مسٹر گرانٹ کو دیکھئے جو بڑی آزادانہ رائے والے سمجھے جاتے تھے!! یہ وہی ہیں جو الفنسٹن کے ماتحت تمام نوجوانوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھے۔ یہ وہی ہیں جنھیں اس لئے کلکتہ لایا گیا تھا کہ یہ ہمیں حکومت چلانے کے طریقے سکھائیں گے۔ مگر اُف رے انقلاب، کس کو یقین آسکتا ہے کہ جو شخص بمبئی کے گورنر کا دست راست تھا آج وہ سر کنسلٹی لارڈ ڈلہوزی کے دفتر کا صرف کلرک اور بوٹ صاف کرنیوالا

بن گیا ہے۔ ہائے ہائے!

ہالیڈے :۔ (غضبناک ہوکر)۔ سنئے جناب! میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے یہ مسخرہ پن پسند نہیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ جھانسی کی رانی کو یہاں لاکر آپ نے آج جس چھچھورے پن کا اظہار کیا ہے اس پر آپ کے مسخرہ پن سے پردہ پڑ جائے گا تو آپ سخت غلطی پر ہیں۔ آنے دیجئے ہز اکسلنسی کو یہاں میں فوراً کہہ دوں گا کہ ایک عورت یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں اس طرح لائی گئی ہے۔

لمحہ بھر سکوت۔ لو اپنے پاؤں سمیٹ لیتا ہے۔ اور ایک خاص شان کے ساتھ حقہ لئے ہوئے اُٹھتا ہے۔ اور ہالیڈے کے سامنے پوری طرح اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور تیز و تند نگاہوں سے دیکھتا ہوا کہتا ہے۔

لو :۔ سنو ہالیڈے! آج تک کسی شخص نے جان لو پر چھچھورے پن یا بزدلی کا الزام نہیں لگایا کہ اسے اس کا مزانہ چکھا دیا گیا ہو۔ یا تو تم اپنے الفاظ فوراً واپس لو ورنہ کونسل کے بعد تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ڈورین :۔ کرنل صاحب! یہ آپکی تمام اکڑفوں بیکار ہے، بات کرنا ہے تو آدمیت سے کیجئے، ہالیڈے یا اس کمرہ میں کوئی اور شخص آپ کی شجاعت اور دلیری پر حرف لانا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ کی صحیح الدماغی پر واقعی ہم سب کو شک ہے۔

لو :۔ میری صحیح الدماغی کا امتحان تو بعد میں ہوتا رہیگا لیکن فی الحال معاملہ عزت و خودداری کا ہے اس لئے یا تو ہالیڈے صاحب اپنے الفاظ واپس لیں یا کونسل کے اجلاس کے بعد مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔

ہالیڈے :۔ (جلکر)۔ کرنل صاحب اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ کا یہ خیال کر لینا کہ مجھے آپ کی شجاعت و بسالت میں شک ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ابھی تک مجھ سے واقف نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں دلیری کا مادہ کسیقدر کم ہوتا تو بہتر تھا۔ گورنر جنرل کے علم یا اجازت کے بغیر رانی صاحب کو یہاں لانے سے پیشتر آپ کو اس معاملہ پر کافی غور کر لینا لازم تھا اور اب آپ نے ہماری جان نہایت سخت جھگڑے میں پھنسا دی ہے۔ آپ کی حماقت کے باعث ہم سب مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔

لو :۔ (کھڑے ہوئے اور ہالیڈے کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہالیڈے! ہم دونوں تقریباً تیس برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس عرصہ میں کیا آپ ایک واقعہ بھی ایسا بیان کر سکتے ہیں جس میں جان لو ——— نے اپنے فعل کی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر رکھی ہو۔

عین اس وقت میز کے پیچھے کا دروازہ کھولکر گورنر جنرل کا فوجی سکریٹری داخل ہوتا ہے اور دروازہ کو ایک ہاتھ سے کھلا رکھ کر اعلان کرتا ہے کہ :۔ حضرات! نگاہ روبرو!! ہز ایکسلنسی گورنر

جنرل ایوان کونسل میں تشریف لا رہے ہیں۔ سنتے ہی ڈورین، ہالیڈے اور گرانٹ مودب استادہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب لارڈ ڈلہوزی کمرہ میں داخل ہوتے ہیں تو سب جھک کر بادب سلام کرتے ہیں۔ لاٹ صاحب میز کے اطراف میں ایک سرسری نگاہ ڈال کر اپنی بلند کرسی کے کے قریب پہونچکر پہلے سر جھکاتے ہیں بعد ازاں منھ اٹھاکر فرماتے ہیں:۔ "میں اگزکٹو کونسل کے افتتاح کا حکم دیتا ہوں"۔ یہ کہکر وہ اپنی کرسی پر متمکن ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی دیگر ارکان کونسل بھی بیٹھتے ہیں۔ لاٹ صاحب کے ہاتھ میں اب بھی حقہ موجود ہے اگرچہ کش بند ہیں اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ گرانٹ کھڑے ہو کر بعض کاغذات لاٹ صاحب کے ملاحظہ سے گزارتا ہے۔

ڈلہوزی:۔ حضرات! آج ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم معاملہ جھانسی راج کا ہے۔ اگر آپ صاحبان پسند کریں تو سب سے پہلے اسی معاملہ پر غور کر لیا جائے۔

(گرانٹ کے سوائے سب ممبر بہت اچھا! کہہ کر منظور کرتے ہیں)

ڈلہوزی:۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ جھانسی والا معاملہ گزشتہ دسمبر میں بھی کونسل کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اور چونکہ میں اسوقت برہما گیا ہوا تھا اس لئے اسوقت اس معاملہ میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

ڈورین:۔ یور اکسلنسی! بالکل درست ہے۔ چونکہ یہ معاملہ گورنر جنرل کی خاص ذمہ داری کا ہے اس لئے ہم نے یہ معاملہ یور اکسلنسی کی واپسی تک ملتوی کر دیا تھا اور ہدایات جاری کر دی تھیں کہ ہتبنیت کے معاملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ (ڈلہوزی سنکر ڈورین کی طرف سر ہلاتا ہے)۔ مجھے یقین ہے کہ وہ احکام میجر مالکم کے پاس ارسال کر دئے گئے تھے اور ان کے مطابق عمل کیا گیا۔

(گرانٹ کی طرف متوجہ ہو کر) کیوں مسٹر گرانٹ یہی ہے نا؟

گرانٹ:۔ ہاں حضور اس معاملہ میں ابھی اسیقدر ہوا ہے۔ اگرچہ مقامی افسران متبنیٰ ولیعہد کی ہتبنیت کے تسلیم کئے جانیکے موافق نظر آتے ہیں لیکن ہم نے ابھی اس بارہ میں کوئی آخری حکم نہیں دیا۔

ڈلہوزی:۔ (پہلے کاغذات اور پھر گرانٹ کی طرف دیکھ کر)۔ اچھا تو مسٹر گرانٹ اس معاملہ کے متعلق تمام ضروری باتیں مختصراً بیان فرمائیے۔ مجھے امید ہے کہ آپ نے اس معاملہ کے متعلق تمام باتوں کا خلاصہ تیار کر لیا ہوگا۔

گرانٹ:۔ یقیناً مائی لارڈ! (ڈلہوزی سے کاغذات لیکر کھولتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے) اس معاملہ کے متعلق تمام غور طلب اور ضروری امور یہ ہیں:۔ اول یہ کہ جھانسی راج ہمیشہ آزاد اور خود مختار رہا ہے۔ اور مرہٹوں کی حکومت کے زمانہ میں جو تعلقات جھانسی کے راجہ سے مرہٹوں کے تھے وہی اب ہمارے ہیں۔ چنانچہ اب اس بارہ میں کوئی سوال

باقی نہیں رہا کہ اگر متوفی راجہ کا کوئی براہ راست وارث نہ ہو تو اس کا فیصلہ کرنا کہ تخت و تاج کا آیندہ مالک کون ہوگا، طاقت بالادست کے اختیار میں ہے۔ مرہٹے اپنے اس اختیار پر ہمیشہ مُصر رہتے تھے، چنانچہ اب وہی حق و اختیار ان کے بجائے ہم کو حاصل ہے۔ اب اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کو اختیار حاصل ہے یا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اب تقاضائے مصلحت کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں دوسرا نکتہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ اس سے قبل جھانسی کے تخت و تاج کی ملکیت پر دو مرتبہ جھگڑا ہو چکا ہے۔ اور دونوں مرتبہ جس راجہ کو ہم نے تسلیم کیا وہ کامیاب نہیں ہوا۔ آخری مرتبہ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ حوالہ کرنے سے پہلے جھانسی راج پر چند سال تک اپنی نگرانی رکھی جائے۔ لیکن بعد کے واقعات سے ہماری یہ تولیت والی پالسی بھی ٹھیک نہ رہی اگرچہ اس وقت کا راجہ یعنی گنگا دھر راؤ اپنی رعایا میں بیشک ہردلعزیز تھا۔ ان واقعات کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جھانسی کی صوبہ داری کو جو بعد میں ریاست کے درجہ پر پہنچ گئی ہم نے کیونکر تسلیم کیا۔ جھانسی راج سے ہمارا سب سے پہلا معاملہ اس وقت کے راجہ شیو راؤ بھاؤ کے اور ہمارے ذاتی تعلقات پر مبنی تھا۔ اور ان دونوں معاہدوں میں جو ہم نے شیو راؤ بھاؤ اور اس کے بیٹے رامچندر راؤ سے کئے ہیں انھیں ذاتی تعلقات پر زور دیا گیا ہے۔ اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ شیو راؤ بھاؤ اور رامچندر راؤ کی نسل کا براہ راست وارث تخت و تاج راجہ گنگا دھر راؤ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اب ان راجاؤں کی نسل کا جن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر پچاس سال سے جھانسی راج پر ہماری بیاورت قائم ہے۔ کوئی براہ راست دعویدار نہیں رہا۔ اور یہ متبنیٰ لڑکا انند کمار جس کے لئے رانی لکشمی بائی نے بہت زور شور کے ساتھ دعویٰ پیش کیا ہے، آنجہانی راجہ سے دور کے رشتہ کا تعلق رکھتا ہے۔

(گرانٹ مزید معلومات کے لئے اپنے کاغذات دیکھنے لگتا ہے۔ اور ڈورین جو موقعہ کی تاک میں تھا کہتا ہے)

ڈورین:۔ اس معاملہ کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی اس ریاست کا نظم و نسق راجہ کے ہاتھ میں رہا آمدنی گھٹتی چلی گئی اور جس زمانہ میں ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں آیا تو آمدنی بڑھ گئی اور ریاست کی مالی حالت ترقی کر گئی۔ کیوں ہے نا مسٹر گرانٹ؟

گرانٹ:۔ ہاں عام طور پر تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

لو:۔ (جلدی دخل دیکر) لیکن آمدنی کی ترقی کس طرح ہوئی۔ اسی طرح نا کہ ریاست کے سر استمراری بند و بست منڈھ دیا گیا اور جو خانہ خراب کسان رقوم واجب الادا نہ داخل کر سکے انھیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

ڈلہوزی:۔ آرڈر! آرڈر!! کرنل صاحب آرڈر!!! ازراہ مہربانی اپنے الفاظ وہیں تک محدود رکھئے جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے۔ (گرانٹ سے) آنجہانی راجہ کو عنان حکومت سپرد کرنے سے پہلے ہم نے ریاست کا

انتظام کتنے عرصہ تک کیا تھا؟

گرانٹ :- مائی لارڈ! تقریباً چھ سال تک - اور اس دوران میں ریاست کی آمدنی بہت کچھ بڑھ گئی تھی اور تمام نظم ونسق کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی -

ڈلہوزی :- متوفی راجہ کے عہد کی ابتدا ہی میں ایسے کیا وجوہ پیش آئے کہ ریاست کا انتظام ہم نے اپنے ہاتھ میں رہنے دیا تھا؟

گرانٹ :- مائی لارڈ! راجہ گنگا دھر راؤ کے باقاعدہ راجہ تسلیم کیے جانے سے پیشتر ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں تھا - کیونکہ سابق راجہ کی وفات کے بعد وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا - ایسی حالت میں یہ قدرتی امر تھا کہ ہم اس بات کا اطمینان کر لیتے کہ ہونے والا راجہ ریاست کے قابل بھی ہے یا نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ متوفی راجہ کے زمانہ میں ریاست کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی - تفتیش وتحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ راجہ گنگا دھر راؤ ایک کمزور عقل ودماغ کا آدمی ہے، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جب تک اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ حوالگی راج کے بعد ریاست کا انتظام خراب نہیں ہوگا، ریاست کا نظم ونسق اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جائے - مگر ۱۸۴۲ء میں ہم اس نتیجہ تک پہونچے کہ اگر ریاست کی حکومت راجہ کے ہاتھ میں دیدی جائے تو کوئی نقصان نہ ہوگا

لو :- (گرانٹ سے) اور غالباً یہ بھی تو صحیح ہے کہ گنگا دھر راؤ کو ریاست دینے سے پہلے ہم نے ریاست کا ایک وسیع اور زرخیز علاقہ اس بہانہ سے غصب کر لیا تھا کہ یہ علاقہ ان مصارف کا معاوضہ ہے جو ہم بندیلکھنڈ رجمنٹ پر کرتے ہیں؟

بالیڈے :- بندیلکھنڈ کی فوج اسی غرض سے وجود میں لائی گئی تھی کہ جھانسی جیسی ریاستوں کا تحفظ کیا جائے -

لو :- (راجگان و دوسروں کی طرف دیکھتا ہے) - بالکل صحیح! میں اس پر اعتراض نہیں کرتا کہ جو رجواڑے اس فوج سے فائدہ اٹھاتے ہیں ان سے معاوضہ لینے کا ہم کو حق حاصل ہے - لیکن کیا تمام رجواڑے اور نواب یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ جو خدمات جلیلہ اس فوج نے انجام دی ہیں ان کا بدل بصورت نقد کس نے مقرر کیا ہے؟ کیا متوفی راجہ جھانسی سے بھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ضعیف عقل وفہم کا آدمی تھا تعین معاوضہ کے بارہ میں مشورہ لیا گیا تھا؟ علاوہ ازیں جو علاقہ فوجی خدمات کے عوض ہم کو حوالہ کیا جانے والا تھا کیا اسکا انتخاب خود راجہ گنگا دھر راؤ نے کیا تھا؟

ڈلہوزی :- آرڈر! آرڈر!! کرنل لو آرڈر!!! آپ کے پیشرو اور ان کے رفقاء کار جو کچھ کر گئے ہیں اس پر نکتہ چینی کرنے میں آپ اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں - جو مسئلہ اس وقت ہمارے زیر غور ہے اُس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں - اور میں اس قسم کے سوال اُٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا -

لو :- (جوش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے) - مائی لارڈ! میں التجا کرتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ ضبط تحریر میں لائے جائیں

کہ بعض ہندوستانی والیان ریاست کے معاملہ میں میں اپنے پیشرووں کے عمل پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کی نسبت یور اکسلنسی نے گیا گزرا زمانہ ارشاد فرمایا ہے وہ پھر واپس آ کر ہم کو پریشان کرنے لگے۔

ڈلہوزی:۔ (سختی سے)۔ کرنل صاحب! یہ آپ کس طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

لو:۔ (آہستہ اور سنجیدگی سے)۔ مائی لارڈ! میرا مقصد یہ ہے کہ دیسی رجواڑوں کا جسقدر اعتماد ہم کو حاصل ہوگا، اُسیقدر مضبوطی سے ہم اپنے علاقہ پر قابض رہیں گے۔

(ڈلہوزی اپنی کرسی سے اُٹھ کر اِدھر اُدھر بیقراری کے ساتھ ٹہلنے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد دفعتہً کرنل لو کے پاس رک کر تیز الفاظ میں خطاب کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ کرنل لو میں آپ کے خیالات و جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ کی زمانہ شناسی پر آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتا۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ارادے خواہ کچھ ہوں لیکن اس ملک میں ہماری موجودگی سے نئی نئی قوتیں وجود میں آرہی ہیں؟ ہمارے اغراض و مقاصد خواہ کچھ ہوں لیکن ہم ملک میں نئے نئے معیار قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ دولت مغلیہ کو محض اسی وجہ سے زوال ہوا کہ وہ اقتضاء زمانہ کو پورا نہ کر سکی۔ مغل فرمانرواؤں میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ دورِ جدید کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ اور بڑھتی ہوئی ضروریات کو دیکھ کر ویسا ہی طریقہ خود بھی اختیار کریں۔ کرنل صاحب ہم اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب ماضی کا خیال کم اور مستقبل کی فکر زیادہ کریں۔ (کرنل کی کرسی کے قریب آ کر) یہ چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن سے آپ اسقدر دلدادہ ہیں، یہ کیا ہیں؟ یہ سب بدانتظامی اور خودغرضی کے مرکز ہیں۔ (اپنی کرسی پر بیٹھ کر) زمانہ چلا چلا کر حسن نظام، باقاعدگی، اشتراک عمل، تعلیم، مستعدی اور عمدہ ذرائع نقل و حمل کا تقاضا کر رہا ہے، اور تاوقتیکہ ہم ایک ترقی پذیر حکومت کے یہ عناصر اس ملک میں پیدا نہ کر دیں گے، ہماری حکومت بھی اس ملک میں اتنی ہی مختصر ہوگی جتنی کہ مغلوں کی ہوئی۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ رعایا کی فلاح و بہبود رہے گا۔ خواہ اس میں مجھے کامیابی ہو یا شکست۔ (سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھ کر) اچھا اب کام کا سلسلہ جاری ہونا چاہئے۔

ڈورین:۔ یور اکسلنسی، میں نے جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا ہے۔ میرے نزدیک وہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو مجلس ڈائرکٹران نے ریاست ستارہ کے متعلق قائم کیا ہے اور جس پر ہم حال ہی میں ناگپور کے بھونسلا خاندان کے متعلق عمل کر چکے ہیں۔ ہمیں جھانسی راج کا الحاق کر لینا چاہئے۔ اور ایسا کرنے کا ہمیں کامل حق ہے۔ رانی کو ایک معقول پنشن دیدی جائے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی تمام جائز ضروریات اور خواہشات پوری کر سکے۔

ڈلہوزی :۔ آپ کا شکریہ مسٹر ڈورین! آپ کی رائے میری رائے سے بالکل متفق ہے۔ (پہلے ہالیڈے پھر لو کی طرف دیکھ کر) کیا کونسل کے دیگر ممبر صاحبان بھی اس معاملہ میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہالیڈے :۔ میں مسٹر ڈورین اور یور اکسلنسی کی رائے سے قطعی متفق ہوں۔

(سب کے سب کرنل لو کی طرف دیکھتے ہیں جو کسی خیال میں محو ہے)

ڈلہوزی :۔ اچھا تو کرنل صاحب اگر آپ کچھ نہیں فرمائیںگے تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ آپ بھی ہم لوگوں سے متفق الرائے ہیں اس صورت میں مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ اپنا یہ متفقہ فیصلہ ضبط تحریر میں لے آؤں کہ جھانسی راج کا الحاق کیا ہونا چاہئے۔ بعد ازاں میں اس کے متعلق پورے وجوہ قلمبند کر کے ڈائرکٹروں کی خدمت میں ایک سفارشنامہ ارسال کر دوں گا۔ اور بھیجے جانے سے قبل اس سفارشنامہ کا مسودہ مسٹر گرانٹ آپ لوگوں کے معائنہ کے لئے بھیجدیں گے۔

لو :۔ (ڈلہوزی کی طرف دیکھ کر) یور اکسلنسی نے رعایا کی فلاح و بہبود کی نسبت جو کچھ فرمایا تھا میں اس وقت اسی پر غور کر رہا تھا۔ اور اسوقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ الحاق جھانسی سے قبل ریاست کی رعایا سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ ہمارے ماتحت رہنا زیادہ پسند کریں گے یا رانی اور اس کے متبنیٰ بیٹے کے ماتحت۔

ڈلہوزی :۔ (غضبناک ہو کر کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کرنل لو میں آپ سے آخری مرتبہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی مداخلت سے باز آئیے، ورنہ مجھے اپنا یہ تکلیف دہ فرض ادا کرنا پڑے گا کہ میں آپ کی شکایت ڈائرکٹروں سے کر دوں۔

لو :۔ (آہستہ اُٹھکر آداب بجالاتا ہے) اگر یور اکسلنسی کا مقصد یہ ہے کہ کونسل کی ممبری سے میرا استعفا طلب کیا جائے گا تو میں یہ نہیں چاہتا کہ یور لارڈشپ اسقدر زحمت گوارا فرمائیں۔ یہ دیکھئے یہ میرے کاغذات تیار ہیں (کوٹ کے اندر سینہ کی جیب سے سربمہر لفافہ نکال کر ڈلہوزی کو دکھاتا ہے) اور میں یہ کاغذات ہز اکسلنسی کے حوالہ کرنے کو طیار رہوں مگر ایک شرط سے۔

ڈلہوزی :۔ (حیران ہو کر کبھی لو کی طرف دیکھتا ہے کبھی دوسروں کی طرف) کرنل صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

لو :۔ (اپنی کرسی سے ہٹ کر اور گرانٹ کے پیچھے آکر) یور اکسلنسی کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس برس ہندوستان پر قربان کئے ہیں اور اگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اسوقت ہندوستان کی عنان حکومت ہے یہ سمجھتے ہیں کہ اب میں بیکار اور دقیانوسی ہو گیا ہوں تو میں مردانہ وار ملازمت سے دستبردار ہونے پر

آمادہ ہوں۔ بہرحال اگر یور اکسلنسی چاہتے ہیں کہ اب میں چلا جاؤں تو میں یور لارڈشپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس طرح جانے کی اجازت دی جائے جو میری عزت کے شایان شان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں شرط پیش کرتا ہوں۔

(لمحہ بھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ سب آؤ کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور آؤ ڈلہوزی کے اشارہ کا منتظر ہے۔ ڈلہوزی ہٹکر ایک کھڑکی کے پاس ہو کر باہر کی طرف جھانکنے لگتا ہے۔ تو اس کے پیچھے جاتا ہے۔ اور پہلے آہستہ پھر تیزی سے گفتگو کرتا ہے)

لو:۔ یور اکسلنسی بالکل شام میرے پاس ایک نوجوان افسر آیا جس کے والدین میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ یہ نوجوان پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ میں نے ہی اس کو تربیت دی ہے۔ اور اس کے کاموں کو فخر کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ یہ نوجوان افسر میجر ایلیس ہے جو بند یلکھنڈ میں تعینات ہے اور معاملات جھانسی کا انچارج ہے وہ اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالکر کلکتہ آیا ہے تاکہ مجھ سے سفارش کرے کہ جس طرح ممکن ہو جھانسی راج رانی اور متبنیٰ راجکمار کے حوالہ کر دیا جائے اور چونکہ رانی اور متبنیٰ لڑکا پہلے سے کلکتہ میں ہیں اس لئے وہ انھیں کل رات مجھ سے ملانے لایا۔ اس نوجوان افسر کا خیال ہے کہ اگر ہم نے کمار کی تبنیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جھانسی راج کا الحاق کر لیا تو بہت سخت غلطی ہوگی۔ وہ اس بات کا پختہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ شیو راؤ بھاؤ کے زمانہ سے آج تک جھانسی کے تمام راجہ ہمارے وفادار رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ قریب کی ایک ریاست اور چھا کی نظیر بھی پیش کرتا ہے جہاں کے متبنیٰ ولیعہد کو ہم نے چند سال ہوئے ایسے ہی حالات میں تسلیم کیا ہے جیسے کہ اسوقت جھانسی میں رونما ہوئے ہیں۔ میں یور اکسلنسی سے بیان نہیں کر سکتا کہ میجر ایلیس کی پرزور اپیل کا میرے دل پر کس قدر اثر ہوا ہے اور چلتے وقت جب وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا تو اس نے ایسے الفاظ کہے کہ اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ:۔ "اگر تبنیت کے معاملہ میں ہم نے وفادار راجاؤں کے حسیات مذہبی کو پامال کر کے ان کا اعتبار کھو دیا تو ایسا سخت طوفان برپا ہوگا کہ اس سے نجات مشکل ہوگی۔

ڈلہوزی:۔ (کسی قدر متوجہ ہو کر گر پشت پھیرے ہوئے)۔ آپ کی خاص درخواست کیا ہے۔ کرنل صاحب!

لو:۔ (اور قریب بڑھ کر) یور اکسلنسی! میں یہ چاہتا ہوں کہ تبنیت کے معاملہ میں حضور کا فیصلہ جو کچھ ہو لیکن کم ازکم ایک مرتبہ رانی سے مل لیجئے، تاکہ اس کو کم ازکم یہ اطمینان تو ہو جائے کہ جو مصیبت اس پر نازل ہونے والی ہے اس کے رفع کرنے میں وہ ہر ممکن کوشش کر چکی۔ ہمیں رانی کو اس بات کا بھی موقعہ دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے حاکم کی زبان سے یہ سُن لے کہ جو فیصلہ ہم نے جھانسی راج کے بارہ میں کیا ہے وہ رموز مملکت پر مبنی ہے خواہ وہ رانی کے خلاف ہی ہو۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی جان لیگی کہ ہم معمولی چور اور ڈاکو نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے کاموں کی وجہ سے

بعض لوگ ہم کو سمجھتے ہیں۔

ڈلہوزی:۔ (گھوم کر) اچھا، میں رانی سے ملاقات کروں گا۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کی باتوں سے متاثر ہوں، بلکہ اس لئے کہ اس ناگوار معاملہ کی تہ میں جو ہمارے اغراض و مقاصد ہیں وہ اسے سمجھا دئے جائیں۔ (میز کی طرف چل کر) مسٹر گرانٹ! آپ فوجی سکریٹری کو حکم دیدیجئے کہ وہ بہت جلد انتظام کر کے جھانسی کی رانی کو ملاقات کے لئے مدعو کریں آج کی کونسل کا کام ملاقات تک ملتوی رہیگا۔ تاکہ جو کچھ گفتگو رانی سے ہو وہ کونسل میں بیان کر دوں۔ اچھا تو ہم الحاق کے بارہ میں متفق ہیں نا؟

(ڈورین اور ہالیڈے سر کے اشارہ سے "ہاں" کرتے ہیں۔ لیکن کرنل لو آگے بڑھ کر ڈلہوزی کے پاس آتا ہے)

لو:۔ یور ایکسلنسی! جھانسی کی رانی یہیں برابر کے ایک کمرہ میں موجود ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ابھی ملاقات فرمالیجئے۔

ڈلہوزی:۔ (کاغذات سے آنکھ اٹھا کر) کیا یہیں کسی کمرہ میں انتظار کر رہی ہے؟

(سکوت طاری ہوتا ہے۔ پہلے گرانٹ، پھر ڈورین اور پھر کرنل لو کی طرف دیکھتا ہے جو اپنا سر جھکا لیتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (کرسی سے اٹھ کر غصہ میں لو کی طرف آکر)۔ کرنل لو! اگر اس بیہودگی اور توہین کے ذمہ دار آپ ہیں تو میں آپ کا سر توڑنے میں ہرگز رحم و کرم سے کام نہیں لوں گا۔

لو:۔ (سر بمہر لفافہ جیب سے نکال کر ڈلہوزی کو دیکر)۔ لاٹ صاحب! میرا سر پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔ نہ صرف سر بلکہ اس کے ساتھ دل بھی!

(ڈلہوزی ہاتھ بڑھا کر لفافہ جھٹک لیتا ہے۔ اور کھڑکی کے پاس جا کر غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی اثناء میں ڈورین اور ہالیڈے اٹھ کر لو کے پاس جاتے ہیں۔ ڈورین محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے اور ہالیڈے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد ڈلہوزی گھوم کر میز کی طرف آتا ہے اور لفافہ کو چاک کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (گرانٹ سے) مسٹر گرانٹ! اجلاس ملتوی۔ رانی کو طلب کرو۔

(ڈلہوزی کے الفاظ سنکر کرنل لو ہالیڈے کے شانہ پر گردن جھکا دیتا ہے)

پردہ گرتا ہے

ایکٹ دوسرا۔ منظر دوسرا

(پانچ منٹ بعد، ہی کمرہ وہی سین۔ لارڈ ڈلہوزی، جھانسی کی رانی، کمار انند راؤ اور مسٹر گرانٹ موجود ہیں۔ ڈلہوزی کے دونوں ہاتھ انند راؤ کے شانوں پر رکھے ہیں۔ اور وہ شفقت آمیز نگاہوں سے لڑکے کو دیکھ رہا ہے۔ رانی مسز گرانٹ کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ چہرہ پر ہلکے آب وال کا لمبا نقاب ہے۔ رانی اگرچہ ہنوز لباس بیوگی پہنے ہوئے ہے لیکن اوپر سیاہ زر دوز شال اور پاؤں میں دلی کی کامدار جوتی پہنے ہے۔ انند راؤ ہندو شہزادوں جیسا لباس پہنے ہے اور اسکے پہلو میں ایک چھوٹی سی تلوار لٹکتی ہے۔ گرانٹ کاغذات دیکھ رہا ہے)

ڈلہوزی:۔ (شفقت آمیز لہجہ میں انند راؤ سے) اچھا تو تم شمشیر زنی اور شہسواری سیکھ رہے ہو؟

(انند راؤ سر ہلا کر ہاں کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (مسکرا کر) اچھا دکھاؤ تم تلوار کیونکر چلاتے ہو۔

(انند راؤ پیچھے ہٹکر تلوار کھینچتا ہے اور چند ہاتھ دکھاتا ہے)

ڈلہوزی:۔ (مسکراتے ہوئے) خوب! خوب!! اچھا اب دیکھیں تم نے لکھنے پڑھنے میں کہاں تک ترقی کی ہے۔

(انند راؤ اپنی تلوار نیام میں ڈال لیتا ہے۔ اور خاموش ہو کر رانی کی طرف دیکھتا ہے)

رانی:۔ مائی لارڈ! یہ بعد میں ہوتا رہیگا۔ جس شخص کو راجہ بننے کی توقع ہو اسے چاہئے کہ پہلے وہ کام سیکھے جو راجاؤں کا خاص شغل ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے تو وہ منشی بھی نوکر رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب تک وہ فن جنگ سے واقف نہ ہوگا۔ وہ اپنے تخت و تاج کی کیونکر حفاظت کر سکیگا۔

ڈلہوزی:۔ رانی صاحبہ! آپ کو معلوم نہیں میرے بزرگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اور ابھی کوئی سو برس کی ہی بات ہے کہ میرا خاندان ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمراں تھے، اور ہندوستان کے راجاؤں کی طرح، سوائے اپنے بادشاہ یعنی شاہ اسکاٹلینڈ اور کسی کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے، اور وہ انگریزوں کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔

(رانی حیران ہو جاتی ہے)

رانی:۔ تو کیا آپ انگریز نہیں ہیں؟

ڈلہوزی:۔ نہیں رانی صاحبہ! میں انگریزوں کے بادشاہ کا ملازم ہوں جو اتفاق سے میرے وطن اسکاٹلینڈ کا بھی بادشاہ ہے۔ جس طرح آپ کے مرہٹہ بزرگ کہ ہر چند وہ رنگ مغلوں جیسا رکھتے تھے اور ان کو بعض اوقات اپنا بادشاہ

تسلیم بھی کرتے تھے، اگر وہ مسلمان نہیں تھے، اسی طرح اگرچہ میرا رنگ انگریزوں جیسا ہے اور میں انگریزی جھنڈے کو سلام بھی کرتا ہوں، لیکن میں نسل کے لحاظ سے انگریز نہیں ہوں۔

رانی :۔ (گرانٹ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے)۔ اور یہ صاحب! کیا یہ انگریز ہیں؟

ڈلہوزی :۔ نہیں وہ بھی میری طرح اسکاٹ ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ انگریزوں کے بادشاہ کے ساتھ لڑنے سے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس کا کام کریں، تو ہم لوگوں نے انگریزی جھنڈے کے نیچے ملازمت اختیار کرلی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ اور اب اسکاٹلینڈ والے ہر جگہ جہاں جہاں انگریزی راج ہے بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور ہیں، فوج میں وہ ہیں، مال میں وہ ہیں، سول میں وہ ہیں، الغرض وکیل بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، پادری بھی ہیں اور تاجر بھی۔

رانی :۔ (گھبرا کر)۔ کیا کرنل ٹو صاحب بھی اسی نسل کے ہیں جس کے آپ اور یہ صاحب ہیں؟

ڈلہوزی :۔ نہیں نہیں رانی صاحبہ! جہاں تک میرا خیال ہے کرنل ٹو کے آبا و اجداد انگلستان میں ایک اور ملک سے آئے تھے جو ہے تو انگلستان کے قریب ہی مگر اس سے اور میرے ملک سے بالکل مختلف ہے اس کے ملک کا نام آئرلینڈ ہے۔ اور وہاں کے باشندے ابھی تک انگریزوں کے دوست نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے انگریز بادشاہ کے اسی طرح ملازم ہیں، جیسے کہ ہم یعنے اسکاٹلینڈ والے۔

رانی :۔ (مضطرب ہوکر کھڑی ہو جاتی ہے)۔ تو مائی لارڈ! آپ اور ٹو صاحب بھی گویا ویسے ہی ہیں جیسے راجہ جے سنگھ اور دیگر ہندو راجہ تھے، جو مغل بادشاہوں کے ملازم ہوکر اپنے بھائی ہندو راجاؤں سے لڑتے تھے۔

ڈلہوزی :۔ (آہستہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور چوکھٹے کے سہارے سے لگ کر کہتا ہے)۔ رانی صاحبہ! اگر آپ اطمینان سے سننا چاہتی ہیں تو میں اپنے خاندان کے تاریخی واقعات سے آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں (رانی کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے)۔ رانی صاحبہ! جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں میرے آبا و اجداد انگریزوں کے خلاف لڑ کر اپنی طاقتیں صرف کیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کی جائداد اس دشوار گزار اور ناہموار علاقہ میں واقع ہے جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ کے درمیان حد فاصل ہے۔ ایک مرتبہ ایک زبردست انگریزی فوج نے اسکاٹلینڈ پر حملہ کیا اسوقت میرے بزرگوں میں سے ایک جو انگریزوں سے بھاگ کر مع اپنے آدمیوں کے غاروں میں جا چھپے تھے، ایسی حالت میں جبکہ انگریز تیار نہ تھے تلواریں سونت کر ان پر آپڑے اور ایک مشہور قلعہ فتح کرلیا۔ اسکاٹلینڈ کے بادشاہ نے خوش ہوکر انھیں مفتوحہ قلعہ کا قلعدار بنا دیا اور گردونواح کا علاقہ بھی انھیں کے ماتحت کر دیا۔ بدقسمتی سے اسی قلعہ کو اسکاٹلینڈ کا ایک اور خاندان ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ جب اس قلعہ کا حاکم میرے بزرگ کو

بنا دیا گیا تو یہ طاقتور قبیلہ بہت ناراض ہوا۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ان لوگوں نے اجتماع کر کے قلعہ کو گھیر لیا۔ اور کچھ دنوں کے محاصرہ کے بعد فتح کر کے قلعدار کو قید کر لیا۔ وہ بیچارے فاقوں کے مارے قید ہی میں مر گئے۔ (رانی کی طرف بڑھ کر) رانی صاحب! اس قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو دوست سے بھی اتنا ہی نقصان پہونچ سکتا ہے جتنا کہ دشمنوں سے۔ اور جن لوگوں کا پیشہ ہی لڑنا ہوتا ہے ان کے نزدیک دشمن و دوست سب برابر ہیں۔ انھیں لڑنے سے غرض ہوتی ہے

(یہ کہکر کرسی کی ٹیک لگا لیتا ہے)

رانی :- (اچک کر بیٹھ جاتی ہے)- لارڈ ڈلہوزی! اگر آپ اپنی عزیز چیزوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لڑنا پڑیگا کیا آپ کے بزرگوں نے اپنی زمین واپس لینے کے لئے جنگ نہیں کی تھی؟

ڈلہوزی :- (مسکراتے ہوئے)- ہاں رانی صاحبہ! انھوں نے ضرور جنگ کی تھی، مگر بعد میں انھوں نے مع دیگر امرا و فرمانروایان اسکاٹلینڈ کے اپنی آزادی کھو دی اور محض برائے نام زمیندار رہ گئے۔ یعنی دوسروں کی طرح بادشاہ کی رعایا بن گئے۔ اور سوائے اس کے کہ اپنی ذاتی قابلیتوں اور خاندانی روایتوں پر فخر کریں ان کے لئے اور کوئی شرف نہیں رہا۔

رانی :- (ڈلہوزی کے قریب جاکر)- مائی لارڈ! آپ یہ نہ سمجھیں کہ جھانسی کے فرمانروا محض زمیندار ہو کر رہ جائینگے ہمارا شرف اور ہماری خودداری اس کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔

ڈلہوزی :- (سیدھے ہو کر اور شاندار لہجہ میں)- رانی صاحبہ! میں آپ کی اس دلیری کی داد دیتا ہوں کہ آپ آج مجھ سے ملنے تنہا تشریف لائیں اور جو کچھ باتیں کیں وہ صاف گوئی سے کیں۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ڈلہوزی کی عزت اور خودداری کسی طرح سے جھانسی کے راجہ سے کم ہے۔ میرے بزرگ صرف چند سو ایکڑ پر حکومت کرتے تھے اور وہ بجا طور پر اپنی آزادی و خودمختاری پر فخر کرتے تھے۔ اور میں ان کی اولاد ملک ہند پر حکومت کرتا ہوں جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ دونوں کو ملا کر بارہ گنا وسیع ہے ——— اور اس لئے زیادہ فخر و شرف رکھتا ہوں۔ بایں ہمہ میں اس میں زیادہ عزت سمجھتا ہوں کہ اپنے بادشاہ کی خدمت کروں اور اسکی وفادار رعیت رہوں۔

رانی :- (اپنی جگہ پر سر نہوڑا کر بیٹھ جاتی ہے اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی ہے)- مائی لارڈ! جو کچھ آپ فرماتے ہیں یہ ممکن ہے کہ گوری قوموں کے لئے صحیح ہو لیکن جھانسی میں انند کمار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ اگر ریاست کا الحاق کر لیا گیا تو اس غریب کا کیا حشر ہوگا؟ وہ فرمانروایان جھانسی کی شان کو کیونکر قائم رکھیگا۔ اور وہ رسمیں کیونکر ادا کریگا جو ہمارے رواج کے موافق ایک فرزند رشید کے لئے لازم ہیں؟

ڈلہوزی :- (بیٹھ کر انند کمار سے)- یہاں آیئے کمار صاحب!

(انند کمار، جو ڈلہوزی اور رانی کی گفتگو کے دوران میں رانی کے قدموں میں فرش پر بیٹھا تھا

(اُٹھ کر گورنر جنرل کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ڈلہوزی لڑکے کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرہ کو تکتا ہے۔ بعد ازاں ہاتھ ہٹا کر رانی کی طرف دیکھتا ہے۔ انند راؤ ہٹکر ڈلہوزی کے قریب فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کے چہرہ کو دیکھتا ہے۔

ڈلہوزی :۔ رانی صاحبہ! ممکن ہے جو کچھ میں کہوں گا وہ سنکر آپ حیران ہوں۔ مگر کاش آپ میری جگہ ہوتیں اور میں آپ کی جگہ یعنی آپ گورنر جنرل ہوتیں اور میں بیوہ رانی، میں جانتا ہوں کہ آپ نے حال ہی میں بڑے بڑے صدمات اُٹھائے ہیں۔ اور آپ کے شوہر گنگا دھر راؤ آنجہانی کی وفات نے آپ کو سخت صدمہ پہونچایا ہے۔ لیکن معاف فرمائیگا آپ کے آلام و مصائب نے سامنے آکر حملہ کیا ہے اور آپ ایک طرح سے اس کے لئے تیار تھیں۔ مگر رانی صاحب! میرے آلام و مصائب نے مجھ پر پشت سے حملہ کیا ہے اور ابھی نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں مجھ پر پڑنے والی ہیں۔ ابھی سال بھر نہیں ہوا کہ میری بیوی اس ملک کی سخت آب و ہوا کی تاب نہ لاکر مجھ سے جدا ہوئی اور اپنے وطن کو چلی گئی۔ اس نے چھ مہینے تک سخت تکلیفیں اُٹھائیں مگر اُف تک نہ کی اور افسوس ہے کہ گھر کے قریب پہونچتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ میری دو بیٹیاں جنھیں میں نے کئی سال سے نہیں دیکھا بے ماں کی بچیاں ہو گئیں۔ وہ لڑکا بھی جس کے پیدا ہونے کی میں دعائیں مانگا کرتا تھا۔ میرے دل کو تسکین دیکر میرے دل سے یہ غم کا پہاڑ نہیں ہٹا سکتا۔ میری صحت تباہ ہو گئی ہے۔ اور گویا ہر وہ چیز جس کی وجہ سے میں جان کو جان سمجھتا تھا، میرے لئے فنا ہو گئی ہے۔ اب رانی صاحبہ! میں ایک رنجور و مجبور آدمی رہگیا ہوں۔

(ڈلہوزی جسمانی اور دماغی خستگی کے باعث رک جاتا ہے۔ وہ پھر سنبھلتا ہے اور اچک کر رانی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو خود بھی کھڑی ہو کر اس کی صورت کو تک رہی ہے۔ ڈلہوزی چند قدم بڑھا کر رانی کے قریب آتا ہے اور جلدی جلدی کہتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (عمیق اندرونی جذبات سے متاثر ہو کر)۔ رانی صاحبہ! میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ مگر وہ محال ہے۔ اگر آپ کی جگہ کوئی میرا بھائی بھی ایسی درخواست کرے گا تو میں فوراً انکار کردوں گا۔ اس لئے رانی صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو حشر ستارہ اور ناگپور کا ہوا ہے وہی حشر جھانسی کا ہوگا۔ یہ ایک اُصولی مسئلہ ہے جس میں کوئی مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں آیندہ کی فکر کرنی چاہئے اور کمزور کو طاقتور کے لئے جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔

(رانی یہ سنکر انند راؤ کو لپٹ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

ڈلہوزی :۔ لیکن رانی صاحبہ! اس سے آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کے لئے ہر بات کا انتظام ایسا کر دیا جائے گا کہ یہ تغیر ناگوار نہ گزرے گا۔ اپنی ضروریات کی کفالت اور کمار صاحب کی شایان شان پرورش کے لئے آپ کو معقول پنشن دی جائے گی۔ وہ متوفی راجہ کی تمام پرائیویٹ ملکیت کے مالک رہیں گے اور رہم شاہی محل اور

اس کے گرد و نواح کی زمینیں آپ کے اور شاہی خاندان کے لئے چھوڑ دیں گے۔ رانی صاحبہ! سوچئے کہ آپ کو کتنی پریشانیوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ حکمرانی ایک سعی ناشکور ہوتی ہے۔ اور آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ اب یہ کام آپ سے لے لیا جائے گا۔ اب آپ اپنا تمام وقت کنور صاحب کی تعلیم پر صرف کر سکیں گی۔ اگر وہ ایک محنتی جفاکش اور لایق نوجوان نکلے تو نہ معلوم آیندہ زندگی میں کسقدر عظمت و شان حاصل کر لیں گے۔ اگر آپ چاہیں گی تو تکمیل تعلیم کے لئے ان کو انگلستان بھی بھیج سکیں گی اور میں ان کے لئے بہترین تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کردوں گا خواہ میں کہیں ہوں۔ (دروازہ کی طرف پھر کر)۔ اب رانی صاحبہ! معاف فرمائیے میں آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت اچھی نہیں اور ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ محنت کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (گرانٹ کی طرف اشارہ کر کے) یہ مسٹر گرانٹ موجود ہیں۔ جو آپ کی پنشن کے معاملہ کا پوری طرح فیصلہ کر دیں گے اور اگر آپ اس کے بارہ میں کچھ کہنا چاہیں گی تو میں نہایت خوشی سے سنوں گا۔

رانی:- مائی لارڈ! اب میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ جب آپ نے مجھ سے کہا کہ دیوتاؤں نے تم کو یہ سزا دی ہے تو میں جان گئی کہ میرے گناہ میرے پیچھے پیچھے پھریں گے۔

(ڈلہوزی رانی کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ بعد ازاں دفعتاً آگے بڑھ کر انند راؤ کے پاس جاتا ہے جو روتی ہوئی رانی سے لپٹا ہوا ہے گورنر جنرل اپنا ہاتھ لڑکے کے سر پر رکھتا ہے اور کہتا ہے)

ڈلہوزی:- کمار صاحب! اگرچہ جھانسی آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گی لیکن آپ حوصلہ کر کے آیندہ زیادہ بڑا آدمی ہونے کی کوشش کریں۔

(اس کے بعد ڈلہوزی جلدی سے نکل کر چلا جاتا ہے۔ رانی روتی کھڑی رہجاتی ہے۔ انند راؤ حیرت زدہ جانے والے گورنر جنرل کی طرف دیکھتا ہے۔ گرانٹ جو اب تک خاموش کھڑا رہا تھا اب ادب کے ساتھ رانی کے پاس آتا ہے)

پردہ گرتا ہے

(باقی)

تذکرہ معرکہ سخن شائع ہو گیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شایقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۸؍ عہ

مینجر نگار لکھنو

کسبی

اگست سنہ ۳۴ء کے نگار میں "کسبی" کے عنوان کے ماتحت میرا جو مقالہ شائع ہوا ہے اُس پر بعض "خدا ترس" بزرگوں نے میرے خلاف اظہار خیال کیا ہے۔ خیر یہ اُن کا فرض تھا جس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے لیکن ان جوابات و اعتراضات کی ضمن میں میں نے یہ محسوس کیا کہ میں نے جن اُمور کو اپنے مقالہ زیر بحث میں پیش کرنا چاہا ہے اُن کو بخوبی نہیں سمجھا گیا۔ غالباً مقالہ کا ایجاز و اختصار اس کا باعث ہوا ہوگا۔ اس امر کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض ایسے اُمور کو زیادہ واضح طور پر پیش کر دوں جو میرے پہلے مقالہ میں تشنۂ تفصیل رہ گئے تھے۔ مجھے توقع ہے کہ اگر ان ہر دو مقالات کا بیک وقت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو غالباً مجھے اس آسانی کے ساتھ "ابلہ فریبی" یا غیر منطقی استدلال کا ملزم قرار نہ دیا جائے گا۔

مجلسے خواہم کہ پیشت گریم و سوزم چو شمع
بر زباں آرم کہ ایں سوز و گداز بہر چیست

"کسبی" کے پیشہ کے حسن و قبح کو معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ "فلسفۂ جرم" کو بخوبی سمجھ لیا جائے۔ اور چونکہ "جرم" کا صحیح مفہوم اُسوقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ "نیک و بد" کے فلسفہ پر غور نہ کر لیا جائے اس لئے سب سے پہلے اس موضوع کو امکانی ایجاز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

بزمی

فلسفۂ نیک و بد

نیک و بد کے فلسفہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کوئی شے بذاتہٖ نہ اچھی ہے نہ بری۔ نیک و بد اور اُس کے تمام مترادفات اُسوقت تک بے معنی ہیں جب تک اُن کے مفہوم کو اضافی حیثیت نہ دی جائے یعنی کسی امر کے اچھے یا برے ہونے کا معیار اُس کے منافع یا مضار کی نسبت سے قائم کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ دنیا میں کوئی شے نہ تو ضررِ محض ہے اور نہ نفعِ محض اس لئے جب ہم کسی فعل یا کسی شے کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ

اچھی یا بُری ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نگاہ کے مطابق اُس کے فوائد یا مضار اُس کے مخالف پہلو کی نسبت سے زیادہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس عالم آب وگل میں ایک کی بقا پر دوسرے کی موت اور ایک کے نشوونما پر دوسرے کی پژمردگی کا عام قانون جاری ہے اور اس لئے ہر وہ چیز جو کسی ایک نقطۂ نگاہ سے مفید ہوتی ہے دوسرے اعتبارات سے مضرت رساں نظر آتی ہے۔ لیکن انسانی دنیا میں کسی چیز کے حُسن وقبح کا معیار اس حیثیت سے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کا پہلوئے ضرر یا نفع عام انسانوں کے لئے اُس کے مخالف پہلو کے اعتبار سے زیادہ شدید ہو۔ مثلاً دریائے گنگا سے جو نہریں نکالی گئی ہیں وہ انسانی کاشتکاری اور زراعت کے لئے بے انتہا مفید ہیں اور اس لئے ہمارا فیصلہ اُن کے متعلق یہ ہے کہ وہ "اچھی" ہیں اگرچہ اُن سیکڑوں آبی جانوروں کے نزدیک ان کو "بُرا" ہونا چاہئے جو گنگا کے پانی میں ان کی وجہ سے ایک معتد بہ کمی دیکھ رہے ہیں اور جس کی بنا پر اُن کی زندگی کی بہت سی لطافتیں کم ہوگئی ہیں۔

انگلینڈ منطقۂ بارد میں واقع ہے جہاں سخت سردی پڑتی ہے اس لئے یہاں کے باشندوں کے نزدیک دھوپ خدا کی بہترین نعمت ہے لیکن افریقہ اور عرب کے استوائی خطوں میں اس سے بدتر مصیبت انسانوں کیلئے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ناروے اور سویڈن کے باشندوں میں دوزخ کا جو تصور ہے وہ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کی طرح نہیں ہے کہ وہاں آگ کا عذاب ہوگا یا لوگ دھوپ کی شدید حرارت میں تپیں گے بلکہ اس کے خلاف اُن کے نزدیک دوزخ کا مفہوم یہ ہے کہ وہاں چاروں طرف برف ہی برف ہوگی، سخت سرد ہوائیں چلینگی اور کبھی دھوپ نظر نہ آئے گی۔

انسانی افعال کے نیک و بد کا معیار

حسن وقبح کے مسئلہ میں جس طرح اشیاء کا حال ہے اُسی طرح افعال کا ہے۔ یعنی انسان جو حرکات اپنے اعضاء وجوارح کی مدد سے عمل میں لاتا ہے وہ بھی بذاتِ خود نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بُری۔ اُن کے حسن وقبح کا مفہوم بھی اضافی ہے اور صرف اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ انسان کو فوائد یا نقصانات پہونچانے میں کیا مرتبہ رکھتے ہیں —— ایک شخص آپ کی توہین کرتا ہے، آپ اُس کے جواب میں ایک طمانچہ مار دیتے ہیں اور اپنے اس فعل کو مستحسن قرار دیتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ آپ کے لئے مفید ہوا۔ اس نے آپ کے وقار کی صیانت اور آپ کے نفس کے تحفظ میں مدد کی لیکن مضروب سے پوچھئے کہ وہ آپ کے اس فعل کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔

اسی وجہ سے ابتداء میں انسانی سوسائٹی کو بالاتفاق کسی فعل کے اچھا یا بُرا کہنے میں بڑی دقتیں پیش آئی ہونگی لیکن مدتوں کے تجربہ کے بعد رفتہ رفتہ انسان نے بعض افعال کے متعلق ہمیشہ کے لئے یہ طے کر لیا کہ وہ بُرے یا بھلے ہیں۔ یعنی یہ سمجھ لیا کہ اُن کا مضر یا مفید پہلو بہ نسبت اُن کے مخالف پہلو کے زیادہ اہم ہے اور اس طرح بعض افعال

کہ حسن و قبح کے متعلق جو فیصلہ سوسائٹی نے صادر کیا وہ عالمگیر سچائیوں کی ذیل میں شمار کیا گیا یعنی جس طرح یہ حقیقت ہمیشہ ہمیشہ رہیگی کہ ستارے چمکتے ہیں، بادل گرجتا ہے، پانی کا میلان پستی کی جانب ہوتا ہے، آگ گرم ہوتی ہے اسی طرح بہت سے افعال کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی ہمیشہ صحیح رہیگا مثلاً چوری، قتل اور جھوٹ "برا" ہے، صداقت، حلم اور امانداری "اچھی" ہے۔

مگر ان تمام افعال کی تہہ میں یہ امر نہایت شدت کے ساتھ کارفرما ہوگا کہ آیا اُن کا مفید پہلو زیادہ وقیع ہے یا مضر پہلو۔

لیکن انسان نے اپنے تمام افعال کے حسن و قبح کے متعلق ابدی فیصلے نہیں کئے ہیں بلکہ بہت سے افعال ایسے بھی ہیں جو آب و ہوا کے اثرات، ماحول کی کیفیت، ملک کی حالت یا سوسائٹی کی ضروریات کی وجہ سے وقتی طور پر اچھے یا بُرے کہے جاتے ہیں اس امر کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایسے وقت میں جبکہ کسی ملک میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ چاروں طرف سے غنیم کی تباہ کاریوں اور خونخواریوں کا ڈر ہو، غارتگری عام ہو تو فطرتاً ملکی افراد کا فیصلہ یہ ہوگا کہ :-

باہر نہ نکلو

روپیہ پیسہ زمین میں دفن کردو۔

پڑھنے لکھنے کے بجائے فنون حرب سیکھو

عورتوں کو مرہم پٹی کرنا سکھلاؤ ———— وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر ملک کی یہی حالت زیادہ عرصہ تک باقی رہے اور لوگ اس کا اندازہ نہ کرسکیں کہ وہ کب تک ختم ہوگی تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تحفظ ناموس و جان کے لئے وقتی طور پر اہل ملک نے جو مذکورۂ بالا فیصلے کئے تھے وہ رفتہ رفتہ اس طرح لوگوں کی زبان پر چڑھ جائیں گے۔

باہر نکلنا بُرا ہے

روپیہ پیسہ زمین میں دفن کرنا اچھا ہے

پڑھنے لکھنے کے بجائے فنونِ حرب سیکھنا اچھا ہے۔

عورتوں کو "مرہم پٹی" سکھلانا اچھا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ سے جس حقیقت کو آپ کے ذہن نشین کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر جماعت اپنی ملکی اور سماجی ضروریات کی بنا پر بہت سی چیزوں کو مفید اور بہت سی چیزوں کو مضر سمجھ کر اُنکے متعلق حسن و قبح کا فیصلہ کرتی ہے لیکن اگر آپ دوسرے ملک کی قوموں پر نظر ڈالیں جن کے حالات اس پہلی قوم سے مختلف ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے وہ افعال جن کو پہلی قوم بُرا سمجھتی ہے اس قوم کے یہاں بُرے نہیں ہیں۔

اس امر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ذیل کی چند مثالوں پر غور کیجئے :۔

۱۔ اسلام کی بعثت سے قبل عربوں کی زندگی بالکل خانہ بدوشانہ تھی۔ ملک کسی زرعی ترقی کے قابل نہ تھا اور تجارت و صنعت بھی فروغ پر نہ تھی اس لئے ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کو لوٹ لینا اور اُس کی منقولہ و غیر منقولہ جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لینا باعثِ فخر سمجھتا تھا اور اس بنا پر ہر عرب ہر وقت اپنے آپ کو میدانِ جنگ میں تصور کرتا تھا۔ ان حالات کے ماتحت اُن کی نظروں کے سامنے ایسے بہت سے واقعات پیش آئے کہ کسی قبیلہ کے افراد ذکور کے قتل و نہب کے بعد اُن کی لڑکیوں اور بیویوں کو ذلّت کے ساتھ غلام بنایا گیا۔ اور اسی لئے رفتہ رفتہ اُن کے دماغ میں اس خیال نے نشوونما پائی کہ لڑکیوں کے وجود ہی سے اپنے قبیلہ کو پاک رکھا جائے تاکہ نہ تو جنگ کرتے وقت کسی قسم کا دغدغہ رہے اور نہ مرنے کے بعد کسی ذلت کا خوف۔ ماحول کے اسی اثر کی بنا پر عرب کی سوسائٹی میں "دختر کشی" ایک مستحسن اور پسندیدہ فعل سمجھا جانے لگا۔ لیکن جب اسلام کی تابناک شعاعوں نے اُن کی معاشرتی اور تمدنی ساری زندگی کو منقلب کر دیا تو یہ فعل بھی خود بخود بجائے "اچھا ہونے کے برا ہو گیا۔

۲۔ ہندوستان میں نسبتاً زیادہ امن چین کی زندگی بسر کی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں کی تعداد بہت کافی ہو گئی اور ہر مرد کے لئے لڑکی کا بآسانی مل جانا ممکن ہو گیا۔ اس امر نے مرد کی خشونت و طاقت کے ساتھ متحد ہو کر عورت کی پوزیشن کو اتنا صدمہ پہونچایا کہ "عورت" مرد کے سامنے ایک "داسی" سے زیادہ وقیع نہ رہی۔ ہندو سوسائٹی نے عورت کے لئے مرد کو ایک دیوتا بنا دیا اور مرنے کے بعد اُس کے لئے زندہ جل جانا ایک مستحسن فعل قرار پایا۔

۳۔ آئے دن کے جنگ و جدل کی بنا پر عرب میں "دختر کشی" کی جو رسم قائم ہو گئی تھی اُس نے لڑکیوں کی تعداد میں معتد بہ کمی کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے وہاں ہندوستان کے مقابلہ میں عورت کا مرتبہ بہت بلند ہو گیا یہی سبب ہے کہ ہندو بیوہ کے نکاح کو آج تک برا سمجھتے ہیں، طلاق کو ایک قبیح فعل تصور کرتے ہیں، لیکن اہلِ عرب دورِ جاہلیت میں بھی ان چیزوں کو برا نہ سمجھتے تھے۔

۴۔ ہندوستان و ایران میں پردہ کی رسم کی بنا پر مرد و عورت کی فطری طاقتوں پر جو غیر معمولی بندشیں عائد کی گئیں اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے جذبات کا رجحان بے ریش و بریدہ نوجوانوں کی طرف ہو گیا۔ اور "اہلِ ذوق" نے انھیں میں "سلوچنا" "زبیدہ" اور "نارا شیرر" کا جلوہ دیکھ کر اُن کے چشم و ابرو کے سامنے اپنے گریبان چاک کرنا شروع کر دئے۔ رفتہ رفتہ امرد پرستی کا یہ جذبہ اتنا عام ہوا کہ اُردو اور فارسی شعراء کے خیالات کا مرکز صرف "امرد" بن گیا اور اس کو آج تک معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

بحث کے ان تمام اجزا کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ دنیا میں اچھے اور برے افعال

دو قسم کے ہوتے ہیں :-

۱- وہ افعال جن کے متعلق ایک طویل تجربہ کے بعد انسانی جماعتوں نے بالاجماع یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اچھے یا برے ہیں اور جو ہمیشہ ایک عالمگیر صداقت کی طرح علیٰ حالہٖ قائم رہیں گے۔ جیسے جھوٹ بولنا بُرا ہے، سچ بولنا اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

۲- وہ افعال جو ہر قوم میں اُن کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق اور اُن کے ملکی و جماعتی ماحول کی بنا پر اچھے یا بُرے ہوتے ہیں اور جو اُن حالات کی تبدیلی کے بعد تبدیل ہو سکتے ہیں۔

پہلے حسن و قبح کا نام ہم "حسن و قبح عام" رکھتے ہیں اور دوسرے کا "حُسن و قبح خاص"

جُرم

یہاں تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ :- ہر وہ فعل بُرا ہوتا ہے جس کے مضر اثرات اُسکے مفید اثرات کے مقابلہ میں زیادہ ہوں۔

لیکن انسانی جماعتیں بالعموم جس فعل کو "بُرے" کے لفظ سے تعبیر کرتی ہیں فلسفہ کی زبان میں اُسے "جرم" کہا جاتا ہے۔ مذہب اُسے "گناہ" کہتا ہے اور ماہرینِ اخلاق (Ethicists) اُس کا نام "سوءِ اخلاق" یا "بداخلاقی" رکھتے ہیں۔

چونکہ اسوقت ہم اپنے موضوع پر خالص فلسفیانہ ڈھنگ میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہم فلسفہ کی اصطلاح کے بموجب انسان کے ہر قبیح فعل کو "جرم" سے تعبیر کریں گے۔

جُرم کا مفہوم "قانونی" نقطہ نظر سے

یہاں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ "جرم" کا جو مفہوم "قانون" میں سمجھا جاتا ہے وہ بہت محدود ہے اور اُس کا اطلاق صرف اُن جرائم پر کیا جاتا ہے جن کا بُرا اثر دوسروں پر پڑے اور دوسروں کے لئے شدید طور پر وجہ شکایت پیدا کرے اور جس سے سوسائٹی کے عام امن و آسائش میں خلل واقع ہو۔ لیکن فلسفہ کی اصطلاح میں جُرم کے لفظ سے ایک وسیع مفہوم مراد لیا جاتا ہے جس کے دائرہ میں انسان کے تمام قبیح افعال داخل ہو جاتے ہیں اور اس لئے ہمارے "جرم" کی تشریح کے لئے آپ کو کسی بیرسٹر یا وکیل کے کتب خانہ میں نہ جانا چاہئے بلکہ اُس کو فلاسفی اور نفسیات کے علماء کی کتابوں میں تلاش کرنیکی ضرورت ہے۔

جرم کا مفہوم فلسفیانہ نقطہ نظر سے

جُرم کے متعلق اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آپ جرم کی ایک جامع و مانع تعریف کریں تو یہ ہوگی :-

"جرم ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر مضر اثر مترتب ہو"

جرم کی اس تعریف میں "حسن و قبح عام" اور "حسن و قبح خاص" دونوں داخل ہیں اور اب اس تعریف

کے ماتحت جرم کی دو تقسیمیں کی جاسکتی ہیں۔ یعنی

ا۔ وہ جرائم جن کا بُرا اثر صرف آپ کی ذات پر مرتب ہو اور دوسرے لوگوں کو اُس سے کوئی نقصان نہ پہونچے مثلاً دولت کا بُری طرح ضائع کردینا، یا بخل سے کام لیکر اپنے آپ کو ضروری آسائش سے محروم رکھنا، رات کو دیر کرکے سونا، کھانے میں احتیاط نہ برتنا وغیرہ وغیرہ ——— یہ سب چیزیں چونکہ آپ کے نفس کو نقصان پہونچاتی ہیں اس لئے "بری" ہیں اور ایسی، بنا بر ایک فلسفی کی نظر میں "جرم" ہیں۔

اس قسم کے تمام جرائم کو ہم "شخصی جُرم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲— وہ جرائم جن کا مضر اثر دوسروں تک متعدی ہو۔ جیسے چوری، قتل، ضرر شدید وغیرہ — دنیا کی وہ تمام اشیاء جو جماعت کی ملک ہیں اگر اُن کو آپ کی ذات سے نقصان پہونچے یا آپ اُن میں اس طرح تصرف کرنا چاہیں کہ جس سے جماعت کے دیگر افراد کے حقِ استفادہ کو صدمہ پہونچتا ہو تو وہ فعل بھی جماعتی جرم کی ذیل میں آجائے گا، مثلاً جنگل کے درختوں یا عام شاہراہوں پر بیجا حقِ تملیک جتانا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا دفینہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اگر آپ کو اتفاقاً کسی جنگل یا ویرانے میں مل جائے تو "قانونی" اعتبار سے آپ اُس کے مالک قرار نہیں پاسکتے کیونکہ اُس کی حیثیت جنگل کے اُن درختوں کی سی ہے جن سے مستفید ہونے کا استحقاق جماعت کے ہر فرد کو ہے اور اس لئے دفینہ کی ملکیت میں قوم کا ہر فرد برابر کا شریک ہے۔

الغرض اس قسم کے تمام جرائم کا نام ہم "جماعتی جرم" رکھتے ہیں۔

"جُرم" اور سزا ازروئے قانون

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قانون کی نظر میں صرف وہ افعال "جُرم" قرار پاتے ہیں جن کا مضر اثر دوسروں تک پہونچے اور جو سوسائٹی کے عام امن و آسایش میں خلل انداز ہوں۔ چنانچہ اس اعتبار سے قانون میں صرف ایسے جماعتی جرائم قابل سزا ہوتے ہیں جو بر اہِ امن کا باعث ہوں۔ اسکے علاوہ اُن تمام جماعتی جرائم" سے جو ایسے نہ ہوں اور نیز تمام "شخصی جرائم" سے "قانون" کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اُن کی سزا سوسائٹی اپنے طور پر دیتی ہے مثلاً بخیل سے نفرت کرتی ہے۔ اُس کی عزت نہیں کرتی، مہذب محفلوں میں مختلف طریقوں سے اُس کی توہین کرتی ہے۔ اُس کی مناسب امداد کرنے سے دستکش رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قانونی نقطۂ نگاہ سے بخیل کو نہ مجرم قرار دیا جائے گا اور نہ پولیس اُس سے تعرض کرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ دفینہ پانے کے بعد اگر آپ اُس کی اطلاع حکومت کو نہ دیں اور خاموشی کے ساتھ اُسکو تصرف میں لے آئیں تو حکومت کے سپاہی آپ کو پابجولاں بنادیں گے۔ لیکن اگر اپنی ذاتی دولت کو آپ جمع کئے بیٹھے رہیں اور سخت سے سخت جسمانی و روحانی مصائب برداشت کرنے کے باوجود بھی اُسے خرچ کرنا گوارا نہ کریں تب بھی "قانون" آپ کے راستہ میں حائل نہ ہوگا۔

لیکن ابتدائے سوسائٹی نے بہت سے "شخصی جرائم" کے خلاف بھی سزائیں تجویز کی تھیں مثلاً جو قانون مذہب نے مرتب کیا تھا یا جو اگلے زمانہ کے روایتی عقائد پر مبنی تھا اُس میں عبادت نہ کرنے پر سزا تھی۔ اسلام میں نماز نہ پڑھنے پر قید کا حکم ہے۔ ارتداد کی صورت میں قتل کیا جاتا ہے لیکن آج کل بارگاہِ قانونی سے یہ فیصلہ صادر ہوا ہے کہ قانون کے تحت میں صرف اُن جرائم کو قابلِ سزا سمجھا جائے گا جن کا بُرا اثر دوسروں تک متعدی ہو، جو سوسائٹی کی عام فلاح و بہبود کے منافی ہوں، اور جن سے امن و آسائش عامہ کو صدمہ پہونچے۔

اسی لئے قانون میں زنا بالجبر جرم ہے لیکن زنا بالتراضی جُرم نہیں۔ لیکن اغلام بالتراضی بھی جرم ہے اس لئے کہ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ فعل فطرتِ سلیمہ کے مخالف ہے اور سوسائٹی کی عام فلاح و بہبود پر اس کا مضر اثر پڑتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانہ میں یہ نظریہ بدل جائے جیسا کہ کچھ دن ہوئے فرانس کے رسائل و اخبارات کے صفحات پر یہ بحث نہایت زور شور سے چل رہی تھی کہ — آیا اغلام بالتراضی کو قانوناً جرم ہونا چاہئے یا نہیں۔

"جُرم" کے مسئلہ میں تمام بحث کا خلاصہ

الغرض یہاں تک ہم نے جس امر کی وضاحت کی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے ہر "بُرا" فعل جُرم ہے، اور اس اعتبار سے جُرم کی دو قسمیں ہیں یا شخصی اور جماعتی۔ اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ جماعتی جرائم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ جُرم رہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ سوسائٹی کا کوئی فیصلہ کسی خاص وقت اور کسی ماحول کے ماتحت جُرم کی ذیل میں داخل ہو لیکن اُن حالات و ماحول کے تبدیل ہو جانے کے بعد وہ جرم نہ رہے (ملاحظہ ہوں امثلۂ مذکورۂ بالا) یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جُرم کے متعلق سوسائٹی نے جو فیصلہ صادر کیا ہو وہ سرے سے غلط ہی ہو۔

فلسفۂ جرم کے اعتبار سے "کسبی" کے پیشہ کی تحلیل

فلسفۂ جرم کے متعلق ان تمام تفصیلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ہم "کسبی" کے پیشہ پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا اُس کو جرم کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔

ظاہر ہے کہ قانون کی نظر میں تو یہ پیشہ جُرم نہیں ہے۔ لیکن ہمارے جماعتی اور سماجی فیصلہ کے مطابق یہ حد درجہ قبیح جرم ہے۔ اور اس لئے ہماری بحث صرف اسی اعتبار سے ہوگی۔

"کسبی" کی عصمت فروشی

"کسبی" کے خلاف جو زبردست ترین جرم عائد کیا جاتا ہے وہ "عصمت فروشی" کا جرم ہے۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "کسبی" کا یہ فعل جُرم ہے تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جُرم کی کونسی قسم ہے — آیا "جماعتی" جرم ہے یا "شخصی" جرم؟

ظاہر ہے کہ اگر "عصمت فروشی" حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے تو وہ "شخصی جرم" نہیں ہے۔ اب اگر اسکو جرم کے کسی شعبہ میں داخل کیا جا سکتا ہے تو وہ "جماعتی جرم" ہی ہو سکتا ہے لیکن مرد و عورت کے اتصال کی تین اہم اغراض (یعنی — (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیرِ منزل۔ اور (۳) آلامِ حیات سے آسودگی) میں سے

چونکہ ایک بڑی غرض "آسودگیِ نفس" بھی ہے اس لئے جب تک "گسبی" کا وجود اس غرض کی تکمیل کرتا ہی اُسوقت تک "عصمت فروشی" کو جماعتی جرم بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بحث کے اس پہلو کو ہم اپنے سابقہ مقالہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں اس لئے دوبارہ اعادہ کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ البتہ بعض اُمور ایسے ہیں جو مقالہ محوّلہ میں زیادہ وضاحت سے بیان نہ ہوئے تھے اس لئے اُن پر یہاں تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جائے گی۔ بدیں وجہ ضروری ہے کہ پہلے اس سلسلہ میں ہماری سابقہ بحث کا بغور مطالعہ کر لیا جائے۔

"گسبی" کا مفہوم سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ گسبی کا مفہوم کیا ہے۔ میرے نزدیک "گسبی" عبارت ہے ——— ہر اُس نوجوان (نوجوان کا عام مفہوم سمجھئے، یعنی جو "آنسہ" نہ ہو) عورت سے جو اپنے حسن ظاہری کے ساتھ "فنون لطیفہ" نغمہ، موسیقی وغیرہ سے بخوبی آشنا ہو۔ جو اُٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے آداب سے کما حقہ واقف ہو اور جس کی معیت میں انھیں اُمور کی بنا پر مرد کے لئے بے انتہا کیف پنہاں ہو۔

یہ ہے میرے نزدیک "آئیڈیل گسبی"۔ اور اس لئے ہر وہ عورت جسے فن لطیف تو در کنار بات کرنیکا بھی سلیقہ نہ آتا ہو اور جو صرف "عصمت" کی قیمت پر مرد کی خاطر کر سکتی ہو میری تعریف سے خارج ہے، شاید میرے اس مفہوم کو "گسبی" کے مقابلہ میں "طوائف" کا لفظ زیادہ صحت کے ساتھ ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ صرف اسی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے رقاصہ، مغنیہ اور مطربہ کی قسم کے تمام الفاظ میرے نزدیک ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ نغمہ و طرب اور رقص و سرود ایک "گسبی" کی زندگی کے اتنے اہم اجزا ہیں کہ اگر اُسکو اُن سے علٰحدہ تصور کیا جائے تو اس پیشہ کے استحسان و جواز کے تمام راستے یکدم بند ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے اگر "گسبی" کی زندگی کے اس اہم عنصر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس کو صرف مغنیہ، رقاصہ یا مطربہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اور اس لئے اب میں بجائے گسبی کے مطربہ کا لفظ استعمال کروں گا۔

لیکن اس سے یہ مطلب بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ میں جس مطربہ سے بحث کر رہا ہوں عصمت فروشی اُسکے دائرہ سے خارج ہے۔ اس کے برخلاف میرا مطلب صرف یہ ہے کہ عصمت فروشی اُس کی بارگاہ میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے ——— اُس کا اصل فن صرف اُس کی معیت اور مصاحبت کا لطف ہے، گویا "میری گسبی" ایک ایسی حسین نوجوان لڑکی ہے جو علم مجلسی سے بخوبی واقف ہو، ہر موضوع پر دلچسپ انداز سے گفتگو کر سکتی ہو، بہت خوش سلیقگی کے ساتھ ہر ایک بات کا جواب دیتی ہو اور بات بات پر خود مسکراتی اور دوسروں کو ہنساتی ہو۔ اُس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی تمناؤں کا طوفان کم نہ ہو۔

بقول قیس ابن الخطیم :۔

تَغتَرِقُ الطَّرفَ وَہِیَ لاہِیَۃٌ — کَاَنَّمَا شَفَّ وَجہَہا نُزُفٌ

وہ بے توجہی کے ساتھ کبھی اور طرف دیکھتی ہوتی ہے لیکن دیکھنے والوں کی نظریں اُس کے غیر فربہ چہرہ پر گڑ جاتی ہیں جس پر ہلکی ہلکی زردی جھلکتی ہے۔

وَلَا یَغِثُّ الحَدِیثُ مَا نَطَقَت — وَہُوَ بِفِیہَا ذُو لَذَّۃٍ طَرِفُ

جب وہ بولتی تو اُس کی گفتگو سے دل نہیں اُکتاتا۔ اُس کے منھ سے جو جملہ نکلتا ہے ایک نئی لذت رکھتا ہے۔

تَخزُنُہُ وَہُوَ مُشتَہًی حَسَنٌ — وَہُوَ اِذَا مَا تَکَلَّمَت اُنُفُ

وہ بات کر کے چُپ ہو جاتی ہے لیکن دل اُس کی گفتگو سننے کو تڑپتا رہتا ہے۔ اُس کی گفتگو کا ہر موضوع بالکل اچھوتا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک "کسبی" کا مفہوم وہ ہے جس کے نام پر واجد علیشاہ کے دربار میں "پریاں" جمع کی جاتی تھیں اور ایک "کسبی" کے لئے وہ تمام صفات ضروری و لابدی ہیں جن کی تعلیم لکھنؤ کے اس زندہ دل فرمانروا کی حرم سرا میں ان حسین "فتنوں" کو دی جاتی تھی۔

جو "کسبیاں" اِن صفات سے معرّا ہیں وہ حقیقۃً "آلامِ حیات" سے آسودگی کے اہم مقصد کو انجام ہی نہیں دے سکتیں۔ اور اس لئے خالص عصمت فروشی ہے کسبِ زر کرنا یقیناً ایک ناقابلِ معافی جرم ہے۔ بلاشبہ اس کے جواز میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ پنجاب اور بمبئی وغیرہ میں اس قسم کی کسبیوں کی جو کثیر تعداد پائی جاتی ہے اُن کے مسکنوں کو اگر آگ لگائی جائے تو سب سے پہلے میں اس کی تائید میں حرکت کروں گا۔

"تجارتِ معصیت" کی واقعی ذمہ داری کس پر ہے؟

اگرچہ اس قسم کی کسبیوں کو میں سزاوارِ ملامت سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی اُن پر رحم ضرور آتا ہے اس لئے کہ بظاہر تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کو لوٹ لیتی ہیں گھرانے کے گھرانے تباہ کر دیتی ہیں، نوجوانوں کو دیوانہ بنا دیتی ہیں لیکن آپ کو کیا معلوم کہ ان "غریبوں" کی ایک کثیر تعداد یہاں بھی ایک مرد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتی ہے، وہ جو کچھ کرتی ہے کسی اور کے اشارۂ ابرو سے کرتی ہے جو ماموں، خالو اور چچا تائے بنکر اُس کے "سرپرست" کہلاتے ہیں اور صبح سے شام تک اُسے اس فن کا درس دیتے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ خون پسینہ بہا کر حاصل کرتی ہے اُس کے وہ تنہا مالک ہوتے ہیں اور وہ خود صرف اُن کے رحم پر رہتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو کشمیر جا کر معلوم کیجئے کہ وہاں سے ہر سال کتنی لڑکیاں محض اس غرض کے لئے لائی جاتی ہیں۔ وہاں کے اُس قانون کے اغراض و مقاصد کو پڑھئے جو صرف اسی کی روک تھام کے لئے معرضِ وجود میں لایا گیا ہے۔ لاہور اور بمبئی وغیرہ کے بازاروں میں تحقیق کیجئے کہ ایک ایک

مرد کے پاس کتنی لڑکیاں ہوتی ہیں جن سے وہ مستقل تجارت کرتا ہے لیکن بظاہر اُن کا چچا یا ماموں کہلاتا ہے۔ اور اس لئے اگر یہ "پیشہ" ننگِ انسانیت ہے تو اس کے ذمہ دار خود ہم ہیں۔ ہم خود ہی اپنا خون چوس رہے ہیں، خود ہی اپنی گردن میں موت کا پھندا ڈال رہے ہیں، خود ہی ذلّت و رسوائی کے اِس غار میں گر رہے ہیں۔

بیوی سے "آلامِ حیات کی آسودگی" ممکن ہے

میں نے اپنے گزشتہ مقالہ میں یہ ظاہر کیا تھا کہ مرد و عورت کے اتصال کے تین اہم اغراض ہیں ۔۔۔ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیرِ منزل (۳) آلامِ حیات سے آسودگی۔ اور اس کے بعد یہ تبلایا تھا کہ "مطربہ" کی زندگی کے مقاصد میں صرف تیسری غرض کی تکمیل کرنا داخل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں نے عورت کے مقاصد کی اس تقسیم کے بعد یہ طے کر لیا ہے کہ "بیوی" سے ان ہر سہ اغراض کی تکمیل ناممکن ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بیوی صرف اول الذکر دو اغراض کی تکمیل کرتی ہے اور تیسری غرض کے حصول کے لئے ہم کو کسی "مطربہ" کے "کوٹھے" پر جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بالکل خلاف میرا مقصد اس تقسیم سے صرف اتنا ہے کہ "مطربہ" کے مقصدِ حیات کے استحسان کو واضح کر دیا جائے عام اس سے کہ بیوی کے ذریعہ سے مذکورۂ بالا تینوں اغراض پوری ہوں یا نہوں۔۔۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ عصمت شکنی کے جس جُرم کو بُرا کہا جاتا ہے وہ صرف اُسی وقت بُرا ہے جبکہ عورت کے مقصدِ حیات میں بقائے نسل اور تدبیرِ منزل داخل ہوں۔

یقیناً ہمارے گھروں میں ایسی بیویوں کا کال نہیں ہے جو اتصالِ مرد و زن کے ان ہر سہ اغراض کی تکمیل کرتی ہوں لیکن بالعموم ایسی بیویوں کا وجود آٹے میں نمک کے مترادف ہے۔

ہماری "بیویاں"

ہمارے گھروں کی معاشرت کچھ اس نہج کی واقع ہوئی ہے کہ اُس میں لڑکی کو بچپن سے اس تیسری غرض کی تکمیل کے لئے تیار ہی نہیں کیا جاتا۔ آپ کسی جگہ شادی کی درخواست بھیجے ہیں تو لڑکی کی خوش سلیقگی، سینے پرونے، اور حُسنِ کردار کے بعد حُسنِ صورت کا مرتبہ رکھتے ہیں لیکن مشرق کے ایک لاکھ گھرانوں میں سے شاید ایک گھر بھی ایسا نہ ہو جہاں لڑکی میں "فنونِ لطیفہ" کے کمال کو دیکھا جائے۔ یہ دریافت کیا جائے کہ وہ موسیقی میں کتنی ماہر ہے؟ اُس کو پیانو، ہارمونیم اور بنجو وغیرہ بجانا آتا ہے؟ موضوعاتِ حاضرہ پر خوشگوار انداز سے گفتگو کر سکتی ہے؟ ہر سوال کے بے ساختہ لطیف جواب دینے کا ملکہ اُس نے اپنے اندر پیدا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف ہماری "بیویوں" کا تو یہ عالم ہے کہ وہ مشکل سے کسی بات کا جواب مسرور کُن انداز سے دے سکتی ہیں، سیاسیات و معاشرت کے سینکڑوں دلچسپ مباحث سے قطعاً نابلد ہیں، علمی و عملی زندگی کا کوئی شگفتہ سے شگفتہ پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر آپ اُن سے رائے زنی کر سکیں۔ جب تک گھر میں رہیے ایک مخصوص

قسم کی تعب انگیز [illegible] گفتگو سنتے رہیے اور سُنتے سُنتے بالآخر ایک قنوطی، بجس اور جامد مجسمہ بنکر رہجائیے۔

بعض اوقات ہم خاموش رہنا چاہتے ہیں لیکن وہ تکلیف دہ انداز سے بولنا شروع کردیتی ہے، ہم سوچ رہے ہوتے ہیں وہ ٹوک دیتی ہے۔ ہمارا دماغ مختل ہوتا ہے اور ایک پُرکیف منظر چاہتا ہے اور وہ گھر کے قضیے لے بیٹھتی ہے، ہم اپنے مصائب سے آرام چاہتے ہیں اور وہ عین اُسی وقت رو رو کر ساس نند کے جھگڑے دُہرانے لگتی ہے۔ ———— کیا ”آلامِ حیات سے آسودگی“ اس طرح نصیب ہو سکتی ہے؟

نوجوان اور بالخصوص تعلیمیافتہ اور لطیف و پاکیزہ ذوق والے نوجوان، عورتوں میں اس کمی کو شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر یہی حال چندے اور رہا تو وہ وقت دور نہیں جب ”نکاح“ کی قدر بھی ہمارے قلوب سے بالکل فنا ہو جائے گی اور ہر نوجوان کسی ”مطربہ“ کے صدائے خلخال پر جھومتا نظر آئے گا۔

بہرحال اگر بیوی سے یہ تمام اغراض پوری ہو جائیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد لیکن ہماری سوسائٹی کی موجودہ حالت تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہماری ”بیویاں“ اس ”وادی“ سے قطعاً ناآشنا ہیں اور دوسری طرف ”مطربہ“ صرف اسی فن کو اپنے لئے مخصوص کر لیتی ہے۔ پھر جس طرح ایک ادیب کی خصوصیات میں یہ داخل کر لینے سے کہ وہ بہترین ”شاعر“ بھی ہو اور عمدہ ”نثر نگار“ بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی شخص صرف نثر نگار ہو تو وہ بُرا ہے اسی طرح اگر ”مطربہ“ اپنے مقصدِ حیات میں ”اتصالِ مرد و زن“ کے صرف ایک پہلو کو پیشِ نظر رکھتی ہے تو اُس کو بھی بُرا نہیں کہا جا سکتا۔

چند مناظرِ ”طرب“

آپ اپنی بیویوں کی معاشرت تو روز دیکھتے ہیں۔ آیئے چند منٹ میرے اس آئیڈیل پر بھی غور کیجئے:۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست کو اپنی بیوی کے طرزِ عمل سے سخت ہیجان پیدا ہوئی۔ مجھ سے شکایت کرنے آئے، اور کہنے لگے ”میں اس کا کیا علاج کروں کہ ”وہ“ جو کچھ کہتی یا کرتی ہیں بالکل نیک نیتی سے کرتی ہیں۔ اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہ میرے ہر حکم کو ایک خادمہ کی طرح ماننا اپنا فخر سمجھتی ہیں۔ لیکن اِن تمام باتوں کے باوجود اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے میرے دماغی سکون کے لئے مستقل عذاب بنی ہوئی ہیں“۔

اس کرب و اضطراب کے دفعیہ کے لئے وہ کسی ”محفلِ طرب“ میں پہونچ گئے۔ مگر چہرہ سے مسرت مفقود تھی، بولنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اُن سے پوچھا گیا:۔

”آج آپ کے اس غیر معمولی سکوت کی وجہ؟“

اس کے جواب میں وہ مبہم انداز سے کچھ ہوں، ہاں کہہ کر چپ ہو گئے۔ لیکن جب اُن سے مسلسل اصرار کیا گیا تو جھنجھلا کر کہنے لگے :-

تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ مے دانی
طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ برپا را

(ایک لطیف قہقہہ کے ساتھ) "ماشاء اللہ! شعر بھی آپ کو ملا تو کوئی ہزار برس کا فرسودہ۔ یہی پڑھ دیا ہوتا :-

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نواگرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

(کسیقدر تبسم کے ساتھ) — جی ہاں میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آپ کی زد سے کون بچ سکتا ہے :-

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

(خندۂ دنداں نما کے بعد) پھر وہی فرسودگی۔ کبھی تو اپنی لطافتِ خیال کا ثبوت دیجئے .... ادھر دیکھئے ......

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اس مختصر سی تمہید کے بعد اُن کے دماغ کی دنیا یکسر پلٹ گئی۔ اور اس کے بعد کی گفتگو سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ چند لمحے بیشتر وہ سرتاپا جمود و خموشی بنے ہوئے تھے۔

خودرو پودوں کی طرح ہندوستان کی فضا میں جو لاکھوں غزلگو شاعر پیدا ہو گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک میٹھا "گل و بلبل" کے "افسانے" سُنا رہا تھا، طبیعت سنتے سنتے اُکتا گئی مگر اُس کو احساس کہاں جبکہ چند "بلند ذوق" "مستقل" "ہنگامۂ داد" بپا کئے ہوں۔

غزل ختم ہوئی اور خفیف سا سکوت ہوا کہ "نشاط و حسن" کی سیمابی تیتری نے ایک ہلکی سی ترنم ریز آواز میں کہا "میں نے بھی اس "طرح" میں کچھ عرض کیا ہے"

سب کی نظریں اس طرف جم گئیں۔ اور غزل شروع ہوئی۔ ایک شعر تھا :-

ہر ذرۂ امکانِ حیاتِ ابدی سے
اوجِ شرفِ خاکِ ثریا نہ ہوا تھا

سننے والوں نے کہا :- "واللہ کیا نزاکتِ خیال ہے ...."
"اقبالؔ و غالبؔ کا رنگ ہے — مگر اُس سے زیادہ دلکش"

"لیکن یہ "امکان" کے نون کو غیر ظاہر ہونا چاہئے تھا"

"یہ غلطی تو اقبالؔ نے بھی کی ہے ——— "منزلِ دہر سے اونٹوں کے حُدی خوان گئے"

(تبسم کے ساتھ) "مگر میرے شعر میں تو "امکان" "حیات" کی طرف مضاف ہے۔

ہر ذرۂ امکانِ حیات ابدی سے

"اوہو! بالکل ٹھیک، اللہ اکبر!! کتنا بلند شعر ہے"

لیکن کتنا پرظرافت تھا وہ منظر جب ایک خاص سنجیدگی کے ساتھ یہ کہا گیا:-

"آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ...... مگر غزل کے کسی مصرع میں میں نے بامعنی ہونے کا خیال نہ کیا تھا"

ایک نوجوان نہایت غم و غصہ کے ساتھ اپنی بیوی کے احمقانہ کردار کی شکایت کر رہے تھے۔ اور ساری "کتھا" ختم کرنے کے بعد اس کے خواستگار ہوئے کہ اُن کے ساتھ ہمدردی کیجائے۔ آدمی کہنہ خیال اور احمق سے تھے اور موجودہ "دہریت و ارتداد" کے خلاف اکثر لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس تمام داستانِ الم کے بعد کہنے لگے

"مگر ہماری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا"

(مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ ہلکے سے تبسم سے) آپ سے ہزار دفعہ کہا کہ جب بیوی کے پاس جایا کیجئے تو تین مرتبہ قل ہو اللہ پڑھ کر دم کر دیا کیجئے مگر آپ مانتے ہی نہیں ..... آپ کو معلوم ہیں اس کے صفات؟

دفعتہً گفتگو کا رُخ پلٹ گیا۔

ایک صاحب مستقل طور پر بتکلف انگریزی بول رہے تھے۔ یکایک اُن کو کچھ احساس ہوا تو فرمانے لگے:-

"کیا بتاؤں میری اُردو بہت ناقص ہے ...... مگر آپ تو انگریزی جانتی ہوں گی؟"

"جی، میں انگریزی سے اُتنی ہی ناواقف ہوں جتنا آپ اپنی "وطنی زبان" سے"

ایک مرتبہ ایک صاحب بالکل "کانگریسی" لباس میں گاندھی کیپ لگائے تشریف لائے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُن سے کہا گیا:- "اوہو! یہ آج آپ اُلٹا ظرف سر پر کیوں رکھ لائے؟"

نوجوانوں کی دولت کو بیرحمی کے ساتھ لوٹ لینا

"مطربہ" کے پیشہ کے خلاف عصمت فروشی کرنے اور محبت کے نام پر دھوکہ دینے کے علاوہ ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو اپنے دام میں اس طرح

پھانستی ہے کہ آہستہ آہستہ اُن کی ساری دولت اپنے قبضِ تصرف میں لے آتی ہے اور اُن کی دولت کو بے رحمی کے ساتھ لوٹ لینے کے بعد جب وہ نانِ شبینہ تک سے محتاج ہوجاتے ہیں تو نفرت و حقارت کے ساتھ اُنھیں اپنی بارگاہ سے نکلوادیتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ گو بعض خاص مثالیں اس نوع کی مل جائیں لیکن زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔ مردوں نے اپنے اردگرد کی نوجوان عفیف لڑکیوں کو تباہ کرنے میں جتنا حصہ لیا ہے اُس کے مقابلہ میں مطربہ کی تباہ کاریاں صفر کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو ایسے قصے بھی معلوم ہیں کہ دہلی کی بعض "طوائف" نے صرف اتنا معلوم ہونے پر کہ اُن کے بعض قدردانانِ نغمہ و ترنم علیگڈھ کالج سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کی پوزیشن ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے اُن سے "شرکتِ محفل" کا کوئی معمولی معاوضہ لینا بھی گوارا نہ کیا —— میرے "علیگیرین" احباب مجھے اُن کے اس "اجمالی افشائے راز" میں معاف فرمائیں۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ محض الفاظ کے فریب سے اُسے دام میں نہیں لایا جاسکتا۔ اور غالباً یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ہمارے "خوش فکر و خوش نظر" ادیب "استلذاذ بالمثل" کو بھی اس کے مقابلہ میں مرجح سمجھتے ہیں۔

"مطربہ" کی عصمت فروشی

مطربہ کی عصمت فروشی کا ڈھول بڑی شدت سے پیٹا جاتا ہے اور اسی بنا پر اُس سے نفرت کی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک کے "خوش فکر و خوش ذوق" شعراء و اُدباء سے پوچھئے کہ وہ اُن بے ریش و بروت لڑکوں اور نوجوان لڑکیوں کی "ملاقاتوں" کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جو ایک حیثیت سے اُن کی نگاہِ محبت و دیوانگی کا مرکز ہوتی ہیں۔ حقیقۃً اگر صرف عصمت فروشی قابلِ نفرت سمجھی جاتی تو ہمارے ملک کے شاعروں، ہمارے کالج کے پروفیسروں اور ہماری درسگاہوں کے طالب علموں کے واسطے ملامت سے بچنے کے لئے دُنیا میں کوئی راہِ نجات میسر نہ آتی۔ لیکن ہماری سوسائٹی کی جو کچھ حالت ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ جس نوجوان کی زندگی کے تجربات میں کم از کم دو تین دوشیزہ لڑکیوں اور چند حسین "نوخیز لڑکوں" کی فریب دہی کے "رومانی" واقعات شامل نہ ہوں وہ جمالیاتی احساس سے یکسر بیگانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اُس کی معیت و مصاحبت ہر ایک کے لئے وبالِ جان ہوتی ہے۔

ہندوستان کے ایک مشہور مدرسۃ العلوم میں ایک حسین لڑکی بی۔ اے میں داخل ہوئی، چونکہ حُسن کے علاوہ ثروت و دولت سے پوری طرح بہرہ یاب تھی اس لئے پروفیسروں تک کی نگاہوں کا واحد محور بن گئی چنانچہ ایک فاضل پروفیسر نہایت فخر کے ساتھ اپنا یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں "—— ایک دفعہ میں اور وہ تنہا بیٹھے تھے —— میں نے کہا:۔

"میں آپ سے ایک چیز مانگنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے"
"مگر ایسا نہ ہو کہ میری استدعا رد کر دی جائے"
"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں"
"ایک بچہ"

یہ واقعہ اُن کی زندہ دلی، ظرافت طبعی اور خوش ذوقی کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اس قسم کے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا کہ آخر وہ کیوں "نوخیز لڑکوں" پڑوس کی عفیف کنواریوں یا شہر کی غریب عورتوں کی زندگیاں تباہ کرنے کے بجائے "بازار عصمت" کے علانیہ خریدار نہیں بنتے۔ لیکن اس کے جواب میں وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے کہ وہاں جانا زیادہ معیوب ہے۔ حالانکہ اُن کے اس طرزِ عمل کی توجیہہ اسکے سوا اور کچھ نہیں کی جاسکتی کہ اس طرح وہ سینکڑوں کر و دغل کے ساتھ اپنے شکار کو کم سے کم قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں لیکن دوسری صورت میں اُنھیں اس کی پوری پوری قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔

پھر اگر ہماری بیویوں میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ "مرد و عورت کے اتصال" کی تمام اغراض کی تکمیل بوجہِ احسن کر سکیں تو مطربہ کے وجود کی اہمیت خود بخود فنا ہو جائے، اور یہ "پیشہ" اپنے آپ ختم ہو جائیگا۔ لیکن جب تک اس کا بازار گرم ہے اُس وقت تک یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہماری بیویوں نے "آلامِ حیات سے آسودگی" کے پہلو کو اپنا لیا ہے۔ کسی چیز کی "مانگ" اُس کی "ضرورت" کا ثبوت ہے۔ اور اس لئے جب تک مطربہ کے دروازہ پر موٹریں رُکتی رہینگی اُسوقت تک، یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ضرورت ختم ہو گئی یا ہم اس کو قابلِ نفرت وحقارت سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔

"آلامِ حیات سے آسودگی" کے دیگر ذرائع

یہاں یہ امر بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ "آلامِ حیات سے آسودگی" عکاس خانوں تھیٹروں، دلچسپ کتابوں، ناولوں اور افسانوں میں بھی ممکن ہے۔ لیکن جو آسودگی ایک سیماب وش اور متبسم پیکرِ ناز کی معیت میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور طرح حاصل نہیں ہوسکتی۔

موجودہ معاشرت میں مطربہ کی پوزیشن

اگر مطربہ کو ہماری زندگی سے علیٰحدہ کر لیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہماری روح کو بدترین طور پر داغدار بنانے کی دعوت دی جارہی ہے۔ ہماری اخلاقی دنیا کو بالکلیۃ تیرہ و تار کیا جارہا ہے۔ اور ایک بے کیف "جنسی اختلاط" کے علاوہ ہماری زندگی کی تمام رومانیت ہم سے چھینی جارہی ہے۔ اور ہمیں اُن عورتوں کے چارج میں سونپا جارہا ہے جو چند محدود و بے کیف باتوں کے علاوہ ہم سے گفتگو نہیں کر سکتیں۔ یقیناً جب تک عورت پردہ کے قفس کی "بے زبان" چڑیا ہے۔ جب تک اُس کے پر و بازو کی طاقتیں محروم پرواز ہیں۔ جب تک اُس کی ذہنی و دماغی سطح مرد کے مقابلہ میں بے انتہا

پست ہے۔ جب تک وہ فنونِ لطیفہ سے ناآشنا ہے۔ جب تک وہ قیام و قعود کے آداب سے ناواقف ہے۔ جب تک وہ انسانی جذبات کی نازک ترین لہروں سے نابلد ہے۔ جب تک وہ ظریف دلطیف گفتگو کرنیکے کے سلیقہ سے بے خبر ہے ——— اُسوقت تک حرف "مطربہ" کا وجود ہی ایک ایسا سرسبز جزیرہ ہے جو زندگی کے اس یک رنگ و یکساں (Monotonous) سمندر میں ہمارے سفر کی تعب انگیزی کو کافی حد تک خوشگوار بنا دیتا ہے۔

ورنہ دنیا میں پھر، کیا جائے ——— نکاح و عقیقہ؟

سید ابو سعید بزمی۔ ایم۔ اے

"نگار" جنوری ۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چندر بردائی۔ اور اس کے ہمعصر شعرا۔ جگ نائک۔ سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورو گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعرا معہ نمونۂ کلام اس عہد کے مختلف شعرا اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ۔ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔

ہندی شاعری کا دوسرا دور:۔ (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور انکے پہلے کے بھگت شعرا۔ مقلدین رامانند۔ بھاؤنند۔ رے داس بھگت۔ کبیر۔ گورو نانک دیو۔ میراں بائی۔ ملک محمد جائسی۔ تلسی داس۔ سور داس۔ عبدالرحیم خانخاناں وغیرہ

ہندی شاعری کا تیسرا دور:۔ (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیسو داس کے ہمعصر سندر داس سیناپت بابا دین۔ دیال گر۔ بھوشن۔ متی رام۔ چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعرا اسی عہد کے بعض رزم گو شعرا، ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔

ہندی شاعری کا دور چہارم:۔ (۱۸۵۷ء کے بعد) للولال۔ سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار۔ بھارتندو بابو ہرشچندر۔ پدماکر۔ بینی پردین۔ سری دھر پھاٹک کی شاعری شعرا حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کیے جائیں گے اور اُردو رسم الخط میں بھی۔ ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت ۸؍ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لیجائے گی۔   منیجر نگار

دولت کی مساوی تقسیم

عام طور پر ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ غربت انسان کے لئے نہایت تکلیف دہ چیز ہے۔ اور ہر غریب انسان بہت بدقسمت ہوتا ہے۔ لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ غریب لوگ اس حالت میں بھی کہ وہ شدت کی بھوک اور مہلک سردی میں مبتلا ہیں، دوسرے لوگوں سے زیادہ مسرور نظر آتے ہیں۔ تم کو ایسے بہت سے آدمی نظر آئینگے جو ساٹھ برس کی عمر میں چالیس سال پیشتر کی زندگی سے دس گنا زیادہ امیر ہیں لیکن ان میں ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو یقینی طور پر کہہ سکے کہ وہ پہلے سے دس گنا زیادہ مسرور و مطمئن بھی ہے ـــــ تمام مفکرین عالم اس بات پر متفق ہیں کہ حصولِ مسرت مال و دولت پر منحصر نہیں ہے بلکہ نفسی کیفیات سے متعلق ہے۔ دولت بھوک کا علاج کرسکتی ہے لیکن غم دائم کو دور نہیں کرسکتی۔ ایک مشہور جرمن اشتراکی فرڈیننڈ لیسیلے (Ferdinand Lassalle) کہتا ہے کہ غربا کو فلاکت و عسرت کے مقابل صف آرا کرنے کے لئے میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور اس کی وجہ اُن کی "بے احتیاجی" تھی ـــ بے احتیاجی کے معنی یہ نہیں کہ ان کو کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اُن میں اسقدر تڑپ نہ تھی۔ کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرکے اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کرلیتے۔ ایک غریب عورت عظیم الشان محل، ورجنوں پوشاک، بے مثل خوبصورتی، اور حسین بالوں کی تمنائیں پال سکتی ہے لیکن ایک صاحب ثروت عورت جو ان تمام اسباب سے بہرہ ور ہوتی ہے۔ کسی سنسان مقام پر رہ کر ان سے رہائی کی کوشش کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گھنٹوں نہانے، دھونے، کنگھی چوٹی اور لباس تبدیل کرنے میں منہمک رہنا۔ اور ہر وقت خادماؤں سے گھرا رہنا نہایت تکلیف دہ ہے۔

ایک رندِ مے نوش ازاہدِ خشک سے زیادہ مسرور رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس عادتِ بد کا شکار ہوجاتے ہیں ـــ بہت سی ایسی دوائیں ہیں جو نہایت کیف آور ہوتی ہیں۔ مگر انکا استعمال جسم و روح دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔ الغرض مسرت کی جستجو دولت یا دیگر اسباب تفریح میں کرنا مفید نہیں ہے اور جب تک خود نفس میں کوئی کیفیت انبساط نہ پائی جائے تمام مادی ذرائع بیکار ہیں۔ موجودہ غربت وہ نہیں ہے جو پہاڑ والے وعظ میں نہایت مبارک بتائی گئی تھی بلکہ یہ غربت وہ غربت ہے جو ذلت و پستی

کی علمبردار ہے، جو غریبوں کو ذلیل کرتی ہے۔ ان کو حقیر بتاتی ہے ورنہ یوں تو غریب اپنی غربت میں بھی اتنا ہی خوش رہ سکتے ہیں۔ جتنا امیر لوگ اپنی نشاط سامانیوں میں۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ غربت جو ہر شہر و قصبہ میں پائی جاتی ہے۔ لوگوں کو پستی کی طرف ڈھکیل رہی ہے اور اس طرح تمام ماحول کو مسموم کر رہی ہے اور اپنا حلقۂ اثر وسیع کر کے بر اعظم بلکہ تمام مہذب دنیا میں نفوذ کر جائیگی جب متعدی اور مہلک امراض آغوشِ غربت میں پرورش پاتے ہیں۔ تو اُمرا اور اُن کے بچے بھی ان میں مبتلا ہو کر مرسکتے ہیں۔ اور جب ناداری و مفلسی جرائم کا باعث ہوتی ہے تو امرا ہی ان سے زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں اور جب فلاکت زدہ خوبصورت عورتیں کسبِ روزی کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرتی ہیں۔ تو امیرزادے اُن کی صحبت سے متاثر ہو کر اپنی بیویوں اور بچوں کو مبتلائے امراض کر دیتے ہیں۔ جو بعض اوقات بدبختی، بے بصری اور موت کا باعث ہوتے ہیں۔

یہ فرسودہ خیال کہ ہم اپنی دنیا صرف اپنے ہی تک محدود کرلیں یہاں تک کہ قرب و جوار سے بھی غیر متعلق ہو جائیں ایک خطرناک غلطی ہے۔ یہ ضرب المثل کہ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ صرف مقدس گرجاؤں ہی میں (بے سوچے سمجھے) پڑھے جانے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جسے ہر شخص کو سمجھنا چاہئے ممکن ہے کسی شہر کے امرا وہاں کے غریب لوگوں سے بچ کر بستی سے دور رہنا اختیار کریں مگر اُن مہلک امراض سے جاں بر نہیں ہوسکتے جو غریب آبادی کی غربت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔

لوگ ایک محدود دائرۂ حیات میں رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ مگر صرف اسی طرح کہ غربت کا استیصال کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک یہ باقی ہے، اُسوقت تک یہ ناممکن ہے کہ امرا مفلسی کے دردناک مصائب، غریبوں کی کرب انگیز چیخ پکار اور اُس کے اثرات بد کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں۔ یا مطمئن ہو جائیں کہ اس کا خوفناک حملہ اُن پر اثر انداز نہ ہوگا۔ علاوہ ازیں جب تک غربت دنیا میں موجود ہے، ہم قطعی و حتمی طور پر یقین نہیں کر سکتے کہ اس کی جال گداز گرفت سے آزاد ہیں ؟ ― اگر ہم دوسروں کے لئے غار کھودیں گے تو ممکن ہے ہم ہی پہلے اس میں جاگریں۔ اور اگر ہم کسی خطرناک نشیب کو بغیر حفاظتی تدابیر کے کھلا چھوڑ دیں تو بعید از قیاس نہیں کہ ہمارے ہی بچے، کھیلتے کھیلتے اس میں جاگریں۔

ایک بیکار و مفلس آدمی کی بابت یہ کہہ دینا نہایت آسان ہے کہ غربت اس کے لئے تازیانہ ہے اور یہ کہ اسے غریب ہی رہنے دو۔ کیونکہ اس کے لئے یہی بہتر ہے۔ لیکن اس خیال کی اشاعت سے قبل یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ مفلس و بیکار آبادی کی مصیبت نہایت وسیع الاثر چیز ہے اور اس سے امرا کا طبقہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

لہٰذا معقول و مناسب تقسیم دولت کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر شخص کو اتنا حصہ ملنا چاہئے جو غربت و ناداری سے اُس کو محفوظ رکھ سکے۔ تقسیم دولت کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ملکہ الزبتھ کے زمانۂ حکومت سے انگلستان کا قانون ہے کہ کوئی متنفس اس بے چارگی کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قانون کا استعمال صحیح طور پر نہیں ہوتا اور بسا اوقات ایسی نامعقول شرطیں لگا دی جاتی ہیں کہ ایک غریب مگر شریف الخیال شخص اس قانون سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

اب ہم ایک ملک کو بڑا گھرانا تصور کرتے ہیں۔ اور تمام قوم کو خاندانی افراد۔ اچھا اس خاندان کا بنظر غور مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہماری نظر بھوکے، ننگے اور خانماں برباد بچوں پر پڑتی ہے۔ وہ تمام روپیہ جو ان کا پیٹ بھرنے، تن ڈھانکنے اور سر چھپانے پر خرچ ہونا چاہیئے تھا۔ وہ عطریات، زیورات، تفریحی و نمائشی کتوں۔ قیمتی موٹروں اور اسی قسم کی بہت سی فضول چیزوں پر صرف ہوتا ہے۔۔۔ اسی گھرانے میں ایک بہن کے پاس پھٹے کپڑے بھی نہیں کہ سردی سے محفوظ رکھ سکیں، اُس کے پاس غلاظت صاف کرنے کے لئے ایک پھٹا معمولی کپڑے کا رومال تک نہیں۔ مگر دوسری بہن کے پاس بکثرت قیمتی جوڑے اور درجنوں ریشمی رومال ہیں، ایک پراگندہ حال معصوم بچہ روٹی کے ایک خشک ٹکڑے سے بھوکے پیٹ کی تسکین کرنا چاہتا ہے مگر بے حال ہو کر اپنی دُکھی ماں ۔ نان و شبینہ سے محروم ماں، کے دامن کو کھینچتا ہے کہ وہ اُس کا پیٹ بھر دے۔ یہ تحمل فرسا نظارہ ماں کا دل توڑ دیتا ہے۔ مگر اُسی قوم کا دوسرا فرد کسی عالی شان ہوٹل میں جا کر بیسیوں روپئے صرف ایک کھانے پر صرف کر دیتا ہے۔ اور پھر کسی کلب میں جا کر داد عیش دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ طرز زندگی کسقدر دل شکن اور حوصلہ فرسا ہے۔ اور جب کسی شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ ایسا کیوں ہے۔ تو وہ جواب دیتا ہے۔ وہ چالیس جوڑے رکھنے والی عورت اور ہوٹلوں میں مسرتانہ زندگی بسر کرنے والا آدمی دونوں صاحب ثروت والدین کی اولاد ہیں۔ اور ٹوٹے جوتے والی لڑکی اور بھوک سے بلبلانے والا بچہ دونوں نہایت ذلیل اور پست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔" یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قوم جو بھوکے بچوں کو دودھ پلانے کے بجائے اُمرا کی بادہ خواریوں پر روپیہ ضائع کرتی ہے اور وہ قوم جو لذیذ و بیش قیمت کھانوں سے نمائشی کتوں کی پرورش کرتی ہے۔ اور یہ نہیں دیکھتی کہ چھوٹے چھوٹے انسانی بچے پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہونے کے باعث مر رہے ہیں یقیناً نہایت جاہل قوم ہے اور اس کے نصیب میں یقینی موت اور ہلاکت ہے۔

سوسائٹی کے یہ نقائص صرف دولت کی غیر مساوی تقسیم سے از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک امیر آدمی بھی روٹی۔ کپڑا۔ مکان خریدنے کی ضرورت رکھتا ہے۔ اور ایک غریب آدمی کو بھی یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب غریب آدمی اپنی ایک ایک پائی تک ان ضروریات پر صرف کر دیتا ہے۔ تو اُسوقت بھی اُس کو شکایت رہتی ہے

کہ کھانا ناکافی ہے، کپڑے میلے ہیں، اور مکان تنگ ہے۔ اس کے برعکس امیر کے پاس لذیذ کھانے، مکلف کپڑے اور عالی شان مکان حاصل کر لینے کے بعد بھی اس قدر دولت بچ رہتی ہے کہ شراب و کباب میں صرف کرے۔ پھر صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب کی یہ غم آلود چیخ سنائی دیتی ہے کہ مجھے پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا چاہیئے اور دوسری طرف عیش و عشرت میں کھیلنے والا امیر کہتا ہے کہ مجھے استے موٹر چاہیئے ایک ہلکا، سبک رفتار، تفریحی جہاز چاہیئے، میری بیوی کے لئے موتی اور ہیرے چاہیئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاروباری لوگ موٹر کار اور جہاز بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، افریقہ کی کانوں سے مہینوں کی کوہ کنی کے بعد جواہرات لائے جاتے ہیں، اور موتیوں کے لئے سمندر کھنگالے جاتے ہیں۔ مگر غریب اور اُسکی چیخ و پکار کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ امیروں کی ان خواہشوں کی وجہ سے مزدوروں کو کام کرنے کا موقع میسر آجاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مزدوروں ہی کو اس دولت میں سے کیا ملجاتا ہے۔

یہ کہنا کہ امیروں کی دولت بے کاروں کے لئے کام کاج مہیا کرتی ہے۔ قابلِ پذیر عذر نہیں ہے۔ کام کا مہیا کرنا کوئی قابلِ تعریف کام نہیں۔ ایک خونخوار قاتل بھی، پھانسی دینے والے کے لئے وجۂ معاش ہے اور ایک موٹر ڈرائیور جو کسی کو اپنے موٹر سے کچل دے وہ بھی ایک ڈاکٹر۔ ایک کفن دوز، ایک پادری۔ ایک ماتمی لباس بنانے والے کو کام پر لگا دیتا ہے لیکن کیا ایسا کام پر لگنا کوئی قابلِ تعریف بات ہے۔

وہ تمام روپیہ جو یوں غیر ضروری مدوں میں صرف ہوتا ہے مساوی تقسیم دولت کے بعد، صحیح اور جائز ضرورتوں میں کام آسکتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت اتنا فالتو روپیہ نہیں ہوگا کہ موٹر کاریں اور جواہرات خریدے جائیں۔ اُس وقت بھوکوں کا پیٹ بھرنا، ننگوں کا تن ڈھانکنا اور خانماں برباد وں کا سر چھپانا فرضِ اولین سمجھا جائے گا۔

اُس وقت نمود و نمائش مٹ جائے گی بے کاری جاتی رہے گی۔ خسران و نقصان فنا ہو جائیں گے اور دنیا میں زیادہ امن و سکون نظر آئے گا۔ مساویانہ طور پر تقسیم دولت ناممکن العمل چیز نہیں ہے بلکہ ایک عرصۂ مدید کی آزمودہ چیز ہے۔ متمدن دنیا کے بہت سے کام ہمیشہ سے اسی اشتراکی اسلوب کے مطابق کئے جاتے ہیں اور کئے جایا کریں گے۔ اس طریقۂ کار میں چھوٹے، بڑے، کالے، گورے، جوان اور بوڑھے، کوارے اور بیاہے کی تقسیم و تمیز نہیں ہے۔ ایک پیشے میں طے شدہ اُجرت ہے، اور ہر کام کے لئے مقررہ مزدوری ایک سپاہی اور ہر کارے کی تنخواہ، ایک مزدور اور معمار کی مزدوری، ایک جج اور پارلیمنٹ کے ایک رکن کی تنخواہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ کوئی ان میں سے سو پاؤنڈ سالانہ پاتا ہے اور کوئی پانچ ہزار مگر ہر سپاہی ہر جج اور ہر ایک رکن کی تنخواہ مساوی و برابر ہوگی۔ اُن میں کسی قسم کا اختلاف ناممکن ہے۔ اگر کسی ڈاکٹر سے

پوچھا جائے کہ اُس کی فیس معائنہ پانچ روپیہ کیوں مقرر ہے وہ دس روپیہ کیوں نہیں لیتا۔ تو غالباً اسکے پاس اس سے بہتر اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا کہ میں وہی فیس لیتا ہوں جو دوسرے میرے ہم پیشہ ڈاکٹر لیتے ہیں۔
اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر ہر شخص کو مساوی حصّۂ دولت دیا جائے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد پہلے کی طرح پھر امیر و غریب کی تفریق پیدا ہو جائے گی۔ اُس کو اُن ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی مثالیں بتائی جائیں جو مساوی و مقررہ تنخواہیں لیتے ہیں۔ اور اپنی تمام زندگی اُسی یکسانی اور مساوات کے ساتھ بخیر و خوبی گزار دیتے ہیں۔ اور کوئی انقلاب انگیز بات پیش نہیں آتی۔ وہ حالات جن میں کوئی غریب آدمی، امیر ہو جاتے، استثنائی واقعات میں اور امیروں کا غریب ہو جانا بھی محض اتفاقات پر مبنی ہے۔ عام روش یہ ہے کہ ہم پیشہ و ہم مشرب لوگوں کو مساوی و مقررہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور وہ اتنی میں ایک ہی طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن میں نہ کوئی غریب تر ہو جاتا ہے اور نہ زیادہ امیر بن جاتا ہے۔

ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ایک پوسٹ مین کو۔ پوسٹ ماسٹر کے برابر تنخواہ ملا کرے اور پوسٹ ماسٹر کو دوسرے کارکنوں کے برابر۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک جج کو، بحری کپتان کے برابر تنخواہ دینے سے ہمارا مقصد بالکلیت پورا ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیوں کیا جائے۔ کہ ایک جج بحری کپتان سے پانچ گنا زیادہ روپیہ لے۔ اور اگر کپتان اس بیجا تفریق کا سبب دریافت کرے اور تم اس سے کہو کہ جج کے برابر تنخواہ لینے سے بھی تم سال کے آخر میں مثل سابق غریب ہو جاؤ گے۔ تو وہ یقیناً ایسے درشت و مکروہ الفاظ میں جواب دیگا کہ تم سننے کی تاب نہ لا سکو گے لہٰذا اشتراکی یا مساوی تقسیم دولت کے متعلق ایسی پوچ۔ لغو اور بے سرو پا باتیں کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے تقسیم دولت کا یہ طریقہ نہایت سادہ اور سریع الفہم ہے۔ یہ صرف عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقلاً عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

(شا) ا۔ ج

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

کی

طباعت ختم کے قریب ہے

عورت کی منطق

جب وہ جنگ کے لئے آمادہ ہوجائے

لیڈی ڈرامونڈ انگلستان کی مشہور صحافت داں خاتون ہیں اور ٹھیک اسوقت جبکہ ساری دنیا امن سکون کے لئے بیتاب ہے، وہ جنگ ہی کو انسانیت کے لئے مفید بتاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اس منطق کے سامنے مشکل ہی سے کسی کو یارائے گفتگو ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:-

انسانیت کے لئے جنگ امن وسکون سے زیادہ حریت نواز ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جنگ نے کسی قوم کی روح کو فنا کیا ہو یا اس کے اخلاق کو تباہ کرکے برباد کر دیا ہو بلکہ یہ برکت صرف عشرت وتنعم کی ہے جو جمود وتعطل پیدا کرکے قوموں کو ہلاک کر دیتی ہے، روما کی ہلاکت کا سبب جنگ نہیں بلکہ عیش وتنعم تھا جو افراد قوم کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور جس نے آخر کار اسے ایک بے حس وبیکار قوم بنا کر چھوڑ دیا، آج تک انسانیت نے جو ترقی حاصل کی ہے۔ خواہ وہ ترقی مادی ہو یا اخلاقی مرہون ہے صرف جنگ کی، جنگ نوع انسانی کے جسم پر ایک عمل جراحی ہے جس کے بعد اس میں زیادہ قوت حیات پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ ایک قوم کا حال جنگ سے پہلے کیا تھا اور جنگ کے بعد اس کے قوائے عمل میں کتنا تغیر پیدا ہو گیا۔ روحانی ترقی کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک خواہشات سے جنگ نہ کیجائے حاصل نہیں ہو سکتی۔

سر ہاری مالٹ اور میجر باردی کا قول ہے کہ:- "جنگ اشکال ریاضی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے" چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کو دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا تھی۔ وہ صرف علم کی لڑائی تھی، ریاضی کی جنگ تھی اور آخر کار وہی کامیاب ہوا جو زیادہ ریاضی داں اور زیادہ صاحب علم ثابت ہوا۔ گزشتہ زمانہ میں بھی جنگ ریاضی کے کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلوتارخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ارشیداموس نے جب سب سے پہلے تیر کو دیکھا جو صقلیہ سے لایا گیا تھا تو یکایک اس کے منھ سے یہ چیخ نکل گئی کہ "یا خدا! کیا اب سچی شجاعت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیگی" اس زمانہ کی جنگیں بھی وہی ریاضی کا کھیل ہیں لیکن زیادہ دقیق، زیادہ عسیر الفہم اور جس طرح ارشیداموس

نے سب سے پہلا تیر دیکھ کر حیرت کی تھی، اسی طرح اب بھی بعض غیر ریاضی داں دماغ ان کو شجاعت کے منافی سمجھتے ہیں۔ جنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک، تاریخ کی بنیاد ہمیشہ اسی پر قائم ہوئی ہے وہ ایک نغمہ ہے جسے ہر زمانہ میں ہر جگہ انسان گاتا ہے۔ وہ لوگ جو دنیا سے جنگ کو مٹا دینا چاہتے ہیں وہ گویا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا صدیوں پیچھے ہٹ جائے کیونکہ دنیا اب اس کے لئے طیار نہیں ہے کہ مسیح دوبارہ تشریف لاکر اس کو امن وسکون کا وعظ دیں۔ کیا دُنیا میں بغیر تکلیف ومصیبت برداشت کئے ہوئے کوئی نعمت حاصل ہوسکتی ہے۔ تمام اہل مذاہب کا اعتقاد ہے کہ جب تک تکالیف جسمانی برداشت نہ کی جائیں روحانی واخلاقی ترقی حاصل نہیں ہوسکتی۔ پھر ہم کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں کہ مجتمع انسانی جمود وبے حسی کے عالم میں مسرت وسعادت سے ہمکنار ہوسکتا ہے اور بغیر کسی ایسی چیز کے جو اسے آگے بڑھنے پر اُبھارے وہ ترقی کے زینہ پر قدم رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ اُبھارنے والی چیز کیا ہے؟ جنگ اور صرف جنگ۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ سلطنت فارس ناقابل تسخیر ہے لیکن جب سنہ ۹۰ قبل مسیح میں انھوں نے فارس سے جنگ کی تو معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا اور آخرکار اسی کامیابی نے یونان کو علوم وفنون کا مخزن اور موجودہ تہذیب یوروپ کا گہوارہ بنا دیا۔ پھر جب تک یہ جنگجویانہ عہد اسپارٹا قائم رہا، یونان کی برتری بھی قائم رہی اور جب وہ عیش وراحت میں پڑ گیا تو فنا ہوگیا۔

اب خود اہلِ برطانیہ کی ترقی کی تاریخ پر نظر ڈالئے کہ اس کی ابتدا کب ہوئی۔ پھر کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اگر سنہ ۵۵ (ق۔م) اہلِ روما اُن سے جنگ نہ کرتے تو وہ بدستور وحشی بنے رہتے۔ اس سے قبل یہ بالکل جاہل وغیر مہذب تھے، انھیں تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی مگر جب اہلِ روما داخل ہوئے تو انھوں نے انھیں مہذب بنایا اور موجودہ تمدن سے روشناس کیا۔ انھوں نے انواع واقسام کے درخت لگائے، جھاڑیوں وغیرہ کو کاٹ کر زمین کو کاشت کے قابل بنایا۔ ایسے مقامات کا پتہ چلایا جہاں معدنیات پائی جاتی ہیں چنانچہ ڈین کے جنگل سے لوہا نکلا، کورنوال کی معدن سے ٹین دستیاب ہوا، مونٹگومری سے تانبہ اور سیسہ برآمد ہوا۔ اور شرودشیر سے کوئلہ۔ علاوہ اس کے پچاس قلعہ بند شہر طیار کئے جن میں سے ایک لندن بھی تھا۔ اس کے بعد جب سنہ ۱۰۶۶ء میں نارمنڈیوں نے جنگ کی تو ترقی وآزادی کی طرف دوسرا قدم اُٹھایا اور میگنا چارٹا حاصل کیا جو دستور آزادی کی پہلی بنیاد تھا۔ پھر جب داخلی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۱۴۸۵ء میں ہنری سابع (ٹیوڈر خاندان کا پہلا فرمانروا) تخت نشین ہوا اور اس طرح گویا سب سے پہلے دمیقراطی حکومت کی بنیاد پڑی اور بحری قوت کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس کے لوئیس چہاردہم اور انگلستان کے فرمانروا ولیم ثالث سے جنگ ہوئی جس میں فرانس کے خلاف ہالینڈ اور اسپین بھی

انگلستان کے شریک تھے۔ اور اس کا نتیجہ بھی اہل تاریخ سے مخفی نہیں کہ اگر لوئیس کے خلاف یہ جنگ نہ کیجاتی تو پروٹسٹنٹ مذہب فنا ہو جاتا اور تمام مغربی یورپ پر فرانسیسی استبداد کی حکومت قائم ہو جاتی۔

اسی کے ساتھ اس جنگ کو دیکھئے جو فرانس اور پروشیا کے درمیان ستر سال تک جاری رہی کہ جدید جرمن حکومت کی بنیاد اسی کی وجہ سے پڑی اور پاپائے روم کو جو دینوی اقتدار حاصل تھا وہ بھی اسی سلسلۂ جنگ کی وجہ سے محو ہوا۔

اب جاپان کی جنگوں کو دیکھئے جو اس نے چین اور روس سے کیں کہ اگر چین کو ہزیمت نہ ہوتی تو وہ قیامت تک خوابِ عظمت سے نہ چونکتا اور اگر روس کو شکست نہ ہوتی تو استبداد قیصری شاید اب بھی وہاں قائم رہتا۔

اب رہگئی گزشتہ جنگ عظیم، سو اس کے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی ترقی، جدید آلات حرب کے سلسلہ میں میکانکی اکتشافات، مدافعت کے عجیب و غریب علمی ذرائع افواج کی جدید تنظیم، بحری جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی جدتیں، طرح طرح کی گیسوں کی ایجاد، قلعہ بندی و تحفظ کی نئی نئی تدبیریں، الغرض ریاضی، سائنس اور کیمیا کا کونسا چھپا ہوا راز ایسا تھا جو اس جنگ کی بدولت ظاہر نہیں ہوا اور ان اکتشافات کے بدولت وہ کونسا شعبۂ تمدن ہے جو متاثر نہ ہوا ہو۔

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" حسن و شوق کی مکمل داستان ہے اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک ۱۲ ضخامت ۲۳۲ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔ یو پی

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

ایک مدت سے کلیات خاقانی کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس محفوظ ہے اس میں خاقانی کے قصاید مراثی مندرج ہیں یعنی کلیات کا یہ پہلا حصہ ہے، اہل نظر جانتے ہیں کہ خاقانی نے اپنا سارا سرمایۂ خیال اور زورِ قلم قصاید پر صرف کیا ہے اس میں شک نہیں اس کے یہاں عرفی کی طرح شاعرانہ حلاوت و شگفتگی نہیں پائی جاتی اسی لئے اس کے قصاید عوام میں قصاید عرفی کی طرح مشہور و دلپسند نہیں خاقانی کی دقت پسندیوں نے اسکو تغزل کے میدان میں تو بالکل مجہول بنا دیا یہاں تک کہ اس کی غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ اپنی بے نمکی کے باعث ایک دفتر بے معنی سمجھا جاتا ہے، رہگیا مجموعہ قصاید تو اس میں بھی عوام کے لئے سامان تفریح نہیں ہاں جو لوگ ادب عالیہ اور انشائے لطیف پر نقادانہ نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح عرفی اور خاقانی کے قصاید کا فرق و امتیاز سمجھ سکتے ہیں عرفی کی نزاکت تخئیل، معنی آفرینی اور روانی بیان مسلم ہے، خاقانی کے یہاں بھی یہ سب کچھ ہے لیکن تلمیحات نے اس کے کلام کو ادق بنا دیا وہ جس آزادی کے ساتھ قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ، تاریخ و سیر، ریاضی و حکمت، فلسفہ و تصوف، نجوم و ہیئت کے مسائل کی طرف اپنے قصاید میں اشارے کرتا ہے وہ اسقدر بلند سطح کی چیزیں ہیں کہ فکر عامہ کی وہاں تک رسائی نہیں اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ فارسی شعراء میں ملٹن کا کوئی مقابل ہے تو میں فوراً خاقانی کا نام لے دوں گا ملٹن کی "فردوس مفقود" (Paradise Lost) کا ایک سرسری جائزہ لیجئے اور اس کے بعد قصاید خاقانی پر ایک نظر ڈالئے آپ فوراً اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ملٹن اور خاقانی کی بدایعہ انشا اور اسلوب تحریر میں ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے[1]۔

---

[1] الیور کرامول (Oliver Cromwell) کا زمانہ ہے انگلستان میں جمہوریت قائم ہو چکی ہے۔ م

اوراق ہذا میں قصاید خاقانی کے اس حصہ سے بحث کی جائے گی، جس میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کیجائے نجوم کے بعض تاریخی شواہد اور علمی نکات پر روشنی ڈالنا ازبس ضروری ہے۔

میرا یہ مضمون جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے تین حصوں پر منقسم ہے پہلے حصہ میں نجوم کے متعلق تاریخی و علمی مباحث ہوں گے، دوسرے حصہ میں خاقانی کے سوانح حیات سے بحث کی جائے گی اور تیسرے حصہ میں اس کے قصاید کے ان ابیات کی شرح وبسط ہوگی جن میں شاعر نے منجمانہ نکتہ سنجیاں کی ہیں۔

احکام نجوم کے متعلق تاریخ میں بہت سے دلچسپ اور معتبر واقعات نظر آتے ہیں یہاں تک کہ حدیث اور اسماء الرجال میں بھی جستہ جستہ اس کا تذکرہ آجاتا ہے امام بخاری نے ہرقل کے متعلق ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں آنحضرت صلعم کے اس خط کی نقل کی ہے جو آپ نے ۶ھ میں دحیہ کلبی کے ہاتھ بصری کے حاکم کو بھیجا تھا (اور اس نے وہ خط ہرقل کو بھیجدیا) اور جس میں ابوسفیان اور قریش سے پیغمبر صلعم کے متعلق ہرقل کے سوال وجواب کی تفصیل پائی جاتی ہے اسی حدیث میں ضمناً بخاری نے یہ بھی لکھا ہے:۔

قال ابن الناطور کان ہرقل حزاءً ینظر فی النجوم فقال لہم حین سالوہ انی رأیت اللیلۃ حین نظرت فی النجوم ملک الختان قد ظہر[1]	ابن ناطور نے کہا ہرقل ستارہ شناس تھا لوگوں نے اس سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ رات کے وقت جبکہ میں نے ستاروں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا

ابن ناطور ایلیا کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا پیر پادری تھا اس نے بتایا کہ

صفحہ ۱۶۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک کرامول کا اقتدار رہا اس عہد میں ملٹن کی شخصیت بھی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے چنانچہ کرامول کی سیاسی کامرانیاں بہت کچھ ملٹن کی عالمانہ سعی کی منت پذیر ہیں، وہ لاطینی زبان کا ماہر اور "معتمد خارجہ" (Foreign Secretary) کے عہدہ پر فائز تھا اجنبی ممالک والوں سے خط وکتابت لاطینی زبان میں ہوتی تھی، عہد حاضر میں ترکی کے اندر مصطفےٰ کمال اور عصمت پاشا کی جو شخصیتیں ہیں وہی حالت الیور کرامول اور ملٹن کی تھی، فرق صرف یہ ہے کہ ملٹن ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا اور عصمت پاشا صرف ایک سیاسی مدبر اور علامہ ہیں ہاں بحث یہ تھی کہ ملٹن لاطینی زبان کا ماہر تھا "خلد گم شد" کا ہر صفحہ اس کے ذوق لاطینی کا آئینہ دار ہے۔ خاقانی نے جس آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اسلامیات اور خرافیات کے اشارے کئے ہیں اسی طرح ملٹن یونانی اوہام واساطیر اور لاطینی قصص وروایات کی طرف اشارے کرتا ہے۔

[1] بخاری (کیف بدء الوحی)

یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا اس کو خبر نہ تھی کہ مسلمان بھی ختنہ کرتے ہیں اور یہی ہوا کہ مسلمان رومی سلطنت پر قابض ہو گئے ۔

اسی طرح حضرت ابن حبان محدث (متوفی ۳۵۴ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ :-

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت ، فقہ و لغت و طب و نجوم را نیک می دانست[۱]

قرون اولیٰ میں طب کے ساتھ نجوم کو خاص تعلق تھا چنانچہ اطبا نجوم کی بھی باضابطہ تعلیم حاصل کرتے تھے ، ڈاکٹر ڈی آوبر لکھتا ہے :-

> نویں صدی میں جدید ہیئت اجتماعیہ چاہتی تھی کہ اطبا فلسفہ کے بھی حامل ہوں ان کو غذا کی ماہیت ، مزاج جسمانی کا علم بھی حاصل کرنا ضروری تھا ، اور ہر حالت میں اثر کواکب کی واقفیت لازمی تھی ، طبیب منجم کا بھائی تھا ، اور اس کی عزت کرتا کیونکہ علم نجوم طبابت سے کہیں زیادہ بلند مقصد رکھتا ہے[۲]

احکام نجوم کی تصدیق کے سلسلہ میں معتبر مورخین نے بہت سی روایتیں درج کی ہیں ان میں ابو شجاع بویہ دیلمی ابو ریحان بیرونی ، الحاکم بامر اللہ فاطمی ، المعز الدین اللہ اسمٰعیلی ، حسن گانگوی بہمنی کے عہد کی منجمانہ پیشین گوئیاں بہت دلچسپ ہیں ۔

ابو شجاع بویہ دیلمی | چوتھی صدی کے آغاز سے پانچویں صدی کے وسط تک دیالمہ کی حکومت رہی ابو شجاع نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ بہت سخت آگ لگی ہے اور پھیل کر بعض شہروں پر چھا رہی ہے یہاں تک کہ اس کی روشنی آسمان تک پہونچی ، اس کے بعد یہ آگ تین حصوں میں تقسیم ہو گئی ، اور شہر دل اور انسانوں کو دیکھا کہ آگ کے ان حصوں کے حضور میں سجدہ کر رہے ہیں اس عرصہ میں بویہ سے ایک منجم و معبر کی ملاقات ہو گئی بویہ نے اپنا خواب بیان کیا منجم نے کہا یہ بہت بڑا خواب ہے اس کی تعبیر اس شرط پر بتاؤں گا کہ مجھے گھوڑا اور کپڑا انعام دو ، بویہ نے کہا ، خدا کی قسم سوائے اس کپڑے کے جو پہنے ہوئے ہوں میرے پاس دوسرا کپڑا نہیں ہے منجم نے دس اشرفیاں طلب کیں ، بویہ نے اس پر اظہار عجز کیا ، آخر کار منجم نے مجبور و ناچار دیکھا تو کہا تمہارے تین بیٹے ہوں گے اور یہ سب ان آتش زدہ شہروں پر حکمرانی کریں گے ، اور چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہو گی ۔ بویہ نے کہا کیا یہ جائز ہے کہ تم مجھ سے استہزا کرو ، میں مرد فقیر ، میرے بچے تمہارے سامنے ہیں کس استعداد کی بنا پر بادشاہ ہوں گے ، منجم نے کہا ان کی ولادت کی ساعت معلوم ہو تو بتاؤں ، بویہ نے اپنے لڑکوں کی ولادت کی

---

۱ بستان المحدثین صفحہ ۳۸ ۔ ۲ (The History of Philosophy in Islam)

تاریخیں و ساعتیں بتائیں منجم نے احتیاط کے ساتھ درجات طالع اور "نظرات کواکب" پر غور کیا، اور سب سے پہلے بڑے لڑکے عماد الدولہ علی بن بویہ کا ہاتھ چوما اور کہا کہ پہلے یہی لڑکا بادشاہ ہوگا اس کے بعد دونوں لڑکوں معز الدولہ اور رکن الدولہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا لڑکوں نے کہا اباجان اس منجم کو کچھ انعام دیجئے، بویہ خفا ہوا اور کہا یہ شخص تم سے تمسخر اپن کر رہا ہے۔ منجم نے کہا اگر میرے بیان پر تم کو اعتبار نہیں تو کم سے کم یہ عہد کرو کہ جب بلند مرتبہ پر پہونچوگے تو میرے ساتھ مہر و کرم سے پیش آؤ گے، ابوشجاع نے دس درم دئے۔ آج تاریخ کا طالب العلم جانتا ہے کہ منجم کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔

الحاکم بامر اللہ فاطمی فاطمیہ مصر عباسیہ کے زبردست حریف گزرے ہیں تقریباً ڈھائی صدی تک اس خاندان نے حکمرانی کی اس گھرانہ کا مشہور حکمران الحاکم بامر اللہ بہت بڑا منجم گزرا ہے۔ چنانچہ معجم المذاہب والاخلاق (انسائیکلوپیڈیا آف ریلجن اینڈ اتھکس) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ باوجودیکہ وہ فن نجوم میں مہارت رکھتا تھا لیکن اس نے عوام کو اس کی تحصیل سے قطعاً روک دیا تھا۔

الحاکم بامر اللہ کا قاعدہ تھا کہ وہ روزانہ صبح کے وقت ایک گدھے پر سوار ہو کر تنہا ایک پہاڑ پر سیر کے لئے جایا کرتا تھا، ایک دن اس نے زائچہ دیکھا تو کہا کہ اگر فلاں شب کو مجھے کوئی آسیب نہ پہونچے، تو میری عمر اسی برس سے متجاوز ہو جائے گی، جب شب معہودہ آپہونچی اور حاکم نے چاہا کہ پہاڑ کے طواف کے لئے روانہ ہو تو اس کی ماں نے بڑی منت و سماجت کے ساتھ اس کو روک لیا حاکم نے بھی کسی قدر توقف کیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سخت مضطرب ہوا، اور ماں سے کہا اگر مجھے جانے نہیں دوگی تو میری روح جسم سے پرواز کر جائے گی چنانچہ وہ پہاڑ پر گیا اور وہیں درباریوں کی ایک مخالف جماعت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

المعز الدین اللہ اسمٰعیلی یہ بھی فاطمیہ مصر کا ایک مشہور فرمانروا گزرا ہے اس کے متعلق محمد بن خوند شاہ لکھتے ہیں:۔

> المعز الدین اللہ منجمے ماہر بود روزے ملاحظہ زائچہ خویش کردہ در آنجا قاطعے دید ایں صورت را بایکے از ارباب نجوم درمیان نہادہ دراں باب مشورت فرمود منجم گفت خلیفہ را چند روزے مستور باید تا آں نکبت درگزرد، معز ازیں حدیث اعراض نمودے

اس کے بعد معز نے اعیان دولت کو جمع کیا اور فرمایا کہ میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں موت سر پر آچکی ہے میں اپنے لڑکے کو تمہارے سپرد کرتا ہوں اور اس کو اپنا خلیفہ بناتا ہوں امید ہے کہ تم اس کی اطاعت کروگے،

لہ ابوشجاع بویہ دیلمی، حاکم بامر اللہ اور معز الدین اللہ کے ان واقعات کے متعلق ملاحظہ ہو روضۃ الصفا جلد ۴۔

المعز نے اس لڑکے کا لقب العزیز باللہ رکھا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔

ابوریحان البیرونی

ابوریحان بیرونی عہدِ غزنویہ کا بہت بڑا علامہ گزرا ہے اس کی تصنیفات سے اسکی عالمانہ جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے نجوم میں اس کو خاصہ درک تھا چنانچہ اس کے متعلق فرشتہ نے بہت پر لطف روایتیں لکھی ہیں۔

علم کے ساتھ علم کا پندار ہونا ناگزیر ہے ابوریحان بیرونی کے اسی استغنا سے سلطان محمود غزنوی کچھ خوش نہ تھا ایک دن سلطان اپنے مشہور باغ "ہزار درخت" کے سامنے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا کہ البیرونی آیا سلطان نے پوچھا کہ بتاؤ میں قلعہ کے ان چار دروازوں میں سے کس دروازہ سے باہر جاؤنگا منجم نے اصطرلاب مانگا اور طالع درست کر کے دیکھا، اور ایک پرزہ پر کچھ لکھ کر سلطان کے سرہانے رکھدیا اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ قلعہ کی شرقی دیوار کو توڑ دیا جائے، اور اسی طرف سے باہر گیا، اس کے بعد کاغذ مانگا دیکھا کہ لکھا ہوا تھا کہ ان چار دروازوں میں سے کسی دروازہ سے باہر نہیں جائیں گے، بلکہ پورب کی دیوار توڑ کر نیا راستہ بنایا جائیگا سلطان یہ معلوم کر کے بہت خفیف ہوا، اور حکم دیا کہ بیرونی کو محل کی دیوار سے نیچے پھینک دیا جائے، منجم نے پہلے ہی دیوار سے ایک پھندا لگا دیا تھا، اسی کے ذریعہ نیچے اتر آیا اور اس کو کوئی ضرر نہ پہونچا سلطان نے پوچھا یہ بھی تم نے دیکھا تھا، منجم نے کہا ہاں، اور اپنے غلام کے ہاتھ سے تقویم لیکر سلطان کو دکھا دیا کہ اس دن کے احکام میں لکھا ہوا تھا کہ اس کو ایک بلند مقام سے زمین پر پھینک دیں گے لیکن کوئی نقصان نہ پہونچے گا، اس سے سلطان کا غصہ بہت بڑھ گیا، اور علامہ بیرونی کو زندان میں بھیجدیا، اسی طرح چھ ماہ گزر گئے، ایکدن بیرونی کا غلام بازار سے گزر رہا تھا، کہ ایک "فال بین" نے اس کو بلایا اور کہا تمہارے طالع میں چند چیزیں میں نے دیکھیں، انعام دو تو بتاؤں، غلام نے دو درم دئے، فال بین نے کہا کہ تمہارا آقا ان دنوں مصیبت میں ہے لیکن آج سے تین دن کے اندر وہ اس مصیبت سے رہا ہو جائے گا، اور خلعت شاہی زیب جسم کریگا، غلام نے بشارت کے طور پر یہ خبر اپنے آقا کو پہونچائی، وہ ہنسا اور کہا تم میرے غلام ہو کر ایسے ایسے آدمیوں کی باتوں کا اعتبار کرتے ہو، لیکن، فال بین کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، اور خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سفارش سے بیرونی کو رہائی حاصل ہو گئی، بیرونی نے جب فال بین کو بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا، تو اس کے سر سے منجمانہ پندار کا سودا بہت کچھ دور ہو گیا۔[1]

حسن گانگوی بہمنی

۷۴۸ھ ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم سال گزرا ہے اسی سال ایک برہمن کا مفلوک الحال خادم ہندوستان کے تخت پر بیٹھتا ہے اور دو سو برس کے

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ (ذکر فیروز شاہ بہمنی)

لگ بھگ اس کے خاندان میں حکومت رہتی ہے، ظفر خاں دکن میں آچکا ہے اور اس ساعت کے اختیار کرنے کے باب میں گفتگو ہو رہی ہے جبکہ علاء الدین حسن کے سر پر تاج شاہی رکھا جائے گا، دربار معلی علما و فضلا سے بھرا ہوا ہے ایک طرف برہمن جوتشی ہیں، دوسری طرف صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی ہیں اختیار ساعت کے متعلق رائیں طلب کیجارہی ہیں ہندوستانی نجموں نے متفقہ طور پر ایک ساعت مقرر کردی اسلامی منجموں نے دوسری ساعت تجویز کی لیکن کثرت رائے برہمنوں کی طرف تھی، اسی ساعت سعید میں سلطان قطب الدین کی مسجد میں علاء الدین کے سر پر دکن کا تاج رکھدیا، ملا داؤد بیدری تحفۃ السلاطین میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی کے تاسف کا حال لکھتے ہیں ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب علاء الدین کو اسلامی منجموں کے تاسف کا پتہ چلا تو ان کو خلوت میں طلب کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کے افسوس کی کیا وجہ ہے؟ مجھے از بس تشویش ہے، مسلمان منجموں نے جواب دیا کہ تشویش کی کوئی وجہ نہیں، لیکن ہم لوگوں نے تاجپوشی کے لئے جو ساعت اختیار کی تھی، اگر اسوقت یہ مبارک تقریب انجام پذیر ہوتی تو آپ کے خاندان کے ڈیڑھ سو سلاطین تخت دکن پر جلوہ افروز ہوتے، اور سات سو برس تک آپ کے گھرانہ میں حکومت رہتی، لیکن برہمنوں نے جو ساعت تجویز کی ہے، اس کے مطابق آپ کے خاندان میں بیس حکمران سے کم ہونگے، اور دو سو سال کے اندر حکومت ختم ہو جائے گی، فرشتہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:-

مؤلف ایں حکایت بوالعجب می گوید کہ بعد از یک صد و ہفتاد و ہفت سال کہ دولت آل بہمنیہ منقضی ہو شد، بر علما و فضلائے صاحب انصاف صدق کلام آں دو بزرگوار مہارت انشمان در علم نجوم ظاہر گشت و نیز عدد شاہان بہمنیہ ہنوز بہ بست نفر نہ رسیدہ بود کہ آں سلسلہ صفت اختتام پذیرفت[1]

ابوطاہر منجم شیرازی

احکام نجوم کی تصدیق کے متعلق حمد اللہ مستوفی القزوینی نے بھی تبریز کے سلسلہ میں بعض روایت درج کی ہیں وہ کہتے ہیں کہ زبیدہ خاتون (اہلیہ ہارون الرشید) ۱۷۵ھ میں اس شہر کی بنیاد ڈالی، ۶۹ سال کے بعد ۲۴۴ھ میں جبوقت خلیفہ متوکل تخت بغداد پر متمکن تھا یہ شہر زلزلہ سے برباد ہو گیا، خلیفہ نے اس کی دوبارہ تعمیر کی، پھر ایکسو نوے برس کے بعد ۴۳۴ھ میں زلزلہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہو گیا اس واقعہ کے وقت ابو طاہر منجم شیرازی تبریز میں موجود تھا، اس نے زلزلہ کی

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۳، روضہ ۱

پیشین گوئی کی تھی، اور کہا تھا کہ یہ شہر بالکل برباد ہو جائے گا، حکام باشندوں کو مستعدی کے ساتھ شہر سے میدان میں لاتے تھے، تاکہ عمارات کی بربادی سے انسانی جانیں تلف نہ ہوں، پھر بھی شب موعودہ کو زلزلہ آیا اور تقریباً چالیس ہزار آدمی اس واقعہ فاجعہ سے ہلاک ہو گئے، خلیفہ قایم باللہ کی طرف سے جو شخص اسوقت اس شہر کا حاکم تھا اُسنے ابو طاہر منجم کے مشورہ سے شہر کی تعمیر شروع کی منجم نے برج عقرب کے طالع میں اس شہر کی تعمیر سے، بار بیاد رکھی اور یقین دلایا کہ پھر کبھی اس شہر کو زلزلہ سے خرابی نہو گی لیکن سیلاب سے تباہی ہو سکتی ہے چنانچہ حمداللہ مستوفی اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

دتا غایت کہ بر تراز، سہ صد سال است حکم او راست آمدہ است و ہر چند دراں شہر زلزلہ بسیار اتفاق اُفتادہ اما خرابی عظیم نہ کردہ[1]

اسلامی نجوم کے اصطلاحات[2]

مسلمان لوگ، علم نجوم کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

(۱) مثلاً منطقۃ البروج کے مختلف حصے، مقامات سماوی اور ہر سیارہ کے خصایص، بارہ بروج اور ان کے مالک سیارہ کے متعین کرنے کے طریقے، اور قرآن سیارگان وغیرہ۔

(۲) الاحکام الی امور العالم (Prognostics of a Universal Character) وہ جنکا علاقہ حکومتوں کے قیام و زوال خاندانوں کے عروج و ہبوط، مذاہب کے نشر و اضمحلال، جنگ کی خون آشامیوں، قحط کی تنگیوں، طوفان کے مصائب بارش کے انعام، اور بازار کے فروغ و کساد سے ہے نجوم کے اس حصہ کو بطلیموس "تحویل صنع العالم" (Universal Apotelesmatics) کے نام سے موسوم کرتا ہے ان پیشین گوئیوں کا بڑا حصہ سیارہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے جبکہ ہر (Tropic) سال کے موقعہ پر آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔

(۳) المو الید (Nativities) نجوم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں افراد کے حالات کے متعلق پیشین گوئی کی جاتی ہے یعنی ولادت کے وقت سیارہ کے عروج و ہبوط، شرف و زوال کی معلومات بہم پہونچا

(۴) مسایل (Interrogations) نجوم کا وہ حصہ جس کا تعلق سوالات کا جواب دینے سے ہے مثلاً ایک دور افتادہ عزیز کے حالات کی تفتیش چور کا پتہ لگانا بھاگے ہوئے غلام کے مقام روپوشی کی تعیین وغیرہ نجوم کے اس حصہ کا تعلق محض مسلمان منجموں سے ہے وہ لوگ جو بطلیموس کے حقیقی پیرو ہیں۔

---

[1] "نزہت القلوب" مصنفہ حمداللہ مستوفی (بسلسلہ شہر تبریز)۔ [2] اسلامی نجوم کے اصطلاحات و ارتقاء کے متعلق "معجم المذاہب والاخلاق" (Encyclopedia of Religion & Ethics) کے مقالہ "شمس قمر و کواکب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

وہ "مسایل" کو تسلیم نہیں کرتے،

(۵) اختیارات (Elections) یعنی کسی خاص کام کے آغاز کرنے کی نیک ساعت اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ منجمین پتہ لگاتے ہیں کہ اس ساعت میں قمر بروج دوازدہ میں سے کس برج کے اندر ہے، غالباً یونانیوں کے یہاں بھی یہی طریقہ مروج تھا، لیکن بعض اسلامی منجمین لحاظ رکھتے ہیں کہ اسوقت قمر اپنے اٹھائیس منازل میں سے کس منزل میں ہے یہ ہندوستان کی پیداوار ہے، دراسیوس (Dorotheus) کی طرف منسوب ہے بطلیموس کے تبعین "اختیارات" کو بھی تسلیم نہیں کرتے،

مختلف اثرات

اسلامی نجوم پر مختلف ممالک کا اثر پڑا ہے چنانچہ عربی زبان کے کتب نجوم سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان منجمین نے یونانی، ہندوستانی اور ایرانی اثرات قبول کئے ہیں۔

یونانی اثر

بطلیموس کی کتاب (Tetrabiblos Quadrapartitum) دراسیوس سدانیوس (Dorotheus Sidonius) کی تحریریں (پہلی صدی مسیحی) اثینیہ کے مشہور منجم کی کتاب جو "مسایل" اور "موالید" وغیرہ پر ہے (دوسری یا تیسری صدی مسیحی) یہ ساری معلومات عربوں کے پیش نظر تھیں، ایک یونانی منجم ریلوس یا زیلوس کا نام بھی اسلامی منجموں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے لیکن تحریف کے باعث مصنف کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا، ایک دوسرے یونانی مصنف تنکلوس (Teucros) سے بھی مسلمان منجمین واقف تھے لیکن اس کے متعلق ایرانی ماخذ کے ذریعہ انھوں نے معلومات حاصل کئے۔

ہندوستانی اثر

مسلمان منجمین سات یا آٹھ ہندوستانی منجموں کا نام لیتے ہیں لیکن ابھی تک یہ پتہ نہ چلا کہ سنسکرت زبان میں ان کا اصلی نام کیا تھا، انمیں سب سے اہم شخصیت "کنکہ" (K.N.K.H.) یا "کنکھ" (K.T.K.H.) کی ہے جس کے متعلق بعض عربی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی کتب (ہیئت) کے ساتھ خلیفہ منصور کے دربار (بغداد) میں آیا بعض عربی مصنفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے علم حساب کی تعلیم دی عرب لوگ "موالید" اور "قرآن سبعہ سیارگان" کے متعلق بعض تصنیفات اسکی طرف منسوب کرتے ہیں اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اس نے ہندوستانی نجوم پر بحث کی ہوگی جس کو سنسکرت میں "ہورہ" یا "جاتک" کہا جاتا ہے اور جس پر یونانی اثر پڑا ہے، اس سے ایف بال (F. Ball) کے قیاس کی توثیق ہو جاتی ہے ابومعشر کے مقدمہ سے اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ کنکہ کے پاس قدیم یونانی ماخذ کے مواد موجود تھے، کیونکہ اجرام سماوی کی جو صورتیں اس نے پیش کی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے اسلامی منجموں نے عموماً ہندوستانی ماخذ کا حوالہ دینے میں بجائے منجموں کا نام لینے کے صرف ہنود لکھا ہے۔

پھر بھی عربی اصطلاحات میں بعض ایسے ہندوستانی الفاظ کا پتہ چلتا ہے جو اسی شکل میں موجود ہیں مثلاً "دریجان" جو ہندوستانی "درگانہ" Dare khana کی تحریف ہے۔

ایرانی اثر عہد وسطیٰ کی پہلوی زبان سے مسلمان منجموں نے استفادہ کیا ہے پہلی صدی کے نصف آغاز میں تنک لوشِ بابلی Teucrus کی کتابیں جو اجرام سماوی اور (Decain) کے متعلق تھیں۔ فارسی ترجمہ کے ذریعہ مسلمانوں تک پہونچیں یہاں یہ مصنف پہلوی تصنیفات کے باعث تنک لوس (یا تنکہ لوش یا تنک لوشا) کے نام سے مشہور ہوا، اسی لئے ابومعشر نے اپنے مقدمہ میں اسکی تعلیمات کو "مذہب الفرس" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس میں منازل قمر کے بعض فارسی نام بھی پائے جاتے ہیں؛ دوسرا ذریعہ بزرجمہر کی شرح تھی، جس کا یونانی سے پہلوی میں "وزیزک" (منتخب) کے نام سے ترجمہ ہوا تھا لیکن عربی میں "البزیزج" بن گیا اور اس کے بعد عرب مصنفوں نے توڑ مروڑ کر عجیب و غریب تحریفیں پیدا کردیں نجوم کے سلسلہ میں مسلمان منجموں نے زرافیاتی زردشت کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا نام چوتھی صدی اور اس کے بعد یونانی علم نجوم میں یقیناً متداول تھا، چوتھا ذریعہ زادان فرخ کے بیٹے "الاندرزگر" کی کتاب متعلقہ "موالید" تھی، اس شخص کے متعلق صحیح حالات معلوم نہیں چونکہ القبیصی (مسلمان منجم) کے "موالید" اور ابن عزرا (یہودی منجم) کے لاطینی تراجم میں اس کے نام کی مختلف تحریفیں پائی جاتی ہیں، نجوم کی وہ کتابیں جو جاماسپ (مشہور صوفی بادشاہ گشتاسپ کا مشورہ کار) کی طرف منسوب ہیں آخری زمانہ کے مسلمانوں کے حسنِ عقیدت کا نتیجہ ہیں ورنہ یہ کتابیں جاماسپ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

ہم لوگوں کو اس کا صحیح علم نہیں کہ ان ساری کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا، لیکن یہ یقین ہے کہ آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں یہ کتابیں مشہور تھیں، یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کے تمدن کا آغاز ہو چکا تھا، اگر "ہرمس" کی کتاب "المفتاح النجوم" کے قلمی نسخہ (جو Milan کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) کا بیان صحیح مانا جائے تو ماہ ذوالقعدہ ۱۲۵ھ میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا یعنی اسوقت خلفائے بنی امیہ سریر آرائے حکومت تھے خلیفہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کے زمانہ میں پہلے پہل یحیی البطریق نے بطلیموس کی کتاب Tetrabiblos کا ترجمہ کیا

ل خاقانی نے بھی اپنے قصیدہ میں اس مصنف کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اس کو "تنک لوشا" کہتا ہے اس سے جہاں معجم المذاہب والاخلاق کے مقالہ نگار کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ مسلمان منجمین اس مصنف سے پہلوی ماخذ کے ذریعہ واقف ہوئے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خاقانی کو اس علم میں کس قدر ید طولیٰ حاصل تھا، اور اس علم کی کیسی اہم کتابیں اور ان کے مصنفین اس کے پیش نظر تھے وہ کہتا ہے:—

به نام قیصر ال سازم تصانیف   به از ارتنگ چین و تنک لوشا

کا ترجمہ کیا آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں ماشاء اللہ نے اپنی تصنیفات میں وراسیوس اور انطاکیوس کے حوالے کنکھ کی کتابیں خلیفہ منصور ہی کے زمانہ میں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں نویں صدی کے وسط میں کندی نے نجوم پر مختصر رسائل لکھے، جن کو ہندوستانی نمونہ پر ترتیب دیا گیا تھا یہ تقریباً یقینی ہے کہ خاندان نوبخت کے افراد نے پہلوی زبان سے عربی میں فارسی کتابوں کا ترجمہ کیا اس خاندان کا سردار خلیفہ منصور کے دربار میں "منجم" تھا، بعض ایسے حقایق بھی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عربی نجوم پر ایرانیوں کا اثر پڑا ہے کیونکہ ماشاء اللہ کے رسایل میں جن کا یوحنا اشبیلی نے لاطینی میں ترجمہ کیا ہے ایرانی ماخذ کے بعض اصطلاحات پائے جاتے ہیں جیسے الکتخدا، الجانبختان وغیرہ۔

تحریری دستاویزات کے علاوہ زبانی روایتیں بھی تھیں جو نومسلم قومیں اپنے ساتھ اسلام میں لائیں، حران میں قدیم عہد جاہلیت کے علوم کے ساتھ نجومی روایتیں بھی ترقی پر تھیں سیوفیلوس (Theophilus) ابن طامس جو اڈیسہ کا رہنے والا اور مسیحی مذہب کا پیرو تھا خلیفہ مہدی کا درباری منجم تھا چند مسلمان منجموں نے "اختیارات" کے موضوع پر اس سے استناد کیا ہے اس نے شام کی زبانی روایتیں لیں اسی طرح یہ بھی قدرتی ہے کہ مسلمانوں کے تمدن میں آرامی مراکز دیار بکر، اور بابل اور مصریوں کے منجمانہ عقاید جذب ہوئے، مسلمانوں کے علم نجوم کے ابتدائی زمانہ میں یہودی عنصر کا بھی اثر پڑا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی کے مخصوص منجموں میں ماشاء اللہ، سہل ابن بشر، ربان الطبری، اور سند ابن علی ہیں اور یہ سب یہودی تھے۔

یورپ پر اثر

بارھویں صدی سے پندرھویں صدی کے اخیر تک لاطینی عہد وسطی کا علم نجوم حقیقۃً عربی نجوم ہے اس عہد میں سارے ذخیرہ نجوم کا ماخذ عربی تھا، چنانچہ ابو معشر، القبیسی، الکندی، المنصور، الفضل، عمر، ماشاء اللہ، ذہیل وغیرہ نے اپنے افکار و آرا اور اپنی تصنیفات و مولفات سے یوروپی علماء کو اثر پذیر کیا بطلیموس کی بعض کتابوں کے عربی تراجم سے بھی یوروپی علماء نے استفادہ کیا لاطینی زبان میں منجمانہ اصطلاحات کے لئے یا تو عربی کے لفظی ترجمے ہیں .... یا عربی کلمات کی تحریف، بزنطینی دنیا میں عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی نجوم کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں اس لئے قدیم یونانی تصنیفات کے پہلو بہ پہلو ابو معشر، احمد ابن یوسف الضیاء، ماشاء اللہ، سہل ابن بشر اور دوسرے عربی مصنفوں کی کتابیں نظر آتی ہیں اس طور سے نجوم کے متعلق بزنطینی کتابوں میں سیاروں کے اسماء اور فنی اصطلاحات کے لئے عربی فارسی نام ہیں جن کو قدیم یونانی ناموں سے کوئی مناسبت نہیں آخر میں یہ بھی بتادینا ضروری ہے کہ یورپ کا یہودی ادب نجومی جس میں ابراہیم ابن عزرا کی نمایاں شخصیت نظر آتی ہے،

عربی ماخذ سے مستفاد ہے۔

اسلامی نجوم کی خصوصیت

ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی میں دنیا کے مختلف اقوام یونانی و قبطی، شامی، ایرانی اور اہل ہند پر عربوں کا تسلط ہوا تو ان قوموں نے حوادث اور اثرات کواکب کے متعلق پہلے ہی تمام ممکن اصولی باتیں خیال کر رکھی تھیں اس لئے مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز پیش کرنے کا موقعہ نہ تھا باوجود اس کے اسلامی نجوم ساری دنیا حتیٰ کہ یونانیوں کے فن نجوم سے بھی بالاتر اور ایک حقیقی ترقی کا علمبردار ہے۔

نجوم اور اسلامی فلاسفہ و ائمہ

ابو معشر اپنے مقدمہ (۸۴۸ء) میں سات قسم کے آدمیوں کو نجوم کا مخالف بتاتا ہے اور دفاع میں بطلیموس کے انھیں مباحث کو بسط و کشاد کے ساتھ پیش کرتا ہے جو اس نے نجوم کے فواید کے سلسلہ میں لکھے ہیں اور مستقبل کے متعلق پیش بینی سے جو مادی اور اخلاقی منافع ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح الکندی (فیلسوف العرب) نے نجوم کو حکمت کی ایک شاخ بتایا ہے وہ اسکو نہ صرف ریاضی کے قوانین اربعہ بلکہ طبیعاتی اور ماوراطبیعی قوانین پر مبنی بتاتا ہے غالباً الکندی ہی وہ شخص ہے جس نے نجوم کو عقلی اور باضابطہ اصول و طرق کے ماتحت مرتب کیا لیکن معاملہ نے فوراً ہی دوسرا رخ اختیار کیا دوسری صدی ہجری کے آخر میں ارسطو کی تعلیم پوری طرح ترقی پر تھی، اور یہاں نجوم کا گزر نہ تھا، اس لئے فلاسفہ نے اس فن کے خلاف نزاع شروع کر دی اسی طرح علمائے دین نے بھی مخالفت شروع کی اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں و رسایل رد میں لکھے گئے چنانچہ ان میں سب سے قدیم ابوالقاسم عیسیٰ بن علی کی کتاب ہے جو نجوم کے رد میں ہے، اور جو حنبلی امام ابن قیم الجوزی کی کتاب، مفتاح دار السعادہ میں محفوظ ہے عیسیٰ بن علی کا معاصر فارابی بھی اس کا مخالف تھا اور کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ ارسطو کے فلسفہ کا ماہر اور پیرو تھا نجوم کے رد میں اس کی ایک کتاب ہے لیکن یہ کتاب ایسی نہیں جو اتنے بڑے فلسفی کے شایان شان ہو اس میں بہت سی بچوں کی سی بحثیں ہیں فارابی کی یہ کتاب محض حواشی کا ایک سلسلہ ہے، جسے اس کے ایک شاگرد نے بجنسہ شائع کر دیا۔

فارابی کے تمام معاصر فلسفیوں نے اس مخالفت نجوم میں حصہ نہیں لیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن مذاہب فلسفہ پر ارسطو کا زیادہ اثر نہ تھا انھوں نے اس کی حمایت کی جیسا کہ الکندی کے واقعہ سے ثابت ہو اسی طرح بصرہ میں اخوان الصفا اور بغداد میں ابو سلیمان محمد بن طاہر ابن بہرام السجستانی المنطقی نے بھی نجوم کے متعلق کتابیں لکھیں اخوان الصفا کے یہاں "قرآن سیارگان"، خاص موضوع بحث تھا؛ سجستانی کے زمرۂ فلاسفہ کی اکثر بحثیں ابو حیان التوحیدی (چوتھی صدی ہجری) نے اپنی کتاب المقالسات میں جمع کی ہیں اسی طرح

اس جماعت نے نجوم پر بھی رد و قدح کی ہے اور یہ پوری بحث ابن قیم کی کتاب میں محفوظ ہے۔

بو علی سینا نے نہ صرف الشفا اور النجات میں نجوم کی مخالفت کی ہے بلکہ اپنی اس خاص کتاب میں بھی اس کے خلاف لکھا ہے جس پر اے ایف مہرن نے ۱۸۹۴ء میں پوری طرح روشنی ڈالی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے بنیاد فن ہے اور اس کی نظری حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ لکھتا ہے کہ اس کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔

ابن رشد (۵۹۵ھ) کے متعلق بھی یہ طے شدہ ہے کہ وہ نجوم کا مخالف تھا، جیسا کہ خود اس نے ارسطو کی بعض کتابوں کی شرح کے سلسلہ میں لکھا ہے لیکن یہ ایک غیر مفید بات ہے کہ ہم ان فلاسفہ پر ایک تبصرہ کریں جو مخالفت نجوم کے اس مسئلہ میں متفق ہیں بلکہ زیادہ دلچسپ یہ ہوگا کہ ہم مذہبی اماموں کے اس رویہ پر روشنی ڈالیں جو نجوم کے خلاف آخری نویں صدی ہجری میں انھوں نے اختیار کیا تھا۔

امام ابن حزم اشاعرہ اندلس اور ان کے مذہب کے مخالف تھے، انھوں نے نجوم کے متعلق اپنی کتاب الفصال فی الملل والاہوا والنحل میں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان لوگوں کو جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مستقبل کے متعلق کواکب کی وساطت سے پیشین گوئی کی جا سکتی ہے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) کفار و مشرکین۔ (۲) گمراہ لوگ۔ پہلے تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ کواکب اور اجرام سماوی ذی عقل ہستیاں ہیں، ان کے اعمال ہیں اور ان کا استقرار دائمی ہے موجودات ارضی پر اللہ کے ساتھ یا خود اپنا اثر ڈالتے ہیں دوسری جماعت والے وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ خدا نے کواکب اور اجرام سماوی کو آنے والے واقعات و حوادث کا آئینہ دار بنایا ہے۔

امام غزالی (۵۰۵ھ) جو مذہب اشعری کے محافظ تھے، اپنی کتاب احیاء العلوم الدینیہ میں نجوم کی مخالفت کرتے ہیں اور یہی رویہ حنبلی امام ابن تیمیہ (۷۲۸ھ) نے بھی اپنی کتابوں میں نجوم کے خلاف اختیار کیا ہے لیکن نجوم کے متعلق سب سے زیادہ سخت اور مکمل تردید حنابلہ کے مشہور امام ابن قیم الجوزی (۷۵۱ھ) کی کتاب مفتاح دار السعادۃ میں پائی جاتی ہے۔

مذہبی دنیا میں غالباً نجوم کی کفالت کرنے والے مجدد امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) ہیں یہ قرآن مجید کی عظیم الشان تفسیر کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہیں انھوں نے دینیات، فلسفہ اور نجوم پر بہت سی کتابیں لکھیں اور طب و ریاضی کی بھی تحصیل کی، نجوم پر آپ کو پورا اعتقاد تھا اور یہ نتیجہ تھا علوم حکمیہ کی تحصیل کا، تفسیر قرآن سے آپ کا یہ اعتقاد صاف ظاہر ہے، امام فخر الدین رازی نے جس جرأت کے ساتھ قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تاویل کی اس کی نظیر کسی دوسرے دینی عالم کے یہاں نہیں ملتی، نجوم کے متعلق ابن قیم الجوزی اور آپ کے پیشرؤں کی بحث و نظر اور رد و قدح کے بعد اس موضوع کی تمام بحث و نزاع

میں کوئی ندرت باقی نہیں ہاں تاریخ کے فلسفی کبیر ابن خلدون (۸۰۸ھ) نے اپنے تاریخی مقدمہ میں جن خیالات کو ترقی دی وہ قابل غور ہیں۔

نجوم کو جس طرح علمائے طب وریاضی نے اہمیت دی اسی طرح مذہبی علماء اور شعراء نے بھی اس فن پر توجہ مبذول کی چنانچہ موسیقی وشاعری کو بھی نجوم سے وابستگی رہی بالخصوص بعض شعراء تو نجوم کے ماہر گزرے ہیں تیسری صدی ہجری میں یحیٰ بن علی بن یحیٰ المنجم موسیقی کے بہت بڑے عالم اور مصنف گزرے ہیں آپ کا ایک رسالہ جو موسیقی پر ہے متحف برطانی (British Museum) لندن میں محفوظ ہے آپ کو موسیقی کے ساتھ نجوم سے بھی خاص شغف تھا چنانچہ اسی لئے آپ "المنجم" کے لقب سے مشہور رہیں۔[1] عمر خیام کو مصنف "ہسٹری آف دی سائنس" نجومی شاعر یا "فلکی شاعر" کے نام سے یاد کرتے ہیں حکیم مومن خاں کا مشہور شعر ہے:-

اس نصیبے پہ کیا اختر شناس ۔ آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

مومن خاں ایک بلند پایہ طبیب بھی تھے، اس لئے ممکن ہے ڈاکٹر ڈلی بویر کے سطور بالا کے مطابق انھوں نے اپنے پیشہ کے لحاظ سے اس اہم فن کی تکمیل بھی کی ہوگی، لیکن غالب تو صرف شاعر ہی تھے، وہ بھی فرماتے ہیں۔

هم ز آغاز به خون وخطر ستم غالب ۔ طالع از قوس وشمار از سرطانم دادند

شعر پڑھنے کے بعد صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر "خصائص بروج" سے واقف تھا۔[2]

(باقی)

عبد المالک آروی

فلسفۂ مذہب صرف آٹھ آنہ میں

اُردو میں پہلی کتاب ہو جو اسلامی شعائر وعقاید پر ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اس کا مطالعہ کرے۔ چونکہ اس کی جلدیں کم رہ گئی ہیں اس لئے اسٹاک ختم کرنے کیلئے بجائے ایک روپیہ کے آٹھ آنہ میں ملسکتی ہے محصول اسکے علاوہ ہوگا
(منیجر نگار)

---

[1] "دائرۃ المعارف الموسیقیہ" مؤلفہ الاستاذ جول روانیت مطبوعہ مصر ص ۲۰۔ [2] مسلمانوں کے منجمانہ شغف کا اندازہ ان تصنیفات سے کیا جاسکتا ہے جن کی فہرست حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں دی ہے اس کتاب کا ایک نسخہ مع جرمن ترجمہ میرے پیش نظر ہے، نجوم کی عربی کتابوں اور ان کے مصنفین کی تفصیل مضمون ہذا کے آخر میں درج ہے۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

بدایوں کی ایک خاتون (؟) کی گمنام تحریر

نیاز صاحب!

آداب بصد آداب قبول فرمائیے۔ شاید آپ باور نہ فرمائیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جسے آپ باور فرمانے پر مجبور ہیں۔ خدا معلوم میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔

میرے "محترم" کو جناب کا ذکر "بہ بدی بھی منظور" نہیں ہے۔ اور میں آہ!

اگر جناب کا ذکر خواہ وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو کوئی کرتا ہے تو مجھے "بات بگڑ" جانے کے امکانات پیدا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کے مضامین کا ہر لفظ ایک خاص جاذبیت ایک خاص دلکشی رکھتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر لفظ بجائے خود ایک مکمل 'شعر' ہوتا ہے۔ اگر شعر کی یہ تعریف صحیح ہے۔

(The best words in their best order)
(Milton)

ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ آپ سے کچھ عرض کروں۔ لیکن 'حسنِ عقیدت' مانع تھا۔ اور اب چونکہ "آرزو" اور "حسن عقیدت" میں صلح ہو چکی ہے۔ لہٰذا "آرزو" کو اجازت ہے کہ وہ آپ کو تھوڑا بہت لکھ سکتی ہے۔ لیکن آئینِ عقیدت سے متجاوز نہ ہو۔ خیر۔

کچھ "اسباب پریشانی" ارسال ہیں۔ جناب کو زحمت دینے کے لئے، اگر ایک شعر بھی جناب کو پسند آگیا، تو زندگی بھر مسرور رہوں گی بلکہ مغرور!!

جناب کے فرمانے سے قبل میں اس کا اعتراف کرتی ہوں کہ میرا شعر کہنا۔ کوہ کندن اور کاہ بر آوردن سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن آخر کیا بھی کیا جائے۔ پھر یہ کہ سناؤں کس کو۔ چاند، تاروں کو سنانا میرے بس کی بات نہیں۔ انسان یہاں بستے نہیں۔ یا میں خود انسان نہیں ہوں۔

کاش آپ ایک شعر پر اتنا ہی کہدیتے "غنیمت ہے" تو میری عید ہوجاتی۔

وصالِ یار کی مسعود ساعتیں مت پوچھ
دلِ خراب کو کیا کیا تھیں جرائتیں مت پوچھ

مری ندامتِ بیہم اور اعترافِ گناہ
حسینِ دوست کی رنگیں شکایتیں مت پوچھ

کسی کا وعدۂ باطل مرا یقینِ تمام
وہ انتظار کی بے چین راحتیں مت پوچھ

عدو کی بزم میں بیباکیاں تری اور ہم
گزر گئی ہیں جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

ہنوز تیرے تصور میں خوں بہاتی ہیں
شکیب و صبر کی ناکام حسرتیں مت پوچھ

ہنوز یاد ہے وہ شکلِ زندگی تصویر
بگڑ بگڑ کے بنی تھیں جو صورتیں مت پوچھ

ستمبر کے "نگار" کی بے چینی سے منتظر ہوں تاکہ یہ طے کرسکوں کہ کونسا شعر سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

افسوس ہے کہ نہ میں ہی نگار کی خریدار ہوں نہ کوئی میرے یہاں۔ ہاں خدا اُس عزیز بہن کو خوش رکھے جو ہر مہینے دو چار دن کے لئے نگار کی زیارت کرادیتی ہے۔

نیاز کیش تصویر

(نگار) میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر کوئی نہیں کہ کسی خاتون کی طرف سے گمنام تحریر میرے پاس بھیجی جائے اور اس کا جواب بھی طلب کیا جائے، لیکن اس قسم کی تکلیف مجھے اکثر پہونچتی رہتی ہے اور خدا جانے کیوں میں بعض تحریروں کی طرف اعتنا کرنے پر بھی مجبور ہوجاتا ہوں۔

اس تکلیف کا سب سے پہلا سبب یہ ہوتا ہے کہ اول تو نصف سے زیادہ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق مجھے یہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیا حقیقتًا وہ نسائی دست و قلم کا نتیجہ ہیں۔ اور اگر "حسنِ ظن" سے کام لیکر یہ باور کرلوں تو پھر دوسرا سبب الجھن کا یہ ہوتا ہے کہ جواب دوں بھی تو کس کو اور کس پتہ سے ۔ نگار کے صفحات کو واسطہ بنانا اول تو مجھے پسند نہیں اور پسند ہو بھی تو بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر برملا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے کچھ غصہ مجھے اس بات پر بھی آتا ہے کہ جب کسی عورت کا ماحول اس قسم کی مراسلت کے منافی ہو تو اُسکو اس جسارت کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ کیوں اس اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہوتی ہے۔

اب مثالاً اسی تحریر کو لیجئے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ کہ اس کا کوئی فقرہ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے اُسے کسی خاتون کا نتیجہ فکر ثابت کرسکے۔ اس لئے نہیں کہ اس سے کسی ایسی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے

جو عام طور پر عورتوں میں نہیں پائی جاتی ۔ بلکہ صرف اس لئے کہ مرد ہو جانے کے بعد بھی ایک عورت اپنی ذہنیت کو نہیں بدل سکتی اور نا ممکن ہے کہ اس کی تحریر اس کی غمازی نہ کرے لیکن اس تحریر میں شروع سے اخیر تک اک ایسی مردانہ کرختگی پائی جاتی ہے جو عورت کی طرف سے کبھی ظاہر نہیں ہو سکتی ۔

رامپور کی ایک خاتون ہیں جن سے میرا سلسلۂ مراسلت عرصہ سے قائم ہے اور وہ ہمیشہ قصداً مردانہ انشاء اور مردانہ لب و لہجہ ہی میں مجھ سے خطاب کیا کرتی ہیں، لیکن باوجود اس تمام سعی و ارادہ کے ایک تحریر میں اُن کے قلم سے یہ فقرہ نکل ہی گیا کہ ــــ "ہائے، اللہ کیا کروں، آپ کی مختصر نویسی نے تو میری جان عذاب میں مبتلا کر رکھی ہے" ــــ اور میں دیر تک ان کے مردانہ پندار کی شکست پر لطف اُٹھاتا رہا ــــ الغرض اے خاتونِ محترم،

اول تو مجھے اس بات کے باور کرنے میں تامل ہے کہ آپ واقعی عورت ہیں، کیونکہ آپ کا اندازِ تحریر، آپ کا طرزِ انشاء اور سوادِ خط سب مردوں کا سا ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ نے یہ نقاب اپنے چہرہ پر ڈالنا کیوں پسند کیا، جبکہ خط و خال کی ناموزونی چھپانے میں آپ کو مطلق کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی لیکن اگر ــــ زہے نصیب کسی کے ــــ آپ واقعی وہی ہیں جو اپنے آپ کو ظاہر فرماتی ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ عورت ہونا اگر بلا ہے تو دوسروں کے لئے خود عورت کے لئے نہیں کہ وہ اپنی خصوصیات کو مٹانے کی کوشش کرے ــــ اگر آپ کو فطرت کی طرف سے ادبی ذوق مرحمت ہوا ہے ــــ اور یقیناً مرحمت ہوا ہے ــــ تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ مردوں کی صف میں شامل ہو کر اس کی نمائش کریں، آپ عورت ہیں تو عورت ہی کی باتیں کیجئے، عورت ہی کی طرح چھیڑ چھاڑ کیجئے ــــ رستم و اسفندیار کے تیوروں کے ساتھ نہیں کہ مرد بھی "ہاری" بول اُٹھیں ۔

آپ کے "محترم" کو اگر میرا "ذکر بہ بدی" بھی منظور نہیں تو اس "خاکسار" کو بھی یہ شکایت ہے کہ میرا ذکر آخر آپ اُس بزم میں کریں ہی کیوں، جہاں "غیر کی بات بگاڑنا" اور میری قسمت سدھارنا دونوں میں سے کوئی ایک بھی آپ کے بس کی بات نہیں ۔

آپ نے جن الفاظ میں میری تحریروں کی دلکشی کا ذکر کیا ہے، وہ میری تحریر سے کہیں زیادہ دلکش ہیں، اس لئے میں انھیں کو آپ کے حضور میں پیش کر کے قبول کئے جانے کی تمنا رکھتا ہوں ۔

آپ کے "حسنِ عقیدت" اور "آرزو" میں صلح ہو گئی، اچھا نہ ہوا، کیونکہ "آرزو" کا وجود اسیوقت تک ہے جب تک وہ "حسنِ عقیدت" سے بے نیاز ہے ۔ اور جب آپ نے اس طرح اپنی "آرزو" ہی کو برباد کر دیا تو پھر میں کیا خاک آپ سے یہ مطالبہ کر سکتا ہوں کہ :- کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے ۔

یہ بات آپ نے بہت عجیب لکھی کہ جہاں آپ ہیں وہاں انسان نہیں بستے یا یہ کہ آپ خود انسان نہیں ہیں — یہ بات کہیں اور کی ہوتی تو میں حکم لگا دیتا کہ یقیناً وہاں انسان نہیں بستے، لیکن چونکہ معاملہ "بدایوں" کا ہے جہاں کے ایک "...... انسان" سے میں واقف ہوں اس لئے یوں کھلم کھلا آپ کی ہمنوائی کرتے ذرا ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اُن سے پوچھتا ہوں، دیکھئے کیا کہتے ہیں؟

آپ کی غزل میں نے نہایت غور سے پڑھی اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "کوہ کندن وکاہ بر آوردن" نہیں بلکہ "کاہ کندن وکوہ بر آوردن" ہے۔ تمام اشعار اچھے ہیں اور مطلع ومقطع تو خصوصیت کے ساتھ نہایت خوب ہیں اور یہ باور کر لینے کے بعد کہ یہ جذبات ایک عورت کے ہیں، میں آپ ہی کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

گزر گئی ہے جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے حسب ذیل قیمت پر علاوہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء ستمبر ۳ر — سنہ ۲۴ء جنوری ۸ر - فروری ۴ر - مارچ ۸ر - اپریل ۸ر - مئی ۸ر - اگست ۸ر — سنہ ۲۶ء جنوری ۴ر - مئی ۳ر - جون ۳ر - اکتوبر ۳ر - نومبر ۳ر — سنہ ۲۷ء مارچ ۳ر اپریل ۶ر - مئی ۳ر - جون ۳ر — سنہ ۳۰ء مارچ ۸ر - مئی ۶ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۸ر - نومبر ۸ر سنہ ۳۱ء جولائی ۴ر - اگست ۴ر - ستمبر ۴ر - اکتوبر ۴ر - نومبر ۴ر - دسمبر ۴ر — سنہ ۳۳ء فروری ۴ر جولائی ۶ر - ستمبر ۸ر - اکتوبر ۶ر - دسمبر ۸ر — سنہ ۳۴ء فروری ۸ر - مارچ ۸ر - اپریل ۸ر - جون ۸ر - اکتوبر ۸ر —

دو روپیہ یا اس سے زیادہ قیمت کے پرچے وی پی کے ذریعہ سے بھی بھیجے جا سکتے ہیں، اس سے کم کے لئے پیشگی رقم ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر وصول ہونا ضروری ہے۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فایل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں۔ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

سبدِ گل

کچھ خبر اس کی نہیں کس گل کی یہ آواز ہے
بلبلِ رنگیں نوا محوِ صدائے ساز ہے
پھر وہ سرگرمِ تکلم پردہ برانداز ہے
نغمۂ موجِ صبا کیا؟ دور کی آواز ہے
فرصتِ تکمیلِ معصیت بھی تو ممکن نہیں!
ہر نفس بیدار پھر چشمِ تحیّر باز ہے!!
دوڑتا پھرتا ہے قلبِ خار میں گل کا لہو
بلبلِ آسودہ لیکن زمزمہ پرداز ہے
کچھ خبر بھی ہے تجھے بیگانۂ ذوقِ حیات
داغِ ناکامی بہارِ مدعا کا راز ہے؟

بہارِ لالہ، نمودِ شبنم، نمائش معتبر نہیں ہے
نگہ کی صورت فریب کھانا طریقِ اہلِ نظر نہیں ہے
جو حسن خود راہ زن نہیں ہے تو عشق بھی راہبر نہیں ہے
یہ کیسی افتادگیِ غم ہے کہ اب کوئی ہم سفر نہیں ہے؟!
نسیم نے اس مزے سے چھیڑا کہ نکہتیں ہوگئیں پریشاں
کلی کلی میں وہ چھپ گئے تھے کہ پردہ ہے پردہ در نہیں ہے
فسانۂ دل سنا رہا ہوں وہ روٹھتے ہیں منا رہا ہوں
انھیں بہاروں میں کھو گیا ہوں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے
تمام صہبا، تمام مستی، وہ سر سے پا تک تمام شوخی
نظر اُٹھاؤں تو کیا اُٹھاؤں کہ مجھ میں تابِ نظر نہیں ہے
بہار کیا ہے بس تری نوازش، نگاہ کیا ہے؟ صرف ایک سازش
انھیں کی ساری عنایتیں ہیں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے

گئی نہ محرومیوں کی اُلجھن مٹا نہ ارمان زندگی میں
مآلِ رازِ طلب بھی شاید حریفِ اُلفت ہے عاشقی میں؟
نصیب اُنکا ہے قرب لیکن، ہنوز اُلجھن ہے دوریوں کی
"نشاطِ بے حد" کے تذکرے کیا؟ دلِ ستم کش کی بیکلی میں
نقاب رنگیں، شباب میگوں، ہزار جلوے ہزار افسوں
عجب تھی حسنِ صنم کی صورت جو میں نے دیکھی تھی میکشی میں
بہار اُسکی، اُسی کا دامن، نسیم اُسکی اُسی کا گلشن
جمال جسکا جھلک رہا ہے چمن چمن میں کلی کلی میں
گلوں سے مستی اُبل رہی ہے شراب نکہت اُچھل رہی ہے
ہزاروں نغمے تڑپ رہے ہیں نگاہِ بلبل کی خامشی میں
بکھر نہ جائیں تمام جلوے، چھلک نہ جائے تمام صہبا
ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں، مچل مچل کر ہنسی ہنسی میں

حافظ غازیپوری

میں

میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں خدا جانتا ہے خوب
صرف خلش ہوں یا خلشِ روزگار ہوں

اک نقش آرزو ہوں کہ نقاشِ آرزو؟
صورت گرِ خیال ہوں فطرت نگار ہوں؟

یا ہوں فریب خوردۂ فردائے زندگی؟
یا خود ہی ایک وعدۂ نا استوار ہوں؟

میں اک نوائے سازِ لبِ خونچکاں ہوں یا؟
ناگفتہ داستانِ شبِ انتظار ہوں؟

یا ہوں زبانِ رازِ شبستانِ خامشی؟
یا ناتمامیٔ نفسِ شعلہ بار ہوں؟

بس مختصر یہ ہے کہ حزینِ خراب ہوں!
غم آشنا دکھے ہوئے دل کی پکار ہوں!

لذت کشِ بلا ہوں مصیبت کشِ فراق
منت کشِ درازیٔ شبہائے تار ہوں،

اک مہرِ بے بسی ہوں بساطِ حیات پر
مجبور ہوں ستم زدۂ روزگار ہوں

فانوسِ کائنات میں تصویرِ آرزو
یعنی فریب خوردۂ لیل و نہار ہوں

حزیںؔ

شاعر کی رات

جب شام کو حسنِ صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب چاند کی ضو سے زیرِ سما پُر نور خزانہ بنتا ہے

جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نور کی بارش ہوتی ہے
جب حسن کی سارے عالم میں آنکھوں سے پرستش ہوتی ہے

جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
جب نیند کی پریاں دنیا کو چپکے سے سلانے آتی ہیں

کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے، میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
معلوم نہیں اس عالم میں، میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں

احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے

بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پُر نور نگاہیں ہوتی ہیں
جذبات میں جنبش ہوتی ہے، مسحور نگاہیں ہوتی ہیں

تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو محسوس مجھے تم ہوتے ہو

فطرت واسطی

محسوسات

شوریدہ سری وابستہ ہے اجزائے حیاتِ فانی سے
تکمیلِ عمل کی خواہش میں انجام نظر آتا ہی نہیں
بربادِ سکوں کی ہر خواہش تعجیل کی خواہاں ہوتی ہے
امید کا ہر روشن پہلو ظلمات کا حامی ہوتا ہے
نیرنگِ ستم، احساسِ الم، اپنی ہی نظر کا دھوکا ہے
اسبابِ تعیش پیدا ہیں ہر لحظہ حوادث گاہوں سے

تزئینِ جمالِ گیتی ہے ہر کیفیت انسانی سے
احساسِ سکوں کی منزل میں تسکینِ الم پاتا ہی نہیں
تعجیلِ نوائی دنیا میں تخریب بداماں ہوتی ہے
اے وائے ابہامِ ناکامی کا رنگ دوامی ہوتا ہے!
ہر لذتِ امکاں "باقی" ہے ہر سانس مسرت افزا ہے
انسان اگر بدذوق نہ ہو دنیائے عمل کی راہوں سے

انسان بھٹک جاتا ہے خود اعمال کی بے پروائی سے
ذروں کی سبک رفتاری بھی تحریک کی حائل ہوتی ہے
ایامِ بہارِ رفتہ کی ہلکی سی جھلک تعمیری ہے!؟
ہر تابشِ امکاں باقی ہے ہر کاوشِ ہستی فانی ہے

منزل کا نشاں ملتا ہے ورنہ حوصلہ کی پسپائی سے
یا محفلِ رقص و جوش و الم پروانہ پہ مائل ہوتی ہے
فطرت کے نظارے تخریبی ہیں اور چمک تعمیری ہے!؟
نغموں سے تلاطم پیدا ہے، تمہیدِ نظر "حیرانی" ہے!

شمیم نعمانی نیازی

حدیثِ حسن

مصورِ جذبات جناب فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ ہے جسکی ہر نظم محبت کے لطیف جذبات کی آئینہ دار۔ لطفِ زبان سے رنگین۔ حسنِ تخیل سے مزین۔ ندرتِ بیان میں معجز نما، اور رومانی شاعری کا شاہکار ہے حدیثِ حسن کی تقریباً نصف نظمیں "نگار، شاہکار، زمانہ، اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں شائع ہو کر خراجِ تحسین اور غیر فانی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ اس مجموعہ میں رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کی تقریظ کے علاوہ ملک کے دو مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات شامل ہیں۔ حدیثِ حسن ۱۱۲ صفحات میں۔ دو تصاویر۔ بہترین کتابت۔ کلکتہ کی بنی ہوئی خوشنما جلد اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ تیس پونڈ کے چکنے کاغذ پر زیورِ طبع سے آراستہ ہے۔ اور باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے قیمت صرف ایک روپیہ (عمر) علاوہ محصول ہے۔ المعلن:۔ منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور (یو، پی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۴۸ ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بار ایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان (۱) موتی ولد دُتّی (۲) مسماۃ لچھمن زوجہ موتی اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

بنام

۱- گیا پرشاد } پسران لچھمن داس ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۲- بلدیو سہائے }
۳- لالہ متھری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۴- گنگا دھر رستوگی ساکن بازار راجہ شہر لکھنؤ
۵- منا ولد متھری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۶- نانک سنگھ قوم سکھ ساکن آریہ نگر لکھنؤ
۷- ملک اللہ لبایا ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ
۸- آغا شاہ محمد خاں کابلی ساکن امین گنج لکھنؤ
۹- بنواری لال ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۱۰- موہن مہراج ولد نامعلوم ساکن چتوا پور بھویاں عقب چوکی پولیس لکھنؤ
۱۱- گنیشے ساکن تکیہ پیر جلیل لکھنؤ
۱۲- محمود ولد نادر خاں ساکن مولوی گنج لکھنؤ
۱۳- آغا حبیب اللہ ولد نامعلوم ساکن ناکہ عیش باغ لال اسکول بنواری جی لکھنؤ
۱۴- گوپال داس رستوگی ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۱۵- درگا ولد نامعلوم ساکن ناکہ ہنڈولہ شہر لکھنؤ۔

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۲۵ ماہ مئی ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۳۰ ماہ مئی ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جائداد مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ ۳ ماہ اگست ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جائداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہوکر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعوے کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۱۷ ماہ اگست ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک

اصحاب کہف

(ڈراما)

اڈیٹر نگار کے قلم سے

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ر جنوری ۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائیگا

صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کرسکتے ہیں۔

مینجر

نگار

جلد ۲۸	فہرست مضامین اکتوبر ۳۵ء	شمارہ ۴

ملاحظات ———— ۲

نجوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث ———— عبدالمالک آروی ———— ۹

جھانسی کی رانی ———— ۲۵

روحانئین مغرب کی شعبدہ کاریاں ———— ۴۱

دُم دار ستارہ ———— تحسین الدین علوی۔ بی۔ اے ———— ۴۸

معجزہ وخوارق عادات کی حقیقت ———— عبید اللہ قدسی ———— ۵۱

انتخاب ———— سروپ رانی نگار ———— ۵۶

باب الاستفسار ———— ۵۹

کارامروز نمبر کے تنقیدی حصہ پر ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ ———— ریاضت انصاری ———— ۶۴

باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۷۳

بقیہ ملاحظات ———— ۷۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمارہ ۴	اکتوبر سنہ ۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات

دار العلوم دیوبند کے رسالۂ قاسم العلوم کی جاہلانہ ذہنیت

ذات نبوی کی ناقابل برداشت توہین

اور

احادیث پر ایمان رکھنے والوں کا مضحکہ خیز اسلام

آج اگر آپ کسی مسلمان کے سامنے دار العلوم دیوبند کا نام لے دیجئے تو وہ تقریباً اسی جذبۂ تقدس و احترام کو محسوس کرنے پر مجبور ہوگا جو "حرمین" کا نام سنکر اس کے اندر پیدا ہوتا ہے، اگر کسی سے یہ کہدیجئے کہ فلاں مسئلہ میں علماء دیوبند نے یہ رائے ظاہر کی ہے تو وہ اس کی صداقت پر اس طرح ایمان لائے گا گویا کہ خود روح القدس نے براہ راست اس سے گفتگو کی ہے اور اگر کسی فتوے پر وہاں کے واقفان شریعت نے مُہر ثبت کردی ہے تو اسکے معنے یہ ہوتے ہیں کہ آفتاب کے طلوع و غروب سے انکار ممکن ہے لیکن اس سے انحراف کسی طرح ممکن نہیں کیوں ہے۔ اس لئے کہ دیوبند علم الحدیث کا گہوارہ، اقوال رسول کے ضبط و حفظ کا زبردست ادارہ اور خصائص نبوت

کی تعیین کا نہایت معتمد علیہ دائرۃ المعارف ہے۔

یہ ہے وہ رسوخ اعتقاد دارالعلوم دیوبند اور وہاں کے علماء کرام کے متعلق جس میں نہ صرف عوام بلکہ ہمارے خواص بھی مبتلا نظر آتے ہیں۔ لیکن آئیے آج کی صحبت میں ہم آپ کو بتائیں کہ یہاں کے محدثین عظام خصائص نبوی کا کتنا گہرا علم رکھتے ہیں اور مذہب اسلام کے ساتھ اُن کا کیا سلوک ہے۔

وہ حضرات جو دارالعلوم دیوبند کے نام سے آگاہ ہیں وہ اس حقیقت سے بھی واقف ہوں گے کہ اس ادارہ کی طرف سے ایک رسالہ بھی شائع ہوتا ہے جو اپنی مذہبی تحقیق اور دینی خدمت کے لحاظ سے پرستاران دیوبند کے نزدیک صحیفہ مقدس کی حیثیت رکھتا ہے، اس کا نام "قاسم العلوم" ہے۔

افسوس ہے کہ یہ رسالہ میرے پاس نہیں آتا اور اس لئے مجھے نہیں معلوم کہ اسوقت تک وہ تحقیق علمی کے کتنے دریا بہا چکا ہے۔ مجھے اس جریدہ کے وجود کا علم رسالۂ بلاغ امرتسر کے ذریعہ سے ہوا جس نے اپنی ماہ ستمبر کی اشاعت میں اس کی ایک عبارت نقل کر کے بے اختیارانہ مجھے ان سطور کے لکھنے پر مجبور کر دیا۔

قاسم العلوم کے جس پرچہ سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے وہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۴ھ کا پرچہ ہے جس میں رسول اللہ کی تعدد ازدواج پر بحث کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ:-

"ہم ناظرین کو پھر ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں۔ صحیح حدیث میں موجود ہے کہ حضرت انس نے جب یہ بیان کیا کہ ایک شب میں آپ نے تمام موجودہ ازواج کے ساتھ ہمبستری فرمائی تو لوگوں نے تعجب سے پوچھا کہ اتنی طاقت جناب رسول میں موجود تھی۔ اس پر حضرت انس نے فرمایا کہ ہم لوگ آپس میں اُس زمانہ میں گفتگو کیا کرتے تھے کہ آنحضرت کو چالیس مردوں کی قوت باہ عطا کی گئی ہے۔ یہ قول حضرت انس کا نہایت صحیح اور قوی معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اس آخری عمر میں اس قدر موانع کے موجود ہوتے ہوئے آپ کو روزانہ ایک زوجہ سے ہمبستری کی طاقت نہیں ہو سکتی تھی چہ جائیکہ نو عورتوں سے ایک شب میں ہمبستر ہوں۔ اب اس سے اندازہ کرنا چاہئے کہ جبکہ امت کے ہر ایک مرد کو چار عورتوں نکاح کرنا جایز ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک سو ساٹھ عورتوں کے سنبھالنے کی قوت ہونی چاہئے۔

ہم ناظرین کو اس کے بعد ایک اور ضروری بات یاد دلانا چاہتے ہیں۔ علامہ سیوطی خصائص کبریٰ میں حضرت انس کا مقولہ مذکورۃ الصدر نقل فرماتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جن چالیس مردوں کی قوت باہ آپ کو دی گئی تھی وہ اس دنیا کے مرد نہیں بلکہ جنت کے چالیس مردوں کی قوت آپ کو دی گئی تھی اور چونکہ احادیث صحیحین سے یہ بات دکھائی گئی ہے کہ جنت میں ہر مرد کو دنیا کے سو مردوں کی قوت

دی جائے گی اس لئے آنحضرت علیہ السلام میں دنیا کے چار ہزار مردوں کی قوت ہونی چاہئے اِس لحاظ سے بقاعدہ چار ازواج چاہئے کہ آپ کو ۱۶ ہزار ازواج کی اجازت دیجائے اور آپ میں اتنی ہی ازواج کی قوت موجود ہونی چاہئے۔ (قاسم العلوم جمادی الاول ۱۳۵۴ھ)

رسول اللہ کی کثرت ازواج کا مسئلہ ہمیشہ غیر مسلموں کی توجہ کا مرکز رہا ہے اور انھوں نے ذات نبوی پر ہمیشہ شہوت پرستی کا الزام قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا جواب اہل علم کی طرف سے ہمیشہ یہی دیا گیا کہ رسول اللہ کا متعدد شادیاں کرنا کسی جذبۂ شہوانی کی بناء پر نہ تھا بلکہ صرف اُسوقت کے سیاسی و معاشری حالات کے اقتضاء سے تھا۔ لیکن علوم اسلامی کے مرکز، دار العلوم دیوبند کے صحیفۂ "قاسم العلوم" کے ذریعہ سے یہ حقیقت آج بالکل پہلی مرتبہ واضح ہوتی ہے کہ رسول اللہ کا گنتی کی چند شادیاں کرنا، حقیقتاً آپ کا انتہائی ضبطِ نفس تھا، ورنہ آپ کے جذبۂ شہوانی کا اقتضاء تو یہ تھا کہ آپ سولہ ہزار عورتوں سے بھی شادی کرتے تو کم تھا ۔۔ خوشا رعایتِ ذوق!

اس مسئلہ پر اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا وہ اُس عہد کی معاشرت و سیاسیات کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا رسول اللہ کے غیر معمولی بلند اخلاق کو سامنے رکھ کر لکھا گیا تھا، لیکن چونکہ دیوبند کو تمام علوم کے مرکز ہونے کا فخر حاصل ہے اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ عہد حاضر کے تازہ ترین علم "شہوانیات" (Sexology) کو نظر انداز کر جاتا اور اس کے اُصول کو سامنے رکھ کر رسول اللہ کے تعدد ازدواج کا استحسان ایک نہایت معتبر حدیث کے ذریعہ سے ثابت کرنے کی کوشش نہ کرتا۔

ایک بار پھر قاسم العلوم کی عبارت کو پڑھئے اور درود بھیجئے اُن علماء کرام پر جن کی وساطت سے سالہا سال کی پڑی ہوئی گتھی اس طرح آسانی سے سلجھ گئی ۔۔ اس سے قبل تو غیر مسلم کہہ سکتے تھے کہ رسول اللہ کی کثرت ازدواج کو جائز ثابت کرنے کے لئے معاشرت و سیاست کی بحثیں چھیڑنا صرف بہانہ ہے، محض تاویل ہے۔ لیکن اب تو انکو سوائے دم بخود رہجانے کے کچھ چارہ ہی نہیں کیونکہ اتنی غیر معمولی قوت رکھنے کے بعد ان کا متعدد شادیوں پر مجبور ہو جانا بالکل فطری مجبوری تھی اور اس پر معترض ہونا گویا فطرت پر اعتراض کرنا ہے ۔۔ یہ ہے وہ کھلا ہوا نتیجہ جو قاسم العلوم کی پیش کردہ حدیث سے نکلتا ہے ۔۔ واشہد باللہ انی بریٔ مما تشرکون ۔۔

آج بھی مسلمانوں کے مذہبی جوش کا یہ عالم ہے کہ اگر ان کے اکابر کا ذکر نامناسب الفاظ میں کیا جاتا ہے تو وہ جان لینے اور جان دینے کی پرواہ بھی نہیں کرتے، چنانچہ گزشتہ چند سال کے اندر اس قسم کے متعدد واقعات پیش آچکے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ ان کی نگاہیں اس باب میں لیکھرام اور راجپال ہی کی طرف پڑتی ہیں اور وہ خود اپنی جماعت کے اُن افراد کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو حقیقتاً بانی ہیں رسول اللہ کی توہین کے۔

یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہنا چاہئے کہ آریہ اور عیسائی جماعت کے اعتراضات اسلام و بانی اسلام پر وہی ہیں جو

خود مسلمانوں کی روایات مذہبی اور کتب احادیث سے مستنبط ہوتے ہیں اور اگر کوئی فرق ہوتا ہے تو صرف الفاظ و انداز تحریر کا۔ مثلاً آپ اسی حدیث کو لیجئے کہ اگر کوئی آریہ حضرت انس اور علامۂ سیوطی کا حوالہ دئے بغیر یہ لکھدے کہ "مسلمانوں کے رسول اسقدر پُر شہوت تھے کہ جب تک وہ ہر رات نو عورتوں سے ہمبستر نہ ہولیتے اُن کی تسکین نہ ہوتی" تو ایک ہنگامہ بپا ہوجاتا، لیکن چونکہ بہ تبدیل الفاظ بالکل یہی بات دیوبند کے رسالہ میں شائع ہوتی ہے اور حدیث کی صورت میں جس کے راوی حضرت انس اور مفسر علامۂ سیوطی ہیں، اس لئے مسلمانوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور یہ "زہر" "نوشِ جاں" بن کر رہگیا ہے۔ یہ ہے ہماری کورانہ تقلید کا عالم اور یہ ہے وہ بلا جو احادیث کی بدولت اسلام پر مسلّط ہوئی ہے ــــ ہوسکتا ہے کہ اسلام کے اُصول بدل جائیں، ممکن ہے کہ رسول اللہ کے اخلاق وہ نہ رہیں جو ایک رسول کے ہونے چاہئیں، لیکن یہ ممکن نہیں کہ حضرت ابوہریرہ اور جناب انس کے متعلق ایک لمحہ کے لئے بھی کذب و مبالغہ کا گمان ہو سکے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی حالت زار جب کوئی قوم انحطاط کی منزل سے گزرتی ہے تو اسکی قومیت کے عناصر، اس کی اجتماعیت کے اُصول، اسکے ادارہائے علم و تہذیب سب درہم برہم ہوجاتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان چونکہ آج کل اسی منزل سے گزر رہے ہیں اس لئے اگر اُن کے ہر نظام میں اختلال و اضمحلال نظر آتا ہے تو حیرت کی کیا بات ہے؟

دار العلوم ندوہ اپنی عمر، اپنے مقاصد کے لحاظ سے کافی شہرت حاصل کرچکا ہے، (گو اعمال و نتائج سے اس کی تصدیق نہ ہوتی ہو) اور مذہبی و علمی درسگاہ ہونے کی حیثیت سے بھی کافی مشہور رہے (گو اُسکی مذہبی تعلیم احادیث پرستی اور علمی سرگرمی قدماء کی گورکنی سے آگے نہ بڑھی ہو) لیکن ملک کے عام ذہنی انقلاب سے وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا اور وہی دار العلوم ندوہ جس میں کسی وقت طلبہ کی کثرت سے چہل پہل نظر آتی تھی اب زیادہ سے زیادہ سو، سوا سو طالب علموں کی تربیت کا ذمہ دار ہے۔ مسلمانوں کی آٹھ کرور آبادی کو دیکھئے اور اس تعداد کو۔ ممکن ہے ارباب ندوہ محسوس نہ کریں، لیکن حقیقتاً اس سے زیادہ شرمناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی کہ جس ادارۂ تعلیم کے قیام کو تقریباً پچاس سال ہوچکے ہوں اور جس کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں سے بلا مبالغہ اسوقت تک لاکھوں روپیہ وصول کیا گیا ہو، اس کی بے بضاعتی اور اس کے ناکارہ ہونے کا یہ عالم ہو کہ زیادہ سے زیادہ اوسط طلبہ کا سو سے آگے نہ بڑھے اور جب امتحان ہو تو سب سے اونچے درجے میں ایک طالب علم بھی کامیاب نہ ہو سکے[1]۔

---

[1] سنہ ۱۹۳۴ء میں امتحان سالانہ کا نتیجہ ملاحظہ ہو:- درجہ اول میں کُل ۱۱ طالب علم تھے جن میں صرف سات شریک ہوئے اور ۴۴

اس وقت میں اس مسئلہ پر گفتگو کرنا نہیں چاہتا کہ وہاں کی تعلیم کس حد تک بے نتیجہ ہے یا یہ کہ وہاں کے نصاب میں کتنی فرسودگی و قدامت پرستی پائی جاتی ہے کیونکہ یہ داستان جتنی دردناک ہے اتنی ہی طویل بھی ہے - بلکہ اسوقت پیش نظر صرف وہاں کے نظام و اہتمام کی ابتری ہے، جس کا ذکر ندوہ کی چار دیواری سے گزر کر (باوجود انتہائی کوشش کے) لوگوں کی زبانوں پر اور اخباروں کے صفحات پر بھی آجاتا ہے، چنانچہ حال ہی کی بات ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام نے تین طلبہ کو بعض ایسی شکایتوں پر جن کے لئے ان کے پاس معقول عذر تھے ندوہ سے نکال دیا اور جب تک عام اسٹرایک کی صورت پیدا ہو کر مقامی اخبارات میں اس کا چرچا شروع نہ ہوا، ان کو دوبارہ داخل ہونے کی اجازت نہ دی گئی -

چونکہ دارالعلوم ندوہ میں اکثر و بیشتر طلبہ باہر کے ہیں اس لئے وہ دارالاقامہ میں رہتے ہیں، اور انکی زندگی کے تمام مشاغل کا مرکز وہیں کی سرزمین ہے - ایسی صورت میں جب تک ارکان اہتمام و طلبہ میں باہم گہرا اعتماد کی کیفیت پیدا نہ ہو، تعلقات کبھی خوشگوار نہیں رہ سکتے اور نہ انتظام میں استواری پیدا ہو سکتی ہے -

ظاہر ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے طلبہ مکتب کے بچے تو ہیں نہیں کہ آپ "کان پکڑ کے" ویلے بزندش " کے اُصول پر اُن سے کام لے سکیں، وہ نوجوان طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں، سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت ان میں موجود ہے۔ غیرت و خودداری کا احساس بھی رکھتے ہیں اس لئے ان کی تعلیم و تربیت کے لئے سختی و تشدد درکار نہیں بلکہ نفسیات شناسی اور حکمت عمل کی ضرورت ہے - اور اگر یہ صحیح ہے کہ وہاں کے ارکان اہتمام غیر معمولی ناجائز سختی سے کام لیتے ہیں (جیسا کہ بعض باتوں سے ثابت بھی ہوتا ہے) تو ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ انھوں نے حد درجہ غیر دانشمندانہ اُصول اختیار کیا ہے -

ایک عام شکایت یہ ہے کہ جب سے جدید ارکان اہتمام آئے ہیں، جرمانوں کی کثرت ہوگئی ہے اور یہ طلبہ کو ناگوار ہونا چاہئے، نہ صرف اس لئے کہ ان میں سے اکثر جرمانہ ادا کرنے کے ناقابل ہوں گے، بلکہ اس بنا پر بھی کہ اس کا اخلاق پر بہت خراب اثر پڑتا ہے اور اسی لئے شرعاً تعزیر بالمال جایز نہیں - حیرت ہے کہ ارباب ندوہ نے جو ہر بات کو خالص شریعت اسلامی کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہتے ہیں - انھوں نے کیونکر ایسی

ص۲ - تین پاس - درجۂ دوم میں چودہ طالب علم اور پانچ کامیاب - درجۂ سوم میں بارہ طالب علم اور چار کامیاب - درجۂ چہارم کے سترہ طلبہ میں صرف چھ کامیاب - درجۂ پنجم کے نو طلبہ میں پانچ کامیاب - درجۂ ششم میں سولہ طلبہ اور صرف دو کامیاب - ہفتم میں کل چار طالب علم، کامیاب کوئی نہیں، ہشتم میں نو طلبہ اور چار کامیاب - نہم میں چونکہ کوئی کامیاب نہیں ہوا اس لئے اس کا نتیجہ بھی رجسٹر میں درج نہیں کیا گیا -

غیر شرعی تعزیر کو جاری کرنا پسند کیا۔

ہم کو ماہ اگست ۳۵ء کے جرمانوں کی جو فہرست موصول ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک مہینہ میں طلبہ پر دو پیسے سے لیکر ۴؎ تک تعزیر جرمانہ جاری ہوئی اور اس طرح تقریباً سترہ روپیہ کا مطالبہ عاید کیا گیا۔ (وصولی کا حال معلوم نہیں)

یقیناً ایک دار العلوم کے لئے سترہ روپیہ، ماہوار جرمانہ کوئی ایسی بڑی رقم نہیں ہے لیکن جس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سو، سوا سو طالب علموں میں سے ستر[1] طالب علم جرمانہ کے مستحق سمجھے گئے تو اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یا تو سوء اتفاق سے امسال طلبہ ہی میں حد درجہ سرکشی پیدا ہو گئی ہے، یا یہ کہ دار العلوم کا نظم و اہتمام ناقص ہے اور وہ طلبہ پر کوئی اقتدار قائم نہیں کر سکا۔

مہتمم دار الاقامہ یا دار الاقامہ کے محرر کی طرف سے جو احکام اس دوران میں طلبہ کے نام جاری ہوئے ہیں، ان میں سے خاص خاص یہ ہیں:۔

۱۔۔ داڑھی نہ منڈوائی جائے۔

۲۔۔ انگریزی وضع کے بال نہ رکھے جائیں۔

۳۔۔ نماز باجماعت ادا کی جائے۔

۴۔۔ صبح کی نماز کے بعد فوراً ورزش گاہ میں پہونچا جائے۔

۵۔۔ ۷ ½ بجے شام کے بعد سے مطالعہ شروع کر دیا جائے۔

۶۔۔ بغیر اجازت نامہ کے دار الاقامہ نہ چھوڑا جائے۔

ان احکام میں (سوائے اس حکم کے جو داڑھی اور بال سے تعلق رکھتا ہے) کوئی حکم ایسا نہیں ہے جسے بے محل یا ناجائز قرار دیا جائے، اور اگر طلبہ ان کی پابندی نہیں کرتے تو اس کی وجہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ دار الاقامہ کے مہتمم یا وہاں کے کسی ایسے کارکن سے اُن کو اختلاف ہے جو جرمانہ کی سختی سے اپنا استبداد قائم کرنا چاہتا ہے اور اپنی سیرت کے لحاظ سے اس قابل نہیں ہے کہ طلبہ پر کوئی اخلاقی دباؤ ڈال سکے۔

اس سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ نماز کا صحیح نتیجہ نماز باجماعت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے، لیکن اگر طلبہ نے صرف تعزیر کے خوف سے اس کی پابندی کی تو بیکار ہے، ضرورت تو اس امر کی ہے کہ ان کی ذہنیت میں ایسا انقلاب

---

[1] درجہ وار جرمانہ کی تفصیل یہ ہے:۔

درجۂ اول۔ (۱۹ طلبہ)۔ درجۂ دوم (۵)۔ درجۂ سوم (۱۱)۔ درجۂ چہارم (۱۲)۔ درجۂ پنجم (۱۴)۔ درجۂ ششم (۷)۔ درجۂ ہفتم (۲)

پیدا کیا جائے کہ وہ نماز باجماعت کی اہمیت کو خود محسوس کرنے لگیں اور بغیر کسی جبر و تخویف کے اس کے پابند ہو جائیں یہی حال دیگر احکام کا بھی ہے کہ اگر جبر و تشدد کے خوف سے طلبہ نے ان کی پابندی کی بھی تو کیا نتیجہ ہے۔

ایک دارالتعلیم کا اولین فرض طلبہ کے دماغ و ذہن کو متاثر کرنا ہے اور اگر وہاں کے ادارۂ نظم و اہتمام میں یہ صلاحیت نہیں ہے تو طلبہ کی سرکشی کے انسداد سے قبل یقیناً وہاں کے کانسٹی ٹیوشن کو بدلنے کی ضرورت تھی۔ دارالعلوم ندوہ کی مجلس انتظامیہ کن افراد پر مشتمل ہے اور ان کی ذہنیت کیا ہے، یہ مسئلہ بھی بجائے خود بہت توجہ طلب ہے۔ لیکن اس گفتگو کو کسی دوسرے وقت پر ملتوی رکھتے ہوئے، اس وقت ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ناظم دارالعلوم (جو تنہا مقامی ذمہ دار ہستی تمام نظم و نسق کی ہے) کس حد تک اس انتشار کا جوابدہ ہے موجودہ ناظم (جناب ڈاکٹر عبدالعلی صاحب) اس میں شک نہیں کہ اپنے اخلاق کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ انسان ہیں، اس قدر برگزیدہ کہ ان کو دیکھتے ہی ایک شخص دستِ ارادت بڑھا دینے پر مجبور ہو سکتا ہے، اپنی نیک نفسی اور معصومیت کی حیثیت سے بھی وہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر انسانوں کی جماعت میں کسی فرشتہ کی جستجو ہو تو لکھنؤ کی طرف سے ہم بلا تامل اُن کو پیش کر سکتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ادارہ کے اہتمام کے لئے ہم کو ولی و فرشتہ کی ضرورت ہے یا ایک مصلحت بیں، دور اندیش، نفسیات داں ڈکٹیٹر کی جو اسی دنیا میں رہکر اسی دُنیا کے اُصول کو سمجھے اور انھیں کے مطابق اپنے شخصی اثر سے کام لیکر ایک خاص دستور العمل پر عمل کرنے کے لئے لوگوں کو مجبور کر سکے۔

موجودہ ناظم ندوہ شہر کے کامیاب ڈاکٹروں میں سے ہیں اور ایک کامیاب ڈاکٹر کے معنی یہ ہیں کہ شب و روز میں کوئی ساعت اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ مریضوں کی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ وہ یوں بھی ندوہ کے کاموں پر پوری توجہ کرنے سے معذور رہیں اور مجبور ہیں کہ وہ اپنے ماتحت کارکنوں ہی کی آنکھوں سے سب کچھ دیکھیں اور انھیں کے کانوں سے سنیں۔

ایسے اداروں میں جن کی مالی حالت اچھی ہے، کسی اعزازی ناظم کا ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ہمیشہ وہی شخص اہتمام کا ذمہ دار ہو سکتا ہے جو اپنا پورا وقت صرف کرے اور جس کو کافی معاوضہ دیا جائے۔ ایسی صورت میں کہ موجودہ ناظم نہ اپنا پورا وقت صرف کر سکتے ہیں اور نہ کوئی حق الخدمت ان کو ملتا ہے، ان سے باز پرس کی کوئی صورت نہیں اور زیادہ سے زیادہ ہم ان کی خدمت میں یہی اپیل کر سکتے ہیں کہ اگر وہ بھی واقعی اپنے آپ کو اس عظیم ذمہ داری لینے کا اہل نہیں سمجھتے تو ان کو چاہئے کہ وہ اس خدمت سے اپنی سبکدوشی کا اعلان کر دیں اور اس بدنامی سے بچیں جو بہ حیثیت ناظم ہونے کی اُن پر عاید ہوتی ہیں۔

(بقیہ ملاحظات صفحہ ۶۷ پر ملاحظہ کیجئے)

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

قبل اس کے کہ قصاید خاقانی کے ان اجزار پر روشنی ڈالی جائے جن میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خود شاعر کے بعض نقوش زندگی پیش کر دئے جائیں۔

نام و نسب تذکرہ و تاریخ کی کتابیں تو خاقانی کے حالات سے بھری ہیں لیکن خود شاعر نے بھی قصاید میں اپنے نج کے حالات درج کر دئے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ تذکرہ نگاروں کی روایات لیتے ہوئے خود قصاید کے وہ اجزا بھی پیش کر دئے جائیں، جن میں شاعر نے اپنی زندگی کے اہم پہلوؤں کی طرف اشارے کئے ہیں

آپ کا نام افضل الدین ابراہیم اور کنیت ابوبدیل تھی، عرفی پہلے صیدی اور غالب اسد تخلص کرتے تھے اسی طرح خاقانی نے پہلے اپنا تخلص "حقایقی" رکھا تھا خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کی ملازمت کی تو حقایقی ترک کر کے "خاقانی" تخلص اختیار کیا اپنے نسب و حسب کے متعلق اس نے خود ہی چند قصیدوں میں تذکرہ کیا ہے خاقانی نے اپنے اعمال زندگی سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان جس فضا میں بھی پیدا ہو اس کے لئے میدان ترقی موجود ہے ارادہ کی استواری، ذوق کی پاکیزگی اور سعی و طلب کی فراخ دامانی اس کو یقیناً پستی سے بلندی پر پہونچا کر رہے گی، شہر شروان میں ایک بڑھئی کے گھر میں پیدا ہوئے لیکن علم و فضل اور ہمت و حوصلا نے آخر شاہی دربار میں زریں کرسی پر بٹھا دیا۔

چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں :-

بہ مرور ایام قربت و منادمت خاقانی در حضرت سلطانی بجائے رسید کہ در حضور کرسی طلائی نشست[1]

خاقانی کی زندگی ایک غریب اور غیر مشہور خاندان کے فرد کیلئے بہت کچھ سبق آموز ہے ہندوستان کے اندر اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ اول تو ایسے افراد جن کی پرورش و تربیت اس نوع کی پست فضا میں ہوئی ہو وہ اپنے اندر، اُبھرنے کا حوصلہ ہی نہیں رکھتے اور جو اتفاقاً اُبھر جاتے ہیں وہ اپنا نسب نامہ افراسیاب یا ہلاکو و چنگیز تک پہونچا دیتے ہیں رفتہ رفتہ لوگ ان کی اصل کو بھول جاتے ہیں اور غیر آبا کی نسبت سے ایسے حضرات کو رسمی اعزاز و شہرت، حاصل ہو جاتی ہے اس نوع کی ترقی در اصل قومی ترقی نہیں بلکہ انفرادی خود کامی ہے، جسکی عفونت ہماری ہیئت اجتماعیہ میں مہلک جراثیم پیدا کرتی جاتی ہے اگر ایسے افراد خود غرضانہ فراموش کاری سے کام نہ لیں تو ہماری قومی زندگی میں بہت سے آثار جمیل، پیدا ہو سکتے ہیں دیکھئے خاقانی کی جرأت، اخلاق علم و فضل جاہ و ثروت، امارت و سیادت کے بعد نہ تو وہ ہاشمی بنا نہ قریشی بلکہ خود بہ بانگ دہل کہتا ہے:۔

از یکے سو چوں خلیل اللہ درو گر زادہ ام   بود خواہر گیر عیسیٰ مادر ترسائے من

یعنی باپ کی طرف سے تو میں بڑھئی ہوں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت خلیل اللہ بھی تو آذر بت تراش کے بیٹے تھے، اسی طرح میری ماں ترسا (آتش پرست) تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے حضرت عیسیٰ کی منھ بولی (خواہر گیر) بہن بھی تو ترسا ہی تھی۔

ایک دوسرے قصیدہ میں لکھتا ہے:۔

شیخ مہندس لقب پیر درو گر علی   کاذر و اقلیدس اند عاجز برہان او

یوسف نجار کیست نوح درو گر کہ بود   تا زہنر دم زنند بر در دوکان او

خاقانی نے صرف یہی اقرار نہیں کیا کہ ان کے باپ بڑھئی کا پیشہ کرتے تھے، بلکہ اپنے پیشہ کی شرافت اور اپنے باپ کی صناعانہ مہارت پر بھی زور دیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ علی نجار اپنے پیشہ میں بہت بڑا کمال رکھتے ہیں ایسا کمال کہ آذر کی بت تراشی اور اقلیدس کی ریاضی دانی بھی اس کے سامنے ہیچ ہے، میرا باپ اتنا بڑا ماہر درو گر ہے کہ یوسف نجار (بی بی مریم کا منگیتر) اور حضرت نوح اپنی ملہمانہ فنی استعداد کے باوجود میرے باپ کی دوکان پر اس فن کے متعلق زبان نہیں ہلا سکتے۔

ولادت خاقانی کا وہ زمانہ تھا جبکہ خلافت بغداد پر زوال آچکا تھا ایک طرف اتابکان موصل کا اقتدار تھا، دوسری طرف سلجوقیہ اصفہان بر سر عروج تھے، نور الدین محمود اور صلاح الدین ایوبی

---

[1] صحف ابراہیم

مشرق اور مغرب میں زور آزمائیاں کر رہے تھے، خلافت عباسیہ المستضئی بنور اللہ کے زیر نگین تھی، یہی وجہ ہے کہ کلیات خاقانی کے اندر خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ، محمد بن ملکشاہ سلجوقی، اتابک مظفر الدین قزل ارسلان اور خلیفہ عباسی المستضئی کی مدح میں بھی قصیدے پائے جاتے ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس وقت تذکرہ دولت شاہ سمرقندی، صحف ابراہیم مصنفہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل، مجالس المومنین سید نور اللہ شوستری، روضتہ الصفا، تاریخ مظفری، نفحات الانس اور خلاصتہ الافکار ابوطالب اصفہانی ہیں جن میں خاقانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے، لیکن ان میں سے کسی کتاب میں خاقانی کی تاریخ ولادت مذکور نہیں محمد بن خوند شاہ نے سلطان سنجر کے ضمن میں خاقانی کا تذکرہ کیا ہے۔ انھوں نے پہلے قوم غزان پر سلطان سنجر کے علہ کی زیادتیوں کا حال لکھا ہے پھر اس قوم کے خروج وطغیان کا تذکرہ ہے، سلطان سنجر کی گرفتاری، مرو کی تباہی اور خراسان کی تخریب کا نقشہ کھینچا ہے اسی ضمن میں فرماتے ہیں:۔

علماء و مشایخ و اکابر خراسان بہ تعذیب آں ملاعین گرفتار شدہ درجہ شہادت یافتند
از انجملہ محمد بن یحیٰی راکہ فاضل متقی و عالم متورع بود بہ شکنجہ خاک ہلاک کردند خاقانی در شانش گوید

اس کے بعد مورخ موصوف نے خاقانی کے قصیدہ کے دو بیت نقل کئے ہیں:۔

در ملت محمد مرسل نداشت کس	فاضل تر از محمد یحیٰی فنائے خاک
آں کردہ روز تہلکہ دنداں فدائے سنگ	ایں کردہ گاہ قتل دہاں را فدائے خاک

غزوہ تبوک میں آنحضرت کا دندان مبارک شہید ہو گیا تھا، اسی طرف اشارہ ہے یعنی احمد مجتبیٰ صلعم کا دندان مبارک تبوک کی لڑائی میں شہید ہوا تخریب خراسان کے دن محمد بن یحیٰی کا چہرہ خاک وخون میں آلودہ ہوا محمد بن خوند شاہ نے بس اسی قدر اقتباس پر ختم کیا ہے خاقانی نے اس قصیدہ میں محمد بن یحیٰی کی شخصیت پر اور بھی روشنی ڈالی ہے۔

گفتی کہ بے محمد یحیٰی بہ ماتم اند	از قبہ ثوابت تا منتہائے خاک
با عطرہائے روضۂ پاکش عجب مدار	کز طوبی بہشت برار دگیائے خاک

سنجر بہ سعی دولت او بود دولتے	باد از سیاستش شدہ مہر آزمائے خاک
بے فر او چہ سنجر و تعلیم سنجری	بے بادشاہ دیں چہ بود بادشاہ خاک

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خاقانی محمد بن یحیٰی کے معاصر تھے، محمد یحیٰی سلطان سنجر بن ملک شاہ سلجوقی کے

کے عہد میں گزرے ہیں اور چونکہ سلطان سنجر کی ولادت ۴۷۹ھ اور وفات ۵۵۲ھ میں ہوئی اس لئے خوندشاہ کی روایت کے مطابق خاقانی کے عہد سخن سنجی و طبع آزمائی کی تو تعیین ہو جاتی ہے لیکن اس سے ولادت کی تاریخ متعین نہیں ہو سکتی، خاقانی کی وفات کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے، مولانا جامی نے گول مول لکھدیا ہے۔

در زمان خلافت المستضئی بنور اللہ بودہ است و قصیدہ عربی کہ در مدح بغداد گفتہ ذکر وے کردہ و توفی المستضئی سنہ خمس و تسعین و خمسمایہ[1]

مولانا جامی نے خاقانی کے زمانہ کی تعیین اس کے عربی قصیدہ سے کی ہے جو اس نے بغداد کی تعریف میں کہی ہے، اور اس میں خلیفہ المستضئی بنور اللہ کا تذکرہ کیا ہے عربی قصیدہ کے علاوہ خاقانی نے فارسی میں بھی المستضئی کی مدح کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

من بہ بغداد و ہمہ آفاق خاقانی طلب	نام خاقانی طراز فخر خاقان آمدہ
مہدی آخر زماں المستضئی باللہ کہ ہست	خاک درگاہش بہشت عدن عدنان آمدہ

یہ فارسی قصیدہ بھی طویل ہے۔

جامی کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ۵۹۵ھ میں المستضئی نے وفات پائی اس لئے گویا خاقانی کی وفات کا زمانہ بھی اسی کے لگ بھگ ہے خلیفہ المستضئی کی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ نہیں ہے، بلکہ ۵۷۵ھ ہے، "نفحات" کا ایک عمدہ قلمی نسخہ "پٹنہ اورینٹل لائبریری" میں ہے اس میں بھی ۵۹۵ھ ہی درج ہے نفحات میں بعض تاریخی غلطیاں موجود ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے مولانا جامی سے سہو ہو گیا، بہر حال جامی کی روایت سے بھی صرف اسی قدر پتہ چلتا ہے کہ خاقانی خلیفہ المستضئی کے معاصر تھے، اور اس لئے چھٹی صدی کے آخر میں انھوں نے بھی وفات کی ہوگی۔

عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:۔

وفاتش بہ قول بعضی پانصد و ہشتاد و دو ہجری و بہ قول دولت شاہ پانصد و ہشتاد و ہشت است[2]

عزیز الملک کی یہ روایت صحیح نہیں کہ دولت شاہ سمرقندی نے وفات کی تاریخ ۵۸۸ھ لکھی ہے بلکہ انھوں نے بھی ۵۸۲ھ ہی لکھا ہے، اور یہی تاریخ صحیح معلوم ہوتی ہے ابوطالب اصفہانی وفات کی تاریخ ۵۹۵ھ بتاتے ہیں ان کو غالباً نفحات کی عبارت سے غلط فہمی پیدا ہو گئی۔

---

[1] نفحات الانس [2] صحف ابراہیم

ان تمام تاریخی واقعات کی موجودگی میں یہ تو پتہ چل جاتا ہے کہ خاقانی کس زمانہ میں پیدا ہوئے اور اس عہد میں کونسی علمی وسیاسی فضا تھی، لیکن پھر بھی ولادت کی صحیح تاریخ نہیں معلوم ہوئی، خاقانی نے اپنے مختلف قصاید ومراثی میں سنہ وتاریخ کے بعض اشارے کئے ہیں جن سے نتائج مترتب ہوسکتے ہیں امیر رشید کو جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

طویلہ سخنش سی ویک جواہر داشت نہادمش بہ بہائے ہزار ویک اسمار
بہ سال عمر از و بست و پنج بخریدم ......

امیر رشید نے خاقانی کی تعریف میں ۳۱ ابیات کا ایک قصیدہ کہا تھا خاقانی کہتے ہیں ان ۳۱ ابیات میں سے پچیس بیت تو میں نے اپنی عمر کی مدت سے خرید کیا یعنی وہ اس وقت پچیس سال کے تھے، اور بقیہ چھ ابیات کی قیمت چھ دن (سنیچر اتوار وغیرہ) ہیں ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

کاندر سنہ ثون اختر سعد در طالع کامراں بہ بینم

"سنہ ثون" سے مطلب ۵۵۰ھ ہے، یعنی مشتری ۵۵۰ھ میں برج اسد میں ہوگا۔

اس سلسلہ میں اور بھی ابیات ہیں جو اس عہد کے ایک فلکی حادثہ اور قران سبعہ سیارہ سے متعلق ہے جسکی تفصیل آگے آتی ہے اس بیت سے اتنا معلوم ہوجاتا ہے کہ ۵۵۰ھ میں وہ ۲۵ سال کے تھے، چونکہ بروایت صحیح انھوں نے ۵۸۲ھ میں وفات کی اس لئے نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کی ولادت ۵۲۵ھ یا اسی کے لگ بھگ ہوئی، اور تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں انھوں نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔

وطن اپنے وطن اور مولد کے متعلق خود انھوں نے کہا ہے۔

خاک شروان مولد ودار الادب منشاے من پردہ فخرم مشیمہ دست لطفم قابلہ

یعنی شروان میں پیدا ہوئے، اور "دار الادب" میں پرورش پائی، اس عہد میں "دار الادب" کون سا شہر تھا؟ موصل، بغداد، اصفہان، تینوں شہر اس وقت مرجع افاضل تھے، خصوصاً بغداد کو زیادہ اہمیت حاصل تھی، ہر چند عباسیہ کی حکومت زوال پذیر تھی، ہاں سلجوقیہ کی بدولت اصفہان کا ستارہ اوج پر تھا، اور غالباً "دار الادب" سے "اصفہان" ہی مراد ہے، اصفہان اور شیراز کو شروع ہی سے اہمیت حاصل ہے قرب وجوار اور دور دست مقامات سے اکثر طلبہ یہیں آکر تعلیم حاصل کرتے تھے، چنانچہ شیخ علی حزیں کا مولد "لاہجان" تھا لیکن انھوں نے اصفہان ہی میں پرورش پائی اور اسی رعایت سے اصفہانی مشہور ہیں، خاقانی کا مولد شروان ہے لیکن اس سے وہ بہت بیزار نظر آتے ہیں چند قصاید میں انھوں نے اپنے وطن اور یاران وطن کی مذمت کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں

من شکستہ خاطر از شروانیان و زلفظ من خاک شروان مومیائے بخش ایران آمدہ

اس میں شک نہیں ایران کے مشہور بلاد خراسان و اصفہان، شیراز و تبریز، کی طرح شروان کو بھی شہرۂ آفاق بنانے والا، یہی خاقانی تھا، لیکن خود شاعر اس سے شکستہ خاطر رہا یہی نہیں بلکہ ارباب وطن بھی ان سے آزردہ رہا کرتے تھے، خود کہتے ہیں:-

گرچہ شریان دل شروانیاں را نشترم　　قوت عرق عراق از مایۂ طبع من است

یعنی گو اہل شروان کی رگ (شریان) کے لئے میرا وجود نشتر ہے، لیکن عراق کی رگ کو میری طبع عالی سے قوت ہے۔

وطن اور ارباب وطن سے یہ بیزاری اس قدر بڑھی کہ شروان چمن خزاں رسیدہ کی طرح بالکل بے کیف اور بے آب و رنگ نظر آنے لگا، فرماتے ہیں۔

ازننگ نحس خانہ شروانش وارہاں　　زاں پیشتر کاجل ز جہاں وارہاندش

خیر یہ تو مختلف قصاید کے چند ابیات ہیں انھوں نے شروان کی مذمت میں مسلسل شعر کہے ہیں مگر اسی کے ساتھ بعض جگہ مصالحت کی بھی کوشش کی ہے اور حب وطن کا ثبوت دیا ہے فرماتے ہیں:-

فخر من یاد کرد شروان بہ　　کہ مباہات خور بہ باختر است
لیک تبریز بہ اقامت را　　کہ صدف قطب را بہی مقر است
ہم بہ مولد قرار نتواں کرد　　کہ صدف حبس خانہ درراست
گرچہ تبریز شہرہ تر شہر یست　　لیک شروان شریف تر شہر است
خاک شروان مگو کہ آن شر یست　　کار شرواں بخیر مشتہر است
عیب شرواں مکن کہ خاقانی　　ہست زاں شہر کابتداش شر است
عیب شروان چرا کنی بدو حرف　　کادل شرع و آخر بشر است

کسی چیز کی طرف سے دل میں مخالفانہ جذبات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر ہزار ظاہر دارانہ خلوص و ارتباط کا اظہار کیجئے، اصل جذبہ آشکارا ہو ہی جائے گا وطن کی تعریف کر رہے ہیں لیکن چونکہ دل بیزار ہے اس لئے بے اختیارانہ مذمت میں بھی چند کلمات نکل پڑتے ہیں فرماتے ہیں کہ لفظ "شروان" کی ابتدا لفظ "شر" سے ہے اس لئے اس کا عیب بیان کرنا فضول ہے، حالانکہ اس نوع کے اظہار خیال کا یہ موقعہ نہ تھا۔

اب آئیے ذرا جستجو کی جائے کہ وہ کیا اسباب تھے جن کی بنا پر خاقانی کو وطن سے بیزاری تھی، اور اہل وطن بھی اس سے ناخوش تھے، شاعر کی نازک مزاجیاں مشہور ہیں۔ خاقانی اس سے مبرا نہ تھے، لیکن حزیں کی طرح زود رنج اور غضب کوش بھی نہ تھے، معلوم ہوتا ہے کم سنی میں شعر و سخن کی ابتدا رگی، اور

بہت جلد فروغ حاصل کرلیا اہلِ وطن کے لئے یہی ایک قابلِ رشک بات تھی، بالخصوص حریفوں سے دیکھا نہ گیا اس پر خود شاعر کی سخن گسترانہ طبع آزمائیاں مستزاد تھیں کشمکش شروع ہوئی عرفی کی طرح اربابِ وطن نے ان کو بھی کچھ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا شاعر تھے جوانی کے ولولے تھے، طبیعت میں زور تھا وطن کی ہجو لکھ ڈالی اب کیا تھا چاروں طرف سے ہنگامہ شروع ہوا! یہی وجہ ہے کہ قصاید میں خاقانی نے وطن سے بیزاری کا اظہار کیا ہے، اس سلسلہ میں مفصلہ ذیل ابیات قابلِ غور ہیں۔

زخاقانی این منطق الطیر بشنو	کہ چوں او معانی سرائے نہ بینی

خسرو صاحب خراج برسرِ عالم توئی	بندہ بہ دورِ تو ہست شاعرِ صاحبقراں

ازیں قصیدہ کہ گفتم سخنوران جہاں	بہ حیرت اندچو از منطق الطیر غراب
زہے تمیمہ حسان ثابت و اعشیٰ	زہے نتیجہ سحبانِ وایل و عتاب

ایک نوجوان شاعر کی ان تعلی نوازیوں نے حاسدانِ وطن کو ابھارا وطنی شعرا میں ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، انھوں نے "خاقانیِ تاریک" کا خطاب دیدیا، چنانچہ فرماتے ہیں:۔

روشنان خاقانیِ تاریک خوانندم ولیک	صافیم خواں چوں صفائے صوفیاں راچاکرم

وطنی شعرا کے لئے یہی کیا کم تھا کہ انھوں نے خود کو شاعرِ صاحبقراں کہا حسان بن ثابت (اسلامی شاعر) اور "اعشیٰ" کی شاعری کو انجام تک پہونچانے والا بتایا اپنے کلام کو سحبان بن وایل اور عتاب کی شاعری کا نچوڑ کہا لیکن اب شاعر نے خود زیادتی شروع کی، اور عرفی نے جس طرح ابوالفرج اور انوری سے اپنے کو بالاتر بتا کر ایرانیوں کو رنجیدہ کر دیا اسی طرح خاقانی بھی سنائی جیسے صوفی شاعر اور معزی اور عنصری جیسے باکمال سخنوروں کو اپنے خیال میں نہ لائے، فرماتے ہیں:۔

ازیں شعر خجلت رسد عنصری را	دگر عنصری جان حسان نماند

ایران بہ تو شد حسرت غزنین و خراساں	چوں گفتہ من رشک معزی و سنائی

ایں شعر کہ بشنود از شاعران عصر	زہرہ ز رشک صاحب انشا برافگند
گو عنصری کہ بشنود ایں شعر آبدار	تا خاک بر دہان مجاز ابرافگند

"مجازا" ایک شاعر کا تخلص ہے جو خاقانی کا حریف اور دشمن تھا، ان ابیات کے علاوہ خاقانی کے قصائد میں تعلی کے اور بہت سے اشعار ہیں اور یہ سب اُن کے عہد شباب کی جولانیٔ فکر کا نتیجہ ہیں۔

تعلیم و تربیت

قصائد خاقانی کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم کو اس کے تبحر علمیہ کا اعتراف کرنا پڑتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منقولات اور معقولات کی تمام اصناف پر اس کو یکساں عبور تھا، علوم مذہبی کے علاوہ فلسفہ و تصوف تاریخ و جغرافیات، موسیقی و نجوم وہ سب کچھ جانتا تھا خصوصاً نجوم و شاعری سے تو اس کو عشق تھا، ہر چند اس کا باپ ایک بڑھئی تھا اور کس کو توقع ہوسکتی تھی کہ علی نجار شروانی کے گھر میں خاقانی جیسا مہر درخشاں طلوع ہوگا جس کی شعاعیں نہ صرف ایران بلکہ ایک عالم کو خیرہ بنا دیں گی، یوں تو خاقانی نے فخریہ "از یکے سوچوں خلیل اللہ در دگر زادہ ام" لکھا ہے، لیکن اس کے خاندان والے علوم و فنون میں سرعت کے ساتھ ترقی کر رہے تھے، چنانچہ اس کے چچا علامہ اجل اور حکیم بے بدل تھے، خاقانی نے ان کی وفات پر کئی درد انگیز مرثئے لکھے ہیں، ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

حیات بخشا در خامی سخن منگر — کہ سوختہ شدم از مرگ قدوۃ الحکما
شکستہ دل تر از اں ساغر بلورینم — کہ در میانہ خارا کنی زدست رہا
فروغ فکر و صفائے ضمیرم از عم بود — چوں عم بجرد ببرد آں ہمہ فروغ و صفا

ان ابیات سے معلوم ہوتا ہے خاقانی کے چچا کو "قدوۃ الحکما" کا لقب ملا تھا اور انھیں نے ابتداً خاقانی کی تعلیم و تربیت بھی کی تھی، دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

کو آنکہ ولی نعمت من بود و عم من — عم چہ کہ پدر بود و خداوند بہر باب
آں فخر من مفتخر ماضی و اسلاف — آں صدر من و مصدر مستقبل و اعقاب
آں خاتمۂ کار مرا خاتم دولت — آں فاتحۂ طبع مرا فاتح ابواب
از دولت عم بود ہمہ مادت طبعم — آری نہ دماغ است ہمہ قوت اعصاب

ابیات بالا سے واضح ہوتا ہے کہ خاقانی نے ابتدائی تعلیم تو اپنے چچا سے حاصل کی ہی تھی، پہلے پہل مشق سخن بھی اس نے اپنے چچا ہی کے سامنے کی اسی طرح خاقانی کے چچا زاد بھائی خواجہ امام وحید الدین تھے جن کی وفات پر شاعر نے پر درد مرثیہ لکھا جو اس کی اہلی زندگی کو بہت کچھ نمایاں کرتا ہے اس کے پڑھنے کے بعد ہمیں شیلی کا فاجعہ انگیز مرثیہ (Elegy) یاد آجاتا ہے،

تذکرہ نگاروں نے اس طرف توجہ نہیں کی ہے کہ ابتداً خاقانی کا مربی اور معلم کون تھا لیکن اس کے قصائد سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس کے چچا نے جو علامہ اور فیلسوف تھے، اس کی تربیت کی اور ابتداً

فنون شعری سے انھیں نے اس کو باخبر کیا خاقانی نے اپنے چچا کے علاوہ اپنے اور دو اُستادوں کا تذکرہ کیا ہے، ایک تو "فاضل ساوی" اور دوسرے بہاؤالدین سعید بن احمد، اول الذکر ہیئت و منطق میں ید طولی رکھتے تھے، اور معقولات میں خاقانی کے اُستاد تھے، فرماتے ہیں:۔

گنج فضایل افضل ساوی شناس و بس — کز علم مطلق آیت دوراں شناسمش
اُستاد حکمت من و شاگرد حکم دین — کز چند فن فلاطن یوناں شناسمش

اسی طرح سعید بن احمد کے متعلق لکھتے ہیں:۔

کلیم طور مکارم اجل بہاؤالدین — کہ مدح او ست مسیحائے جان بیمارم
سزائے حمد و محامد سعید بن احمد — کہ خاک درگہش افزود آب بازارم

خاقانی کے تمام سوانح نگاروں نے اس کو ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد بتایا ہے مگر کسی نے نہ تو اس کے ابتدائی معلم قدوۃ الحکما کا تذکرہ کیا جو اس کے چچا بھی تھے، اور نہ فاضل ساوی اور سعید بن احمد کا حال لکھا مولنا جامی لکھتے ہیں:۔

ہر چند وے شاگرد فلکی شاعر است و بہ شعر شہرت تمام یافتہ چنیں گویند کہ وے را طور شعر طور دیگر بودہ است کہ شعر در جنب آں کم بودہ۔[1]

جامی کی روایت کے اس حصہ "وے را طور شعر طور دیگر بودہ" کی شرح آگے آتی ہے لیکن یہاں صرف فلکی سے بحث کی جاتی ہے جامی نے فلکی کو خاقانی کا اُستاد بتایا ہے حالانکہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل ابوالعلاء گنجوی کو خاقانی کا اُستاد بتاتے ہیں اور صاحب تاریخ مظفری کی روایت کے مطابق فلکی بھی ابوالعلاء گنجوی کا شاگرد تھا، فلکی شروانی پر انگریزی زبان میں حال ہی میں ایک کتاب ہندوستان کے ایک عالم نے لکھی ہے خاقانی نے اپنے قصائد میں اس قدر کثرت سے کیوں منجمانہ اشارات کئے ہیں اس کا جواب خود "فلکی" ہے تخلص ہی بتا رہا ہے، کہ فلکی کو ہیئت و نجوم سے شغف تھا اسی کا اثر خاقانی پر پڑا، یا دونوں ہم مشق شاعروں میں ایک ہی اثرات کے ماتحت نجوم کا ذوق پیدا ہو گیا ہو فلکی تخلص اور خاقانی کے منجمانہ اشارات سے قیاس کیا جاتا ہے، کہ اس عہد میں فارسی شاعری کا کیا رنگ تھا اور سلاطین اسلام نجوم سے کیا دلچسپی لے رہے تھے۔

ابوالعلاء گنجوی نے خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار تک پہونچایا بوڑھا اُستاد اپنے شاگرد کو اسقدر عزیز رکھتا تھا کہ اس نے اپنی دختر سے اس کا عقد کر دیا لیکن شاعروں میں نباہ ہونا ذرا مشکل ہے یا دو اپنے

[1] نفحات الانس جامی

دونوں کے کان بھرنا شروع کئے نتیجہ یہ ہوا کہ بروایت صحف ابراہیم دونوں کے درمیان دشمنی پیدا ہوگئی اور "اہاجی رکیکہ" کا تبادلہ ہوا۔

خاقانی اور ابوالعلاء گنجوی کی نزاع کے سلسلہ میں یہ واقعہ غالباً دلچسپی سے سُنا جائے گا کہ ابوالعلاء گنجوی نے جب اپنی لڑکی خاقانی سے بیاہ دی تو فلکی شروانی کو اس کا بیحد رنج ہوا، اُستاد کو پتہ چلا تو اس نے اس کو بیس ہزار درم دیئے، اور کہا کہ یہ چالیس ترکی لونڈیوں کی قیمت ہے، جو حسن و صباحت میں ہماری لڑکی سے کہیں زیادہ بلند مرتبہ ہوں گی۔

ابوالعلاء گنجوی منوچہر شروان شاہ کے دربار میں "ملک الشعرا" کے عہدہ پر فائز تھا خاقانی کا رسوخ ہوا تو وہ اپنے اُستاد کے سامنے شاگردانہ فتادگی کی بجائے بڑے دئے رہنے لگا، اُستاد کو اس کا رنج ہوا خاقانی کو جوانی کی اُمنگ تھی، اُستاد کی ہجو کہہ ڈالی، ابوالعلاء کے مفصلہ ذیل اشعار اس سلسلہ میں بیحد اثر آفرین ہیں۔

از آب دیدہ نخل قدش پرورش گرفت   چندانکہ ہمچوں شاخ گل از ناز سر کشید
چوں طفل اشک عاقبت آں شوخ بیوفا   از چشم من برامد و بر روئے من دوید[۱]

سیر و سیاحت

مشکل ہی سے ایران کا کوئی ایسا شاعر ہوگا جس کو ذوق سیاحی نہ ہو اور اس نے مختلف ممالک و بلاد کی سیر نہ کی ہو، متقدمین میں بھی بعض ہندوستان میں آئے، اور متاخرین کے لئے تو گویا ہندوستان قسمت آزمائی کا مرکز قرار پا گیا تھا، خاقانی نے اپنے مختلف اشعار میں ہندوستان اور "ویران ہندی" کا تذکرہ کیا ہے لیکن وہ یہاں آیا نہیں پھر بھی اس نے عرب و عجم کے مختلف شہروں اصفہان و خراسان، تبریز و موصل، بغداد و حرمین کی سیر کی چنانچہ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:۔

مکرر بہ زیارت کعبہ شریف و اماکن مشرفہ سعادت حاصل کرد[۲]

اس کے علاوہ خود اس کے قصاید اس کے ذوق سیاحی کے آئینہ دار ہیں خراسان، اصفہان اور تبریز کی مدح میں اس نے قصیدے لکھے بغداد کے سفر کا بھی حال درج کیا ہے اس سلسلہ میں اس کے مفصلہ ذیل ابیات قابل غور ہیں:۔

اصفہان:۔ مدت سی سال ہست کز سر اخلاص   زندہ چنیں داشتم وفائے صفاہان
موصل:۔ در سنہ ثانون الف بحضرت موصل   راندم ثانون الف ثنائے صفاہان
گرچہ صفاہان جزائے من بہ بدی کرد   ہم نیکوئی کنم جزائے صفاہان

ا ے ملاحظہ ہو تاریخ مظفری ۲ے صحف ابراہیم۔

خراسان :- هفت مردان کہ منم هشتم ایشاں بہ وفا　　کهف شاں خانہ اخواں بہ خراساں یابم
گم شد آں گنج جوانی کہ بسے کم کم داشت　　از پئے گم شدہ تاواں بہ خراساں یابم
یافت زربفت خزانم علم کافوری　　من ہماں سندس مینیاں بہ خراساں یابم

تبریز :- گرچہ فرماں ندہندم بہ خراساں رفتن　　باز تبریز بہ فریاد رسد نم نگذارند
از پئے ایں بروجا مکتب و دوکاں دارم　　نہ بہ مکتب نہ بہ دوکاں شدنم نگذارند

بسطام :- روضۂ پاک رضا دیدن اگر طغیان است　　شاید ار بر رہ طغیاں شدنم نگذارند
در بہ بسطام شدن نیز زبے سامانیست　　پس براں بے سر و ساماں شدنم نگذارند

طوس :- گر دہد رخصہ کنم نیت طوس　　خوش و شاداں شوم انشاء اللہ

رے :- در خراس ری از ایوان خراساں پرسم　　گرچہ آں طایفہ پرساں شدنم

بغداد :- من بہ بغداد دہمہ آفاق خاقانی طلب　　نام خاقانی طراز فخر خاقان آمدہ

ان شہروں کے علاوہ وہ شروان سے بھاگ کر بیلقان بھی گیا تھا لیکن بہ روایت صحف ابراہیم خاقان کے عملداروں نے اس کو گرفتار کرکے دربار شاہی میں بھیجدیا بادشاہ نے سات ماہ تک قید کرکے اس کو رہا کردیا۔ عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل فرماتے ہیں :-

و ملا جامی در نفحات اعزاز نمودہ کہ در سفر اور افتوحات عظیم روداد نہ با خضر ملاقات کردہ[1]

اس میں شک نہیں کہ خاقانی کے سلسلہ میں جامی کی بعض روایتیں ناقابل قبول ہیں مثلاً فلکی کو خاقانی کا اُستاد بتانا اور ۵۹۵ھ میں خلیفہ المستضئی کی وفات وغیرہ لیکن انھوں نے اس کو صوفی مشرب لکھا ہے اور اس کے چند اشعار نقل کرکے صرف اسی قدر فرماتے ہیں :-

از نہا بہوئے آں می آید کہ وے را از مشرب صافی صوفیاں قدس اللہ تعالیٰ اسرارہم شربی تام بودہ است۔

نہ کہیں خضر کی ملاقات کا تذکرہ ہے اور نہ سفر میں "فتوحات عظیم" حاصل ہونے کا بیان ہمارے سوانح نگاروں کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ایک واقعہ سنکر یا کسی نامعتبر کتاب میں دیکھ کر محض حافظہ پر اعتماد کرکے اہل علم کی طرف اسکو منسوب کردیتے ہیں حالانکہ یہ ضروری ہے کہ جس واقعہ کے انتساب میں کوئی شبہ ہو اس کی تحقیق کرنے کے لئے اصل کتاب پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

---

[1] صحف ابراہیم۔

مذہب فلسفی، صوفی اور شاعر کا مذہب عوام کے مذہبی دایرہ سے بہت زیادہ وسیع ہوتا ہے اس کے مذہب کا اصول عشق و جمال ہے اور اس کے وجدانات ہماری دنیائے آب و گل کی فریب خیالیوں سے بہت ارفع ہوتے ہیں خاقانی کے حکیم اور شاعر ہونے میں تو کلام ہی نہیں لیکن فلسفی اور صوفی ہونیکے باب میں بحث ضروری ہے ایک جگہ خود کہتے ہیں:-

بدل من آدمم اندر جہاں سنائی را　　بدین دلیل پدر نام من بدیل نہاد

اگلے سطور میں لکھا جا چکا ہے کہ امیر معزی اور سنائی کے مقابلہ میں خاقانی نے خود کو برتر بتایا لیکن یہ آغاز زندگی کی باتیں ہیں خود سنائی بھی اپنی اگلی زندگی میں ایسے بلند مشرب صوفی نہ تھے جیسا ان کو سمجھا جاتا ہی اس پر حدیقہ کے وہ اجزا شاہد ہیں جو سلاطین و شاہزادگان امرا و ارباب مناصب کی مدح سے متعلق ہیں اسی طرح خاقانی نے بھی خاقان شروان، وسلاجقہ اصفہان، عباسیہ، اتابکان موصل وغیرہ کی مدح گستری کی لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ نفسیات میں تغیر ہوتا گیا اور وہ ایک صوفی صافی بن گئے، درباری زندگی ترک کی، سلطان نے قید و بند ڈال کر دربار سے وابستہ رکھنا چاہا لیکن ایک مرتبہ بادہ للہیت کا مزہ چکھ لینے کے بعد کسی چیز میں لذت تو ملتی نہیں اس عہد میں انھوں نے جو قصاید لکھے ہیں ان کو الہامات صوفیانہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے وہی پند و موعظت وہی فقر و فاقہ وہی زاویہ نشینی و زہد گزینی جو ہماری صوفیانہ شاعری میں پائی جاتی ہے خاقانی کے یہاں بھی ہے اور اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ رومی و عطار کی طرح انھوں نے بھی حدیقہ سے استفادہ کیا قرین قیاس ہے کہ ۵۲۵ھ میں خاقانی کی ولادت ہوئی جیسا کہ اگلے سطور میں لکھا جا چکا، اور یہی حدیقہ کی تصنیف کا سال ہے اور بعضوں نے سنائی کی وفات کی تاریخ بھی اسی کو قرار دیا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ....بہر حال خاقانی نے سنائی کا زمانہ پایا، ممکن ہے طفولیت یا آغاز شباب کا عالم ہو اس لئے ملاقات نہ ہوئی ہو۔

خاقانی کی آخری زندگی یقیناً ایک صوفی صافی کی طرح بسر ہوئی، اسی لئے ان کے تشیع یا تسنن پر زور دینا بے محل سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن کیا کیجئے ہمارے یہاں کے تذکرہ نگار اس قدر بلند حوصلہ اور رفیع الخیال ہوتے ہیں کہ خواہ مخواہ ہر کسی کو کھینچ تان کر فرقہ بندی میں مبتلا کر دیتے ہیں چنانچہ تقی کاشی اور ملا نوراللہ شوستری نے اس کو شیعی مذہب لکھا ہے ملا نوراللہ فرماتے ہیں:-

در مواعظ و حکم طریقہ شیخ سنائی پیمودہ نقش مذہب اہل بیت بر لوح اعتقاد فی نگاشتہ

اما چوں در روزگار حکیم خاقانی حکم اسم الباطن در جمیع مواطن جاری بود بنا بر تقیہ در طائفہ علیہ شیعہ مرتضویہ ساری لاجرم بعض از عقاید خود را در قصیدہ مشہور کہ مذکور خواہد شد بطریق کنایت دانمود

وطریق تعمیہ والغاز دراں بیمودہ وتا غایت صورت مضمون آں از انظار ابنائے زمان مجوب و مستور بودہ[1]

اس کے بعد شوستری نے خاقانی کا ایک قطعہ نقل کیا ہے اور اس کی لغو و مہمل تاویل کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ خاقانی کا خیال ہے کہ گنبد خضرائے مدینہ میں حضرت رسول اکرم صلعم کے پہلو میں صاحبین (حضرت صدیق وفاروق) کی قبریں نہیں ہیں اسی کے ساتھ اس کے چند اشعار سے محبت اہل بیت اور علوی دوستی پر استدلال کیا ہے حالانکہ ملا صاحب کو سمجھنا چاہئے تھا، کہ اہل سنت بھی محبت اہل بیت پر زور دیتے ہیں اور ان کے شاعروں اور مصنفوں نے اس موضوع پر کافی اظہار خیال کیا ہے ایک جگہ خاقانی کہتے ہیں :-

برسر روضۂ معصوم رضا   شبہہ رضواں شوم انشاءاللہ

مگر اسی کے ساتھ اپنے چچا کے مرثیہ میں ضمناً یہ بھی فرماتے ہیں

زو دیو گریزندہ واو داعی انصاف   زو حکمت نازندہ و او منہی الباب

زاں عقل و بدو گفت کہ اے عمر و عثمان   ہم عمر خیامی ہم عمر خطاب

دربار شاہی اگلے سطور میں تاریخ مظفری کے حوالہ سے لکھا جا چکا کہ ابو العلا گنجوی خاقانی کا اُستاد اور خاقان کبیر منوچہر شروان شاہ کے دربار میں ملک الشعراء کے عہدہ پر مامور تھا، اسی نے اپنے ہونہار شاگرد کو بھی دربار تک پہونچایا رفتہ رفتہ اس کو اتنا بلند مرتبہ حاصل ہوا کہ بقول صاحب "صحف ابراہیم" بادشاہ کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھا کرتا تھا خاقان کے دربار میں اس کو اتنی بے تکلفی حاصل تھی کہ وہ آزادانہ اظہار جذبات کرتا تھا اس ضمن میں تمام تذکرہ نگاروں نے اس کا ایک شعر نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے:-

وشقے دہ کہ در برم گیرد   یا وثاقے کہ در برش گیرم

اس شعر میں انھوں نے خاقان سے ایک کنیز یا امرد غلام طلب کیا ہے اس پر آزاد بلگرامی کا اعتراض اور ابوطالب اصفہانی کا جواب بہت پر لطف ہے عزیز الملک ابراہیم خاں خلیل لکھتے ہیں:-

خاقان برآشفت وگفت چرا ہر دو نخواست مگر قصورے در ہمت من دیدہ خاقانی رنجش خاقان فہمیدہ مگسے را پر و بال کندہ بہ حضور خاقان فرستادہ ومعروض داشت کہ تقصیر ایں مگس است کہ بہ انگندن نقطہ داری از فضلہ خود یا وثاقے کرد[2]

اس پر غلام علی آزاد بلگرامی (مولف یدبیضا) کا اعتراض یہ ہے کہ خاقان کو تو اس پر خفا ہونا چاہئے تھا کہ شاعر نے

---

[1] "مجالس المومنین" مؤلفہ سید نور اللہ بن سید شریف الحسینی المرعشی الشوستری - [2] صحف ابراہیم -

بے ادبی کی، اور بے محابا غلام امر طلب کر بیٹھا ابوطالب بن محمد اصفہانی نے اُس کا مفصل جواب دیا ہے اور آزاد کو گنوار بتاتے ہوئے سلاطین مغلیہ کے ناروا طریق معاشرت پر چٹکیاں لی ہیں فرماتے ہیں :۔

ایں شبہ بسبب کم تتبعی از اوضاع مردم ولایت وی را روی دادہ چہ در زمان قدیم کنیز و غلام خود جزو مرحمت و خلعت دستور بود و الی آلان ہم اعزہ تمام ولایت با سلاطین و امرائے خود بشرط اتحاد بے تکلفانہ زندگی می کنند و از عاداتے کہ متاخرین تیموریہ در ہند رواج دادہ اند کہ سائر خلق سلوک عبدیت با اکابر نمایند بغایت دور اند و حق اینست کہ بسیار قبیح است کہ در مواضع خاص اکابر از متوسلان خویش ادب عامیانہ توقع کنند۔[1]

اس کے بعد ابوطالب اصفہانی نے ہجو اور شوخ نگاری کی تعریف کی ہے اور کہا ہے کہ ہجو شاعر کا حربہ ہے اور بڑے بڑے شعرا نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا ہے کہ کسی شاعر میں ہجو گوئی اور ہزل نگاری کا سلیقہ نہو تو گویا اسکی شاعری ہی ناقص ہے اس کے بعد انھوں نے اساتذہ فارس سعدی، عرفی، وحید وغیرہ کے کلام سے ہزل و شوخ نگاری کی چند مثالیں دی ہیں۔

مولانا آزاد اور ابوطالب اصفہانی دونوں اپنی اپنی جگہ پر ایک حد تک صحیح ہیں اس وجہ سے کہ ہندوستان کے رسوم و قیود کی دنیا میں یقیناً اس نوع کا بے محابا طریق طلب آقا کے سامنے سخت بے ادبی ہے ہر قوم اور ہر سرزمین کی اخلاقیات کو ایک ہی زاویہ نظر سے دیکھا نہیں جا سکتا ڈاکٹر رسل ویلیس نے اپنی کتاب "معاشرانہ فضا اور اخلاقی ترقی" میں اس مسئلہ پر کافی روشنی ڈالی ہے مولانا آزاد بلگرامی نے اس واقعہ کو ہندوستانی معاشرت کے مطابق نہیں پایا اور اس لئے اس پر تعجب کیا ابوطالب اصفہانی کے جواب کا یہ حصہ بہت ہی معقول ہے کہ لونڈی غلام عطائے شاہی کا جزو سمجھے جاتے ہیں اس لئے خاقانی نے بادشاہ سے یہ بھی طلب کیا اگر معاملہ یہیں تک ہوتا تو مضایقہ نہ تھا لیکن "در برم گیرد" اور "در برش گیرم" ہندوستانی نقطۂ نظر سے یقیناً محل نظر ہے، ممکن ہے خاقانی کے عہد میں ولایت میں سلاطین نے اپنے متوسلین کو اجازت دے رکھی ہو کہ وہ ان کے سامنے بے تکلفانہ جس طرح جی میں آئے اظہار خیال کریں لیکن دور متاخرین میں ابوطالب اصفہانی سے پہلے ہی خود شاہزادہ سلیمان صفوی نے صائب تبریزی سے محض ایک معمولی شوخی پر نہ تو کبھی شعر سنا اور نہ مدت العمر کلام کیا۔

شاہزادہ سلیمان صفوی کی شادی تھی، شاہزادہ کی ابھی مسیں بھیگ رہی تھیں وہ بہت ہی حسین و جمیل تھا خوش روئی و خوش پوشی ایک شاعر کو جس طرح بیتاب کر دیتی ہے دنیا سے پوشیدہ نہیں صائب نے ایک قصیدہ پیش کیا اس کا ایک بیت یہ تھا:۔

احاطہ کرد خط آں آفتاب تاباں را　　گرفت خیل پری در میاں سلیمان را

شاہزادہ کو سخت رنج ہوا اور پھر ساری عمر صائب سے بات تک نہ کی۔[1]

اس لئے ابوطالب اصفہانی کا آخری مغل بادشاہوں پر اعتراض کرنا صحیح نہیں اگر ہندوستان میں امراء و سلاطین اپنے ماتحت سے "ادب عامیانہ" ملحوظ رکھتے ہیں تو ایران میں یہ "کبریائی" ناپید تھی کچھ تھوڑی ہی آئین ہمارے ہندوستانی بھائی جو عرب و ترکستان، ایران و توران کا خواب دیکھا کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنا رشتہ ارتباط انھیں غیر ممالک سے وابستہ رکھنے کے لئے وطنی ہمدردیوں سے یکسر دور رہیں، دیکھیں ایرانی شعراء و تذکرہ نگاروں (شیعہ سنی کی قید نہیں) نے محض ملکی عصبیت کی بنا پر ہندوستانیوں پر اکثر پھبتیاں کی ہیں، ایرانی شعراء یہیں کے نذر ربا بھی تھے اور اسی ملک کی آب و ہوا اور یہاں کے اوضاع و مراسم کی ہجو بھی کرتے تھے، غرض کے بندے تھے، ادبی تجارت کی اور گھر کا رستہ لیا شیخ آذری اسفرائنی، صائب تبریزی، حکیم رکنائے کاشی سبھی اس مرض میں مبتلا نظر آتے ہیں حزیں نے ہند اور اہل ہند کی سخت سے سخت ہجویں کی، والہ داغستانی پر ملکی عصبیت طاری تھی غالب ہندی نژاد تھا وہ بھی ایرانیوں کی اُستادی تسلیم کرتا ہے اور بیدل و ناصر علی کو نظر میں نہیں لاتا اور قتیل و واقف کو محض بے مایہ سمجھتا ہے کاش اہل ہند کی آنکھیں ہوں اور وہ دیکھیں کاش ان کے قلوب ہوں اور ان میں گرمی پیدا ہو کبتک وہ خیالی فریب کاریوں میں گرفتار رہیں گے اور ہندوستانیوں سے رشتہ جوڑنے کی بجائے غیر ملکیوں سے ساز باز رکھیں گے، اسلام یقیناً وطنیت کا نام نہیں اور وہ سارے عالم کے انسانوں کو ایک رشتہ محبت و اخوت میں جوڑنا چاہتا ہے مگر اس کا کیا جواب کہ ہم ہر معاملہ کو مذہبی رنگ میں رنگ دیتے ہیں اور دوسرے ملک والے اپنی ملکی و وطنی خصوصیتوں پر بھی نازاں ہیں کاش ہمیں بھی احساس ہو کہ "ہندوستانی" ہونا ہمارے لئے بھی مایۂ نازش ہے!

خاقانی کو منوچہر شروان شاہ کے دربار کے علاوہ سلجوقیہ اور اتابکان موصل سے بھی علاقہ رہا غیاث الدین محمد مسعود بن ملک شاہ کی مدح میں کہتے ہیں۔

اول سلجوقیان سنجر ثانی کہ ہست   سایہ اش خیر العباد سایہ رب انم

قصیدہ بہت طویل ہے اس میں بانوے ابیات ہیں۔

دولت شاہ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ خاقانی حج کو جارہے تھے، مکہ کے رستہ میں جمال الدین موصلی سے ملاقات ہوگئی، ان کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا اسی طرح اتابک عراق مظفر الدین قزل ارسلان کی مدح میں بھی ایک قصیدہ ہے:۔

---

[1] ریاض الشعراء والہ داغستانی۔

گرچہ ملک الغرب توئی تا ابد اما　　برتخت خراساں ملک الشرق توشائی

خاقانی نے خود اپنے قصیدہ میں قیام موصل کا حال لکھا ہے جیسا کہ اگلے سطور میں، سیر وسیاحت کے ضمن میں لکھا جاچکا ہے۔

خصوصیات کلام

خاقانی کی دقت پسندیاں اور دقیقہ سنجیاں تو مسلم ہیں اور اسی لئے اس کو قبول عام حاصل نہ ہوسکا چنانچہ بقول عزیز الملک ابراہیم حال خلیل فیضی خاقانی کا کلام پسند نہیں کرتا تھا حالانکہ خود فیضی نے سواطع الالہام (تفسیر بے نقط) لکھ کر اپنی مشکل پسندی کا بہت کچھ ثبوت پیش کیا ہے اسی طرح بعض نقادان ادب "لغات واصطلاحات غیر متعارفہ" کی بناپر اس کا کلام ناپسند کرتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ جس بادشاہ یا امیر کے دربار میں وہ اپنا قصیدہ بھیجتا تھا تو ایک ہزار اشرفیوں سے اسکو کم صلہ نہیں ملتا تھا۔

خاقانی حج کرنے گیا حرم شریف مشرق ومغرب کے علما و نقادان فن سے بھرا ہوا تھا شاعر نے ایک قصیدہ کہا جس کا ایک بیت یہ ہے ؎ صبح از حمایل فلک آہیخت خنجر شش

اس کا نام "باکورہ الاشعار و مذکورۃ الاشجار" ہے۔

ابوطالب اصفہانی کی روایت ہے کہ "شرفائے مکہ بہ آب زر نوشتہ با مخبر بے نظیرش بہ درخانہ کعبہ آویختند"۔ اس سے بڑھ کر اور کیا کسی شاعر کی پذیرائی ہوسکتی ہے؟ اسی طرح اس نے لیالوشیر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کا پہلا بیت یہ ہے ؎

رخسار صبح پردہ بہ عمد ابر افگند　　راز دل زمانہ بہ صحرا بر افگند

ممدوح نے اس کو صلہ میں دو ہزار اشرفیاں دیں۔

(باقی)

عبدالمالک آروی

"فلسفہ مذہب" صرف آٹھ آنہ میں

اردو میں پہلی کتاب ہے جو اسلامی شعائر وعقائد پر ناقدانہ نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اسکا مطالعہ کرے۔ چونکہ اسکی جلدیں کم رہ گئی ہیں اس لئے اسٹاک ختم کرنے کے بجائے ایک روپیہ کے آٹھ آنہ میں مل سکتی ہے۔ محصول اسکے علاوہ ہوگا
(مینجر نگار)

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

سنہ ۱۸۵۷ء

تیسرا ایکٹ — پہلا منظر

(۵ ر جون سنہ ۱۸۵۷ء کی صبح - جھانسی میں قصر شاہی کا دربار عام - منظر وہی جو پہلے ایکٹ کے تیسرے منظر میں تھا - صرف تخت شاہی موجود نہیں ہے - رانی کی مسند کمرہ کے وسط میں ہے - داہنی طرف ایک ایرانی قالین پر انند راؤ پنڈت جی کے سامنے بیٹھا ہوا سر ہلا ہلا کر پڑھ رہا ہے پنڈت جی ایک موٹی سی کتاب پڑھ رہے ہیں اور کبھی کبھی انند راؤ کو ٹوکتے جاتے ہیں - رانی ادھر اُدھر گھوم رہی ہے گویا کسی گہری فکر میں مبتلا ہے - تھوڑی دیر بعد گنگا بائی دوڑتی ہوئی کمرہ میں آتی ہے - لیکن انند راؤ اور پنڈت کو دیکھکر جھجکتی ہے - بعد ازاں جھپٹ کر رانی کے پاس پہونچکر گھبرائی ہوئی آواز میں رانی سے کہتی ہے)

گنگا بائی :- بہن ! بہن !! غدر ہوگیا - ایک حولدار نے جس کے ساتھ پچاس سپاہی ہیں میگزین پر قبضہ کرلیا ہے - اور وہ کہتے ہیں کہ کمپنی کی باقی فوج بھی بہت جلد ان کے ساتھ ہوجائے گی -

رانی :- (ٹہلتی ہوئی دبی آواز میں) - بیوقوف ! گدھے !! بالآخر اس پاگل بخشش علی کے کہنے میں وہ بھی آ گیا - اب وہ جیلخانہ کے دروازے بھی کھول دیگا اور پھر ایشور ہی جانتا ہے کیا ہوگا -

گنگا بائی :- ابھی وقت ہے - چلو یہاں سے بھاگ چلیں جب سپاہی ہاتھوں سے نکل جائیں گے تو معلوم نہیں کیا حشر ہو - ابھی سے لوگ چہ میگوئیاں کررہے ہیں کہ یہ کریں گے وہ کریں گے -

رانی :- (سخت لہجہ میں) گنگا بائی، بڑی شرم کی بات ہے!! جو عورت حکمراں مرہٹہ خاندان سے تعلق رکھنے کا دعویٰ رکھتی ہو اس کی زبان سے ایسی باتیں مناسب نہیں۔ تم اگر چاہو تو جا سکتی ہو لیکن میں نہیں جاؤں گی۔

گنگا بائی :- (رانی کے پاؤں پر گر کر) بہن معاف کرو۔ اگر پھر ایسے شرمناک الفاظ زبان سے نکالوں تو زبان کاٹ ڈالنا۔ لیکن میں نے بزدلی کی وجہ سے ایسا نہیں کہا۔ میں صرف یہ خیال کرتی تھی کہ اس مصیبت کے وقت کو نسا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ اگر کمپنی کی فوج غدر کرے تو ہم کو اس سے کوئی مطلب نہ رکھنا چاہئے اور ہمارے لئے یہی زیادہ مناسب ہوگا کہ اُسوقت واپس ہوں جب دونوں میں سے کوئی فتح حاصل کرلے۔

رانی :- (آہستہ سے پنچ پر ٹیک لگاکر) گنگا بائی! تم نے اپنی ان ہوشمندانہ باتوں سے تو مجھے تھکا دیا ہے۔ کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جو جھانسی سے اتنی محبت کرتی ہوں عین ایسے موقع پر اُسے خیرباد کہدوں، جبکہ اُسے میری ضرورت ہے۔ کیا کوئی آگ لگنے کے وقت اُس گھر کو چھوڑ دیتا ہے جس میں صد ہا برس اُس نے اور اُس کے اہل و عیال نے زندگی بسر کی ہو۔ نہیں۔ بلکہ اُس وقت وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ اپنے گھر کو کسی نہ کسی طرح بچائے۔

گنگا بائی :- (پنچ کے پاس جاکر) لیکن بہن! اگر کمپنی نے غداروں پر فتح پائی تو انگریز حکام جھانسی کے مقتدر لوگوں کو بدنام کریں گے کہ انھوں نے غداروں کو پس پردہ کمک دی۔ اور اگر غدار فتحیاب ہوئے تو وہ اپنی حکومت قائم کرینگے اور کسی مسلمان سپاہی کو اپنا سردار بنا لیں گے۔ اس لئے اگر تم یہاں ٹھہری رہیں تو تمہارے دو نقصان ہیں۔ تمہارا گزارا بھی جاسے گا اور رانی بننے کا جائز حق بھی۔

رانی :- (بیٹھکر) ٹھہرو! ٹھہرو! گنگا بائی! ان پریشان کن خیالات کو مجھ سے الگ رکھو۔ تم بھاگ چلنے کو کہتی ہو، باپ اور دیوان غداروں کا ساتھ دینے کو کہتے ہیں اور مہاراجہ سندھیا انگریزوں سے وفاداری کرنے کا پیغام بھیجتے ہیں۔ میرے سر کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ (انندراؤ کو دیکھکر) اگر انند کا خیال نہ ہوتا تو میں زندگی ختم کر دیتی اور ان جھگڑوں سے نجات پاجاتی۔ تین ہفتے ہوئے جبسے میرٹھ میں غدر کی خبر سنی مجھے نیند نہیں آئی۔ جھانسی ہی میں غدر شروع ہوگیا اور اب تو عرصہ تک چین ملنا ممکن نہیں۔ (ذرا ٹھہر کر اور یکایک پھر گنگا بائی سے مخاطب ہو کر) بہن ذرا جاؤ، میرے باپ کو تو ڈھونڈو یقیناً انھیں تازہ خبریں معلوم ہوں گی۔ دوڑو! میں سمجھتی ہوں کہ مجھے جلد کوئی تدبیر اختیار کرنا چاہئے۔ گو کہ اب میں نام ہی نام کو رانی باقی رہگئی ہوں تاہم مجھے یقین ہے کہ اب بھی میری تھوڑی بہت عزت باقی ہے۔

(جونہی گنگا بائی دروازے کی طرف جاتی ہے۔ ماما صاحب اور اُن کے پیچھے تارا سنگھ دیوان داخل ہوتے ہیں۔ گنگا بائی الگ کھڑی ہو کر اُن کو غور سے دیکھتی ہے۔ اور باہر چلی جاتی ہے انندراؤ دونوں آدمیوں کو داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر اُن کی طرف دیکھتا ہے، لیکن پنڈت جی

اپنی کتاب پڑھے جاتے ہیں)

ماما صاحب :- (خوشی کا چہرہ بنا کر) خوشخبری! بیٹی! جھانسی میں مرہٹوں کا راج ایک مرتبہ پھر ہو گا۔ کمپنی کے سواروں نے طے کر لیا ہے کہ باغیوں سے مل جائیں گے۔

تارا سنگھ :- رانی! حولدار گور بخش نے میگزین پر قبضہ کر ہی لیا ہے اور بخشش علی داروغہ جیل حکم پاتے ہی قیدیوں کو رہا کر دے گا۔

رانی :- (سختی سے) دیوان صاحب! آپ پر مجھے تعجب معلوم ہوتا ہے اور پتا جی، آپ پر بھی۔ میرا خیال تھا کہ آپ دونوں کبھی اسے نہ پسند کریں گے کہ کوئی سپاہی عہد وفاداری توڑے خواہ وہ کسی کا ماتحت ہو۔

تارا سنگھ :- رانی! یوں تو میں بھی اسے نہ پسند کرتا کہ کوئی سپاہی اپنے مالک کے خلاف بغاوت کرے۔ لیکن یہ سپاہی عہد شکنی کی معقول وجہ رکھتے ہیں۔ اُن کی شورش کی وجہ مذہب ہے اور انگریزوں نے اُن کے مذہبی اُصول میں مداخلت کی ہے۔

رانی :- (طعن کے لہجہ کو چھپا کر) اور کیا تم اُن کا ساتھ مذہب کی وجہ سے دیتے ہو؟

ماما صاحب :- (بے صبری سے) ہاں! بیٹی! مذہب کی وجہ سے۔ سیاسی اور مذہبی وجوہ دونوں ایک ہی طرح پیش ہیں۔

تارا سنگھ :- اور یہی میرا بھی جواب ہے۔ مسلمانوں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے اُن کے پاک عقیدہ کو گندہ کر دیا ہے اور ہم ہندوؤں کا خیال ہے کہ انگریزوں نے ہمارے پاک رسم و رواج تبنیت اور وراثت کو چھین لیا ہے۔ یہ بھی خدا کی مہربانی ہے کہ انتقام کا موقع اُس نے ایسا دیا جس میں دونوں قومیں مشترک ہیں۔

رانی :- (طعن آمیز لہجہ میں) دیوان صاحب! تین ماہ قبل تو آپ انگریزوں کے اس قدر خلاف نہ تھے اب کس بات نے آپ کو ان کا مخالف کر دیا ہے۔

ماما صاحب :- بیٹی! بہت سخت سست ہو۔ علاوہ تمہارے ہم سب اُسوقت مغالطہ میں تھے۔ انگریزوں نے ہم کو بیوقوف بنایا اور وہ ہمیشہ ہندوستانیوں کو بیوقوف بناتے ہیں۔

تارا سنگھ :- مجھے اپنی بیوقوفی پر سخت افسوس ہے۔ میں نے جو کچھ کیا آپ کے فائدے کے لئے کیا میری یہ تجویز کہ گدی کے تمام حقوق کے معاوضہ میں معقول پنشن دیدی جائے آپ ہی کے فائدے کے لئے تھی۔ لیکن جب مجھ کو یہ علم ہوا کہ گزارہ میں ایک شرط یہ تھی کہ سر گباش راجہ کا قرضہ ادا کیا جائے تو جی چاہتا تھا اپنا سر پھوڑ ڈالوں، کہ میں نے مجسٹریٹ کی چکنی چپڑی باتوں پر کیوں اعتماد کیا

رانی :- (غصہ سے) اپنا افسوس چھوڑئے۔ دیوان صاحب! میں ان احسانات کی زیادہ پروا نہیں

کرتی ہوں جو انگریزوں نے زبردستی مجھ پر کئے ہیں۔ یہ مثل قرضہ جات حسنہ کے ہیں اور میں جھانسی کے کسی قرضدار کو قرض نہ ادا کرنے کے بجائے فاقہ کشی سے مرنا زیادہ پسند کرتی ہوں۔ (سخت ہو کر) میجر ایلس کو چھوڑ دو۔ اُنھوں نے تو جھانسی کو بچانے کی تنہا اتنی کوشش کی ہے کہ آپ سب مل کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔

ماما صاحب :۔ (مداخلت کرتے ہوئے) بیٹی ہم وقت برباد کر رہے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس کی ضرورت پڑے گی کہ ازسرِ نو جھانسی راج کا اعلان کیا جائے۔ انند کمار مستقبل راجہ ہوں گے اور تم نائب ہو گی اس لئے سب انتظام تیار رکھو اور اشارہ کی منتظر رہو۔ ہم غداروں سے سازش کر چکے ہیں۔ اور اُنھوں نے نئے راج کی اعانت کا اقرار کر لیا ہے۔

رانی :۔ (کھنچکر اور مستحکم ارادہ کے ساتھ)۔ ماما صاحب مجھے نہ آپ کے احکام کی ضرورت ہے نہ غدار سپاہیوں کے احکام کی۔ انگریز ابھی تک برسرِ حکومت ہیں۔ میں اس نزاع میں نہ اُن کا ساتھ دینا چاہتی ہوں نہ اُن کے نوکروں کا۔

ماما صاحب :۔ (غصہ سے) تم طوطے کی طرح وہی رٹ رہی ہو جو سندھیا اور اُس کے مکار دیوان ڈنکر راؤ نے تم کو پڑھا دیا ہے۔ میں تمھیں مطلع کرتا ہوں کہ یہاں کے حالات گوالیار اور اندور کے حالات سے مختلف ہیں ہمارے پاس ذاتی فوج مثل سندھیا اور ہلکر کے نہیں جس پر بھروسہ کریں۔ پس فتحیاب فریق سے ہم کو صلح کرنا چاہئے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کے غدر کو تین ہفتہ سے زیادہ ہو گئے اور شورش ہر چہار جانب پھیل رہی ہے تھوڑے ہی عرصہ میں ایک انگریز بھی ہندوستان میں نظر نہ آئے گا۔ اس لئے اگر اس جھگڑے میں اپنا پہلو مضبوط رکھنا ہے تو ہم کو ابھی سے اس کا انتظام کرنا چاہئے۔

رانی :۔ (بنچ پر بیٹھ کر) مجھے عجلت نہیں اچھی معلوم ہوتی۔ ابھی سے کوئی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا کہ کیا ہوگا۔ ڈنکر راؤ جو کہتا ہے خود سمجھتا ہے۔ انگریز ہمیشہ لڑائی بُری طرح شروع کرتے ہیں۔ لیکن سمندر پار اُن کے پاس بڑے سامان ہیں جن کو ضرورت پر وہ جہازوں میں لے آئیں گے۔ میں محل کے دروازے بند کرا دوں گی اور پہرہ بٹھا دوں گی۔ اور جب تک یہ طوفان دور نہ ہو جائے ہم سب بند رہیں گے۔ (انند راؤ سے جو کھڑا ہو کر ماما صاحب کو گھورنے لگتا ہے۔) انند! تم پڑھو۔ تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔

ماما صاحب :۔ (رانی کی طرف غصہ میں گھوم کر) پڑھو! پڑھو! تم تو نہایت ہی سخت احمق نکلیں۔ تم تو بڑی سچی رہنے والی عورت بنتی تھیں۔ اب کیا ہوا کہ اُس چور ڈلہوزی کی باتوں پر عمل کر رہی ہو۔ (انند کی طرف دیکھ کر جو ہٹ کر الگ ہو جاتا ہے) پڑھو، ہاں پڑھتے جاؤ، جبکہ تمھیں اپنے حقوق کے لئے جنگ کی تیاری کرنا چاہئے۔ (لکڑی کی چھوٹی میز میں لات مارتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔ انند راؤ رانی کے پاس جاتا ہے جو سیدھی

ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ اور پنڈت متعجب ہو کر جھک جاتا ہے) پڑھے جاؤ! یہاں تک کہ جھانسی راج مسلمانوں کے قبضہ میں چلا جائے اور کوئی مسلمان سردار جھانسی پر حکومت کرنے والا آجائے۔

(ماما صاحب چیزوں کو ٹھکراتا ہوا کمرے سے باہر جاتا ہے اور طعن سے چلاتا جاتا ہے پڑھو! پڑھو! رانی بس پردہ ہوتی ہوئی ایک بازو انند راؤ پر رکھتی ہے جو اپنا سر اُس کی گود میں چھپا لیتا ہے اور نیم وا آنکھوں سے ماما صاحب کو دیکھتا جاتا ہے۔ دیوان جو پیچھے کھڑا تھا ماما صاحب کے پیچھے رانی کو سلام کرتا ہوا باہر چلا جاتا ہے)

پردہ گرتا ہے

دوسرا منظر

(۷ رجون ۱۸۵۷ء۔ خس کی ٹٹی گزرگاہ پر بالاخانہ کے دروازہ پر لپیٹ دی گئی ہے۔ رانی پلنگ پر لیٹی پنکھا جھل رہی ہے۔ انند راؤ فرش پر پلنگ کے نزدیک بیٹھا اُس کی طرف مغموم دیکھ رہا ہے۔ گنگا بائی پیچھے بیٹھی کچھ سی رہی ہے اور وقتاً فوقتاً گزرگاہ کو دیکھتی جاتی ہے۔ نیچی لکڑی والی میز جس پر کتابیں اور لکھنے کا سامان رکھا ہے، داہنی جانب رکھی ہے)

انند راؤ :- پھر ہم سپاہیوں سے کیوں نہ مل جائیں اور انگریزوں کو مار ڈالیں۔ قلعہ میں تھوڑے سے ہیں۔

رانی :- بیٹا! میں تم سے بار بار کہہ چکی ہوں کہ باغیوں کے بنانے سے راجہ بننا خطرناک ہے۔ اگر گدی مکاری سے حاصل کی جائے گی تو مکاری اُسے چھنوا بھی دے گی۔

انند راؤ :- رانی اماں! لیکن آپ مجھے تلوار کی مشق کی ہدایت کرتی تھیں۔ اگر ہم اسوقت انگریزوں پر حملہ نہ کریں گے تو ہم کو جھانسی فتح کرنے کا موقع کبھی نہ ملیگا۔

رانی :- (بیٹھ کر ذرا دلیری سے) اگر پیشوا اپنے راج کو دوبارہ سنبھال لیتے اور مرہٹہ فوج باقاعدہ میدان میں آئی ہوتی تو میں انگریزوں پر حملہ کرنے میں ذرا نہ جھجکتی۔ میں اس کو مذہبی لڑائی سمجھتی اور جو کچھ میرے پاس ہے صرف کر دیتی حتیٰ کہ اپنی زندگی تک قربان کر دیتی۔ (مغموم ہو کر) لیکن بیٹا وہ موقع نہیں ہے۔ چند باغی سپاہی راج کی بنیاد نہیں ڈال سکتے جس سے ہم مرہٹوں کو اطمینان ہو جائے۔ اگر کمپنی کے مسلمان ملازمین کا ہم سہارا پکڑیں تو ہمارے پاس جو تھوڑا بہت ہے وہ بھی نہ رہیگا۔

انند راؤ :- لیکن ماما صاحب کہتے ہیں کہ سب انگریز مار ڈالے جائیں گے اور اگر اب ہم نے سپاہیوں کی مدد نہ کی تو سپاہی پھر ہم کو جھانسی نہ واپس دیں گے۔

رانی :۔ (غصہ سے کھڑی ہو کر) ماما صاحب اور سب لوگوں کی طرح ہیں۔ اُن کو اپنی فکر ہے کہ جو کچھ مل سکے حاصل کرلیں۔ اُنھیں دوسروں کی خواہش اور آرام کی فکر نہیں۔ اُنھوں نے پہلے مجھے راجہ گنگا دھر کے ہاتھ بیچا اور پھر انگریزوں کے ہاتھ۔ اور اب وہ مجھے ان سپاہیوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں اب نہ فروخت ہوں گی۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے ہیں۔ بغاوت ہمارا کام نہیں ہے۔ ہمیں کسی کی طرفداری نہ کرنا چاہئے اگر ماما صاحب۔ ۔۔

گنگا بائی :۔ (دوڑ کر آتے ہوئے) بہن! میں نے ابھی راؤ آپا کو صحن سے آتے اور محل میں داخل ہوتے دیکھا ہے۔ اُن کے کپڑے بالکل پھٹے ہوئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ کسی جنگ میں مشغول تھے۔ پرمیشور کرے کوئی بُری خبر نہ لائے ہوں۔

رانی :۔ (خاموش بنچ پر بیٹھی ہوئی) مرہٹوں کی لڑکیوں کو ہمیشہ بُری خبر سننے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ گنگا بائی! جاؤ اور راؤ آپا کو اندر لے آؤ۔ (انند راؤ سے جو ابھی تک فرش پر بیٹھا تھا) بیٹا! آؤ! میرے پاس کھڑے ہو جاؤ۔ اب جو کچھ لکشمی بائی پر مصیبت آئے تم بھی اُس میں حصہ لینا۔ میں سمجھتی ہوں کہ خوشی کے دن ختم ہو گئے۔

(انند راؤ کھڑا ہو جاتا ہے اور رانی سے لپٹ کر ایک طرف ہو جاتا ہے۔ گنگا بائی جو دروازہ میں جھانک رہی تھی دروازہ کھولتی ہے۔ راؤ آپا پاگلوں کی طرح پھٹے کپڑے اور بکھرے بالوں کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اُس کے سر پر پگڑی بھی نہیں اور بہت مضطرب نظر آتا ہے۔ رانی کے پیروں پر گر کر چلاتا ہے اور پیشانی فرش زمین سے ٹکراتا ہے۔)

رانی :۔ (بنچ سے جھک کر اور راؤ آپا کا کندھا تھپتھپا کر) مرہٹہ جنگجو سپاہی کو اگر اُس کی رانی پر مصائب پھٹ پڑیں چلانے کی ضرورت نہیں۔ راؤ آپا! کیا ہوا؟ میں تیار ہوں۔

راؤ آپا :۔ (سسکیاں لیتے ہوئے) رانی صاحبہ! میں آنے والے مصائب سے خائف نہیں ہوں بلکہ میری پریشانی کا باعث سپاہیوں کی نمک حرامی ہے جنھوں نے عرصہ تک جھانسی راج کا نمک کھایا ہے۔

رانی :۔ کیا محل کے محافظین کے متعلق تم کہہ رہے ہو۔ آج ہی سویرے اُنھوں نے مجھ سے عہد وفاداری کی قسم کھائی ہے اور اقرار کیا ہے کہ خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو وہ میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔

راؤ آپا :۔ (پیشانی زمین پر مار کر) افسوس! رانی صاحبہ! اُن سب نے بدعہدی کی اور سب باغیوں سے جا ملے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ اُن کو ڈرایا گیا کہ اگر تم رانی کا ساتھ دو گے تو کھانے میں تم کو زہر دیدیا جائے گا۔ اور کچھ اس وجہ سے کہ باغی سپاہیوں نے اُن کو بڑے بڑے انعامات دینے کا وعدہ کیا۔

رانی :۔ (غصہ کو دباتے ہوئے کھڑی ہو کر) یہ دھمکیاں اور وعدے کس کے نام سے دیئے گئے؟

راؤ آبا:۔ بخشش علی داروغہ جیل کے نام سے۔ رانی صاحبہ! اِس شخص نے تمام مخلوق کو اُسوقت سے جب سے کہ قیدی رہا ہوئے سخت خائف کر رکھا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ بالکل دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور اُس کا منھ تھوک سے بھر آتا ہے۔ جب کوئی انگریزوں سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا کام اُس کے سپرد کیا ہے۔

رانی:۔ اُس پاگل سے باغی سپاہیوں کے سردار کیا کہتے ہیں؟

راؤ آبا:۔ رانی صاحبہ! وہ اُس کو نہیں سمجھا سکتے! اُس کا اثر مخلوق پر بے انتہا ہے۔ اور فوج کے لوگ بھی فتنہ و فساد کے ڈر سے اُس کی مخالفت نہیں کرتے۔ اُسی نے لوگوں کو میرے پیچھے لگا دیا کہ مجھے مار ڈالیں کیونکہ میں محافظین کو واپسی کی ترغیب دے رہا تھا۔

رانی:۔ (مجبورسی ہوکر) میں سمجھتی ہوں کہ باغی اب اگر ہماری محاصرہ والی توپوں کو صحن سے علٰحدہ کر دینگے محافظین یقیناً اُن کو پتہ بتلادیں گے کہ کہاں چھپی ہیں۔ اگر ہماری توپیں قلعہ کی دیوار پر چلیں تو انگریز یقینی اطاعت قبول کرلیں گے یا جانیں لڑا کر دیدیں گے۔

راؤ آبا:۔ (کھڑے ہوکر) رانی صاحبہ! جب میں آدمیوں کے ہجوم میں تھا ایک نہایت شرم ناک واقعہ پیش آیا۔ تین انگریز مسلمانوں کی صورت میں پکڑے گئے جو آپ کے پاس محصورین کی امداد کے لئے آ رہے تھے۔ جب اُن کا لباس علٰحدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ تینوں افسر تھے جو قلعہ کی حفاظت نہایت انہاک کے ساتھ کر رہے تھے۔ (منھ پر ہاتھ رکھکر اور منھ پھیر کر) میری آنکھوں کے سامنے بخشش علی کے ساتھیوں نے اُن کو ذبح کر دیا تاکہ اور لوگوں کو جو آپ سے ملنا چاہیں تنبیہ ہو جائے۔ (ذرا ٹھہر کر) اُسی غل و شور میں میں نکل بھاگا۔

(رانی بنچ سے کھڑی ہو جاتی ہے اور مٹھی دبا کر سینہ پیٹتی ہے اور اِدھر اُدھر قدم ڈالتی ہے اور سر ہلا کر غصہ میں کہتی ہے)

رانی:۔ بیشک اب بادل گھر آئے ہیں خون برسنا شروع ہو گیا ہے اور معلوم نہیں اب کب بند ہو۔

(پہلے بھنبھناہٹ کی آواز آتی ہے اور پھر یہی آواز بلند ہو جاتی ہے اور شور ہونے لگتا ہے۔ صحن میں ہجوم دکھائی دیتا ہے جو بخشش علی کی قیادت میں توپیں تلاش کرتا ہے۔ غل ہوتا ہے کہ توپیں جل گئیں۔ بخشش علی کی آواز گونجتی ہوئی سُنائی دیتی ہے۔ رانی کو بُرا بھلا کہتا ہے اور مقابلہ کرنے کو تیار ہے۔ ہجوم بھی بخشش علی کی آواز کو دہراتا ہے جس سے وہ خوش ہوتا ہے۔ محل میں سب متوحش ہو جاتے ہیں۔ اندر راؤ روتا ہوا رانی کے پاس جاتا ہے۔ ہاتھ کانوں پر رکھے ہوئے اور سر جھکائے ہوئے۔ رانی کوشش کرکے بولتی ہے اور راؤ آبا کو بلاکر

انند راؤ کو علحدہ لے جانے کے لئے کہتی ہے۔ اسی اثنا میں گنگا بائی آہستہ سے بالاخانہ پر آجاتی ہے۔ خود چھپکر صحن پر نظر ڈالتی ہے۔ غل کچھ دیر کے لئے کم ہوجاتا ہے اور بخشش علی کی بلند آواز اور ڈانٹ پھٹکار سنائی دیتی ہے۔ راؤ آپا اور لڑکا جب آواز تیز ہوتی ہے ٹھہر جاتے ہیں مگر لڑکا کچھ نہ کچھ بولتا جاتا ہے۔

بخشش علی کی آواز:۔ کہاں ہے؟ وہ لامذہب بت پرست بے حیا عورت! کہاں ہے؟ ہمارے عتاب سے اِن کافروں کو کیسے بچائے گی۔ اُس کو باہر لے آؤ میں خود اُسے قتل کروں گا۔ انگریزوں کے سب دوست ہمارے دشمن ہیں۔ لے آؤ! ورنہ ہم اِس منحوس بھٹہ میں آگ لگا دیں گے۔ خدا نے یہ پاک کام میرے سپرد کیا ہے کہ میں ہندوستان کو ان تمام وباؤں اور خباثتوں سے پاک کردوں۔ جاؤ ابھی لاؤ ورنہ تم سب قتل کئے جاؤ گے

(باہر شور ہوتا ہے اور اُس کی آواز گم ہوجاتی ہے۔)

رانی:۔ (جس طرح کوئی کسی کام پر تیار ہو انند راؤ کی طرف اشارہ کر کے) راؤ آپا! اِس چوں چوں کرنے والے چوہے کو لے جاؤ اور کسی سوراخ میں چھپا دو۔ نہ یہ سچا مرہٹہ معلوم ہوتا ہے نہ شاہی خاندان کا موزوں قائمقام ہوسکتا ہے۔

(راؤ آپا دروازے کی طرف جاتا ہے اور انند راؤ کو ہاتھ پکڑ کر لے جاتا ہے۔ یکایک لڑکا ہاتھ چھڑا لیتا ہے اور رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور چھوٹے ہاتھوں سے اُسکو پکڑ لیتا ہے۔

انند راؤ:۔ مہربانی کر کے مجھے نہ بھیجئے۔ رانی ماں۔ میں اب نہ روؤنگا۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتا مگر میں آنسو نکلنے سے مجبور ہوں۔ رانی ماں مجھے علحدہ نہ کیجئے۔ دیکھئے میں اب نہیں روتا ہوں۔ (ماں کی طرف دیکھکر) اور اگر چلاؤں بھی تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ میں ڈرتا ہوں۔ میں مرہٹہ سپاہی ہوں اور دشمن سے خوب مقابلہ کرسکتا ہوں۔

(رانی جھک جاتی ہے اور اُس کو گلے لگا کر پیار کرتی ہے اور راؤ آپا کو اشارہ کرتی ہے کہ وہ بالاخانہ سے دور ایک جانب کھڑا ہوجائے۔

گنگا بائی:۔ (زور سے بالاخانہ سے نیچے دیکھتی ہوئی) وہ توپیں لئے جارہے ہیں۔ محافظ اُن کو امداد دے رہے ہیں۔ اُن کو گولیاں بارود بھی مل گئی ہیں۔ لیجئے اب محافظ بتلا رہے ہیں کہ توپیں کیونکر بھری جاویں گی۔ توپیں اب علحدہ کی جارہی ہیں۔ بخشش علی اور اُس کے ہمراہی محل کی طرف آرہے ہیں۔ شاید اب وہ بدزبانی بھی کرے گا۔

بخشش علی کی آواز:۔ اُس رنڈی کو ادھر لاؤ! لاؤ! ہم اُس کو قتل کریں گے۔ وہ انگریزوں کی حامی ہے

جنھوں نے ہمارے مذہب کی تذلیل کی ہے اور ہماری عزت برباد کی ہے۔ اُس کو باہر لے آؤ! ورنہ اس منحوس جگہ پر کسی کی خیر نہیں۔

(رانی اپنی ساری سنبھالتی ہوئی ایک چھوٹے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھتی ہے اور بالاخانہ کی طرف بڑھتی ہے۔ گنگا بائی اور راؤ آبا آگے بڑھکر اُسے روکتے ہیں لیکن وہ اُن سے چھوٹ کر دروازے پر پہونچتی ہے)

رانی:۔ (بالاخانہ سے) بخشش علی! میں بالکل تیار ہوں۔ اگر میری عزیز رعایا میری موت کی طالب ہے تو میں مرنے پر بالکل خوش ہوں۔ لیکن اے جیل کے داروغہ! یاد رکھ کہ اگر میں اسوقت انگریزوں کی حمایت میں ایک کام بھی کرنا چاہتی ہوں تو تم نے ایسے بیس کام کئے ہیں۔ کیا تم نے اُن کی خوشامد نہیں کی اور بارہا کتے کی طرح ان کے پاؤں نہیں چاٹے یہی لوگ جو اسوقت تمھارے پیچھے آوارہ کتوں کی طرح چل رہے ہیں تم سے کیا کچھ نقصان نہیں اُٹھا چکے ہیں۔ وہ اور دوسرے جھانسی والے ہمارے مابین فیصلہ کریں۔ جن غریبوں کو میں نے پوشاک دی، جن بھوکوں کو میں نے کھانا کھلایا اور جن فقیروں کو میں نے بھیک دی اور جن قیدیوں کو میں نے رہا کیا اگر میرا خون بہانا چاہتے ہیں بہائیں میں ایک لفظ شکایت زبان پر نہ لاؤں گی۔ لیکن اگر وہ میری زندگی نہیں ختم کرنا چاہتے تو یقیناً انھیں تم کو، بخشش علی! تم کو اپنا شکار بنانا چاہئے۔ (ذرا سکوت ہوتا ہے اور ایک خفیف گنگناہٹ کی آواز آتی ہے) کیا؟ کیا تم کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے؟ اچھا! میں فیصلہ کا انتظار کرتی ہوں اور اندر جاتی ہوں۔ جب تمھاری خواہش ہوگی میں تعمیل کے لئے فوراً آجاؤں گی۔ اگر باشندگان جھانسی جیل داروغہ بخشش علی کو رانی لکشمی بائی کے مقابلہ میں ترجیح دینا چاہیں تو یقیناً رانی لکشمی بائی کو موت سے ہم آغوش ہونا چاہئے۔

(جس وقت رانی بالاخانہ پر تقریر کررہی تھی ماما صاحب ننگی تلوار لے کر مع تارا سنگھ کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ذرا ٹھہر کر ماما صاحب بالاخانہ کی طرف بڑھتا ہے۔ گنگا بائی مداخلت کرتی ہے اور واپس ہونے پر اصرار کرتی ہے۔ وہ سب جب تک تقریر ختم نہ ہوئی مستعدی سے کھڑے رہے اس کے بعد رانی واپس ہوتی ہے اور کسی قدر عام تشویش میں کمی ہوجاتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر اپنی جگہ واپس جاتی ہے ماما صاحب تلوار میان میں کرلیتا ہے۔ رانی تھک کر بنچ پر لیٹ جاتی ہے تھوڑی ہی دیر میں گنگا کسی قدر پہلے سے بلند آواز میں بات شروع کرتی ہے۔)

گنگا بائی:۔ وہ اپنے خطرناک بھوتوں کے ساتھ واپس جارہا ہے۔ صحن بالکل خالی ہوگیا۔ اکثر لوگ آپ کی تقریر سُنکر واپس ہوگئے۔ لوگ اُس کو نہیں چاہتے لیکن اُس کے قصاب ساتھیوں سے ڈرتے ہیں۔

بخشش علی کی آواز:۔ (دور سے) سُن! بے شرم رنڈی! ابھی ہم تجھے چھوڑے دیتے ہیں۔ پہلے تیرے انگریز

رفیقوں کو صاف کردیں۔ تب تجھ کو سمجھیں گے۔ لیکن اگر اس اثنا میں تو نے ان بے دینوں کو ذرا بھی مدد دی تو ہم بیرحمی سے تجھے قتل کرڈالیں گے۔ تیرا گوشت گدھوں کو کھلادیں گے۔ خوب سمجھ لے جو بخشش علی کہہ رہا ہے۔ میں نے محافظ سپاہی محل کے گرد تعینات کردئے ہیں اور اب کوئی بات مجھ سے نہ چھپ سکے گی۔

ماما صاحب:۔ کیا تم نے اُس کی آواز میں فرق کا امتیاز کیا۔ بیٹی! تم نے اُسے ڈرادیا ہے۔ اب وہ ہم کو زیادہ نہ ستائیگا جیسے ہی جھانسی راج قائم ہونے کا اعلان ہوگا ہم اُس کی بھی فکر کریں گے۔ (وہ دیوان کی طرف معنی خیز نگاہ سے دیکھتا ہے) ابھی اُسے چھوڑو۔ (رانی سے) بیٹی! میں ایک خوشخبری لایا ہوں۔ پیشواؤں کا علم پھر بلند ہوگیا ہے۔ اس بات کا اعلان ہوا ہے کہ تمام سچے مرہٹے ناناصاحب کی اعانت کے لئے جمع ہوجائیں۔

رانی:۔ (بیٹھی ہوئی) مرہٹے کیونکر کامیاب ہوسکتے ہیں جبکہ مسلمان دہلی میں بہادر شاہ کو تخت پر بٹھا رہے ہیں۔

تارا سنگھ:۔ رانی صاحبہ! بہادر شاہ ضعیف شخص ہے اور وہ صرف برائے نام بادشاہ ہوگا —— اصل حکمراں تو مرہٹہ سردار ہی ہوں گے۔

رانی:۔ کیا سندھیا اور ہلکر نے بادشاہت کا اعلان کردیا ہے؟

ماما صاحب:۔ نہیں بیٹی! لیکن جہاں تک معلوم ہے گوالیار اور اندور کے حالات سندھیا اور ہلکر کو باغی سپاہیوں کی اعانت پر مجبور کریں گے۔

(ایک بلند آواز سنائی دیتی ہے اور اُس کے بعد دوسری پھر ایک خوشی کی گونج سنائی دیتی ہے۔ کمرہ میں ہر شخص چونک پڑتا ہے اور رانی بیٹھ جاتی ہے۔ رانی پھر سیدھی لیٹ جاتی ہے اور آہیں بھرتی ہے اور بال نوچتی ہے اور اُس کا چہرہ تکیوں میں چھپا ہے۔ انند راؤ دوڑ کر اُس کے پاس آتا ہے اور روتا ہوا اُس کے قدموں پر گر پڑتا ہے۔ اُسی وقت گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑ کر جاتی ہے اور فوراً واپس آتی ہے۔)

گنگا بائی:۔ (اپنا ہاتھ آہستگی سے رانی کے ہاتھ پر رکھ کر اور غمگین آواز سے) بہن چپ رہو۔ اچھا ہو کہ اس قلعہ کی دیواریں ہماری توپوں سے گرادی جاویں بجائے اس کے کہ دشمن کی توپیں گرادیں۔

(رانی کے غم کو دیکھ کر سب آدمی اپنا سر جھکادیتے ہیں اور راؤ آپا بظاہر بہت متاثر معلوم ہوتا ہے)

تیسرا منظر

(وقت شب تاریخ ۸ جون ۱۸۵۷ء۔ شمع روشن تھی۔ کمرہ تاریک اور خاموش تھا۔ رانی پلنگ پر لیٹی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے اور پریشان نظر آتی ہے۔ گنگا بائی رانی کے پاؤں کے پاس کھڑی ہے۔ انند راؤ اور

راؤ آپا چوکی پر بیٹھے ہوئے اسلحہ پر صیقل کر رہے ہیں۔)

رانی :۔ (آہ بھر کر) کاش کہ گنگا بائی میں نے تمہاری نصیحت مان لی ہوتی اور اس مصیبت سے بھاگ نکلتی کہ میرے دماغ کو تو سکون ہو جاتا۔

گنگا بائی :۔ (افسوس کرتے ہوئے) بہن! ہونے والا ہو کے رہتا ہے۔ تمہاری تقدیر میں رنج تھا اور میری تقدیر میں اُس رنج میں شرکت کرنا۔ یہی ہمارا دھرم ہے۔ اور پھر بھاگ بھی کہاں جاتے۔ یہ مصیبت تو ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔

رانی :۔ یہی کہکر میں بھی اپنے دل کو تسکین دیتی ہوں کہ اپنے ہی آدمیوں میں رہکر مصیبت کا مقابلہ کیوں نہ کروں اِدھر اُدھر جاکر نئے خطروں میں کیوں پڑوں۔

گنگا بائی :۔ بہن! میں جانتی ہوں کہ بغیر آپ کے جھانسی میں امن دشوار ہے۔ ہر شخص اپنے فائدہ کی فکر میں ہے

(بگل کی آواز باہر سے آتی ہے۔ رانی بیٹھ جاتی ہے اور ہر ایک ہوشیار ہو جاتا ہے۔)

رانی :۔ یہ سپاہیوں کے سردار ہوں گے۔ میرے باپ نے مجھے اُن کو یہاں لے آنے کی دھمکی دی ہے۔ گنگا بائی جلد میری زریں شال لے آؤ۔ ان بدتمیزوں سے رانی ہی کی طرح مجھے بات چیت کرنا چاہیں۔ (گنگا بائی کمرہ سے باہر جاتی ہے۔) انند! تم تلوار اور زرہ بکتر لگالو۔ ہم کو ان معمولی سپاہیوں کو مرہٹہ شاہزادہ کی صورت دکھا دینا چاہئیے

(رانی نے آئینہ دیکھا، اپنی ساری اور بال ٹھیک کئے۔ راؤ آپا نے انند راؤ کو اسلحہ پہنائے گنگا بائی واپس ہوتی ہے اور رانی کو شال اُڑھاتی ہے۔ پھر وہ سلیپر پہناتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ماما صاحب مع تارا سنگھ اور دو ہندوستانی حکام کے اندر آتے ہیں۔ اے نمبر ۱۲ رجمنٹ نیٹو انفنٹری اور نمبر ۱۴ ارگلر کیولری کو احکام دیتے جاتے ہیں۔ جمعدار لال بہادر اور رسالدار لال محمد دونوں بنگال آدمی ہے افسران ہیں جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج ہے۔ اول الذکر ایک چمکدار سُرخ وردی جس پر سفید حاشیے ہیں پہنے ہوئے ہے اور ایک تلوار سفید پٹکے سے لٹکتی ہے۔ رسالدار سفید کوٹ کے ساتھ سفید برجس پہنے ہوئے ہے جو گھٹنے کے نیچے چست ہے اور اوپر کی طرف ڈھیلی اور ایک کرتہ پہنے ہے جو گھٹنوں تک نیچا ہے۔ منھ پر داڑھی ہے اور سر پر پگڑی۔ جمعدار کی پگڑی سفید ہے اور رسالدار کی نیلی۔ اول الذکر فوجی بوٹ پہنے ہے اور دوسرا ہندوستانی جوتہ۔ رانی کھڑی ہے اور انند راؤ اُس کے پاس کھڑا ہے۔ گنگا بائی اور راؤ آپا پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ رانی کو دونوں افسر فوجی قاعدہ سے سلام کرتے ہیں۔ وہ اپنا ہاتھ کسی قدر اُٹھاتی ہے اور کسی قدر گردن جھکا کر سلام لیتی ہے۔ بعد ازاں خاموش کھڑی رہتی ہے۔ سیدھی لیکن گردن پیچھے گرائے ہوئے۔

جمعدار :- (کرتے سے ایک دستاویز نکال کر) رانی صاحبہ ہم لوگ غیر مہذب آدمی ہیں اور محلات کی تہذیب سے ناواقف ہیں۔ اگر ہم خلاف تہذیب کوئی بات کریں تو معاف کئے جاویں۔ وقت کم ہے اور ہمیں دوسرے ضروری کام ہیں۔ اس لئے معاف کیجئے ہم اُس اعلان کو جو ہم نے آپ کے مقتدر باپ اور دیوان کے مشورہ سے تیار کیا ہے پڑھتے ہیں۔ (دستاویز پڑھنا شروع کرتا ہے) مخلوق خدا کی ہے دونوں مذہب ایک ہی آزادی رکھتے ہیں۔ ملک بادشاہ دہلی کا ہے۔ اور رانی لکشمی بائی اُس کے نام سے جھانسی میں حکمران ہے۔ (تارا سنگھ کو دستاویز دیکر) پس رانی صاحبہ آپ ان شرائط کو قبول کیجئے اور اپنی مہر لگا دیجئے۔

رانی :- جمعدار صاحب شرائط کیا ہیں۔

جمعدار :- ہم نے آپ کے مشیروں سے بار بار کہدیا ہے۔ ہمارے شرائط یہ ہیں کہ آپ ہم کو دہلی لیجانے کے لئے روپیہ آدمی سامان وغیرہ فراہم کر دیجئے۔ آپ جھانسی کے بادشاہ کے نام سے حکومت کیجئے اور انگریزوں اور اُنکے رفقاء کے حملوں کا مقابلہ کیجئے۔ آپ اس کام کے لئے حسب ضرورت فوج رکھئے۔ اور آپ وعدہ کیجئے کہ آدمی اسلحہ اور روپیہ سے ضرورت کے وقت آپ مدد کریں گی۔

رانی :- اور اگر میں انکار کروں ؟

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) تو آپ اور آپ کا لڑکا تخت سے علحدہ کر دئے جاویں گے۔ یا شرائط قبول کیجئے یا علحدگی منظور کیجئے۔

جمعدار :- (اپنے ساتھی کے بازو پر اُس کو روکنے کے لئے ہاتھ رکھ کر) رانی! ہمارے دوست کو معاف کیجئے۔ اس کی زبان فوجی زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے آپ سے فوری فیصلہ کا اصرار نہیں کیا ہے اور وقت میں توسیع کرتے رہے ہیں کیونکہ آپ کے والد نے آپ کو ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ لیکن اب انتظار کا موقع باقی نہیں ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ جھانسی تباہی میں ہے۔ بدمعاش چور قاتل چاروں طرف گھوم رہے ہیں۔ اور لوگ ہم سے اصرار کرتے ہیں کہ کوئی معقول راج قایم ہو جانا چاہئے تاکہ جرائم کا انسداد ہو جائے۔ وہ یقین نہیں کرتے کہ یہ سپاہیوں کا قصور نہیں ہے کہ دوبارہ جھانسی میں راج نہیں قائم ہوا۔ وہ بار بار کہتے ہیں کہ اگر ہماری پیاری رانی کو تم گدی پر نہیں بٹھاتے ہو تو کسی اور کو بٹھا دو۔

رسالدار :- (بدتہذیبی سے) اور کل صورت حال اور بدتر ہو جائیگی جب انگریز ہم کو قلعہ سپرد کر دیں گے۔ اگر کسی با اختیار آدمی نے اُن کی حفاظت نہ کی تو بخشش علی اور اُس کے ظالم رفقاء اُن کو ذبح کر ڈالیں گے ہم اُن کی حفاظت کے لئے نہیں بیٹھے رہیں گے۔ مزید براں ہمارے لئے حکم ہے کہ ہم قلعہ پر قبضہ کر کے فوراً دہلی روانہ ہو جاویں۔

ماما صاحب :- (نرمی سے) بیٹی! شاید تم کو معلوم ہوا ہو کہ ہمارے دوست (افسروں کی طرف اشارہ کرکے) سداشیو راؤ سے ملکر آئے ہیں جو تمہارے خلاف اور انند کے خلاف کچھ عرصہ سے سازش کر رہا ہے۔ یہ بدمعاش بہت گستاخ ہو گیا ہے اور راجہ گنگا دھر کا رشتہ دار بنتا ہے۔ گدی کا بذات خود مالک بنتا ہے۔

جمعدار :- رانی! یہ درست ہے۔ اور ہم نے سداشیو راؤ سے کہدیا ہے کہ اگر آپ ہمارے شرائط نہ قبول کرینگی تو ہم اُس کے راجہ ہونے کا اعلان کر دیں گے۔

(رانی ان کی طرف سے منہ پھیر لیتی ہے اور ہتھیلی پر ہتھیلی رکھ کر ہاتھ جوڑتی ہوئی تین بار گردن جھکاتی ہے اور کچھ کہتی ہے۔ پھر گھوم کر دونوں افسروں کی طرف دیکھتی ہے۔)

رانی :- جمعدار صاحب! قبل اس کے کہ میں اپنا آخری تصفیہ بتلاؤں مجھے ایک سوال کا جواب دو۔

جمعدار :- رانی صاحبہ پوچھئے!

رانی :- اگر میں جھانسی راج قایم کر بھی دوں تو اس بات کی کیا ذمہ داری تم لیتے ہو کہ تم پھر میرے خلاف بغاوت نہ کروگے جبکہ تم انگریزوں کے خلاف غدر کر رہے ہو؟

رسالدار :- (اپنے دوست کو الگ ہٹاکر) میں جواب دونگا۔ صرف ایک ذمہ داری۔ اور وہ یہ کہ آپ اُن لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں جو آپ کے لئے اپنی جان خطرہ میں ڈالیں۔ انگریزوں نے میری تیس برس کی ملازمت کے صلہ میں مجھے کیا انعام دیا۔ جوانی میں جنرل پولک کے ساتھ میں افغانیوں کے ملک کابل کو گیا اور انگریزوں کو قید سے رہا کرایا۔ بعد ازاں نیپیر صاحب کے ساتھ سندھ میں خدمات انجام دیں اور میانی کی جنگ میں لڑا۔ بعد ازاں گف صاحب کی ماتحتی میں سکھ خالصہ کے مقابلہ میں مدد کی۔ اور فیروز پور میں لڑا۔ پھر فیروز آباد اور سبراؤں میں لڑا۔ سکھ جنگ کے بعد میں برما اور سکیم کے میدان میں گیا۔ میرے جسم پر چھ زخم ہیں۔ بائیں پاؤں کی دو انگلیاں ندارد ہیں صرف دائیں کان سے سُن سکتا ہوں اور اس سب کے صلہ میں مجھے کیا ملا۔ مجھے اپنا گھوڑا۔ سائیس اور وردی رکھنا پڑتی ہے اور اپنی خوراک کا خود انتظام کرنا پڑتا ہے۔ بحالت صلح میری تنخواہ میرے ذاتی خرچ اور بال بچوں کے خرچ کے لئے بالکل ناکافی ہے اور میدان جنگ میں جانے کے لئے مجھے ساہوکاروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ میری تمام جائداد رہن ہے اور میری بیوی کے اکثر زیور گروی ہیں۔ پھر بتلائیں انگریزوں سے کس طرح محبت کروں؟

جمعدار :- رانی! میرے دوست رسالدار صاحب بدزبان ہیں لیکن ان کا دل بالکل پاک ہے۔ زبان ضرور تلخ ہے اور ہم سب قریب قریب ایسے ہی ہیں۔ ہم یہ ساری مصیبت برداشت کر لیتے۔ لیکن جب کارتوسوں میں سور کی چربی لگی دیکھی تو ہمارا صبر جاتا رہا۔ ایک سپاہی سب سے زیادہ اپنی عزت کا خیال رکھتا ہے۔

رسالدار :۔ (آگے جھپٹ کر) بادشاہ کی حکومت کے زمانہ میں اور خود مرہٹہ حکمرانوں کے زمانہ میں ایک جنگجو سپاہی اگر قابلیت اور عقل رکھتا تھا تو وہ ترقی پاکر فوج کا حاکم اور صوبہ دار بن سکتا تھا۔ لیکن اب ایک نوجوان سوار یا سپاہی کوئی امید ترقی نہیں کر سکتا۔ ہم سب کمپنی کے معمولی سپاہیوں سے زیادہ نہیں۔ سب مصیبت اور دقت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انگریزی حکام کرنل جرنل بن جاتے ہیں یا اچھی اچھی جگہوں پر متعین ہو جاتے ہیں۔ مجھکو اور میرے دوست کو سوائے ایک معمولی پنشن کے کیا اُمید ہے۔ وہ بھی جب زندہ رہے۔ بنگال فوج کے سپاہی اور سوار کمپنی کے علم کو ہندوستان بھر میں لئے گھوم رہے ہیں۔

(جب رسالدار گفتگو کرتا ہے بالاخانہ سے رونے چلانے کی آواز آتی ہے۔ رانی راؤ آپا کو جو کھڑکی کے قریب کھڑا ہے دیکھتی ہے اور یہ بھی دیکھتی ہے کہ صحن میں کیا ہو رہا ہے۔ جب راؤ آپا کی نظر اُس پر پڑتی ہے تو راؤ آپا کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ آواز زیادہ بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ رسالدار کے الفاظ سنائی نہیں دیتے۔ رانی دروازہ کو غور سے دیکھتی ہے۔ کہ شاید راؤ آپا آتا ہو اور پھر سب کی طرف دیکھتی ہے۔ ماما صاحب دروازہ کی طرف جھکتا ہے جس کو راؤ آپا کھولتا ہے اور الگ ہو جاتا ہے اور بہت سے قصبہ کے باشندے دربار کے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔ سب خوفزدہ اور گھبرائے ہوئے۔ رانی کے سامنے زمین بوس ہوتے ہیں اور اپنے ماتھے زمین سے ٹکراتے ہیں اور سینہ ہاتھوں سے پیٹتے ہیں اور زار و قطار روتے ہیں جو لوگ باہر کھڑے ہیں وہ بھی رو رہے ہیں۔ راؤ آپا کمرہ کے اندر کی غل کے متعلق دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے)

رانی :۔ (غصہ سے) راؤ آپا! اس کے کیا معنی ہیں؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو سب کو اس طرح دربار میں گھس آنے دیا؟

راؤ آپا :۔ رانی صاحبہ! وہ کوئی خوفناک خبر سنانے آئے ہیں۔

رانی :۔ (قریب کھڑے ہوئے باشندوں سے) کیا ہے؟ بولو! کیا ہے؟ (اور زیادہ رونا پیٹنا شروع ہوتا ہے) خوف مت کرو۔ جو کچھ کہنا ہے کہو۔

پہلا باشندہ :۔ (رو کر) انگریز قیدی۔ رانی صاحبہ! انگریز قیدی۔ (سسکیاں لیکر)

رسالدار :۔ (غصہ سے) انگریز قیدی بیوقوف کہاں ہیں؟ بتلاؤ یہ غل و شور کیوں ہے ورنہ میں تم سب کی کھال کھینچ لوں گا۔

رانی :۔ (آہستہ سے) اُسے کہنے دیجئے۔ رسالدار صاحب! آپ اُس سے پھر سوال کر سکتے ہیں۔ ہاں! کہو! انگریز قیدیوں کی نسبت تم کیا کہتے تھے؟

سب باشندے :۔ (رو رو کر اور سینہ پیٹ کر) اُن کو قتل کر ڈالا۔ رانی صاحبہ! بے رحمی سے قتل کر ڈالا۔

مرد - عورت - بچے!

(خاموشی پھیل جاتی ہے اور رانی اور حکام ایک دوسرے کو بنظر تعجب غور سے دیکھتے ہیں)

راؤ آپا :- (سمجھانے کے لئے آگے بڑھکر) جب رسالدار صاحب اور جمعدار صاحب اس قلعہ سے سہ پہر کو روانہ ہوگئے تو فوراً اُن کے پاس بخشش علی آیا۔ محصور انگریز قیدیوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ اسلحہ رکھدیں اور قلعہ سے فوراً باہر نکل آویں اُن کو جھانسی سے بہ حفاظت دوسرے مقام پر پہونچا دیا جاویگا۔ انگریزوں نے شرائط قبول کئے۔ اور بخشش علی نے اُن کی محافظت کی ذمہ داری اپنے اوپر لی۔ کیونکہ وہ ہنوز اُن کا ملازم تھا۔ اُس نے اور اُس کے بدمعاش رفقا نے انگریزوں کو معہ بیوی بچوں کے جوکہن باغ پہونچایا۔ اور وہاں اُن سب کو یہ کہکر کہ سپاہیوں کے سرداروں کا حکم ہے قتل کر ڈالا۔

(راؤ آپا کے بیان کے بعد رونا پیٹنا پھر جاری ہوا۔ رانی پریشان حال کمرہ میں ادھر اُدھر گھومتی ہے بال بکھیرتی جاتی ہے اور پیشانی پیٹتی جاتی ہے۔ دونوں افسر باباصاحب اور تارا سنگھ سرگوشی کے لہجہ میں تعریف کرتے ہیں۔ راؤ آپا لوگوں کو دلاسا دیتا ہے۔ انند راؤ رانی کو پریشان دیکھکر گنگا بائی کے پاس جاتا ہے اور اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔)

رانی :- (کسی طرف بغیر مخاطب ہوئے) افسوس! افسوس! ہم سب پر افسوس! اس بے رحمی اور وحشیانہ طریقہ کی خونریزی پر افسوس! ان مقتولین کی روحیں جب تک ہم زندہ ہیں ہمارے مسکن نہ چھوڑیں گی (غصہ سے گیدڑو! دور ہو! تم اب مجھ سے کہنے آئے ہو۔ جب سب قصہ ختم ہوچکا۔ تم اُسوقت میرے پاس کیوں نہ آئے جب تم کو یہ علم ہوا کہ انگریز قلعہ حوالہ کرنے پر ہیں۔ بیوقوفو! بزدلو! دور ہو! یہاں سے چلے جاؤ!

(رانی سب کو بھگا دیتی ہے اور پنکھے سے بھاگنے کا اشارہ کرتی ہے وہ گرتے پڑتے بھاگتے ہیں رانی ایک خاص شاہانہ لہجہ میں مخاطب ہوتی ہے)

رانی :- جمعدار صاحب! آپ کے شرائط منظور ہیں اور اسی وقت سے جھانسی راج دوبارہ قائم ہوتا ہے اور رانی لکشمی بائی امور سلطنت منجانب کمار انند اپنے ہاتھ میں لیتی ہے۔ رسالدار صاحب میرا پہلا حکم یہ ہے کہ آپ اور جمعدار صاحب جائیں اور بخشش علی کو معہ ان لوگوں کے قتل کر ڈالیں جو اس قتل عام میں شریک تھے۔ اُن پر رحم نہ کیا جائے فوراً قتل کر ڈالے جائیں۔ آپ کو روپیہ میرے خزانچی دیں گے۔ جائیے اور جب تک کام نہو واپس نہ آئیے۔ (رسالدار اور جمعدار سلام کرتے ہیں اور چلے جاتے ہیں) دیوان صاحب! راج کے اعلان پر مہر لگائیے اور اس کو باہر جاکر پڑھ دیجئے۔ اور منادیوں کو ہر چہار طرف روانہ کیجئے کہ اعلان کردیں کہ رانی لکشمی بائی بطور نائب گدی پر بیٹھ گئی ہے اور لوٹ مار اگر کوئی کرے گا تو سخت سزا دیجائے گی۔ اور یہ بھی اعلان کیا جائے کہ

بخشش علی اور اُس کے بدمعاش رفقا کو کوئی پناہ نہ دے کیونکہ راج نے اُن کے قتل کا حکم دیا ہے۔

(تارا سنگھ سلام کرتا ہے اور رخصت ہوتا ہے اعلان اور مہر اُس کے ہاتھ میں ہے پھر بالاخانہ پر جاتا ہے اور باشندوں کو اعلان پڑھ کر سناتا ہے۔)

رانی :- ابا! آپ اور راؤ آپا محل کی حفاظت کے لئے ایک گارڈ جلد مقرر کیجئے اور ایک فوج ہوشیار سپاہیوں کی تیار کیجئے۔ دیر نہ کیجئے۔ ہم کو معلوم نہیں کسوقت جنگ کرنا پڑے۔

(ماما صاحب اور راؤ آپا جھک جاتے ہیں اور باہر جاتے ہیں۔ رانی انند راؤ کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے جو گنگا بائی کے پاس سے جھپٹ کر آتا ہے اور اُس کے چمٹ جاتا ہے۔ تب وہ ایک ہاتھ انند راؤ کے سر پر رکھتی ہے اور دوسرا ہاتھ پھیلا کر قسم کھاتی ہے)

رانی :- اس وقت سے میں قسم کھاتی ہوں کہ آیندہ فوج کے ساتھ ہمیشہ جنگ میں آگے رہوں گی۔ آج بیگناہوں کا خون جھانسی میں میری مرضی کے خلاف مگر میرے نام سے بہایا گیا ہے۔ میں ہمیشہ اپنی رعایا کے لئے اپنا خون بہانے پر تیار رہوں گی۔

(اِدھر اُسنے یہ تقریر ختم کی اور اُدھر اعلان سُنانے پر "رانی لکشمی بائی کی جے" کا نعرہ بلند ہوا)

(باقی)

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم-اے-ایل-ایل-بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اُردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے، یا یوں سمجھیے کہ "درزبان شاعراں" حُسن وعشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قایم ہوسکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی کے دیوان کی ضرورت ہو۔ علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کہ بود مانند دیدہ۔ اہلِ ذوق ملاحظہ فرمائیں۔

قیمت معہ محصولڈاک عہ - ضخامت ۲۳۶ صفحات -

ملنے کا پتہ :- منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڑھ - یو-پی

روحانیین مغرب کی شعبدہ کاریاں

گزشتہ ماہ کے ملاحظات میں ہم نے ظاہر کیا تھا کہ روحانیین مغرب جن طریقوں سے کام لیکر بقاء روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ یکسر مکر و فریب ہیں اور آج کی صحبت میں ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ وہ کس کس طرح لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

مشرق میں اہل تصوف سے زیادہ روح و روحانیت کا قایل کوئی نہیں، لیکن انھوں نے اس اصطلاح کو ہمیشہ اخلاق انسانی سے متعلق سمجھا اور روحانیت کا مفہوم ہمیشہ درستی اخلاق لیا گیا۔ انھوں نے وجود روح کا مفہوم کبھی یہ نہیں لیا کہ وہ اس دنیا کے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتی ہے اور تمام وہ خواہشات اپنے اندر رکھتی ہے جو عالم آب و گل میں تعلق جسم کے ساتھ اس کے اندر پائے جاتے تھے۔ برخلاف اس کے اہل مغرب چونکہ مادہ پرست ہیں اس لئے وہ وجود روح کے قایل ہوئے بھی تو اس شان کے ساتھ کہ روحیں آتی ہیں، باتیں کرتی ہیں، گاتی ہیں، ناچتی کودتی ہیں، عشق و محبت کرتی ہیں اور وصل و ہجر کی ہر اُس لذت و اذیت سے متاثر ہوتی ہیں جو اس دنیا میں پائی جاتی ہے۔

میں نے یہاں کے بعض کم علم و ناواقف حضرات کو نہایت فخر کے ساتھ یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ "اب تو اہل مغرب بھی روحانیت کے قایل ہوتے جا رہے ہیں اور عنقریب وہ اسلام کی ہر تعلیم کو اسی طرح ماننے پر مجبور ہونگے" لیکن ان کو مطلق اس کا علم نہیں کہ یوروپ میں یہ مشغلہ ایک کھیل سے زیادہ نہیں ہے اور جن ذرایع سے وہ وجود روح کو ثابت کر رہے ہیں اُن کی حقیقت شعبدہ و فریب نظر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔

مغرب میں ان روحانی کرشموں کی ابتدا ۱۸۴۸ء سے ہوتی ہے جب موضع ہیڈسویل (نیویارک) کے ایک کاشتکار جان فاکس کے مزرعہ میں ان کی اولین نمایش کی گئی۔ فاکس کی کئی لڑکیاں تھیں جن میں ایک کا نام مارگرٹ فاکس تھا اور اسی نے سب سے پہلی مرتبہ ظاہر کیا کہ اس کے ذریعہ سے روحیں آتی ہیں اور اپنا حال بیان کرتی ہیں۔ اس کے بعد یوروپ اور خصوصیت سے ساتھ امریکہ میں اس نوع کے مظاہروں کا رواج بڑھتا گیا اور ایسی ایسی ترکیبیں اختیار کی گئیں کہ آخر کار کینن ڈایل اور سر آلیور لاج ایسے لوگوں کو بھی اس کا یقین آ گیا اور اس

شدت کے ساتھ کہ ان مکاریوں کا راز کھلنے کے بعد بھی وہ اس خیال سے منحرف نہ ہوئے۔

روحانیین مغرب نے جن کو مدعی وجودِ روح کہنا زیادہ مناسب ہوگا روح و روحانیت کا کیا مفہوم لیا ہے اور کن کن طریقوں سے وہ وجودِ روح کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کی تفصیل غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگی۔

اہل مغرب نے چونکہ روحانیت کا تعلق، علی الرغم اہل مشرق، اخلاقیات سے نہیں رکھا ہے اسلئے حیات بعدالموت کی نسبت بھی اُن کے تمام خیالات کا مرکز وہی مادہ ہوا کرتا ہے جس کی پرستش وہ دنیائے آب و گل میں کیا کرتے تھے۔ اور اسی لئے وہ وجودِ روح کو بھی بالکل وجودِ جسم کی طرح مانتے ہیں یعنی روح کے جو حالات و کوائف تعلق جسم کی حالت میں پائے جاتے ہیں وہی جسم سے علحدہ ہونے کے بعد بھی باقی رہتے ہیں۔ چنانچہ اپنے ملک کی روحوں کے جو پیغامات انھیں موصول ہوتے رہتے ہیں وہ بھی وہی توس کھوں والی ذہنیت کو ظاہر کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جو تصویریں روحوں کی پیش کی جاتی ہیں ان میں بھی وہی آڑی مانگ، وہی اونچی ایڑی کا جوتہ اور وہی پوڈر لگا ہوا چہرہ سامنے آتا ہے جو اس دنیا میں نظر آتا تھا۔ الغرض وہ لوگ اس دنیا اور دوسری دنیا میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور یہاں وہاں کی زندگی ان کو بالکل یکساں نظر آتی ہے۔ لیکن اس سے زیادہ دلچسپ بیان ان طریقوں کا ہے جن کے ذریعہ سے وہ روحوں کا وجود ثابت کرتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے جس ذریعہ سے روح کی آمد ظاہر کی گئی وہ رگڑ یا کھٹ کھٹ کی آواز تھی اور سب سے پہلے فاکس کی لڑکیوں نے اس دھوکے کو استعمال کیا۔ صورت یہ ہوا کرتی تھی کہ لوگ ایک میز کے پاس خاموش بیٹھ جاتے تھے اور مارگریٹ فاکس ان سے کہتی تھی کہ جب مطلوبہ روح آئے گی تو وہ خود کھٹ کھٹا کر اطلاع دیگی چنانچہ تھوڑی دیر بعد یہ آواز خود بخود پیدا ہوتی تھی اور لوگوں کو روح کی آمد کا یقین ہو جاتا تھا۔ ایک زمانہ تک اس کا پتہ نہ چلا کہ یہ آواز کہاں سے آتی ہے لیکن ۱۸۸۸ء میں خود مارگریٹ نے اس راز کو ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ یہ آواز اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے پیدا کرتی تھی۔

بعد کو یہ آوازیں لوگوں نے اور مختلف طریقوں سے پیدا کرنی شروع کیں یعنی پاؤں کے ناخن بڑھا کر ان کو ایک دوسرے سے رگڑنا یا میز کی لکڑی پر پوشیدہ طور پر ناخنوں کے تصادم سے آواز پیدا کرنا۔ بعض نے یہ ترکیب اختیار کی کہ گھٹنے کے زیریں حصہ میں لکڑی کا ٹکڑا باندھ لیتے تھے اور اُسے کرسی سے رگڑ کر آواز پیدا کرتے تھے۔ بعض نے میکانکی طریقے استعمال کرکے پنسل، گھڑی، چاقو اور قلم کے اندر سے یہ آوازیں پیدا کیں۔ ایک شخص نے اپنے جوتے کی ایڑی میں سیسہ کی ہتوڑی چھپا رکھی تھی اور اس کا تعلق ایک دھاگے سے رکھا تھا جو پتلون کے پائنچوں کے اندر اندر اس کے ہاتھ تک پہونچتا تھا اور جب وہ اس دھاگہ کو کھینچتا تھا تو ہتوڑی کو جنبش ہو کر اس سے عجیب قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی۔

زمانۂ حال میں بجلی کی مدد سے بھی یہ آوازیں پیدا کی جاتی ہیں۔ یہ برقی آلات جیب میں چھپے رہتے ہیں اور بجلی کا بٹن قالین کے نیچے ہوتا ہے اور اُسے دبا کر کمرہ کے مختلف مقامات سے آواز پیدا کیجا سکتی ہے۔

(۲) دوسرا طریقہ طلب ارواح کے مظاہرہ کا یہ ہے کہ میز کا ایک کونہ یا دو کونے یا پوری کی پوری میز بلند ہوجاتی ہے اور لوگ اس کا راز نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے آمدِ روح کے قایل ہوجاتے ہیں۔ حالانکہ مکر و شعبدہ یہاں بھی کام کرتا ہے۔ اس کی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ عامل اپنا ایک پاؤں میز کے پائے کے نیچے سرکا لیتا ہے اور اس کی جنبش سے میز کا ایک کونا اونچا ہوجاتا ہے اگر عامل کا کوئی دوسرا شریک بھی ہے تو وہ دوسرے کونے میں بیٹھکر یہی حرکت کرتا ہے جس سے میز کے دونوں کونے بیک وقت اُٹھ جاتے ہیں بعض عامل یہ ترکیب کرتے ہیں کہ ہاتھ کی اُنگلی میں مضبوط چھلا پہن لیتے ہیں اور جہاں بیٹھتے ہیں وہیں میز میں ایک چھوٹی سی کیل لگا دیتے ہیں تاکہ چھلے کے اندر اس کو ڈالکر میز کو اُٹھایا جاسکے۔ کبھی کبھی بجائے چھلے کے لوہے کی سلاخ استعمال کی جاتی ہے جو آستین کے اندر چھپی ہوتی ہے اور کلائی پر چمڑے کے تسمہ سے مضبوط کس دیجاتی ہے۔ چونکہ طلب روح کا مظاہرہ ہمیشہ تاریکی یا بہت کم روشنی میں کیا جاتا ہے اور دوسرے لوگوں کو ہدایت ہوتی ہے کہ میز کے اوپر اپنے ہاتھ اور نیچے اپنے پاؤں ایک دوسرے سے ملالیں، اس لئے ان کو کوئی موقعہ یہ معلوم کرنے کا نہیں ملتا کہ عامل کہاں اپنا پاؤں رکھتا ہے اور کس جگہ اپنا ہاتھ لیجاتا ہے۔

سائنٹفک میگزین کا مشتہرہ انعام حاصل کرنے کی غرض سے ایک مشہور عامل عورت مارگیری نے یہی عمل کیا تھا لیکن مغرب کا مشہور شعبدہ باز ہوڈنی وہاں موجود تھا، اس نے اس مکر کو معلوم کرلیا اور یہ راز فاش ہوگیا۔

اگر کوئی ایسا عامل آپ کو ملے تو آپ بہت بھاری میز اس کے سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے اول تو وہ میز میں بیسیوں نقص نکال کر ہلکی میز طلب کرے گا اور اگر اس میں کامیاب نہ ہوا تو کوئی اور بہانہ کرکے ٹال دیگا، کیونکہ یہ عمل صرف ہلکی میزوں پر آسانی سے ہوسکتا ہے۔

(۳) تیسرا طریقہ مظاہرہ روحانیت کا یہ ہے کہ پوشیدہ سوالوں کا جواب دیا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ عامل تین سادے کارڈ پیش کرکے ایک پر سوال لکھواتا ہے اور اسے باقی دو کارڈوں کے درمیان رکھ کر پیشانی کی طرف لیجاتا ہے اور سوال کا جواب دیتا ہے۔ اس میں ہتھکنڈا یہ ہوتا ہے کہ جن دو کارڈوں کے درمیان سوال والا کارڈ رکھا جاتا ہے اُن میں نیچے کا کارڈ فریم کی طرح کٹا ہوا ہوتا ہے اور پیشانی کی طرف لیجاتے ہوئے اُسے اس طرح لیجاتے ہیں کہ درمیانی کارڈ کی عبارت نگاہ سے گزر جاتی ہے۔

کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ لفافہ کے اندر سوال کا کاغذ بند کرا کے جواب دیتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ

ایک رومال الکحل سے تر عامل کے پاس ہوتا ہے اور جب اس سے لفافہ کو تر کر لیا جاتا ہے تو اندر کی تحریر نمایاں ہوجاتی ہے اور تھوڑی دیر میں الکحل اُڑ جاتا ہے۔

کبھی سوال پیڈ (Pad) پر لکھوایا جاتا ہے۔ اس کی ترکیب یہ ہے کہ پیڈ کے جس کاغذ پر سوال لکھا جاتا ہے اس کے نیچے کے کاغذ پر پرافن (Paraffin) ملا ہوا ہوتا ہے، اور جب اس پر باریک کوئلہ چھڑکا جاتا ہے تو تحریر نمایاں ہوجاتی ہے۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ سوال کے کاغذ کو توڑ مروڑ کر ایک لفافہ کے اندر بند کر دیا جاتا ہے اور اُس لفافہ کو آگ میں جلا دیا جاتا ہے۔ اس میں یہ چالاکی ہوتی ہے کہ جس وقت لفافہ کو آگ میں جلاتے ہیں تو چمٹے سے وہ حصہ لفافہ کا دبا لیتے ہیں، جہاں سوال کا کاغذ ہوتا ہے اور اس طرح وہ جلنے سے محفوظ رہتا ہے اس کے بعد اس کو کسی ترکیب سے دوسرے کمرہ میں جاکر پڑھ لیتے ہیں اور جواب دیدیتے ہیں۔

(۴) کہا جاتا ہے کہ روحیں آکر تحریری پیام بھی دیتی ہیں اور لکھ کر سوالوں کا جواب دیتی ہیں۔ ماہرین فن نے اس کی تحقیق کرکے ثابت کر دیا ہے کہ عامل کے سواد خط اور ان روحانی تحریروں میں بہت مماثلت ہوتی ہے، اور یہ عمل اس طرح کیا جاتا ہے کہ پوشیدہ وغیر مرئی سیاہیوں کے ذریعہ سے پہلے ہی لکھ لیا جاتا ہے اور پھر گرمی، روشنی، پانی یا دواؤں کے ذریعہ سے وہ تحریر خود بخود اُبھر آتی ہے۔ اگر آپ شیشہ پر فرانسیسی کھریا مٹی سے کچھ لکھ کر صاف کردیں تو مطلق کوئی تحریر نظر نہ آئے گی لیکن جب آپ منہ کے پاس لیجا کر اپنی سانس اس پر چھوڑیں گے تو تحریر نمایاں ہوجائے گی

(۵) روحانئین مغرب سلیٹ سے بہت کام لیتے ہیں اور طرح طرح کی چالاکیاں صرف کرتے ہیں۔ صورت یہ ہوتی ہے کہ سوال کرنے والا اور عامل دونوں میز کے سامنے بیٹھتے ہیں اس حال میں کہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ہوتے ہیں اور میز کے نیچے پاؤں سے پاؤں ملے رہتے ہیں۔ وہیں نیچے ایک سلیٹ رکھی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کوئی امکان عامل کی چالاکی کا نہیں ہے لیکن پھر بھی سلیٹ پر تحریر ظاہر ہوتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ عامل کے جوتے اور موزے کا پنجہ پھٹا ہوتا ہے اور پنجہ کی مدد سے پنسل کو حرکت دیکر لکھ دیتا ہے۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سلیٹ پر سوال لکھ کر میز پر اسے اُلٹا کرکے رکھدیا جاتا ہے، لیکن میز کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ ایک پوشیدہ کھٹکے کی مدد سے سلیٹ کے برابر میز کے تختہ کا ایک حصہ سرک جاتا ہے اور پھر مختلف آئینوں کے ذریعہ سے جو میز میں لگے ہوتے ہیں، وہ پڑھ لیجاتی ہے۔

بعض دفعہ چالاکی سے سوال والی سلیٹ بدلکر دوسری سلیٹ جواب والی رکھ دیتے ہیں کبھی دو سلیٹوں

سے کام لیا جاتا ہے یعنی معمول کو دو سلیٹ دی جاتی ہیں، کہ وہ انھیں صاف کر کے عامل کو دیدے، اور جب ان کو کھولا جاتا ہے تو اندر سے کوئی پھول نکلتا ہے، حالانکہ یہ بھی ہاتھ کی چالاکی ہے اور کچھ نہیں۔

بعض دفعہ دو سلیٹیں ملا کر رکھدی جاتی ہیں اور ان کے اندر چاک پنسل ہوتی ہے، معمول اور عامل دونوں ہاتھ سے دبائے رہتے ہیں لیکن تھوڑی دیر بعد جب ان کو کھولا جاتا ہے تو چاک سے لکھی ہوئی تحریر نظر آتی ہے، اسمیں عجیب و غریب چالاکی سے کام لیا جاتا ہے اور وہ یہ کہ چاک پنسل خاص قسم کی طیار کی جاتی ہے جس میں لوہے کا برادہ بھی شامل ہوتا ہے اور پھر ایک قوی مقناطیس کے ذریعہ سے جو عامل کے ہاتھ میں ہوتا ہے اندر ہی اندر چاک پنسل کو حرکت دیجاتی ہے۔

اگر سلور نائٹریٹ یا کاسٹک پنسل سے کوئی عبارت سلیٹ پر لکھ کر تر کپڑے یا اسفنج سے صاف کر دیجائے تو غائب ہو جائے گی لیکن سلیٹ خشک ہونے پر وہ پھر نمودار ہو جائے گی۔

بعض دفعہ یہ تماشہ دکھایا جاتا ہے کہ آٹھ چھوٹی چھوٹی سلیٹیں ایک جگہ رکھی جاتی ہیں اور ان کے نیچے ایک بڑی سلیٹ ہوتی ہے۔ سایل سے کہا جاتا ہے کہ نصف سلیٹیں ایک طرف رکھدو اور پھر باقی نصف مع بڑی سلیٹ کے ان کے اوپر رکھدو۔ اس کے بعد عامل و معمول دونوں بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے ہیں۔ اور پھر جب چھوٹی سلیٹو کو اُلٹ کر دیکھا جاتا ہے تو درمیان کی ایک سلیٹ پر پیغام درج ہوتا ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ بڑی سلیٹ میں ایک اور چھوٹی سلیٹ لگی ہوتی ہے جس پر پہلے سے تحریر درج ہوتی ہے اور بڑی سلیٹ پر ہاتھ رکھتے وقت عامل ایک کھٹکے کے ذریعہ سے اس کو علحدہ کر دیتا ہے۔

(۶) بعض عامل کمرہ کی تاریکی میں مختلف ترکیبوں سے روشنیاں بھی پیدا کرتے ہیں اس کی ترکیب یہ ہے کہ کاغذ کی موٹی دفتیوں پر ایک طرف مختلف قسم کے نشانات مثلاً صلیب، ستارہ وغیرہ چمکنے والی سیاہیوں کے ذریعہ سے بنا دیتے ہیں اور جب وہ اپنی جادو کی چھڑی سے انھیں اُٹھا کر کسی جگہ لٹکاتے ہیں تو چمکنے والا حصہ پلٹ کر سامنے کر دیتے ہیں۔ بعض مرتبہ کسی کونہ سے دفعتاً ایک روشنی پیدا ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے اسکی ترکیب یہ ہے کہ کسی مختصر سی چیز پر چمکنے والا مسالہ لگا کر کونہ میں چھپا دیتے ہیں اور پوشیدہ تاروں کے ذریعہ سے جن کا تعلق عامل کے پاؤں یا ہاتھ سے ہوتا ہے ان کو بلند کر دیتے ہیں۔

(۷) روحوں کی موسیقی بھی معمول کو سُنائی جاتی ہے اس کی ایک ترکیب تو یہ ہے کہ میز کے نیچے تختے میں باجہ کا بکس نصب کر دیتے ہیں اور تاروں کے ذریعہ سے موسیقی کے بعض ساز تیرتے ہوئے دکھاتے ہیں جبو قت یہ باجہ بجتا ہے تو کمرہ کی تاریکی کی وجہ سے معمول کو یہ معلوم کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آواز کہاں سے آرہی ہے اور چونکہ کمرہ کی فضا میں وہ موسیقی کے ساز تیرتے ہوئے دیکھتا ہے تو اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ یہ آوازیں

انھیں سازوں سے از خود پیدا ہو رہی ہیں۔ بعض مرتبہ گانے بجانے والے آڑ میں بٹھا دئے جاتے ہیں اور اُن سے یہ کام لیا جاتا ہے، کبھی ریڈیو گراموفون سے بھی یہ کام لیتے ہیں۔

(۸) بعض مرتبہ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ عامل کا کوئی ہتھکنڈا شامل نہیں ہے اس کے ہاتھ پاؤں کرسی یا کسی ستون سے باندھ دیتے ہیں لیکن یہ سب شعبدہ و مکاری ہے کیونکہ رسی باندھنے کے طریقے اور ستون وغیرہ کی ساخت ایسی ہوتی ہے کہ عامل اپنے آپ کو خفیہ طور پر آزاد کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ اسے کرنا ہوتا ہے کرتا ہے۔

(۹) کبھی روح کو روشن شعلوں، روشن دھوئیں اور نورانی لباس کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ سب فاسفورس وغیرہ چمکنے والی دواؤں کی مدد سے کیا جاتا ہے۔ کبھی عامل اپنے رومال پر یہ چیزیں مل لیتا ہے، کبھی ریشم کے گولوں پر مل کر اپنے منھ سے نکالتا ہے، کبھی تمام لباس پر مل کر بالکل انسانی قد و قامت کے ساتھ کمرہ کی تاریکی میں نمودار ہوتا ہے۔

اسٹاک ہوم کا ایک شخص نلسن ریشمی گاز کے ٹکڑے جن پر روشن مادہ ملا ہوتا تھا، نہایت خوبی و صفائی سے نگل نگل کر منھ میں لے آتا تھا، اور کہا یہ جاتا تھا کہ روح اس کے جسم کے اندر سے نمودار ہو ہو کر غائب ہو جاتی ہے۔

ایک عورت ایڈا انسی بٹ نے کینن ڈائل کو بھی اسی طرح دھوکا دیا تھا۔ اس نے کھانے کی میز کا تختہ علٰحدہ کر دیا اور ڈھانچہ کے اندر اس نے بہت سی روشن روحوں کو پیش کیا، اس تماشہ میں بھی اسی چمکدار مسالہ سے کام لیا گیا تھا۔ جو لوگ روح بنکر آتے ہیں ان کا لباس بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ ہوتا ہے کہ جب کمرہ میں وہ سیاہ حصہ سامنے کر دیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ غائب ہو گئے اور جب دوسرا حصہ سامنے لے آتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ نمودار ہو گئے۔

بعض دفعہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دفعتہً کمرہ کے اندر سخت جھونکا نہایت سرد ہوا کا آگیا۔ اسکی ترکیب یہ ہے کہ برف کے ٹکڑے ٹین کے ظروف میں بند کر کے چھپا دئے جاتے ہیں اور بجلی کے پنکھے کے ذریعہ سے ان کی برودت و نمی کو کمرہ میں پھیلا دیا جاتا ہے۔

(۱۰) روحوں کی تصویریں بھی لیجاتی ہیں اور اس سے لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں، درانحالیکہ یہ سب شعبدہ ہے اور اس کے لئے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں، کبھی پہلے کی اکسپوز (Expose) کئے ہوئے پلیٹ سے کام لیا جاتا ہے، کبھی لنس میں نشان دیکر خاص اثر پیدا کیا جاتا ہے، کبھی نصف پلیٹ پہلے سے اکسپوز کی ہوئی ہوتی ہے۔ الغرض اس کی بہت سی ترکیبیں ہیں جن کی وضاحت اس لئے مناسب نہیں کہ وہ فن فوٹوگرافی سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں۔

بعض مرتبہ پردہ پر روحوں کی شکل نمودار ہو جاتی ہے، اس کی ترکیب یہ ہے کہ پہلے ہی سے اس پردہ پر بعض دواؤں سے تصویر بنا دیجاتی ہے اور پھر اس کو مختلف طریقوں سے اُبھار دیتے ہیں۔

اس عمل کے لئے سلفیٹ آف آیرن۔ سلفٹ آف کاپر۔ نائٹریٹ بسمتھ اور پر وشیٹ آف پوٹاس وغیرہ مختلف دواؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔

(۱۱) بعض عامل، سایل کے بعض نہایت ہی پوشیدہ حالات زمانۂ ماضی کے بتاتے ہیں اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ وہ مختلف طریق پر پہلے ہی سے حالات کی تفتیش کر لیتے ہیں اور ان حالات کے معلوم کرنے میں وہ کافی روپیہ صرف کرتے ہیں۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب، تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے۔ اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:

مسئلۂ جبر و اختیار ۔۔۔ خواب کی حقیقت ۔۔۔ معاد و خلود ۔۔۔ طبقۂ نسواں اور غزلگوئی۔
برج بابل ۔۔۔ فاسسٹ جماعت ۔۔۔ سامری کون تھا ۔۔۔ باغ ارم کی حقیقت۔
فلسفۂ محبت ۔۔۔ بھوت پریت ۔۔۔ اصحاب کہف ۔۔۔ سالویشن آرمی
ہالہ کا سبب ۔۔۔ معجزہ و کرامات ۔۔۔ فرقۂ معتزلہ ۔۔۔ مذہب و عقل ۔۔۔
طوفان نوح ۔۔۔ یاجوج و ماجوج ۔۔۔ برہمو سماج ۔۔۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم۔
مریخ کی حقیقت ۔۔۔ منصور حلاج ۔۔۔ چند الفاظ کی تحقیق ۔۔۔ اصطلاحات تصوف کا ترجمہ۔

قیمت معہ محصول خریداران نگار سے ۲؎ ۔۔۔ غیر خریداران سے ۲؎ (عہ) ۔

منیجر نگار لکھنؤ

دُم دار ستارہ

دم دار ستارہ نہایت آب وتاب کے ساتھ نمودار ہوا تھا اور اپنی ضیا باریوں سے تمام دنیا کو منور کر رہا تھا، ہر شخص کا دل اُس کی روشن دم دیکھ دیکھ کر سہما جاتا تھا، امیر و غریب ادنےٰ و اعلےٰ غرضکہ ہر کس و ناکس اُسکا نظارہ کر رہا تھا اور طرح طرح کی خیال آرائیوں میں معروف تھا، ایک دوسرے کو اس آسمانی نشانی کے دیکھنے کی دعوت دیجا رہی تھی اور ہر شخص پروانہ وار اُس کو دیکھنے چلا جا رہا تھا۔

جہاں ایک عالم اُس کے ظہور پر اپنے ذوق و شوق کا اظہار کر رہا تھا وہاں دو ہستیاں ایسی بھی تھیں جو ذرہ برابر اُدھر ملتفت نہوئیں، یہ دو ہستیاں ایک کم عمر بچہ اور اُس کی ماں تھیں، بچہ کے سامنے چربی کی ایک شمع روشن تھی، جس میں اُس کی ماں ایک قسم کی لپک دیکھ رہی تھی اور وہ اُسے دیکھ دیکھ کر اس خیال سے سہم رہی تھی کہ شاید بچہ کچھ ہی دنوں کا مہمان ہے، یہ ایک فرسودہ وہم تھا جس میں وہ گرفتار تھی اور اُسے خبر نہ تھی کہ اُس کا بچہ اپنی عمر طبعی کو پہونچے گا اور ساٹھ سال کی مدت کے بعد دُم دار ستارہ پھر ایک مرتبہ اُسی کے سامنے نمودار ہوگا۔

لڑکے نے اُس ستارہ کی طرف ذرا بھی التفات نہ کیا۔ اُس کے سامنے صابن کے پھین سے لبریز ایک ظرف رکھا ہوا تھا، وہ اُس میں اک مٹی کی نلکی کو بار بار ڈبوتا اور پھر اُس کے دوسرے سرے کو اپنے لبوں پر رکھکر بلبلے اُڑانا شروع کرتا، بلبلے ایک عجیب دلفریب انداز سے ہوا میں تھرتھراتے دکھائی دیتے تھے اور پھر وہ دم کی دم میں زرد سے سُرخ اور سُرخ سے سبزی میں تبدیل ہوجاتے۔

"خدایا تیری عمر کے سال اتنے ہوں جتنے کہ یہ بلبلے ہیں" ماں نے بچہ کو یہ دعا دی "آغاہ! اتنے سال۔ صابن کا پانی کیا ابھی ختم ہوا جاتا ہے" بچہ نے معصومانہ انداز میں جواب دیا اور اپنے شغل میں معروف ہوگیا۔

"وہ دیکھو ایک سال اُڑتا ہے۔۔۔ اے لو وہ دوسرا سال" بچہ ہر بار ٹوٹتے ہوئے بلبلوں کو دیکھ کر چلا اٹھتا چند بلبلے سیدھے اُس کی آنکھوں میں چلے گئے، خدا جانے اُن میں کیسی تیزی تھی کہ اُس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسوؤں کے قطرے بہنے لگے، ہر ایک بلبلے میں بچہ کو اپنا درخشاں مستقبل دکھائی دے رہا تھا۔

"ہمسائیوں نے کہا کہ وہ دیکھو ستارہ اب بہت صاف اور نمایاں ہے، کیا تم لوگ کمرہ میں یونہی

بند بیٹھے رہوگے؟" یہ سنتے ہی ماں نے بچہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور باہر چلی گئی۔

بچہ نے اِس آتشین گیند کو پہلی مرتبہ دیکھا، کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ قریب تین گز لانبا ہے اور کچھ لوگ اُسے ہزاروں گز لمبا سمجھ رہے تھے، ہر شخص اپنے اپنے خیال کے مطابق رائے زنی کر رہا تھا۔ لوگوں کو یقین تھا کہ دُم دار ستارہ دو نسلوں کے گزرنے کے بعد پھر نمایاں ہوگا۔

جب دوسری بار اُس کا ظہور ہوا تو واقعی اُن میں سے اکثر اس دارِ فانی سے کوچ کر چکے تھے۔ وہ بچہ جس کی نسبت ماں کا خیال تھا کہ بہت جلد دنیا سے سدھار جائے گا، ضعیف العمر ہو چکا تھا اور اُس کے بال سفید ہو چکے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ سفید بال بوڑھاپے کے پھول ہوتے ہیں۔ وہ اب ایسے کتنے پھولوں کا مالک تھا۔ اب وہ ایک بوڑھا مدرس تھا، لڑکے اُسے ایک عالم متبحر تصور کرتے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ وہ تاریخ و جغرافیہ کے علاوہ تمام سیاروں کے حال سے بھی بخوبی واقف ہے۔

"فنا اور بقا کا چولی دامن کا ساتھ ہے، ہمیں دنیا کی تمام اشیاء کا بنظرِ غائر مطالعہ کرنا چاہئے" اُستاد نے طالب علموں سے مخاطب ہو کر کہا۔ اُس کی گفتگو کا رُخ دُم دار ستارہ کی طرف بھی پھرا۔ اُس نے بچوں کو سمجھایا کہ پُرانے لوگ دُم دار ستارہ کی نسبت کیا کیا خیالات رکھتے تھے۔ اُس نے یہ بھی بتلایا کہ دم دار ستارہ والا سال شراب والوں کے لئے نہایت موزوں ہے، کیونکہ شراب میں کتنا ہی پانی ملایا جائے کوئی تمیز نہیں کر سکتا۔

کوئی دو ہفتہ فضا ابر آلود رہی اور ستارہ نظروں سے پوشیدہ رہا۔ اُستاد ایک چھوٹے سے حجرہ میں جو مدرسہ سے متصل تھا خاموش بیٹھا تھا، اُس کے ایک طرف کونے میں اُس کے باپ کے وقت کی شکستہ گھڑی رکھی تھی۔ کوئل جو پہلے ایک ایک گھنٹہ کے وقفہ پر سامنے آکر سریلی آواز سے بولتی تھی گھڑی کے ڈبے کے پیچھے خاموش اور گونگی پڑی تھی۔ مگر اُسی زمانہ کا پیانو اب بھی اچھی حالت میں تھا۔ اگرچہ امتدادِ زمانہ سے اُسکے تاروں کا وہ ہلکاپن اور ترنم جاتا رہا تھا پھر بھی اُس پر تمام انسانی نسلوں کے گیت گائے جا سکتے تھے۔

دُم دار ستارہ کو دیکھ کر بڈھے کی آنکھوں میں تمام گزشتہ مسرت و غم کے واقعات کا نقشہ پھر گیا۔ اُسوقت اُسے وہ الفاظ بھی یاد آئے جو اُس کی ماں نے شمع میں ایک قسم کی لپک دیکھ کر کہے تھے۔ اُس کے دل میں اُن رنگین بلبلوں کی یاد بھی تازہ ہو گئی جو اُسکو اسقدر محبوب تھے۔ اُن میں ہر ایک اُس کی عمر کا ایک سال تھا۔ وہ اُن کی رنگینیاں دیکھ کر کیسا خوش ہوتا تھا۔ اُن میں اُسے اپنی معصوم مسرتیں اور شباب کی سرمستیاں اور تمنائیں جھلکتی نظر آتی تھیں۔ آہ! مستقبل کا حباب بھی کیسا طلسم تھا۔ اُسوقت پیانو کی نغمہ ریزیاں اُس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

اُس کے خیالی ساز سے وہ نغمہ بھی نکل رہا تھا جسے اُس کی ملازمہ نے گایا تھا اور اُسے اُسوقت وہ گیت بھی بے چین کرنے لگا جو پہلی مرتبہ رقص و سرود کی محفل میں اُس کے سامنے گایا گیا تھا۔ الغرض ماضی کے تمام دلچسپ مناظر اُسکے

پیش نظر ہو گئے اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اُس کی آنکھیں کھڑکی کے باہر لگی تھیں کہ یکایک بادل کا ایک ٹکڑا ہوا میں تیرتا ہوا دکھائی دیا۔ اور ساتھ ہی دُم دار ستارہ چمکتا ہوا نظر کے سامنے آ گیا۔ اُس کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ایک روز قبل ہی اُسے دیکھ چکا ہے اور اس مختصر وقفے میں ایک پُشت ختم ہو چکی ہے۔ تب وہ بچہ تھا اور اُس کو بلبلوں میں اپنا مستقبل چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا اب مستقبل نہ تھا بلکہ ماضی اور تیرہ و تار ماضی۔ اُس کی آنکھیں دمک اُٹھیں اور اُس نے اپنا ہاتھ بے اختیار باجے پر رکھ دیا، بیانو بج رہا تھا مگر اس طرح گویا اُس کا ایک تار ٹوٹ گیا ہے۔

"فوراً آؤ دیکھو آسمان کتنا صاف اور شفاف ہے۔ ستارہ کتنی دلفریبی سے چمک رہا ہے" ہمسایوں نے پکار کر کہا۔

اُستاد نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ وہ اُسے دیکھنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکا تھا۔ اُس کی روح اُس فضا سے بھی اُونچی جا چکی تھی جہاں ستارہ چمک رہا تھا۔ محلوں، جھونپڑوں اور بازاروں میں ہر جگہ لوگوں کی نگاہیں ستارہ پر لگی ہوئی تھیں لیکن اُستاد کی روح اُن تمام اپنے اجل رسیدہ عزیزوں سے جن سے ملنے کے لئے وہ اسقدر بیقرار تھا، ہم آغوش ہو چکی تھی۔

(انڈرسن)		(ترجمہ)		تحسین الدین علوی - بی - اے

مکتوبات نیاز

ادب و انشار کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف

مکتوبات نیاز

میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۲۸۸ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۱۲؍ ۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

معجزہ وخوارق عادات کی حقیقت

(شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر سے)

اسلام حقیقت میں دنیا کا بہترین مذہب محض اسی وجہ سے ہے کہ وہ دین ودنیا کو دو علٰحدہ چیزیں قرار نہیں دیتا جس کی تفریق کی بنا پر قوموں کو زندگی بسر کرنا دشوار ہو رہی ہے، وہ مذہبیت کو سیاست ومعاشرت پر اسقدر غلبہ دینا نہیں چاہتا کہ اس کے پیرو "انسان" کہلانے کی بجائے "روح" اور "فرشتہ" بنکر ظاہر ہوں، وہ اپنے پیروی کرنے والوں کو صرف "طریق معاشرت" اور ان کی تخلیق کا حقیقی نشاء "ہمدردی" کی تعلیم دیتا ہے، وہ اپنے ہر نظریہ کو عقلی دلایل کے ساتھ پیش کرتا ہے، ہر چیز فطرت کے موافق ظاہر کرتا ہے، غور و تدبر کی دعوت دیتا ہے، وہ خدا کی ہستی کو زبردستی نہیں منواتا بلکہ اس کی ضرورت اور اس کے وجود کے لئے سیکڑوں عقلی دلائل صراحت اور تمثیل کے ساتھ پیش کرتا ہے، رسول کو ایسی ان ہونی نشانیاں دیکر نہیں بھیجتا جسکو دیکھکر لوگ خوف یا وقتی مصالح کی بنا پر تسلیم کرلیں، بلکہ اس کی نبوت کا ثبوت محض وہ دستور العمل ہے جس کی تلاش میں ہر انسان سرگرداں ہے، اور جس کے حصول کے بعد ہر فلسفی کو تسکین ہوتی ہے

لیکن ہمارے علمائے سلف اور حکیمانِ اُمت نے تفکر و تدبر کو حرام قرار دیدیا اور اپنی اُلٹی سیدھی خراش و خراش سے اس کو ایسا تنگ اور ٹیڑھا بنا دیا کہ ہر چیز مضحکہ خیز حد تک قیاس و گمان کی حد سے باہر پہونچ چکی ہے حتی کہ آپ خدا اور اس کے رسول کو بھی خود سے نا آشنا اور اجنبی خیال کرنے لگیں گے۔

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ پر جب آپ نظر ڈالیں گے تو دیکھیں گے کہ اُسوقت نہ تو اس قسم کی جنگ زرگری کا بازار گرم تھا اور نہ کفر سازی کی مشینیں چل رہی تھیں، لیکن اس کے بعد بہتّر چھوڑ بہتر ہزار فرقہ پیدا ہوگئے قسم قسم کے عقاید بنائے، ہر شخص کے زعم میں دوسرا کافر ہوگیا، قرآن وسنت کی بجائے لوگوں نے اپنے اصول اور اپنے زور قلم کے منوانے میں عمریں صرف کردیں، غرض یہ کہ ہر طرح اسلام کو مسخ ہی کرتے گئے خواہ وہ خود کو اہل قرآن کہتے ہوں یا اہل حدیث، یا اہل عدل یا اہل فقہ، آہستہ آہستہ مسخ شدہ دین جمہور کے عقائد میں اسطرح

منطبع ہوگیا کہ جو اسلام کی حقیقت سے واقف ہوتے تھے وہ بھی جمہور کے خوف سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے اگر کسی نے جرأت کرکے کچھ کہا بھی تو اس کے نتائج کی تاریخ کے خونی اوراق شہادت دیں گے۔

امام غزالی نے اپنی کتابیں علوم دین پر تحریر کیں لیکن حقیقت کا اظہار کسی میں بھی نہ کرسکے، نہایت دعوے کے ساتھ احیاء العلوم کو پیش کیا لیکن جہاں حقایق و معارف کو کھول کر بیان کیا جمہور یا یوں سمجھئے کہ ملاؤں کے مخترعہ اُصول کے خلاف چلے، اسی پر اعتراضات کئے گئے، کفر کے فتوے لگائے گئے، اور پھر بھی وہ احیاء میں واضح حقیقت نہ لکھ سکے، اور یہ لکھنا ہی پڑا کہ اس میں بھی حقیقت سے پردہ نہیں اُٹھایا ہے جو اصل باتیں ہیں وہ اس میں نہیں ہیں۔ آخر ایک کتاب مضنون لکھی لیکن اس کے لئے اپنے شاگردوں کو سخت تاکید کردی کہ جمہور درکنار علماء کو بھی نہ دکھایا جائے صرف سینہ بسینہ جو لوگ اس کے اہل ہوں اُن تک پہونچایا جائے۔

سب سے آخر دور میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم پیدا ہوئے جن کے لئے مشہور ہے کہ ہندوستان میں حدیث کی اشاعت کا سہرا انھیں کے سر ہے، شاہ صاحب نے بھی کئی کتابیں لکھیں لیکن وہی مشکلات اب بھی موجود تھیں چنانچہ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :- " بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ شریعت کے احکام میں کوئی مصلحت نہیں ہوا کرتی، اعمال اور ان کی جزائیں جو منجانب اللہ مقرر ہیں کوئی مناسبت نہیں ہے یہ گمان بالکل فاسد ہے اور قرآن وسنت ونیز اسوۂ صحابہ سے اس کی تکذیب ہوتی ہے " (صفحہ ۵ مطبوعہ مصر) " اسرار دین کی تدوین بہت ضروری ہے اور کثیر فائدوں کی حامل ہے، ایمان لانے کے بعد اس علم سے دلی اطمینان زیادہ بڑھ جاتا ہے "۔ لیکن امام غزالی کی طرح شاہ صاحب بھی حجۃ اللہ میں حقیقت کو بے نقاب نہ کرسکے اور جمہور کے سامنے حجۃ اللہ میں سابقہ شاہراہ سے ملا ہوا ایک راستہ اختیار کیا جہاں سے پہلا راستہ بھی نظر آتا ہے اور مسافر جب چاہے اس راستہ کو چھوڑ کر ایک لمحہ میں قدیم شاہراہ پر چلا جائے۔

اس کے بعد ایک مختصر رسالہ " تاویل الاحادیث " تحریر کیا جس میں بہت ہی مجمل طور سے چند مسئلوں کو تحریر کیا لیکن جو کچھ ہے وہ بھی حقیقت کی رہنمائی اور تحقیق کا راستہ قائم کرنے کے لئے بہت کافی ہے، شاہ صاحب نے اس رسالہ میں انبیاء کے قصے اور ان کے معجزات کی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے اور جمہور کے خلاف نہایت بیباکانہ قدم اُٹھایا ہے، ہمیں اسوقت اسی کتاب پر ایک نظر ڈالنا مقصود ہے۔

شاہ صاحب اس کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ " جب خدا اپنا علم نازل کرتا ہے تو وہ بطریق مجاز وکنایہ نہیں ہوتا بلکہ اس طرح ہوتا ہے کہ طبیعت اس کو جائز سمجھے مطلب یہ کہ انسان کے حواس میں جب کسی ہونے والی حالت کا علم دیا جاتا ہے تو وہ خواب وغیرہ کی صورت میں ظہور پاتا ہے، اس کے بعد صفحہ ۲ پر اور وضاحت کرتے ہیں " جب خدائے تعالیٰ کوئی " خرق عادت " کسی تدبیر کے واسطے ظاہر کرتا ہے تو اسے

عادت کے ضمن میں ظاہر کرتا ہے" (خلاف فطرت کوئی واقعہ نہیں ہوتا)

چونکہ "خرق عادت" کا لفظ اصطلاح میں خلاف فطرت وقوع کے لئے استعمال ہو رہا ہے اس لئے اس شک کو رفع کرنے کے لئے خرق عادت کی بھی تعریف فرما دی اور حقیقت یہ ہے کہ یہ رسالہ ہی اس مسئلہ کو طے کرنے کے لئے لکھا گیا ہے کہ انبیا کو دنیا میں شعبدے باز بنا کر نہیں بھیجا گیا، دنیا میں کوئی واقعہ خلاف عادت وقوع پذیر نہیں ہوتا۔ "سچ یہ ہے کہ جب خرق نام رکھا جاتا ہے تو وہ اُمور عادیہ ہی سے ہوتا ہے مگر چونکہ اسکے اسباب قلیل الوقوع ہوتے ہیں اس لئے وہ قلیل ہی واقعہ ہوتا ہے اور عام لوگوں کو اس کی توقع نہیں ہوتی اس لئے خوارق کہتے ہیں، اور اکثر خارق کے لئے نظیر ہوتی ہے اور عام لوگوں کے لئے مالوف ہوتی ہے، لیکن عام لوگ اس کی طرف توجہ نہیں کرتے (صفحہ ۸۰)

قرآن شریف میں جتنے معجزوں کا تذکرہ کیا ہے مثلاً عاد و ثمود کی ہلاکت، شق القمر، دریا کا پھٹ جانا وغیرہ حقیقت میں یہ سب اسباب عادیہ سے وقوع پذیر ہوئے تھے کہیں زلزلے اور باد و باران سے ہلاکت ہوئی جبکہ اسباب ارضی مواق ہو چکے تھے اور کبھی اجرام فلکی کا اثر تھا بغیر اس کے کوئی واقعہ ظاہر نہیں ہوا۔

قوم لوط کی تباہی کے سلسلہ میں لکھتے ہیں :- "جتنے عذاب کائنات فطرت کی طرف سے آتے ہیں اُسی وقت آتے ہیں جبکہ کواکب کا اتصال وحشت ناک ہوتا ہے، پانی بند ہو جاتا ہے اور آسمان وزمین میں، کافی مواد ایک مدت تک جمع ہو جاتا ہے"۔ (صفحہ ۲۵)

یوسف علیہ السلام کے سلسلہ میں لکھتے ہیں " ان کی تقدیر میں مصیبت و بلا اور والد سے جدائی اسی لئے تھی کہ اسباب سماوی اسی کے خواہاں تھے" (صفحہ ۲۵)

نوح علیہ السلام کے طوفان کی تاویل میں لکھتے ہیں کہ جب کشتی وغیرہ سب سامان طیار ہو گیا تو "تدبیر الٰہی ایک ہولناک واقعہ کا فضا کی طرف سے انتظار کر رہی تھی، جس کے واقع ہونے پر انھیں عذاب دے چنانچہ عام طوفان آنے کے لئے اسباب سماوی و ارضی موافق ہو گئے تو خدا نے اپنا حکم جاری کیا" صفحہ ۱۵

حضرت موسیٰ کے معجزات میں مچھلی کے زندہ ہونے کا قصہ تحریر کر کے لکھتے ہیں "حضرت موسیٰ خستہ ہو کر سو گئے تھے اور یوشع وضو کرنے بیٹھے تو پانی کی بوندیں مچھلی پر گر پڑیں اور پانی میں یہ خاصیت ہے کہ وہ پانی کے جانور کو زندہ کر دیتا ہے" (صفحہ ۴۳)

حضرت عیسیٰ کے مردہ جلانے کی نسبت لکھا ہے کہ "جو نفس جسم سے تعلق رکھتا تھا اس کا تعلق وہم کا سا تھا نہ حیات کا سا" (صفحہ ۵۹)

معجزہ شق القمر کی نسبت شاہ صاحب فرماتے ہیں :- "یہی ضرور نہیں کہ انشقاق ذات قمر ہی میں ہوا ہو، بلکہ

ممکن ہے کہ دھویں یا ستاروں کے ٹوٹنے یا کسوف و خسوف کی طرح ہو جیسا کہ لوگ دیکھتے رہتے ہیں اور عربی زبان میں اس طرح استعمال کرتے ہیں گویا کہ ذات شے میں واقع ہوا ہے اور میرے خیال میں اس حادثہ کا سبب یہ ہے کہ اجزائے مائیہ صیقلیہ ملتمہ، سطح واحد کی طرح جمع ہو گئے ہوں گے جس کے پیچھے پہاڑ یا ابرِ غلیظ آئینہ کی طرح ہو گا اور اس میں چاند کا عکس دیکھ کر لوگ دو چاند سمجھے ہوں، اور کبھی وہ بھی منطبع ہو جاتا ہے جو آسمان میں نہیں ہے اور کبھی چاند چھپ جاتا ہے اور فضا میں دو ٹکڑے نظر آتے ہیں اور ان سب صورتوں کی مثال وہی کسوف و خسوف وغیرہ ہے" (صفحہ ۴۴)

دوسری چیز شاہ صاحب یہ ثابت کرتے ہیں کہ نبوت، ولایت یہ سب قوت نفس سے متعلق ہیں جسقدر نفس میں صفائی اور روح کی طاقت وسیع ہو گی اسی قدر نظام سماوی (بالفاظ دیگر ملاء اعلیٰ) سے زیادہ اتصال ہو گا چنانچہ ہونے والے واقعات کی خبر کے لئے کہتے ہیں کہ کوئی چیز بغیر اسباب کے پیدا نہیں ہوتی لہذا " نظام طبیعی کا پہچاننے والا اگر زکی نفس ہے تو اسباب کے شروع ہوتے ہی حادثہ کی پیشین گوئی کر دے گا اگر کم زکی ہے تو کچھ دیر میں اور جو اس سے کم زکی ہو تو وہ اس سے بھی دیر میں پہچانے گا" (صفحہ ۶۶)

"جن لوگوں کو قضا و قدر کی شناخت میں کچھ خصوصیت تھی جیسے کاہن یا نجومی اور راجہ انھوں نے اپنے علم کے ذریعہ آپ کی صداقت اور پیغمبری کی تصدیق کی تھی" (صفحہ ۷۶)

"نیک بخت اور عادل بادشاہ اپنی استعداد کے موافق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے اور اس سے یقیناً امور خارقہ صادر ہونگے جس شخص میں ایسے اخلاق حمیدہ جمع ہو جائیں یقیناً اس کی پیدائش کے وقت کواکب میں اجتماع سعادت ہو گا" (صفحہ ۷۷)

اور بخت کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:- "بخت کی تحقیق یہ ہے کہ نفوس انسانیہ میں ایک نقطہ ہے کہ تمام نفوس اس کی طرف کھنچتے ہیں پھر وہ غالب آجاتا ہے اور نفوس اس کی طرف اس طرح آجاتے ہیں جیسے مقناطیس لوہے کو کھینچتا ہے، پھر اگر وہ قویۃ السعادت ہے تو ان نفوس میں جو اس کے آس پاس ہیں فیض پہونچاتا ہے اور اگر شقاوت میں قوی ہے تو آس پاس کے نفوس میں سختی پیدا کرتا ہے" (صفحہ ۷۵)

"ہمنے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ بعض آدمیوں کے نفس میں ایک نقطہ ہے روشن ستارہ کی طرح چمکتا ہوا کہ اس میں سے شعاعی خطوط نکلتے ہیں اور دوسرے نفوس میں نفوذ کرتے ہیں" (صفحہ ۷۵)

آج کل بھی تمام ماہر نفسیات اس مسئلہ کی تصدیق کر چکے ہیں چنانچہ موسیو لیبان نے "روح الاجتماع" میں اس کی نہایت واضح تشریح کی ہے اور تمام بڑے بڑے لیڈروں میں اس قوت کا وجود ثابت کیا ہے،

شاہ صاحب لکھتے ہیں "رسول اکرم کی پیدائش احسن تقویم پر تھی یعنی بہت معتدل مزاج میں جبکہ قوی کواکب بہت اچھی صورت میں مجتمع تھے، بزرگی اور غلبہ کے مستدعی تھے" (صفحہ ۷۶)

" لہذا آپ نے اچھی طرح سمجھ لیا کہ خیر و شر اور اخلاق کریمہ و ذمیمہ کا انحصار تزکیۂ نفس پر ہے اگر قلب منجلی ہے تو اچھے اخلاق ہوں گے اور تاریک ہے تو بُرے حالات، اور یہ تمام علم آئینۂ نفس میں غور کرنے سے پیدا ہوئے خواہ وجدانی طور پر خواہ قیاس کے لحاظ سے" (صفحہ ۶۲)

اسی نفوذ و نفوس کے مسئلہ میں شاہ صاحب نے ابراہیم علیہ السلام کو مکارم اخلاق میں تمام انبیاء سے بہتر شمار کیا ہے، لکھتے ہیں:- " افعال عبادت میں ابراہیم علیہ السلام بہت پورے تھے، اس خلق میں اول درجہ کا کوئی نہ ان سے پہلے ہوا نہ ان کے بعد ہوا اسی وجہ سے خدائے تعالیٰ نے ان کو امام کیا اور انبیا کو ان کے دین کی پیروی کرنے کا حکم فرمایا" (صفحہ ۱۹)

اس کے علاوہ شاہ صاحب نے چند اور مسئلے بھی عقل کی ترازو میں تولے ہیں اور یہ ثبوت بہم پہونچایا ہے کہ کوئی امر خلاف فطرت اور خلاف عقل نہیں ہے، اور حقیقت میں یہی اسلام کا دعویٰ بھی ہے وہ خود کو ایک طلسم اور ایک مبہم چیز بنا کر پیش نہیں کرتا۔

عبیداللہ قدسی

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہے

ہندی شاعری کی بے مثل تاریخ
ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب
اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات
برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ

اور

ہندوستان کی گویؤں کی شاعری

قیمت فی پرچہ دو روپیہ ـــ خریداران نگار سے کچھ نہیں

منیجر نگار

انتخاب

(تمثیلچہ)

افراد :—

دُردانہ	بہارستان کی ملکہ
ثاقب	ملکہ کا محبوب مطرب
ارژنگ	وزیر

منظر :—(صبح کو دُردانہ اپنی خواب گاہ میں حریری بستر پر نیم دراز ہے، اچاٹ نگاہیں کہ رہی ہیں کہ رات بہت بے آرامی سے بسر ہوئی ہے۔ سامنے صندلی تپائی پر زرکار رباب رکھا ہوا ہے۔

دُردانہ دیر تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتی رہتی ہے، تھوڑی دیر بعد لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا کر رباب کے تاروں کو چھیڑتی ہے، جب آواز گونجتی ہے تو رباب سے ہاتھ ہٹا کر کچھ سوچنے لگتی ہے اور پھر رباب کو دور پھینک کر دفعتہً اُٹھ بیٹھتی ہے اور ہاتھ پر سر رکھ کر سوچنے لگتی ہے)

دُردانہ :—(آہستہ آہستہ) کیا کروں، سمجھ میں نہیں آتا۔ کہتے ہیں محبت عورت کی زندگی ہے، لیکن فریضۂ زندگی تو نہیں ہے کہ تمام عالم کو حلقہ بگوش دیکھنا میرا مقصد حیات تھا، آج خود غلام ہوں۔ غلام ہوں ایک مُطرب کی، ایک ایسے شخص کی جو سب سے پہلے فریضۂ زندگی کا احساس چھینتا ہے اور پھر زندگی بخشتا ہے— پھر اگر یہ زندگی صرف میری ہی زندگی ہوتی تو مجھے اختیار تھا خواہ سنوارتی یا برباد کر دیتی، لیکن میں اور میری حیات ملک و قوم کی ملکیت ہے، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ آج سے ثاقب کے قدم محل میں آئیں۔ (بلند آواز سے)۔ بیشک نہیں آئیں گے۔

(دُردانہ اُٹھ کر ٹہلنے لگتی ہے۔ کچھ دیر بعد دور سے گانے کی آواز آتی ہے وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو جاتی ہے، پھر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے)

——ظالم پھر مجھے تباہ کرنے کے لئے آ رہا ہے اُس کی نگاہیں میری نگاہوں سے ملیں گی اور میں پھر سر جھکا کر رہ جاؤں گی۔ (دفعتہً کھڑی ہو کر) مگر نہیں میں عزم کر چکی ہوں، ایک شاہانہ عزم اور اب وہی ہو گا جو ہونا چاہئے۔

(ثاقب ایک خوش رو نوجوان داخل ہوتا ہے اور زمین پر ٹوٹے ہوئے رباب کو دیکھتا ہوا آگے بڑھتا ہے)

ثاقب :- (ملکہ کے سامنے جُھک کر) ملکۂ عالم، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رباب کو کس قصور میں پامال کیا گیا ہے۔

دردانہ :- (منھ پھیر کر) ثاقب، جاؤ چلے جاؤ اور میری سلطنت کی حدود سے اتنی دور چلے جاؤ کہ اگر میں تمھیں ڈھونڈھوں بھی تو کبھی نہ پا سکوں۔

ثاقب :- ملکۂ عالم میں کچھ نہیں سمجھا کیا ارشاد ہوا۔

دُردانہ :- جو بات میں خود نہیں سمجھ سکتی اس کو تمھیں کیا سمجھا سکوں گی۔ مگر جو میں کہتی ہوں اس کی تعمیل تم کو کرنا چاہئے کیونکہ تمھارا وجود تمھارے لئے خطرناک ہے اور ملک تمھارا جانی دشمن ہے۔

ثاقب :- مگر، میرا قصور؟

دُردانہ :- اس کا حال اپنی نگاہوں سے پوچھو، اپنے نغموں سے دریافت کرو، جنھوں نے مجھے فرائض سلطنت سے غافل کر رکھا ہے اور جن کی موجودگی میں میں کچھ نہیں کر سکتی۔

ثاقب :- ملکۂ عالم، اگر میں اپنی آنکھیں پھوڑ کر اور زبان کاٹ کر آپ کو فرائض سلطنت ادا کرنے کی طرف مایل کر سکتا ہوں تو میں اس کے لئے طیار ہوں، لیکن خدا کے لئے اس فضا سے مجھے دور نہ کیا جائے جہاں دُردانہ سانس لیتی ہے۔

دُردانہ :- (جھنجھلا کر) ثاقب، خدا کے لئے، خاموش رہو، میں ڈر رہی ہوں کہ مبادا میری نسائیت پھر مجھے مغلوب کر لے۔

ثاقب :- تو کیا ملکہ اپنی نسائیت سے بھی دست بردار ہو جانا چاہتی ہے۔

دردانہ :- ہاں، جب ثاقب نہ ہوگا تو دُردانہ صرف ملکہ ہو کر جئے گی اور اپنی نسائیت کو بھلا دے گی۔

ثاقب :- کاش میں ان الفاظ کو سمجھ سکتا۔

دردانہ :- کاش اس ملک کے بسنے والے ایک عورت کے جذبات کو سمجھ سکتے۔ ثاقب، جاؤ، تمھارے سامنے میرے حوصلے پست ہوئے جاتے ہیں، خدا کے لئے جاؤ اور مجھے برباد نہ کرو۔

(ملکہ کی آنکھ سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور وہ تکیوں میں منھ چھپا لیتی ہے)

ثاقب :- دُردانہ مجھے اس ملک کی رعایا کے ہاتھ سے قتل ہو جانا منظور ہے لیکن تجھے چھوڑنا منظور نہیں۔

دُردانہ :- ثاقب، مجھ پر رحم کر اور چلا جا، تجھے نہیں معلوم کہ تیرے الفاظ میرے عزائم کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔

ثاقب :- موت کے سوا کوئی طاقت مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتی۔

دردانہ :- لیکن تجھے معلوم ہے کہ اس موت کے کیا معنی ہیں۔

ثاقب :- دائمی سکون۔

دردانہ :- نہیں، دُردانہ کی موت۔

ثاقب :۔ (گھبرا کر) موت! دُردانہ کی موت! نہیں میں کبھی اسے گوارا نہیں کر سکتا اور میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر سکتا ہوں۔

(یہ کہکر وہ واپس جاتا ہے اور دروازہ تک پہونچتا ہے)

دردانہ :۔ (گھبرا کر) ثاقب، ٹھہر جا، میں بھی تیرے ساتھ چلتی ہوں۔

(وزیر ارژنگ داخل ہوتا ہے)

ارژنگ :۔ مجلس شوریٰ ملکۂ عالم کا فیصلہ سننے کی منتظر ہے۔

دردانہ :۔ جاؤ ان سے کہدو کہ تمہاری ملکہ نے سلطنت اور ثاقب میں صرف ثاقب پسند کیا ہے۔

(وزیر کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ملکہ ایک ہاتھ کے اشارہ سے اسے منع کرتی ہے اور دوسرے ہاتھ سے ثاقب کا دامن پکڑ لیتی ہے۔)

دُردانہ :۔ ثاقب، رباب اُٹھاؤ اور چلو، اب تمہارا دل میری مملکت ہوگی اور اس کے امن و سکون کا قیام میرا فرض۔

(دونوں محل کے دروازہ سے باہر نکل جاتے ہیں اور ارژنگ دیکھتا کا دیکھتا رہ جاتا ہے)

سروپ رانی نگار

جمالستان

حضرت نیاز کے اُن ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ جو انشاء عالیہ کی جان ہیں۔

ادب اُردو میں جو خصوصیت حضرت نیاز کی طرز نگارش کو حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ۵۷۵ صفحات کے مجموعہ کا ہر ہر لفظ اپنی جگہ ایک ایسی دلکش حقیقت کا مالک ہے جو صرف مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔

قیمت فی جلد خریداران نگار سے تین روپیہ اور غیر خریداران نگار سے چار روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

باب الاستفسار

زلزلہ اور بداعمالی

(جناب فضل الدین احمد صاحب۔ فورٹ سنڈیمن)

عام لوگوں کا خیال بلکہ یقین ہے۔ کہ کوئٹہ میں جو زلزلہ گذشتہ ماہ میں آیا ہے۔ وہ اہل کوئٹہ کی بداعمالیوں کی وجہ سے آیا ہے۔ چنانچہ قرآن شریف کی ان آیات سے بھی تصدیق ہوتی ہے:۔

"اذا اردنا ان نہلک قریۃ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا فحق علیہا القول فدمرنٰہا تدمیراؕ وکم اہلکنا من قریۃ بطرت معیشتہا فتلک مسٰکنہم لم تسکن من بعدہم الا قلیلا وکنا نحن الوارثین ؕ"

لیکن سوال اب یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا کوئٹے میں دیگر بڑے بڑے مقامات سے زیادہ بداعمالی تھی؟ جو قدرت کو وہاں غضب سے کام لینا پڑا۔ جہاں تک مجھے علم ہے۔ اور میں نے بچشم خود دیکھا ہے۔ پنجاب ہندوستان اور دیگر ممالک میں کوئٹے سے کہیں زیادہ بداعمالیاں ہوتی ہیں۔ اور وہ کونسا طبقہ ہے جہاں نیک و بد لوگ نہیں رہتے ہیں۔ اسی طرح کوئٹے میں بھی اگر سیکڑوں بدکار تھے۔ تو ہزاروں کی تعداد میں نیکوکار لوگ بھی تھے۔ اگر مسلمان زیادہ تھے۔ تو غیر مسلم عیسائی، ہندو، پارسی وغیرہ بھی کم نہ تھے۔ زلزلہ ایک اتفاقیہ امر ہے۔ جس کا غضب سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مگر اکثر مسلمان میرے اس خیال سے متفق نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ غیر مسلم اقوام کو خداوند کریم نے قیامت تک کی مہلت دیدی ہے۔ اُن سے ان کے اعمال کا دنیا میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ اسی لئے ان ممالک (جاپان کے زلزلہ کا ثبوت ان کو مطمئن نہ کر سکا) میں زلزلہ نہیں آتا۔ اگر اس کو صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ تو کیا لاہور۔ دہلی۔ کلکتہ۔ بمبئی وغیرہ شہروں میں مسلمان آباد نہیں ہیں؟۔ اور وہاں کی بیشتر مُسلم آبادی بداعمال نہیں ہے؟۔ تو پھر وہاں خداوند کریم نے اپنا غضب نازل کیوں نہ کیا؟۔ اور اگر کوئٹہ پر ہوا۔ تو کیوں غیر مسلم برابر بلکہ زیادہ تعداد میں ہلاک ہوئے؟۔

میں امید کرتا ہوں - کہ جناب "نگار" کے صفحات پر اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے اور یہ بھی بتلائیں گے - کہ عہد حاضرہ کی عالمگیر تباہی جو زلزلہ - آتش - سیلاب - طوفان آندھی کی صورت میں دنیا کے تمام حصوں میں رونما ہے - کیا معنی رکھتی ہے؟

(نگار) اس سے قبل جب صوبۂ بہار میں زلزلہ آیا تھا، اس وقت بھی عوام نے یہی خیال کیا تھا کہ یہ سزا ہے انسانی بداعمالیوں کی اور اب کوئٹہ کے متعلق بھی لوگوں کا یہی خیال ہے - لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بہار اور کوئٹہ کے زلزلوں سے پہلے جب کبھی دنیا میں زلزلہ یا کوئی اور ایسا ہی سخت حادثۂ طبیعی ظہور میں آیا جس کا سبب عوام نہیں سمجھ سکتے تھے، ہمیشہ اس کو عذاب خداوندی سمجھا گیا اور چونکہ خدا کا عذاب صرف بدکار انسانوں ہی کیلئے مخصوص ہے اس لئے اس کا کھلا ہوا منطقی نتیجہ یہی نکلا کہ جب کبھی زلزلہ آتا ہے وہ نتیجہ ہوتا ہے انسان کی بدکاریوں کا اور اہل مذہب کی طرف سے اس کا ثبوت بھی آسمانی کتابوں سے پیش کر دیا جاتا ہے، جیسا کہ آپ نے سورۂ بنی اسرائیل کی دو آیتوں سے استدلال کیا ہے -

ان آیتوں کا مفہوم یہ ہے کہ "جب ہم کسی بستی کو برباد کرنا چاہتے ہیں تو ہم وہاں کے خوش باش لوگوں کی ہدایت کے لئے احکام نازل کرتے ہیں اور جب وہ اُن احکام سے سرتابی کرتے ہیں تو ہم اس بستی کو بالکل تباہ کر دیتے ہیں - اور نوح کے بعد ہم بہت سی نسلوں کو اسی طرح برباد کر چکے ہیں اور اللہ اپنے بندوں کے گناہوں سے پورا خبردار رہتا ہے" -

ان آیتوں میں چونکہ بستیوں کی بربادی کا سبب انسانی عدوان و بغاوت کو قرار دیا گیا ہے اور بستیوں کی ویرانی کا بڑا ذریعہ زلزلہ ہوا کرتا ہے، اس لئے بظاہر یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ملک کے جن حصوں میں زلزلے آتے ہیں، وہ انسانی بدکاریوں کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں، لیکن حقیقت یہ نہیں ہے اور نہ قرآن پاک کی ان آیتوں سے یہ استدلال درست -

سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ خدا کا یہ ارشاد کہ "اذا اردنا ان نہلک قریۃ" سے کیا مراد ہے - یعنی خدا کا کسی بستی کی بربادی کا ارادہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے - اگر اس کا مفہوم یہ قرار دیا جائے کہ خدا خود بربادی چاہتا ہے اور لوگوں کی دعصیا نکاری کا بہانہ ڈھونڈھتا ہے تو یہ نہ صرف صفات خداوندی کے خلاف ہوگا بلکہ دیگر آیات قرآنی کے بھی منافی ہوگا - سورۂ اعراف میں ارشاد ہوتا ہے :- "ان اللہ لا یامر بالفحشاء" (اللہ کسی کو بُرے کام کرنے کا حکم نہیں دیتا) اور خود آپ کی پیش کردہ آیات سے قبل جو آیت نظر آتی ہے اس سے بھی اس خیال کی تردید ہوتی ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :- "من اہتدیٰ فانما یہتدی لنفسہ و من ضل فانما یضل علیہا"

یعنی جو سیدھی راہ اختیار کرتا ہے وہ اسی کے فائدہ کے لئے اور جو غلط راہ چلتا ہے اس میں اسی کا نقصان ہے اس آیت سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کسی کو گمراہی پر مجبور نہیں کرتا۔ الغرض یہ خیال کرنا کہ خدا خود کسی قوم کو گمراہ کرنے اور پھر بستی کی بستی کو اُلٹ دینے کا ارادہ کرتا ہے، سخت لایعنی بات ہے اور خدا کا جو مفہوم مذہب نے بتایا ہے اس کے بالکل منافی ہے۔

فی الحقیقت یہ قرآن کا انداز بیان ہے اور عربوں کے نمونۂ خطابت میں بھی اس قسم کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔

اب رہگیا بستی کو تباہ کرنے کا مفہوم سو یقیناً اس سے مراد در و دیوار کی مسماری نہیں ہے بلکہ اہل قریہ کی تباہی مراد ہے اور ظاہر ہے کہ جب کسی بستی کے رہنے والے برباد ہوجائیں گے تو وہ بستی آپ اُجاڑ نظر آئیگی۔

اس لئے ان آیات کا صحیح مفہوم یہ ہوا کہ جب کوئی قوم بداعمالی کرتی ہے تو وہ برباد ہوجاتی ہے، لیکن بداعمالی سے مراد ترک صوم و صلوٰۃ نہیں بلکہ احساس قومیت و خودداری کا فقدان، قواء عمل کا اضمحلال، غلامانہ ذہنیت کا استیلاء، اور جمود و تعطل ہے، جو آجکل ہندوستان کے مسلمانوں پر طاری ہے اور جس کا یقینی نتیجہ اس قوم کی عام بربادی اُن کی بستیوں کی ویرانی ہے، اور جو نتائج زلزلہ سے کہیں زیادہ عبرت خیز و حسرتناک ثابت ہونے والی ہے۔

زلزلہ بھی منجملہ دیگر طبیعی حوادث کے ہے جس کے اسباب متعین ہوچکے ہیں اور اس کو انسانی بداعمالیوں سے کوئی تعلق نہیں، یہاں تک کہ اگر بہار و کوئٹہ میں سوائے اولیاء کرام کے کوئی اور متنفس نہ پایا جاتا تو بھی زلزلہ کی تباہکاریاں اسی طرح ظاہر ہوتیں اور اگر ریگستانی مقامات میں رات دن سوائے فسق و فجور کے اور کچھ نہ ہو تو وہاں زلزلہ کے شدائد کبھی محسوس نہیں ہوسکتے۔

اس نوع کا استدلال صرف اس ملایانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جسے عقل سے ہمیشہ دشمنی رہی ہے اور جس نے مذہبی لٹریچر کو بھی اپنی احمقانہ تاویلوں سے گندہ کرکے ہمیشہ دوسروں کو ہنسنے کا موقع دیا ہے۔

حجر اسود۔ تخلیق عالم چھ دن میں

(جناب محفوظ الرحمٰن صاحب۔ چھالاواڑ)

کرامت ظہور حضرت مولانا نیاز صاحب۔ ہدیہ سلام مسنون۔ چونکہ فی زمانہ آپ کے فیض تحقیق و

تدقیق سے وسیع النظر وصحیح دماغ روشن اور منور ہو رہے ہیں لہٰذا یہ نیازمند بھی بہ وکالت نیازنامہ ہٰذا نیازمندانہ حضرت نیاز میں بہ امید عطائے جواب سوال ذیل غائبانہ شرف نیاز حاصل کرتا ہے۔ وہو ہٰذا

(۱) حجر اسود موجودہ خانۂ کعبہ کے نسبت مختلف اقوال پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں مورخ تو کہتے ہیں کہ یہ ایک سیارہ تھا جو ساتویں صدی عیسوی میں بصورت شہاب ثاقب معمولاً آسمان سے ریگستان عرب میں گرا جس کو اہل عرب مکہ میں لے گئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ پہلے سے اسکو حضرت ابراہیمؑ نے خانۂ کعبہ میں بروقت بنار کعبہ کعبہ میں نصب کیا تھا، چونکہ اس کا وجود ارکان حج فریضہ میں داخل ہے لہٰذا مطلع فرمایئے کہ اس کی صحیح اصلیت کیا ہے اور دراصل یہ پتھر ہے یا کوئی دہاتی شے۔ اور یہ خانۂ کعبہ میں کب اور کیونکر اور کہاں سے آیا اور اس کے بصورت بوسہ دینے کے ارکان حج میں داخل ہونے کی کیا حقیقت ہے۔

(۲) اللہ تعالےٰ قرآن میں ارشاد فرماتا ہے کہ:۔ "خلق السموات والارض فی ستۃ ایام ثم استویٰ علی العرش"۔ اور یہ بھی ارشاد ہے کہ:۔ "قال کذالک اللہ یخلق ما یشاء اذا قضیٰ امراً فانما یقول لہٗ کن فیکون"۔ پس استدعا دریافت یہ ہے کہ آیا کن فیکون کے مقابلہ میں زمین و آسمان کا مخصوص چھ روز میں بنانا ظاہر کرنے میں معنیاً یا تاویلاً کیا مصلحت ہے اور کیا آسمان کوئی مرکب یا مادی شے ہے کہ جس کی ترکیب وصنعت میں اس کن فیکون جیسی قادر لاتعد ولاتحصیٰ طاقت کو انتہا ہر چھ روز صرف کرنا پڑے اور کیا یہ آسمان نہ درجہ کئی آسمان ہیں جیسا کہ علماء و مفسرین کا بیان ہے۔

میں نے بہ نظر تحقیق آپ کے تحقیقی معیار کے مطابق یہ مسایل حل کرنا مناسب سمجھ کر تکلیف دی ہے امید کہ نگار کے قریبی اشاعت میں اس کا جواب مفصل شائع فرمائیں گے۔

(نگار) (۱) حجر اسود کے متعلق اس سے قبل کئی سال ہوئے میں اظہار خیال کر چکا ہوں، اگر آپ اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو مجموعہ استفسار وجواب جلد اول ملاحظہ فرمایئے۔

(۲) جو آیت چھ دن میں آسمان و زمین کے پیدا کرنے کی آپ نے پیش کی ہے، وہ بڑی مابہ النزاع چیز ہے اور مختلف مفسرین نے مختلف مفہوم ظاہر کیا ہے۔ بعض نے یوم سے دور مراد لیا ہے اور ہر دور پچاس پچاس ہزار سال کا قرار دیا ہے، بعض نے ایک دن ہزار سال کا بتایا ہے، بعض نے یوم سے حالت مراد لی ہے، لیکن میرے نزدیک یہ سب بارد تاویلیں ہیں اور عقل سے دور۔

حقیقت یہ ہے کہ آسمان و زمین کے چھ دن میں بنائے جانے کا اعتقاد اسلام کی اختراع نہیں ہے

بلکہ یہود کا اعتقاد ہے اور توریت میں اس کا ذکر موجود ہے۔ چونکہ اہل عرب بھی یہود کی روایات کو صحیح تسلیم کرتے تھے اس لئے انھیں کے عقیدہ کو اُن کے سامنے پیش کر کے خدا کی عظمت ظاہر کی گئی ہے، چنانچہ تفسیر کبیر میں اس کی صراحت موجود ہے اور میرے نزدیک یہی بہترین تاویل ہے۔ صاحب تفسیر کبیر لکھتے ہیں کہ :-

"توریت میں لکھا ہے کہ خدا نے چھ دن میں آسمان و زمین پیدا کئے، پھر چونکہ اہل عرب کا یہودیوں سے بہت خلط ملط تھا اور انھوں نے یہود سے یہ بات سُنی تھی، اس لئے خدا فرماتا ہے کہ تم بتوں کی پرستش نہ کرو کیونکہ تمھارا پروردگار تمھارے ہی عقیدہ کے مطابق اتنا عظمت والا ہے کہ چھ دن میں اس نے آسمان و زمین پیدا کئے۔"

(۲۲) "کن فیکون" کے جو معنے عام طور پر سمجھے جاتے ہیں وہ صحیح نہیں، یعنی اس کا مفہوم یہ قرار دینا کہ لفظ کُن کہا گیا اور کائنات فوراً ظاہر ہو گئی غلط ہے۔

فیکون میں حرف (ف) تدریج و ترتیب کو ظاہر کرنے کے لئے ہے یعنی جب خدا کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو اس کے ظہور کا حکم دیتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ تدریج کے ساتھ وجود میں آجاتی ہے، علاوہ اس کے کن فیکون کہکر یہ ظاہر کرنا بھی مقصود ہے کہ خدا آفرینش کے لئے کسی نمونہ کا محتاج نہیں ہے اور نہ وہ مادی ذرائع کا پابند ہے۔

یادگار۔ ادباء ہند کا بے مثل مرقع

جناب وصل بلگرامی ان لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہتے ہیں۔ حال ہی میں ان سے ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک نہایت ہی اہم اور دلچسپ کام میں عرصہ سے مصروف ہیں۔ یعنی وہ ایک ایسا مرقع طیار کر رہے ہیں جس میں ملک کے تمام ادباء، ماضی و حال کی تصاویر معہ اُن کے نمونہ تحریر اور مختصر حالات کے یکجا نظر آئیں۔ اس سلسلہ میں اسوقت تک جتنا کام ہوا ہے وہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور بہت کافی ہے۔

لیکن یہ کام اتنا اہم اور اسقدر مشکل ہے کہ تنہا ایک شخص کی کوشش اس کو کامیاب نہیں بنا سکتی بلکہ ضرورت ہے اجتماعی حیثیت سے سعی و عمل کی۔ یقیناً اسوقت ملک کے بہت سے ادیب و مصنف شاعر و نثار ایسے ہیں جنکی تصاویر یا تحریروں کے نمونے وہ ابتک فراہم نہیں کر سکے ہیں، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تمام ایسے حضرات جو اس مرقع میں شرکت کرنا چاہتے ہیں اپنی تصاویر کے بلاک معہ نمونۂ تحریر و مختصر حالات کے جناب وصل کے پاس بھیجدیں۔ اور اس باب میں تنہا وہی نہیں بلکہ میں بھی ممنون ہوں گا۔ ان کا پتہ ——— قیصر باغ لکھنؤ کافی ہے۔

کارامروز نمبر کے تنقیدی حِصّہ پر ایک غیر جانبدارانہ تبصرہ

جناب سیماب اکبرآبادی کا مجموعۂ منظومات (کارامروز) چھپکر طیار ہی ہوا تھا کہ جناب سیماب نے ۲۲ر دسمبر ۳۳ء کو مجھے ایک خط لکھا جو بعینہٖ یہاں نقل کیا جاتا ہے :-

محترمی - السلام علیکم - میری نظموں کا جدید مجموعہ "کارامروز" چھپ کر طیار ہوچکا ہے - میرا ارادہ نہ تھا کہ میں اس مجموعہ کے لئے مقدمہ لکھواؤں مگر بعض احباب اور تلامذہ کا اصرار ہے کہ مقدمہ ضرور لکھوایا جائے - میری نظموں پر مقدمہ لکھنے والے میں چند اوصاف کا ہونا ضروری ہے -

(۱) وہ میرے یقین میں میرا معاصر ہو (۲) ادبیات مشرق و مغرب پر اسے عبور ہو (۳) اسکا دماغ قدامت زدہ نہ ہو۔

آپ میں یہ تمام اوصاف موجود ہیں، اس لئے بغیر کسی تکلف و تصنع کے آپ کو دیباچہ نگاری کی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔ مقدمہ کی جلد ضرورت ہے، کتاب طیار ہوچکی ہے۔ مقدمہ کی کتابت و طباعت کے بعد شائع ہوجائے گی۔ اجازت دیجئے کہ کارامروز کے مسودات ذریعہ رجسٹری آپ کو بھیجدوں یا خود لیکر چلا آؤں۔

مولانا، نہ انکسار کی ضرورت ہے نہ اعتذار کی، آپ مجھے جانتے ہیں اور میں آپ کو۔ مقدمہ لکھ ہی دیجئے۔ اپنے صوبہ میں آپ سے بہتر مجھے کوئی اور شخص اس کام کے لئے نظر نہیں آتا۔

منتظر جواب

سیماب اکبرآبادی

میں نے اس کے جواب میں اپنی غیر معمولی مصروفیت کا عذر پیش کیا، لیکن انھوں نے پھر اصرار فرمایا اور میں نے لکھدیا کہ مسودہ بھیجدیجئے۔

جس وقت مسودہ آیا اور میں نے جستہ جستہ اس کا مطالعہ کیا تو میں نے یہ دیکھکر کہ وہ اغلاط سے پاک نہیں ہے یہی مناسب سمجھا کہ مقدمہ لکھنے سے احتراز کیا جائے اور آخر کار میں نے مسودہ واپس کر دیا۔

اس کے بعد جب کتاب چھپ کر ریویو کے لئے موصول ہوئی تو اس وقت بھی میں نے خاموشی اختیار کی، لیکن جناب سیماب کے متواتر و پیہم اصرار سے مجبور ہو کر میں نے ریویو کیا اور محاسن کے ساتھ جو نقائص نظر آئے وہ بھی ظاہر کر دئے۔ جس وقت ریویو کی پہلی قسط اپریل ۳۵ء کے نگار میں شایع ہوئی تو میں متامل تھا کہ آیندہ اس سلسلہ کو جاری رکھوں یا نہیں لیکن سیماب صاحب کا ایک کارڈ ٹائپ میں تحریر تھا کہ:۔

"کارامروز پر مفصل تبصرے کا شکریہ۔ براہ کرم اس کا حصہ باقی بھی آیندہ نمبر میں ضرور شائع کر دیجئے تاکہ میں آپ کی رائے اور آپ کے خیال سے کلیتاً مستفیض ہو سکوں"۔

چنانچہ باقی دو حصے اس ریویو کے مئی اور جون کے نگار میں شایع کر کے میں خاموش ہو گیا۔ اس کے کئی مہینے کے بعد رسالہ "شاعر" (آگرہ) میں کارامروز نمبر کا اعلان دیکھا اور اسی میں کسی جگہ اس مفہوم کا بھی اعلان تھا کہ اس خاص نمبر میں نیاز کی اس "یتیم العلمی" اور نااہلی کو بھی ظاہر کیا جائے گا جو کارامروز کے سلسلۂ تبصرہ میں اس سے ظاہر ہوئی ہے۔

آخر کار بڑے انتظار کے بعد جولائی کا شاعر (جو کارامروز نمبر کے نام سے موسوم ہے) ستمبر میں موصول ہوا اور جناب فضل الدین اثر کا وہ مضمون پڑھا جس میں انھوں نے میرے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

خیر اعتراضات کا جواب تو ایسی بات نہیں ہے جس کی طرف مجھے توجہ ہوتی، لیکن تحریر کے انداز بیان نے مجھے بہت لطف دیا اور میں حیران رہگیا کہ اثر صاحب کو میری سیرت و خصوصیات کا اتنا صحیح علم کیونکر حاصل ہو سکا۔

ہر چند میری سمجھ میں اسوقت تک یہ بات نہیں آئی کہ میرے تبصرہ کا جواب دینے کے لئے میرے اخلاق و عادات سے بحث کرنے کی کیا ضرورت تھی تاہم چونکہ اثر صاحب نے کافی وسعت نظر سے کام لے کر اس خدمت کو انجام دیا ہے اس لئے اس کی داد نہ دینا ظلم ہے۔

سب سے پہلے انھوں نے مجھے "جاہل حاسد" کے لقب سے یاد کیا ہے اور پھر بہ تصدیق و روایت جناب جوش ملیح آبادی "فریب خوردہ انسان" کا خطاب مرحمت فرمایا ہے، اس کے بعد کسی جگہ انھوں نے میری بصارت کے فقدان پر ماتم کیا ہے، کہیں میرے ملحدانہ کفر کا ذکر فرمایا ہے اور اس پیشین گوئی کے ساتھ کہ "وہ وقت بہت قریب ہی جب مولانا نیاز فتحپوری نہ کوؤں میں رہیں گے نہ موروں میں"۔ پھر یہ خطابات تو وہ ہیں جو یونہی گرمی سخن قائم رکھنے کے لئے استعمال کئے ہیں ورنہ جواب کے سلسلہ میں تو انھوں نے اس سے بھی زیادہ حسن قراءت سے کام لیا ہے۔

میں کبھی اس نوع کی تحریروں پر اعتنا کرنے کا عادی نہیں ہوں اور چونکہ جناب اثر کے کسی لفظ سے مجھکو کسی قسم کی کوئی تکلیف ہی نہیں پہونچی اس لئے یوں بھی مجھے جواب دینے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اتفاق سے ایک اور

صاحب کا مضمون اس موضوع پر آگیا اور میں نے اسے صرف اس لئے شائع کرنا مناسب سمجھا کہ اس کے سلسلہ میں مجھے بھی چند باتیں کہنے کا موقع مل جائے گا اور اثر صاحب اس صدمہ سے محفوظ رہیں گے کہ میں نے اس کا کوئی اثر ہی نہیں لیا۔

رسالۂ شاعر کی اس اشاعت میں جو کارامروز نمبر سے موسوم ہے، تمام رائیں اور تبصرے نقل کئے گئے ہیں، لیکن نگار کا تبصرہ شایع نہیں کیا گیا کیونکہ نگار کے پرچے اثر صاحب مسوری لیکر چلے گئے تھے اور جب وہ واپس آئے تو رسالہ میں جگہ باقی نہ رہی تھی۔ ممکن ہے یہ عذر صحیح ہو، لیکن مجھے نہیں کسی شخص کو یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ نگار کا مفصل تبصرہ لفظ بہ لفظ نقل کرنے کے بعد جواب دینا مشکل ہو جاتا، کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نگار کے تقریباً سوا سو اعتراضوں میں سے صرف ۲۹ اعتراضوں کا ذکر کیا گیا ہے اور باقی کی طرف سے بالکل خاموشی اختیار کی گئی ہے۔

اسی سلسلہ میں مجھے یہ بھی ظاہر کر دینا چاہئے کہ لفظ حسین کے متعلق لطیف صاحب کی جس تحریر کا ذکر کیا گیا ہے وہ میری نظر سے گزر چکی ہے، لیکن لطیف صاحب کو نہیں تو کم از کم سیماب صاحب کو اور ان کی وساطت سے آپ کو ضرور معلوم ہونا چاہئے کہ فارسی زبان یا فارسی انشا کے باب میں مولانا روم کی مثنوی بالکل ساقط الاعتبار چیز ہے اس کے مرتبہ کی بلندی کا تعلق صرف اس کے مفہوم و مطالب سے ہے، الفاظ یا زبان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لئے اگر علاوہ مثنوی کے کسی اہل ایران کے کلام میں لفظ حسین کا استعمال ہوا ہو تو اس کے سننے کا میں بھی مشتاق ہوں۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ مثنوی کے قدیم نسخوں میں حسینانِ زمن نہیں ہے بلکہ جمیلانِ زمن ہے۔ خیر، ان کے اس قول کو تو میں سنداً پیش نہیں کرتا لیکن یہ ضرور عرض کروں گا کہ فارسی زبان کی بحث میں آئندہ اگر مولانا روم کی مثنوی سے استناد کی مضحکہ خیز جرأت نہ کیجائے تو مناسب ہے۔

نیاز

انسانی زندگی کے تمام واقعات اکثر و بیشتر نتیجہ ہوتے ہیں جذباتی رجحانات کا۔ ماہرینِ علم النفس اس پر متفق ہیں کہ انسانی جذبات میں جذبۂ محبت اور جذبۂ غیظ و غضب کا غلبہ دماغی توازن کو برباد کر دیتا ہے چنانچہ یہ مسلم ہے کہ ایک فنافی المحبت یا مغلوب الغضب کبھی کسی صحیح رائے کا اظہار نہیں کر سکتا۔

ابتک کارامروز پر جتنے تبصرے ہوئے ہیں اُن میں سوائے مولانا نیاز فتحپوری کے تمام تر مبصرین سیماب اور سیمابیت کے دلدادہ ہیں اور اُن کا حسنِ اعتقاد اس بات کی اجازت نہ دے سکا کہ وہ تنقید و تبصرہ کو ٹھنڈے دل سے ادبی کسوٹی پر کستے۔ تبصرہ نیاز سے اس بات کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک مبصر کو کتنا دیانتدار ہونا چاہئے۔ تبصرہ چونکہ کسی امر کے کلی و جزئی محاسن و معائب پر ایک غائر نظر کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار ہو۔

قریب قریب نیاز صاحب اس معیار سے کہیں نہیں ہٹے۔

فضل الدین صاحب اخترؔ سیمابی ہیں۔ سیمابیت کے دلدادہ ہیں۔ انھیں تمام اقصائے عالم میں صرف سیماب صاحب ہی کی ایک ایسی ہستی نظر آتی ہے جو ان کے "ادبی جذبۂ اعتقاد" کی مرکز ہے۔ اس لئے تنقیدِ نیاز پر اُن کی برہمی و بیقراری قطعاً حق بجانب ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اُن کا یہ حُسنِ اعتقاد سیمابیت کے تاریک ترین پہلوؤں پر کبھی نظر نہ کرنے دے۔ نیز ہر وہ بات جو سیماب صاحب کے خلاف ہو (چاہے قطعاً درست ہی کیوں نہ ہو) "مجروحِ عقیدت" دل پر تیر و نشتر ثابت ہوگی، لیکن اس میں نیاز صاحب کا کیا قصور؟ نیاز صاحب نے بالکل وہی کیا جو ایک دیانتدار مبصر کا فرض ہوتا ہے جس کے روشن دلائل اُن کے "اعترافاتِ محاسن" اور "اعتراضاتِ معائب" ہیں۔

سیمابؔ صاحب فرشتہ نہیں بشر ہیں اور بمقتضائے بشریت غلطی بھی کر سکتے ہیں یہ اور بات ہے کہ اخترؔ صاحب کی عقیدتمندانہ نگاہیں اُن پر نہ پڑیں۔ تاہم ماہرینِ فن کا یہ فرض ہے کہ وہ تمام مطبوعات کی فنی اور ادبی خصوصیات کو روشنی میں لاکر دنیائے ادب کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کو ادا کریں۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز اور مضحکہ خیز یہ بات ہے کہ اخترؔ صاحب نے جو تنقیدی معیار قائم کئے ہیں اُن پر سیمابی عقائد کی وجہ سے خود بھی ثابت قدم نہ رہ سکے۔ آپ کے مزعومات کے مطابق ناقد کو "گڑے مردے نہ اکھاڑنا چاہئیں"۔ لیکن نیاز صاحب کی ملحدانہ زندگی کے تذکرہ سے کیا منشا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخترؔ صاحب نے (جو ذہنی توازن اور شائستگیِ خیال کو معیارِ تنقید قرار دیتے ہیں) نیاز صاحب کی پرائیوٹ زندگی بیان کر کے کیوں دل کے جلے پھپھولے پھوڑے اور خارج از بحث موضوع نظائر پیش کر کے خود کو ایک زبردست علمبردارِ ادب ثابت کرنے کی ناکام کوششیں کیں اور بقول خود ایک جاہل حاسد کی حیثیت اختیار کر کے ایک ناقد کے منصبِ اعلیٰ سے گر گئے۔

شاعر کی تصنیفات کو غزلوں اور نظموں کی بیاض تسلیم کرنے کے بعد بھی یہ امر تشنۂ تکمیل رہ جاتا ہے کہ نظموں کے موضوعات اور تجزیۂ خیالات کو کیا کہا جائے جو اکثر فلسفیانہ نظائر، حکیمانہ تجاویز، مذہبی مشورے، قومی احساسات، سیاسی اسباق اور جذباتی رجحانات کے آئینہ دار ہوتے ہیں کم عقل سے کم عقل بھی یہ کہہ سکتا ہے کہ شعر یا نظم جس موضوع کے ماتحت ہو اُس پر اُسی موضوع کے نظریوں سے بحث کیجائے پھر یہ کہنا کس قدر تنگ نظری اور علمی افلاس کی دلیل ہے کہ شاعر کی رائیں اتفاق و اختلاف کے لئے نہیں بلکہ محض برائے حصولِ حظ ہوئی ہیں۔ اس حیثیت سے تو شاعر ایک پیغمبرِ فطرت نہیں بلکہ محض ایک کامیڈین Commedian ہے جو بیک وقت چند تماشائیوں کی وقتی تفریح کا باعث بن سکے۔ طرفہ تماشہ یہ کہ اخترؔ صاحب نظموں کی

بیاض کو پرائیوٹ ڈائری سے تعبیر کرتے ہیں - ان کا میدانِ صحافت میں آنا کیا معنی رکھتا ہے۔ خدا رحم کرے اگر یہی حال رہا تو کیا عجب کہ شاعر کی پرائیوٹ لائف بھی منظرِ عام پر رونما ہو جائے۔

اثر صاحب فرماتے ہیں کہ شاعر نہ تو فلسفی ہے نہ مدبر، نہ سیاسیات کا ماہر نہ اخلاقیات کا مدرس تو پھر شاعر کس مرض کی دوا ہے؟ - حالانکہ مولانا سیماب فرماتے ہیں کہ :-

شاعر نہ ہو تو صورتِ ملہم فضول جائے ‏‏‏‏ شاعر نہ ہو تو دنیا نظم اپنا بھول جائے
جب جادۂ اقوام میں دشواریاں ہوں سدِ راہ ‏‏‏‏ اسوقت شاعر سے کہو تدبیر آسانی کرے (سیاست)
جب گردِ فکر و یاس میں دب جائے سارا قافلہ ‏‏‏‏ اسوقت شاعر سے کہو سعی درخشانی کرے (اخلاقیات)
جب شورشوں کے بعد بھی ممکن نہ ہو اک انقلاب ‏‏‏‏ اس وقت شاعر سے کہو خونِ جگر پانی کرے (سیاست)
محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر ‏‏‏‏ ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر (محبت)
حدِ معلومۂ ہستی سے گزرتا ہی نہیں ‏‏‏‏ حرف اک یہ ہے وہ انسان جو مرتا ہی نہیں (مذہبیات)

مشتے نمونہ از خروارے ـــ واللہ اُستاد اور شاگرد کا تضادِ خیال بہت ہی پر لطف ہے۔

عرضِ حال

نہ تو میں نیازی ہوں اور نہ سیمابی صاحب سے کوئی ذاتی پرخاش ہے۔ فن کی خدمت اور اظہارِ حقیقت کا جذبہ مجھے مجبور کرتا ہے کہ نیاز صاحب کے اعتراضات اور اثر صاحب کے جوابات پر ایک خالص ادبی غیر جانبدارانہ تبصرہ پیش کروں۔

اعتراض :- وہ سطحِ زمیں پر تن تن کر حوروں کی طرح چلنے والے

اس مصرع میں سب سے پہلے اثر صاحب کو مشبہ، مشبہ بہ اور وجہ شبہ میں ایک شدید ابہام واقع ہوا ہے، حالانکہ بتدی شعرا بھی یہ جانتے ہیں کہ مشبہ اور مشبہ بہ میں وجہ شبہ ایک خاص صفت ہوتی ہے۔ حور چونکہ مذہبی تخئیل کی پیداوار ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی صفات کے لئے مذہبی لٹریچر سے استفادہ کیا جائے۔ صرف اسی خیال کے اظہار پر اثر صاحب نیاز صاحب پر بُری طرح برسے اور اپنے زعمِ ہمہ دانی میں نہ جانے کیا کیا خارج از موضوع جذبات کا اظہار کیا۔ ایک "ذمہ دار شاعر" کم از کم اتنا فاتر العقل تو نہیں ہوتا کہ شعری مشورہ کے جواب میں ذاتیات پر ناجائز حملے بھی روا رکھے۔

زندگی ہستی مرحوم پہ احساں کر دے ‏‏‏‏ پھر مرتب مرے اجزائے پریشاں کر دے

اعتراض یہ ہے کہ "زندگی" کو بغیر مدا کے اس جگہ استعمال کرنا مناسب نہیں۔ وجہ اعتراض چونکہ محل استعمال

ہے اس ملئے ذوق ؔ کے شعر کو دلیلاً پیش کرنا اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ منادی بغیر ندا کے بھی استعمال ہوتا ہے ایک بے معنی بات ہے جبکہ دونوں کے محل استعمال میں دور کا بھی واسطہ نہیں ہے شاید اس مسئلہ کی وضاحت اثرؔ صاحب کی تمہید میں کہیں نہیں ہے۔ کیا عجب ہے کہ جس طرح آپ اور مقامات پر اپنے نظریوں سے ہٹ چکے ہیں یہاں بھی منشا صرف معترض کو مرعوب کرنا ہو۔

شعر۔ پھر بنا لالا مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار پھر گلستاں میں گُل ولالہ بداماں کردے

جہاں تک ادبی تعلق ہے معترض کی زریں رائے قابل قدر ہے۔ اور اثرؔ صاحب باوجود اعتراف احتراز کے فطرت سے مجبور ہو کر یہاں بھی ذاتیات پر حملہ کناں ہیں۔ رہا اصلاح کا سوال تو۔

سونپ دے پھر مجھے رنگینیٔ دامانِ بہار پھر گلستاں میں مجھے لالہ بداماں کردے

میں "مجھے" کی تکرار نے جو لطف بیان پیدا کر دیا ہے اس سے کچھ ارباب فصاحت ہی حظ اندوز ہو سکتے ہیں نیز سونپ دے کی رکاکت بھی دلیل طلب ہے۔

شعر۔ جمع کر کے مرے سامانِ نواسنجی کو بربطِ خامشیٔ عالم امکاں کردے

اس شعر میں معترض اور مجیب کے درمیان ایک دلچسپ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ شعر محض المعنی فی بطن الشاعر کی تفسیر کر رہے ہیں۔

شعر۔ محفلِ عالم جمالِ حُسن سے خالی ہوئی صبح کی صورت جہنم کی طرح کالی ہوئی

جمال حُسن اور جلوہ کے امتیاز میں معترض کو ایک شدید مغالطہ ہوا۔ تاہم مشورہ نیک ہے اور محض تبادلۂ الفاظ سے معانی میں ایک شاندار اضافہ ہو جاتا ہے ۔ ثانیاً شاید سیمابؔ صاحب جہنم اور پردۂ ظلمات کو مترادف سمجھتے ہیں۔ ایسی جگہ جہاں شعلے دہکتے ہوں "کالی" کہنا کتنی لغو اور مہمل بات ہے فاضل معترض نے نہ جانے کیوں اسے نظر انداز کر دیا۔ صبح کو جو مرکز انوار و منظہر تجلیات ہے جہنم کی طرح کالی کہنا ایسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے جسے مذہب فطرت کبھی معاف نہیں کر سکتا۔

شعر۔ مستقل جو عہد شخصیت کا لعنت ہو گیا نام اُس قانون وضعی کا سیاست ہو گیا

نیازؔ صاحب یہ کہنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ شخصیت سے (Autocracy) کا مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ شخصیت اور شخصی حکومت میں جو فرق ہے اس سے سوسائٹی کا ہر فرد واقف ہے۔ شعر کا مفہوم جو اثرؔ صاحب نے پیش کیا ہے وہ صرف اُن کی ذہنی پیداوار ہے جس کا اصل شعر سے کوئی ربط نہیں۔ قانون وضعی سے محض لفظی معنی لینے کے بعد بھی صرف قانون مفاد مراد لینا (اور قانون استبداد کو نظر انداز کر دینا) ایک ایسی بدعت ہے جسے لٹریچر کبھی گوارا نہیں کر سکتا ۔ یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ محض قانون مفاد ہی کیونکر سیاست بن سکتا ہے

سیاست بجائے خود کوئی قانون نہیں البتہ سیاست کا قانون گر ہونا ممکن ہے۔

شعر:۔ اک دور وہ تھا روح فزا کیفیت اندوز کعبہ میں تھی اک عید تو بتخانے میں نوروز

حقیقت تو یہ ہے کہ اعتراض بالکل درست ہے اور اصلاح نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا ہے۔ مجیب نے حقیقی عید اور مجازی عید کی لفظی بحثوں میں پڑ کر مفہوم اعتراض کو الجھا دینے کی ناکام کوشش کی ہے۔ اعتراف شکست کا یہ پہلو نہایت شاندار ہے۔

شعر:۔ ایک آزردہ سی چتون میں بھی تھا حسنِ کشاد ایک دزدیدہ نظر بھی گرمی افسانہ تھی

جس طرح اور مقامات پر جناب اثر نے "سوال از آسمان وجواب از ریسمان" پر اپنی تنقیدی بنیادیں قائم کی ہیں، اسی طرح یہاں بھی انھوں نے اعتراض نہ سمجھتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ایک واقعی زاید ہے سیماب صاحب کے "سی" اور جوش صاحب کے "سی" میں محل استعمال جداگانہ ہیں اس لئے ایک دوسرے کی سند نہیں بن سکتا۔ موضوع نظم پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر عہد ماضی کے روادارانہ سلوک اور پر خلوص زندگی کے کامیاب منظر پیش کرنا چاہتا ہے مگر رعایات لفظی اور اظہار قابلیت واجتہاد نے شعر کو مبہم کر دیا۔ حقیقت پسند احباب ہی فیصلہ دیں گے کہ سیماب صاحب کے مفہوم کو نیاز صاحب کے اصلاحی شعر نے پوری وضاحت کے ساتھ ادا کر دیا۔

جناب اثر نے یہ فرما کر کہ نیاز صاحب کے اکثر افسانہائے حیات کی تخلیق کا باعث محض "دزدیدہ نگاہی" ہے اپنے دعوے کو اور کمزور کر دیا۔ وجہ تخلیق افسانہ گرمی افسانہ نہیں بن سکتی کیونکہ گرمی کا لفظ کسی بات کی ارتقائی منزل کو ظاہر کرتا ہے چاہے اُس کی بنیادیں کمزور ہی کیوں نہ ہوں۔

سیماب۔ چاند کی نظروں میں ہے ابتک وہی عالم کشی سینۂ خورشید میں سوزِ حقیقت بھی وہی
گرمی تخلیق میں ابتک وہی ہے سوز وساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

اصلاح نیاز۔ سینۂ خورشید میں ابتک وہی ہے التہاب چاند کی نظروں میں پرواز لطافت بھی وہی
عشق میں اور حُسن میں ابتک وہی ہے سوز وساز خوئے ضبط اُسکی وہی اور اسکی نخوت بھی وہی

عالم کشی پر اعتراض تو کچھ اتنا قوی نہیں البتہ چاند کی عالم کشی اور سینۂ خورشید کے سوز حقیقت کو گرمیٔ تخلیق سے کوئی علاقہ نہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دونوں اشعار دو متضاد معانی کے حامل ہیں درانحالیکہ شاعر کا یہ مقصود نہیں۔ ہاں معترض نے چاند کی پرواز لطافت اور سینۂ خورشید کے التہاب کو حسن وعشق سے استعارہ کر کے ایک بامعنی اصلاح دی ہے جس سے معترض کی اُستادانہ ذہنیت اور پختہ کلامی کا پتہ چلتا ہے۔

شعر:۔ بیکسی کے زرد چہرہ پر خوشی کا نور تھا افسر شاہی بساطِ محفلِ مزدور تھا

معترض کی درست مقالی کے اعتراف کے بعد یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ پیروں سے کچل کر افسر تو کیا سر بھی بساط بنایا جاسکتا ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ کسی شے کی (بالخصوص افسر و سر) پامالی سے اس کے بساط بن جانیکا کہاں تک امکان ہے؟ ممکن ہے چودھویں صدی کے اس ایجاد و اختراع کے دور میں جناب اثر صاحب ایسا وسیع سر لیکر آئے ہوں جو کچل جانے کے بعد ایسی بساط بن سکے جس پر محفل مزدور کا انعقاد ہو۔

شعر:- تغیرات اور علی التواتر تصرفات اور بے محابا — کمال حسن و جمال کیا ہو زوال شیب و شباب کیا ہو

تحولات غریب اور غیر شاعرانہ لفظ ہی سہی لیکن معنی کے اعتبار سے ضروری ہے۔ اگر شیب کے زوال کو موت تسلیم کر لیا جائے تو جوانی کی موت کو کیا کہیں گے۔ موت زوال شیب نہیں بلکہ زوال زندگی کا نام ہے۔

شعر:- دور صیاد میں اسد رجہ ہوا غم مجھ کو — اب مسرت کبھی ہوتی ہے مگر کم مجھکو

اصلاح نیاز:- دور صیاد میں اسد رجہ ہوا غم مجھ کو — کہ مسرت کبھی ہوتی ہے تو کم کم مجھکو

معمولی عقل والے تو ضرور نیاز صاحب کے مصرعہ کو بھسپھسا کہیں گے۔ البتہ ارباب دانش اور ماہرین فن کی جوہر شناس نگاہیں ایسے گہر پاروں کی قدر کر سکتی ہیں۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

رہا شرم کا سوال تو اثر صاحب اپنے گریبان میں منہ ڈالکر دیکھیں "تو" اور "کم" بھرتی سمجھنے پر مدتوں گردن نہ اٹھا سکیں گے۔

شعر:- مجسم ہو کے ملتی باریابی تیری محفل میں — ہم اک لمحہ میں مثل روح تیرے پاس آ جاتے

حقیقت یہ ہے کہ لفظی کشمکش نے نیاز صاحب کو معنویت سے بہت دور کر دیا ہے۔

شعر:- نعمت مقسوم کا ممنون ہونا چاہیئے — صاحب دولت کو ہے تحدیث دولت لازمی

سمجھ میں نہیں آتا کہ نیاز صاحب نے تحدیث کے معنی بیان کرنے اور گفتگو کرنے کے لینے کے بعد بھی تجدید وفا کے معنی کیونکر پیدا کر لئے۔ درانحالیکہ شعر کا مفہوم بھی یہ نہیں ہے۔

شعر:- شروع ہوتے ہیں کچھ واقعات نو ساماں — مغنیہ سے کہو ختم کر فسانۂ دوش

مانا کہ ختم کر صحیح ہے لیکن اعتبار فصاحت سے گرا ہوا ہے۔ کم از کم ایک اُستاد کے لئے ایسی کمزوری شایان شان نہیں۔ ثانیاً مغنیہ واقعی افسانہ گو نہیں ہے۔ اکثر افسانے منظوم ہوتے ہیں مگر قیود غنا سے آزاد ۔ مقاصد نظم و غنا میں جو فرق ہے اُس پر اثر صاحب دوبارہ غور فرمائیں۔

رنگین تیتری یا عورت

اس نظم کے متعلق شاعر اور معترض دونوں اپنی جگہ ایک درجہ رکھتے ہیں جس کا امتیاز ارباب نقد و نظر خود کر سکتے ہیں۔

اختتام پر مولانا نے جن اعتراضات کے اقتباس پیش کئے ہیں وہ بجائے خود ایک حقیقت کے حامل ہیں البتہ سیماب صاحب کے "بھی" اور غالب صاحب کے "بھی" میں جو امتیاز ہے اُس پر مولانا غور فرمائیں۔

رہا یہ کہ اس تنقید سے معترض کے علمی وقار کو جو صدمہ (بقول اثر صاحب) پہونچا وہ بھی دلیل طلب ہے۔ محض اپنے احباب اور بالخصوص تلامذہ کی تعریفوں سے خوش ہونا اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مصداق ہے۔ جناب عبدالحفیظ صاحب اثر صاحب کے خاص دوستوں میں سے ہیں اس لئے تنقید نیاز سے اثر صاحب کے ساتھ ہی ساتھ اُن کا برہم ہونا حیرت کی بات نہیں۔

رسالۂ ہندستانی کے اعتراضات کے جواب میں اثر صاحب نے سمن اور سما کے مسئلہ پر روشنی ڈالکر کافی دلچسپی کا سامان فراہم کر دیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ سمن صرف اس لئے زمین کے معنی میں مستعمل ہے کہ وہ زمین کی پیداوار ہے تو جناب موصوف سے یہ پوچھنا غیر ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ آفتاب جو فضائے سماوی پر طلوع ہوتا ہے کیا آسمان کے معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے؟۔

ایک بات اور قابلِ غور ہے کہ اصلاحِ شعر و سخن کے لئے آگرہ اسکول کا اتباع ضروری ہے کیا یہ نظریہ تمام دنیا کے لئے قابلِ تسلیم ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس کی وسعتیں اسکول تک ہی محدود رہنا چاہئیں ۔۔۔ کارامروز محض آگرہ اسکول کا رسالہ نہیں بلکہ تمام دنیا کے لئے پیغام ہے اور دنیائے شعر و شاعری نے اب تک اساتذۂ سلف کے اتباع کو ضروری مانا ہے۔ اس لئے تنقید و تبصرہ میں جدید قوانین یا (بدعات) بغیر دنیا کے تسلیم کئے ہوئے اساسی اُصول نہیں بن سکتے۔ اگر اساتذۂ سلف کی عائد کردہ قیود بیکار ہیں تو ظاہر ہے کہ اُن کا کلام بھی اس دور کے لئے سند کا کام نہیں دے سکتا، پھر غالب و ذوق سے استناد کے کیا معنی؟ رہا یہ کہ قید و بند یا اغلاطِ شعری محض مبتدی کے لئے ہیں اُستاد کے لئے نہیں تو شاید یہ تسلیم کرنا پڑے کہ اُستاد کے معنی ہیں "مرتکب اغلاط کثیرہ" مگر شاید دنیا اسے بھی نہ مانے ۔۔۔ مضمون کا اختصار کرتے ہوئے صرف ایک بات کا اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ نگار کے مسلسل مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر اعتراضات مولانا نیاز نے درست کئے تھے اور غالباً اثر صاحب نے اُن کی درستگی کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں نظرانداز کر دیا ہے۔ اپنے مضمون کو اثر صاحب سے مخاطب کرتے ہوئے اس شعر پر ختم کرتا ہوں:۔

مختصر ہست کہ گفتم دبدل ترسیدم | کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار ست

اگر ضرورت ہوئی تو انشاء اللہ آئندہ اس موضوع پر بعنوانِ انکشافِ راز ایک بسوط و مکمل تبصرہ ہدیۂ ناظرین کرونگا۔

ریاضت انصاری

باب المراسلۃ والمناظرہ

تحسین سخن شناس یا اعترافِ دلدادگی؟

(جناب ناطق مالوی)

قبلۂ اشرف!

لفافہ میں جو کچھ ملفوف ہے۔ وہ آپ دیکھ ہی لیں گے۔ مجھے صرف اتنا اور عرض کرنا ہے۔ کہ جس غور و فکر سے آپ نے "تصویر" کی غزل کا معائنہ فرمایا تھا اُس سے کہیں زیادہ میرے معروضات قابل توجہ ہیں۔ تاکہ میری غلطی آپ کی ذمہ داری کی شکل میں تبدیل ہو جائے۔ والسلام

"مت پوچھ"

گزشتہ مہینہ کے نگار میں "خاتون بدایونی" کی ایک غزل شایع ہوئی ہے۔ پیر طریقت "حضرت نیاز" نے جس انداز میں داد کلام فرمائی ہے وہ بجائے خود ایک مستقل شعر ہے۔ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ ایک شوریدہ سر اپنی رندانہ جراتوں کو سینہ میں خاکستر ہوتے ہوئے دیکھے اور زبان پر "اُف" بھی نہ لائے۔

ہفوات مسطورہ میں کوشش تو اس بات کی کی گئی ہے کہ جنس لطیف کے ادب و احترام کا کوئی معمولی پہلو بھی مجروح نہ ہونے پائے۔ تاہم "وسعت" جس شے کا نام ہے۔ اُسے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ گفتگو کی ادنےٰ لغزش بھی (اگر پائی جائے تو)، بجائے تعریض کے خلوص تصور کئے جانے کے قابل ہے۔

خاتون موصوف معاف فرمائیں کہ آخری اشعار میں "اُن" سے جو خطاب کیا گیا ہے۔ وہ ایک والہانہ کمزوری ہے۔ اپنے ہی جذبات نیاز و نیائش کی۔

محترمہ تصویر سے:۔ نہ پوچھ اپنے بیاں کی لطافتیں مت پوچھ ہیں شعر شعر میں پنہاں نزاکتیں مت پوچھ

ہر ایک "بول" سے پیدا ہے شوخیٔ گفتار
کلام سادہ کی رنگیں حلاوتیں مت پوچھ

دلوں میں ہوتی ہے بیدار جس سے روح طرب
حقیقتاً ہیں یہی - وہ عبارتیں مت پوچھ

زباں کی شستگی و دلفریبیاں توبہ!
بیان و نطق کی موزوں اضافتیں مت پوچھ

کھلا ہوا ہے گلستان حسن و رعنائی
بہار باغ معانی کی نزہتیں مت پوچھ

ادب نواز تخیل کی دلربا شکلیں
لطیف ذوق وفا کی شکایتیں مت پوچھ

حدیث "بزم عدو" پر سنا کہ سنکے اسے
گزر گئی ہیں - جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

"ان" سے:-

ستم کے لطف جفاؤں کی لذتیں مت پوچھ
نیاز مند وفا کی مسرتیں مت پوچھ

وہ بار بار سر بزم پرسش خاموش
تری نگاہ کی کافر شرارتیں مت پوچھ

تجھے قسم ہے - ترے ذوق بے نیازی کی
نہ پوچھ مجھ سے مرے دل کی حسرتیں مت پوچھ

ہم اک جہان تمنا ہیں - دیکھ ہم کو نہ چھیڑ
ہمارے رنج - ہماری مصیبتیں مت پوچھ

مجھی سے پوچھ ارے میرے پوچھنے والے
رقیب سے مری مایوس حسرتیں مت پوچھ

وہ میری عرض تمنا پہ تیرا ہنس دینا
وہ تیرے ہنسنے پہ میری ندامتیں مت پوچھ

غضب کا مصرعہ "تصویر" ہے مگر ناطق
گزر گئی ہیں - جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

(نگار) انگریزی کا مشہور مقولہ ہے:-

Imitation is the Sincerest form of flattery

یعنی کسی شخص کی نقل و تقلید، تحسین و اعتراف کی نہایت پُرخلوص صورت ہے - اس لئے اصولاً محترمہ تصویر (بدایونی) کو آپ کے ان جذبات کی قدر کرنا چاہئے، رہگیا میں سو ظاہر ہے کہ مجھے اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں، ایک ہدیہ پیش کرتا ہے، دوسرا قبول کرتا ہے یا رد، مجھے اس سے کیا واسطہ کہ ہدیہ کی نوعیت کیا ہے اور رد و قبول کی کیا؟ لیکن اگر دونوں فریق میں بدگمانی پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں جناب ناطق سے ضرور دریافت کرتا کہ ایک غزل میں آپ نے محترمہ تصویر سے خطاب کیا ہے اور دوسری میں "اُن" سے تو کیا یہ "اُن" کا اشارہ کسی اور شخص مقصود کی طرف ہے — اگر نہیں، تو میری رائے میں اس کا عنوان "پھر انھیں سے" زیادہ موزوں ہوتا۔

علاوہ اس کے ایک فنی استفادہ بھی جناب ناطق سے کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ پہلی غزل کے چوتھے شعر میں جو

شستگی کا عطف حرف (واو) سے "دلفریبیاں" پر کیا گیا ہے کیا وہ درست ہے؟ - دلفریبی فارسی لفظ ہے لیکن اس کی جمع "دلفریبیاں" فارسی نہیں، اس لئے شستگی کے ساتھ اس کا عطف بجائے (واو) کے (اور) سے ہونا چاہئے تھا۔ اگر یہ مصرعہ یوں ہوتا تو کوئی حرج تھا

زباں کی شستگی و دلکشی، معاذ اللہ!

اسی غزل کے آخری شعر میں "سنا کر سنکے اسے" بھی نظر ثانی کا محتاج تھا۔

دوسری غزل کے دوسرے شعر میں بجائے "اپنی نگاہ" کے "تیری نگاہ" اور تیسرے شعر میں بجائے "اپنے ذوق" کے "تیرے ذوق" لکھنا بھی غالباً محل نظر ہے۔

مقطع میں لفظ (مگر) کا صرف بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ مصرعہ یوں بھی ہو سکتا تھا:-

غضب کا مصرعۂ تصویر ہے یہ اسے ناطق

یوں بہ حیثیت مجموعی آپ کی دونوں غزلیں خوب ہیں اور خصوصیت کے ساتھ دوسری غزل کا دوسرا اور چھٹا شعر تو قیامت ہے۔ مگر میں کیا اور میری پسند کیا۔ "اُن" سے پوچھئے دیکھئے وہ کیا کہتی ہیں؟

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

اُردو زبان میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے، اگر آپ "گناہ" کی دنیا کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو اس تصنیف کو ملاحظہ فرمائیے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہے۔ فحاشی کی تمام صورتیں اور اُنکی مفصل تاریخ عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک۔ ان سیکڑوں عجیب و غریب واقعات کے جنکی طرف یوں کبھی آپ کا ذہن بھی نہ منتقل ہوا ہوگا اس کتاب میں موجود ہیں۔ الغرض یہ کتاب "جنسیات" کے موضوع پر ایک سائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور ممکن نہیں کہ آپ ایکبار اسکو شروع کرنے کے بعد آخر تک دیکھنے پر مجبور نہ ہوں۔

قیمت غیر مجلد تین روپیہ، مجلد ہے علاوہ محصول۔
خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت — منیجر نگار لکھنؤ

مجموعۂ استفسار و جواب

جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جس وقت یہ مجموعہ شایع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائے گی اور اسی وقت قیمت بھی اس کی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضخامت و قیمت کیا ہو گی۔

منیجر نگار لکھنؤ

ملاحظات

(بہ سلسلہ صفحہ ۸)

ایران کی ادائے اتر کانہ

اس وقت عالم اسلامی اور خصوصیت کے ساتھ اثنا عشری دُنیا میں حکومت ایران خاص توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے اور عراق و ہندوستان اور شاید خود ایران میں بھی بعض جگہ شیعہ حضرات ان جدید احکام کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں جو رضا شاہ پہلوی کی طرف سے حال ہی میں شایع ہوئے ہیں۔

وہ احکام جن کے خلاف خصوصیت کے ساتھ اظہار برہمی کیا جا رہا ہے، چار ہیں، ایک یہ کہ عورتوں کے لئے پردہ و نقاب کی ضرورت نہیں ہے اور انھیں بے حجابانہ سامنے آجانا چاہئے، دوسرا یہ کہ متعہ اور تعداد ازدواج دونوں قابل ترک ہیں، تیسرا یہ کہ ٹوپی اور ملبوس مغربی وضع کا استعمال کیا جائے۔ چوتھا یہ کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس مسئلہ میں بحث کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ حکومت ایران نے ایسے احکام کیوں نافذ کئے اور دوسرا یہ کہ ان احکام کو شیعہ جماعت کیوں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتی۔

وہ حضرات جنھوں نے رضا شاہ پہلوی کے دور حکومت کا ابتدا سے مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہ ہوگی کہ سرزمین ایران میں قاچاری حکومت کا ختم ہونا اور اس کی جگہ ایک ایسے شخص کی حکمبرداری کو قبول کر لیا جانا جو طبقۂ عوام سے متعلق تھا، صرف یہی معنی رکھتا تھا کہ وہاں دور استقراطی ختم ہو کر اس کی جگہ ڈماکریسی لے رہی ہے جو اس عہد کی سیاسیات کا اُصول اساسی ہے۔

پھر چونکہ ڈماکریسی بنیاد ہے اشتراکیت کی اس لئے اگر ایران اپنے احکام میں مذہبی تقشف کی رعایت کرنے پر آمادہ نہیں تو حیرت نہ کرنا چاہئے کیونکہ دورِ اشتراکیت میں سب سے پہلے جس گرفت کو ڈھیلا کیا جاتا ہے وہ مذہب کی گرفت ہے۔ وہ زمانہ، جب بادشاہ مذہب کے باب میں بھی اتنا ہی سخت ہوتا تھا جتنا سیاست دنیادی میں ختم ہو چکا ہے اور نہ اب وہ دور باقی ہے جب حکومت کا نصب العین، سلطنت کا مقصود اور سیاست کا مدعا صرف مذہب کی اشاعت ہوا کرتا تھا۔ یہ زمانہ ہے علوم صناعی کی ترقی کا، تجارتی مقاومت کا، اقتصادی تفوق و برتری کے حصول کا اور مرکزیت پیدا کرنے کے لئے مذہب کے بجائے قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا، اس لئے مذہب کو

کسی حکومت کے نظام میں زیادہ سے زیادہ تنی ہی جگہ مل سکتی ہے، جتنی قومی رسم و رواج کو اور چونکہ تنظیم جدید میں اجتماعیت قائم کرنے کے لئے حد درجہ ہم آہنگی و یکسانیت پیدا کرنے کا خیال سامنے ہوتا ہے اس لئے سب سے پہلے روایتی زندگی کو محو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، جس کی بنیاد وہی اختلاف آراء پر قائم ہے اور یہ ظاہر ہے کہ روایتی زندگی کا خلاق صرف مذہب ہے اور صرف قیام مذہب پر اس کی زندگی کا انحصار ہے۔

نفسیات کا یہ بالکل کھلا ہوا مسئلہ ہے کہ جس طرح انسان کا بطون اس کی وضع و صورت سے ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا، بالکل اسی طرح وضع و صورت کا اثر بھی انسانی احساس پر بہت پڑتا ہے ۔۔ ہم ایک شخص کو دیکھ کر جسکی داڑھی لمبی ہے، عبا طویل ہے، سر پر عمامہ اور ہاتھ میں تسبیح ہے یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ وہ سخت مذہبی انسان ہے۔ اسی طرح جب ہم ایک بے ریش و بروت انسان کو، انگریزی وضع و ملبوس میں دیکھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اس کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں یا بہت کم ہے۔ لیکن اگر ہم اُس مذہبی انسان کو غیر مذہبی اور اس غیر مذہبی انسان کو مذہبی بنانا چاہیں تو منجملہ دیگر تدابیر کے ایک نفسیاتی تدبیر یہ بھی ہوگی کہ مولانا کی داڑھی مونڈ کر اس رند کے چہرہ پر لگا دیجائے اور اس کا کوٹ پتلون اُتار کر اُن کے قامت مبارک کو آراستہ کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ اول اول ان دونوں کو یہ تغیر پسند نہ آئے، لیکن رفتہ رفتہ اُس کے لئے داڑھی کا بوجھ گوارا ہو جائیگا اور یہ صاف چہرہ کی نعومت و تازگی کو محسوس کرنے لگیں گے۔

یہی وہ نفسیاتی نکتہ ہے جس پر ترکی میں مصطفےٰ کمال نے عمل کیا اور اب اس کی تقلید رضا شاہ پہلوی نے کی ہے۔ دنیا میں جب کوئی قوم انتہائی انحطاط کو پہونچ جاتی ہے اور اس کا احساس بالکل جامد و معطل ہو جاتا ہے تو پھر صرف وہی تدبیر اُس میں حرکت پیدا کر سکتی ہے جو بیک وقت دفعتہً ذہنوں میں انقلاب پیدا کر دے اور اس قسم کے احکام جو ترکی و ایران میں نافذ کئے گئے ہیں بدرجۂ اتم اس مقصود کو پورا کرنے والے ہیں۔

پھر ایران و ترکی میں اسوقت جو کچھ ہو رہا ہے ممکن ہے وہ اب سے سیکڑوں سال قبل کے بنائے ہوئے قانون کے منافی قرار دیا جائے، لیکن ضروریات زمانہ اور تمدن عالم کے موجودہ بین الاقوامی نظام کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کے اجتماعی و ملی مفاد کے لئے بہر نوع اس کو مفید تسلیم کرنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے اگر خالص مذہبی نقطۂ نظر سے ان مسائل پر غور کیا جائے تو بھی میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان احکام میں کیا کفر و الحاد ملا ہوا ہے عورتوں کا پردہ، اسلام کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کی مخالفت مذہب کی مخالفت قرار دیجائے، نہ ملبوس و وضع کا تغیر اعتقادات کے تغیر کو مستلزم ہے، اسی طرح اگر تعدد ازدواج اور متعہ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ خدا کی مرضی کے خلاف حلال کو حرام قرار دیا گیا ہے درست نہیں، کیونکہ نکاح وغیرہ کے مسایل قوم کی معاشرت سے متعلق ہیں اور وقت و زمانہ کی مصلحت کے لحاظ سے ان میں ہمیشہ تغیر ہو سکتا ہے

یعنی اگر آج تعدد ازدواج یا متعہ بربنائے مصالح ملکی مناسب نہیں تو کل پھر ان کے جواز کا حکم صادر ہو سکتا ہے اگر ضرورت اس کی مقتضی ہو، رہا یہ امر کہ ایران کے حالات کا اقتضاء یہ تھا یا نہیں، سو غالباً ہندوستان و عراق کے مسلمانوں سے زیادہ وہیں کے ارباب فکر و سیاست کو اس کے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کا حق حاصل ہے۔ رہا یہ امر کہ کسی شہر میں تین مسجدوں سے زیادہ قائم نہ رکھی جائیں، سو میرے نزدیک اس سے زیادہ مفید کوئی بات اور ہو ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں انتشار پیدا کرنے کا ایک سبب مساجد کی کثرت بھی ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہر محلہ میں متعدد مسجدیں موجود ہیں جس کے معنے یہ ہیں کہ ایک ہی محلہ کے مسلمانوں کو بھی کبھی ایک جگہ جمع ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر مسجدیں کم ہوں گی تو ظاہر ہے کہ ان کا اجتماع بھی زیادہ ہو گا اور رشتۂ اخوت و ہمدردی بھی زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ علاوہ اس کے یوں بھی دیکھئے کہ شہروں میں کتنی مسجدیں غیر آباد و ویران رہتی ہیں اور ان کی ویرانیوں کو دیکھ کر غیر مذاہب والے کیا سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے اگر سجدہ گاہوں کی کثرت کی بجائے سجدہ کرنے والوں کی تعداد بڑھائی جائے تو زیادہ موزوں ہے اور اس کی تدبیر صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مسجدوں کی تعداد کو کم کیا جائے۔

الغرض رضا شاہ پہلوی کا کوئی حکم میرے نزدیک ایسا نہیں ہے جس پر ہنگامہ بپا کیا جاتا، لیکن افسوس ہے کہ مشہد مقدس میں شیخ بہلول نے یہ ہنگامہ بپا کیا اور حکومت کو تیغ و تفنگ سے کام لینا پڑا جس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی کچھ مارے گئے، کچھ زخمی ہوئے اور کچھ بھاگ گئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کی اصلاحیں جبر و اکراہ کے ساتھ مناسب نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ اسوقت ایران میں کتنے نفوس ایسے ہیں جو خوشی سے ان احکام کی پابندی پر مائل نہیں ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ سوائے مولویوں یا اس جماعت کے جو قدیم مذہبی خیال کی پابند ہے، نئی نسل کے تمام افراد رضا شاہ پہلوی کے ہم آہنگ ہیں اور اس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ جس وقت یہ احکام نافذ ہوئے تو دفعۃً ملک کی تمام نوجوان لڑکیاں بے نقاب باہر نکل آئیں اور مغربی ٹوپی کی قیمت تیس تومان تک پہونچ گئی۔

اس لئے میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہندوستان کے شیعہ حضرات کا جلسے کر کر کے مخالفت کی آواز بلند کرنا، جن لوگوں نے مشہد میں حکومت کے خلاف آواز بلند کر کے اپنی جانیں دی ہیں انھیں شہداء کا لقب دیکر فاتحہ خوانی کے مراسم ادا کرنا کیا مفید ہو سکتا ہے۔ مسلمانان ہند کی یہ ادا کہ وہ اپنے حال پر ماتم کرنے کے بجائے ایران و حجاز کے معاملات پر سر دھننا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں، آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔

حبش اور اطالیہ کی آویزش

اس وقت ساری دنیا کی نگاہیں افریقہ کی اس سیاہ فام زمین پر لگی ہوئی ہیں جس کو سفید تہذیب سے آراستہ کرنے کے لئے میسولینی نے اپنی تمام محاربانہ

قوتوں کو بروئے کار لانے کا عزم کر لیا ہے۔ اس لئے غالباً بے محل نہ ہوگا اگر ان مدعیان شائستگی کی تہذیب پرستی کی حقیقت پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجائے۔

۵ دسمبر ۳۴ء کو حبش اور برطانیہ کے نمائندوں کا ایک کمیشن جس کے ساتھ کچھ حبشی فوج بھی ہے دلول کے قریب حد بندی کے مسئلہ پر غور کر رہا ہے کہ اطالوی فوج کا کپتان دفعتہً بغیر کسی اطلاع کے حملہ کر دیتا ہے اور حبشی سپاہ کے ایک بڑے حصہ کو تہ تیغ کر دیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ خون کا گھونٹ شاہ حبش کے حلق سے نیچے اترتا، خود اٹلی کا سفیر الٹا یہ احتجاج کرتا ہے کہ "مسلح حبشیوں نے بغیر کسی اطلاع کے ہم پر حملہ کیا" اور اس کا نتیجہ اٹلی کی طرف سے اس مطالبہ کی صورت میں نکلتا ہے کہ "حبشی گورنر، دلول آکر معافی چاہے، اطالوی جھنڈے کے سامنے سرنگوں ہو، اور حبش کی حکومت دو لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کرے"

غریب حبش نے اس مسئلہ کو جمعیتہ اقوام کے سامنے پیش کر دیا، لیکن بدقسمتی کہئے یا ملی بھگت کہ آج تک کوئی فیصلہ اس کا وہاں سے بھی صادر نہیں ہوا۔

جن لوگوں نے حبش کے نقشہ کو دیکھا ہے انھیں معلوم ہے کہ وہ چاروں طرف اطالوی، برطانوی اور فرانسیسی مقبوضات سے محصور ہے۔ شمال میں اریٹریا اور مشرق و جنوب کے گوشہ میں ایک وسیع رقبہ اٹلی کے قبضہ میں ہے جسے اطالوی سومالی لینڈ کہتے ہیں، مشرق میں برطانوی اور فرانسیسی سومالی لینڈ کا حصہ ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اسوقت حبش کے مسئلہ سے گہرا تعلق رکھنے والی یورپ کی تین حکومتیں، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کی باہمی رقابت نے اسوقت تک حبش کی خود مختاری قائم رہنے دی، ورنہ ان میں سے کوئی ایک کب کا اس کو ہضم کر چکا ہوتا۔

اس وقت تک حبش اور ان سلطنتوں کے درمیان، یا حبش کے متعلق خود ان تینوں کے مابین جو جو معاہدے ہو چکے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آہستہ آہستہ اپنے قدم وہاں جمانا چاہتی ہے، چنانچہ اپنی سرحد سے بڑھ کر دلول کے کنوؤں پر اٹلی کا قابض ہو جانا، فرانس کا اپنے علاقہ سے ادیس ابابا تک ریل جاری کر دینا اور انگلستان کا نیل ازرق کے لئے اٹلی سے خفیہ سازباز کرنا، سب اس امر کا ثبوت ہیں کہ آج نہیں تو کل حبش کو ختم ہونا ہے خواہ وہ ان سلطنتوں کے باہمی مفاہمت سے ہو یا جنگ و جدال سے۔

بحالت موجودہ یہ مسئلہ جمعیتہ اقوام کے سامنے پیش ہے اور مہینوں گزر جانے کے بعد بھی اس وقت تک کوئی بات طے نہیں ہوئی۔ اٹلی کہتا ہے کہ حبش ایسے وحشی ملک کو جمعیتہ اقوام میں شامل ہی کیوں کیا گیا اور اگر وہ اس کا ممبر رہتا ہے تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ برطانیہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ جاپان اور جرمنی پہلے ہی علحدہ ہو چکے ہیں اگر اٹلی بھی علحدہ ہو گیا تو جمعیتہ کا وجود ہی ختم ہو جائے گا، اس لئے وہ ایک طرف یہ بھی ظاہر کرتا جاتا ہے کہ حبش کی خود مختاری قائم رہنا ضروری ہے اور دوسری طرف اٹلی کو بھی سمجھا رہا ہے کہ گھبرانے کی کونسی بات ہے، تمھارے مطالبات پر غور نہ ہو جبھی

شکایت کرنا۔ الغرض سیاسیات مغرب کی وہ مشہور چال جس میں برطانیہ کو کمال حاصل ہے چلی جارہی ہے اور اگر باہمہ گرکوئی مفاہمت فرانس، برطانیہ اور اٹلی کے درمیان اندرونی طور پر ہوچکی ہے تو اس کا نتیجہ یقیناً یہ ہوگا کہ اٹلی جمعیۃ الاقوام کی تمام سفارشوں کو رد کردیگا اور پوری قوت کے ساتھ میدان جنگ میں اُتر آئے گا۔ پھر اگر حبش کو شکست ہوئی تو شرائط صلح میں فرانس اور برطانیہ کا حصہ بھی (اُسی خفیہ معاہدہ کی رُو سے) تقریباً برابر ہی رہے گا اور اگر اٹلی تنگ گیا تو پھر حبش کے ساتھ برطانیہ اور فرانس کی یہ نمائشانہ ہمدردی، دوستانہ طور پر حبش سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکے گی۔ اس میں شک نہیں کہ یوں اٹلی وحبش کا مقابلہ ہی کیا، لیکن وہاں کے جغرافی حالات ایسے نہیں ہیں کہ اٹلی آسانی سے کامیاب ہوسکے۔ ملک حبش کا مسخر ہوجانا ممکن ہے لیکن حبشی قوم کا مغلوب ہونا بہت دشوار ہے، اس لئے اٹلی کی کامیابی بھی ایک لحاظ سے ناکامی ہی متصور ہوگی اور اس کا اپنی اقتصادی دشواریوں سے بہ آسانی گزر جانا تقریباً ناممکن ہوگا۔ الغرض اسوقت نہ صرف یوروپ بلکہ ساری دنیا سخت خطرہ میں مبتلا ہے اور اگر جنگ چھڑ گئی تو نہیں کہا جاسکتا کہ اس کے شعلے کہاں کہاں بھڑک اُٹھیں گے۔

لکھنؤ اُردو اکاڈمی

اس سے قبل ناظرین نگار کو اس تجویز کی خبر دی گئی تھی جو اُردو اکاڈمی کے قیام کے لئے اہل لکھنؤ کے زیر غور تھی اور یہ امر حد درجہ باعث مسرت ہے کہ آخر کار وہ تجویز بروئے کار آکر رہی اور ایک ادارہ "لکھنؤ اُردو اکاڈمی" کے نام سے قایم ہوچکا ہے، جو یقیناً اپنے مقاصد وآمال کے لحاظ سے نہایت برمحل واہم ہے۔ اس ادارہ کا مقصد بالکل علمی ذرایع سے متعلق ہے اور صرف لکھکر خاموش ہوجانے کی کوئی گنجایش اس کے پروگرام میں نہیں ہے۔ ارادے بلند ہیں اور تدبیریں مستحکم اس لئے توقع کی جاتی ہے کہ اگر اہل ذوق وارباب وطن نے ہمدردی کی تو یہ انجمن صحیح معنی میں خدمت زبان کے فرایض انجام دے سکیگی۔ تعیین مقاصد کے بعد اس کا دستور العمل بھی جلسہ عام میں کافی بحث وگفتگو کے بعد طے ہوچکا ہے اور اجراء کار کے لئے دفتر بھی قائم کردیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اکتوبر میں دوسرا جلسہ عام طلب کرکے انتخاب عہدہ داران کی کارروائی عمل میں لائی جاویگی اور اس کے بعد وفود مختلف مقامات کا دورہ کرنے کے لئے روانہ کئے جائیں گے۔

جو صاحب اس کے مقاصد اور دستور العمل ملاحظہ فرمانا چاہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈمی سے مطبوعہ کاپی طلب فرمالیں۔

ضرورت ہے

ایک سربرآوردہ شیعہ خاندان کی لڑکی کے لئے ایک بر کی جو شیعی مذہب کا ہو اور متوسط الحال زندگی بسر کرنے کے کافی ذرایع رکھتا ہو۔ لڑکی ہر لحاظ سے ایک شریف گھر کی رونق بننے کی اہلیت رکھتی ہے ——— ن۔ ذریعہ دفتر نگار۔ لکھنؤ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۸	فہرست مضامین نومبر ۱۹۳۶ء	شمار ۵

ملاحظات ———— ۲
نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث ———— عبدالمالک آروی ———— ۹
جھانسی کی رانی ———— ۲۶
مسئلۂ خلافت ———— ہرنام ———— ۳۶
انتقام ———— خواجہ احمد فاروقی بچھرایونی ———— ۴۶
باب الاستفسار ———— ۵۷
باب المراسلۃ والمناظرہ ———— ۶۲
چاند کا سفر ———— ۶۸
مطبوعات موصولہ ———— ۷۲
منظومات ———— رضوی۔ شمیم۔ صہبا۔ مخدوم محی الدین بی اے ———— ۷۷

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	نومبر ۱۹۵۳ء	شمار ۵

ملاحظات

ایک جدید عالمگیر مذہب کی ضرورت

اس وقت تمام مذہبی اقوام کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو آزاد ہیں اور علوم و فنون، تجارت و صناعت، سیاست و اقتصاد اور زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی یافتہ نظر آتی ہیں اور دوسری وہ جو غلام ہیں اور بجائے ترقی کے پستی کی طرف مایل۔ اول الذکر میں آپ مغربی اقوام کو لیجئے جو برائے نام عیسوی مذہب رکھتی ہیں اور موخر الذکر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو جو اسلام کے پیرو ہیں اور نہایت شدت کے ساتھ۔

آپ اہل مغرب سے سوال کیجئے کہ ان کی ترقی کا باعث کیا ہے تو وہ اس کے جواب میں یہ کبھی نہ کہیں گے کہ ان کی ترقی کا سبب ان کا مذہب ہے، لیکن ایک مسلمان ہمیشہ یہی کہیگا کہ اس کے زوال کا باعث صرف یہ ہے

کہ اس سے عقاید مذہبی ضعیف ہو گئے ہیں۔

کسقدر عجیب بات ہے کہ ایک ترقی یافتہ قوم کے سامنے ترقی کے باب میں مذہب کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور دوسری غیر ترقی یافتہ قوم مذہب ہی کو عروج و اقبال کا اصل سبب قرار دیتی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ضرور صحیح ہوگا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دونوں غلطی پر ہیں، دونوں گمراہ ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی سچا نہیں، کیونکہ جس طرح اہل یورپ کی موجودہ ترقی صحیح معنے میں ترقی کہلائے جانے کے قابل نہیں ہے، اسی طرح مسلمانوں کا یہ خیال کہ صرف مذہب کا عقیدہ ہی ترقی کا کفیل ہو سکتا ہے، یکسر وہم و خیال ہے، اگر مذہب سے مراد چند مخصوص حرکات و مراسم ہیں۔ قبل اس کے کہ اس باب میں کوئی تفصیلی گفتگو کیجائے، مذہب کی گزشتہ تاریخ اور تمدن کے موجودہ دورِ ترقی پر ایک نظر ڈال لینا ضروری ہے۔

ان مذاہب کا کوئی ذکر نہیں جن کا تعلق انسان کے عہدِ وحشت سے ہے بلکہ اُن مذاہب کو لیجئے جو الہامی و تاریخی مذاہب کہلاتے ہیں، جو صحف مقدسہ رکھنے کے مدعی ہیں اور غور کیجئے کہ ان کے صفحات تاریخ میں آپ کو کیا چیز نمایاں نظر آتی ہے۔ غیر مذاہب والوں کے ساتھ جنگ و جدل، باہمدگر عقاید کے ادنےٰ اختلافات پر خونریزی اور مذہب کے نام پر ملکی فتوحات اور سیاسی اقتدار کا قیام۔

حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی بانیِ مذہب زندہ رہتا ہے اس کی تعلیم کی اصل روح بھی زندہ رہتی ہے اور اگر اس کے مرنے کے بعد چند جانشین اُسی عزم و ثبات کے میسر آگئے تو کچھ زمانہ تک اصل تعلیمات کے اثرات باقی رہتے ہیں ورنہ مذہب نام رہجاتا ہے صرف اغراض ذاتی کی تکمیل کا، مختلف جماعتوں کے سیاسی نزاعات کا اور اُن تمام چالوں کا جو قیام ملوکیت و سلطنت کے لئے ایک قوم کو چلنا پڑتی ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ تقریباً تمام مذاہب کا نصب العین قیام امن و سکون رہا ہے، لیکن صرف ایک محدود جماعت کے افراد میں، ایک مخصوص ملک و قوم کے اندر۔ تمام دنیا اور اس کی آبادی کا سوال کسی کے سامنے نہیں تھا اور نہ ایسا ہونا ممکن تھا کیونکہ دنیا کے جغرافیہ، مختلف ممالک کے طبیعی حالات اور وہاں کی آبادی کے نفسیاتی رجحان سے وہ ناواقف تھے اور کسی ایسے قانون کی تدوین سے وہ مجبور تھے جو تمام نوع انسانی پر حاوی ہو سکے۔ اس لئے اگر عہد ماقبل میں کوئی مذہب تمام کرۂ ارض کی آبادی کو کسی ایک مرکز پر لانے اور ان سب میں باہمدگر رشتۂ اخوت و ہمدردی پیدا کرنے سے قاصر رہا تو یقیناً یہ نہ مذہب کا قصور تھا اور نہ بانیِ مذہب کی تعلیم کی کمزوری، بلکہ ایک ایسی مجبوری تھی جس کا کوئی علاج ممکن ہی نہ تھا۔

اب اسی کے ساتھ عہد حاضر کی ترقیوں کی طرف نگاہ ڈالئے کہ ان کی حقیقت کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ علوم و فنون کی ترقی، تجارت و صنعت کی توسیع، اقتصادی مسایل کی بین الاقوامی اہمیت، ذرایع حمل و نقل

کی وسعت، مکاتبت ومخابرت کی آسانیوں نے اسوقت دنیا کے تمام افراد کو ایک دوسرے سے ملا دیا ہے اور اس وقت کوئی ملک ایسا نہیں جو کسی نہ کسی امر میں دوسرے ملک کا دست نگر نہ ہو، گویا اقوام عالم کا مفاد اس وقت ایک ایسا اجتماعی مسئلہ ہے کہ اس سے قطع نظر کرکے ہم تمدن وعمرانیت کی کسی گتھی کو سلجھا ہی نہیں سکتے لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ باایں ہمہ ضرورت اتحاد واتفاق، بے اعتمادی یا خود غرضی کا یہ عالم ہے کہ ایک ہی مذہب، ایک ہی نسل کے لوگ اور ایک ہی مرز وبوم میں سانس لینے والے افراد مل جل کر نہیں رہ سکتے اور ہر وقت ایک ملک دوسرے ملک کو کھا جانے ایک قوم دوسری قوم کو تباہ کرنے کی فکر میں لگی ہوئی ہے۔

عام امن وسکون کے قیام کے لئے ہیگ کانفرنس، مجلس اقوام اور تخفیف اسلحہ کی انجمن بروئے کار آتی ہے، لیکن جسوقت تک کوئی صورت رزم وپیکار کی پیدا نہیں ہوئی ان کے جلسے بھی ہو رہے ہیں، بحث وگفتگو بھی جاری ہے، امن وسکون کی ضرورت پر تقریریں بھی ہو رہی ہیں، جبر وتعدی کو دنیا سے محو کرنے کے لئے ہر قسم کی آمادگی ظاہر کی جا رہی ہے، لیکن جب خرمن کے کسی گوشہ میں کوئی چنگاری پڑ جاتی ہے، تو پھر آگ بجھانے کے بجائے ہر ملک اسی فکر میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خرمن کی لوٹ میں سب سے بڑا حصہ اسی کو ملے۔ چنانچہ حال ہی میں جب جاپان نے چین پر دست درازی شروع کی تو مجلس اقوام کا وجود جس درجہ ناکارہ ثابت ہوا وہ بھی کسی سے مخفی نہیں اور اب اطالیہ کے ظالمانہ اقدام پر مجلس اقوام جو کچھ کر رہی ہے وہ بھی سب پر عیاں ہے۔

الغرض جس حد تک دنیا کے امن وسکون کا تعلق ہے نہ مذاہب عالم اس کے قایم کرنے میں کامیاب ہوئے اور نہ تمدن جدید کی ترقیاں اس یوسف گم گشتہ کا کوئی سراغ لگا سکیں اور اس کا سبب صرف یہ ہے کہ مذاہب کے سامنے عملاً تمام دنیا کے انسانوں کا قدرتاً کوئی سوال پیدا ہی نہ ہو سکتا تھا اور اب جو اس کا امکان ہے تو مذہب کو بالکل علیحدہ کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ وطنیت وقومیت نے لیلی ہے، جو دنیا کے امن وسکون کے لئے اتنی ہی خطرناک چیز ہے، جتنا ایک مذہب والے کا دوسرے مذہب والے کو گمراہ وکافر کہنا۔

اس میں شک نہیں کہ تمدن انسانی اور ہیئت اجتماعی کے اخلاق پر کسی چیز کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا مذہب کا اور یہی سبب ہے کہ جب کسی مذہب نے کسی قوم کو ابھارا تو اسے ہمدوش ثریا بنا کر چھوڑا اور جب گرایا تو زمین میں دفن کئے بغیر چین نہ لیا۔ اس لئے مذہب کو شامل کئے بغیر کوئی اصلاح ممکن نہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ موجودہ مذاہب عالم میں کونسا مذہب اس مقصد کے پورا کرنے میں ہمارا معاون ہو سکتا ہے۔ اسکا ایک مختصر جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ "کوئی نہیں" اور دوسرا یہ کہ "سب"۔ کیونکہ اگر تمام مذاہب کسی ایک خیال کو غرض مشترک قرار دیکر تمام نوع انسانی کے مفاد کو اپنے سامنے رکھیں اور لغو وفضول عقاید ترک کرکے آپس کے اختلافات کو مٹا دیں تو سب کے سب ہمارے لئے مفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ مذاہب کے موجودہ

مفہوم کے لحاظ سے اس کا کوئی امکان نہیں ہے، اسی لئے میں نے کہا کہ اس کا مختصر جواب صرف یہ ہو سکتا ہے کہ "کوئی نہیں"۔

یہی وہ حقیقت ہے جس نے دنیا کو کسی نئے عالمگیر مذہب کے خیال کی طرف مایل کر رکھا ہے اور اس کی تشکیل کی صورتیں پیدا ہو رہی ہیں۔

اس مذہب کا مدعا خدا سے انکار نہیں، بلکہ اس کا اقرار ہے، لیکن خدا اور اس اقرار کا مفہوم یقیناً کچھ اور ہے۔ خدا سے مراد کوئی ایسی مستبد ہستی نہیں جو خواہش دیدار کا جواب صدائے "لن ترانی" سے دے یا جس کا ادنیٰ سا جلوہ پہاڑوں کو خاک سیاہ کر کے رکھدے، بلکہ ایک رحم و اُلفت والی ہستی سراپا لطف و احسان ذات جو ساری دنیا کو ایک خاندان، ایک عایلہ اور ایک ہی گھرانا بنانے میں ہمارا ساتھ دے اور جس کے نزدیک عبادت و عبودیت کا مفہوم سوائے "سماجی اخوت" کے اور کچھ نہ ہو۔ الغرض اس مذہب کا خدا وہ ہوگا جسے زردشتیوں نے ایک "محیط الکل روشنی" سمجھا، ہندوؤں نے "حقیقت عظمیٰ" جانا، پیروان کنفوشس نے "ترتیب و استقلال" سے تعبیر کیا، بودھ مذہب نے "دائمی سکون" میں تلاش کیا، اسلام نے "قدرت مطلقہ" کہا، یہودیت نے "تقدس محض" جانا اور عیسویت نے "محبت" کے نام سے پکارا ــــ کہ ــــ ان میں سے ہر تعبیر انفرادی و اجتماعی طور پر اسی ایک "صداقت" کی طرف رہنمائی کرنے والی ہے جو اوہام و رسمیات سے قطع نظر تمام مذاہب کا تنہا مدعائے تگ و دو ہے۔

مذاہب کی باہمی جنگ کا سبب نہ خدا کی ذات ہے نہ اس کا تصور، بلکہ صرف یہ کہ جس نام سے ہم اسے پکارتے ہیں دوسرا کیوں نہیں پکارتا اور جس طرح ہم اس کی یاد کرتے ہیں دوسرا کیوں نہیں کرتا۔ درانحالیکہ وہ سب نام ایک ہی ہستی کے ہیں اور وہ یاد ایک ہی ذات کی ہے۔ ہمارا اختلاف صرف اس بنا پر ہے کہ ہم نے اپنا خدا علحدہ علحدہ بنا لیا ہے اور اس کی پرستشگاہیں مختلف شکل و صورت کی ہیں، ہم میں افتراق کا سبب حقیقتاً مذہب نہیں بلکہ ہماری لامذہبیت ہے ـــ لامذہبیت عقاید باطلہ کی، اوہام خرافیہ کی، تفریق مسجد و کنیسہ کی، امتیاز ناقوس و اذان کی اور اس لئے اسوقت ضرورت ہے ایک ایسے عالمگیر مذہب کی جو اختلاف مٹا کر سب کو ایک مرکز پر لے آوے، جو سچا جذبۂ خلوص و صداقت پیدا کر کے نوع انسانی کے تمام افراد کو ایک خاندان اور ایک قبیلہ سے منسلک کر دے اور جو خدا کو اس صورت میں پیش نہ کرے کہ وہ پیشانی پر قشقہ دیکھ کر چیں بجبیں ہو جاتا ہے اور محراب مسجد میں اپنی آغوش کھولے بیٹھا رہتا ہے ـــ الغرض ایک ایسا مذہب جس میں فردوس ہی فردوس ہو اور جہنم کا پتہ نہ ہو، جس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کسی کو کافر کہدینا ہو اور سب سے بڑا صواب خطاؤں کو درگزر کر دینا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ ایسے مذہب کو کیونکر مقبول بنایا جا سکتا ہے اور اس کو بروئے کار لانے کے لئے کونسا تعمیری پروگرام مفید ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں بہائی مذہب کے چند افراد نے ایک سوسائٹی نیو ہسٹری (عہد جدید) کے نام سے قایم کی ہے اور اس کا نصب العین صرف یہ ہے کہ وہ موجودہ اور آیندہ نسل کو ایک عالمگیر مسلک کے خیال سے آشنا کرکے مذاہب کی باہمی تفریق کو مٹائے اور دنیا میں امن و سکون کی حکومت قایم کرے۔

اس سوسائٹی نے ۳۵ء میں ایشیا کے تمام نوجوانوں کو دعوت دی تھی کہ وہ ایک عالمگیر مذہب کی ضرورت و تشکیل پر اپنے خیالات کا اظہار کریں، چنانچہ بہ کثرت مضامین موصول ہوئے اور ان کے مطالعہ کے بعد تین مقالے قابل انعام ٹھہرے۔

سب سے پہلا انعام ۳۰۰ ڈالر (تقریباً ایک ہزار روپیہ) کا، چین کی ایک نوجوان خاتون "مس لوئی ین ین چانگ" کو ملا، دوسرا انعام ۲۰۰ ڈالر کا ایک مدراسی نوجوان ٹی-ام-پی مہادیو کو دیا گیا، اور تیسرا انعام سو سو ڈالر کا دو آدمیوں کو ملا۔ ان میں سے ایک خاندیس کے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید ہیں اور دوسرے جاپان کے ایک عیسائی لڑکی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مقالے سب کے سب نہایت پاکیزہ ہیں، لیکن چینی خاتون نے چونکہ زیادہ ترعملی تدابیر پیش کی ہیں اس لئے ان کا ذکر اس جگہ غالباً زیادہ مناسب ہوگا۔

انھوں نے اس مسلک جدید کے مفہوم کو جن الفاظ میں متعین کیا ہے وہ یہ ہیں کہ:-

"ہم سب جو ایک ہی ماں جائے اور ایک ہی باپ کی اولاد ہیں، ایک الٰہیانہ ڈماکریسی قایم کرنے کا عہد کرتے ہیں جس میں تمام قومیں، تمام ملتیں یعنی نوع انسانی کے تمام افراد بلا قید جنس و عمر شامل ہیں اور انسانی آبادی کی اجتماعی ترقی و بہبود، دنیا کے عام امن و سکون کے لئے متفقہ طور پر کوشش کرنے کا عزم کرتے ہیں۔ ہم سب اور ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہوگا کہ وہ دنیا سے معصیت و عدوان جرم و بداخلاقی کے عنصر کو محو کرے اور سوائے محبت کے کوئی اور جذبہ دل میں پیدا نہ ہونے دے۔"

اس مسلک کو بروئے کار لانے کے لئے بعض ذرائع بھی خاتون مذکورہ نے بتائے ہیں۔ مثلاً

(۱) ایک مرکزی سوسائٹی قایم کی جائے جو مشتمل ہو ہر ملک و قوم ہر جماعت و طبقہ کے افراد پر اور جس کا ہر فرد بے غرضانہ طور پر پورے ایثار سے کام لیکر اس مسلک کی اشاعت کرے۔ اور اس مرکزی سوسائٹی کی شاخیں دنیا کے تمام ممالک میں قایم کی جائیں۔

(۲) سوسائٹی کے ماتحت ایسے مدارس کا قیام جہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام اسی مسلک کے

ماتحت کیا جائے اور ان کو اس جدید عالمگیر مذہب کا سچا پیرو بنایا جائے۔

(۳) ہر قبیلہ میں اس مذہب کا ماننے والا ایک خاندان طیار کرنا چاہئے، جس کے بچوں کو شروع سے مساوات کی تعلیم دیجائے اور انھیں دوسری قوموں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے اُٹھنے بیٹھنے کی طرف مایل کیا جائے۔

(۴) اس سوسائٹی کا پریس علٰحدہ ہونا چاہیے جو اخبارات و جرائد تصانیف و اشتہارات کے ذریعہ سے اپنے مسلک کی اشاعت کرے۔

(۵) مشنری اُصول پر مختلف جماعتیں دنیا کے تمام حصوں میں روانہ کی جائیں تاکہ وہ اپنے اقوال و کردار سے سوسائٹی کے مقاصد کو لوگوں پر واضح کریں۔

(۶) نہ کسی مذہب پر حملہ کیا جائے اور نہ اس کے عقاید و مراسم پر اور بلا قید مذہب و مسلک سب کو اس سوسائٹی میں شامل ہونے کی دعوت دیجائے۔

(۷) جہاں تک عقاید کا تعلق ہے صرف اس خیال کو پیش کیا جائے کہ تمام مذاہب کا سرچشمہ وہی ایک ذات خداوندی ہے خواہ اس کو کسی نام سے پکاریں۔

(۸) حکومت کے نظم و نسق اور اس کے قوانین میں ایسی تبدیلیاں کرائیں جو امتیازی حیثیت کو محو کرنے والی اور "انسانیت" کے اُصول کو قایم کر کے "حکومت متحدۂ کرۂ ارض" کی بنیاد ڈالنے والی ہوں۔

(۹) علوم جدیدہ کی طرف عام توجہ پیدا کرنا ضروری ہے، کیونکہ علم جتنا وسیع ہوگا، اتنا ہی "متحدہ انسانیت" کا دایرہ وسیع ہوگا۔

یہ ہیں وہ تدابیر جو مس لوئی بن ین چانگ نے ایک عالمگیر مسلکِ اتحاد کے قیام کے لئے بتائی ہیں اور انکے مفید و کار آمد ہونے سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، لیکن میرے نزدیک، سب سے پہلے اس سوسائٹی کو یہ کرنا چاہئے کہ وہ مختلف مذاہب کے علماء و سربر آوردہ لوگوں سے ملے اور ان سے یہ التجا کرے کہ وہ دوسرے مذاہب والوں کو کافر و گمراہ سمجھنا اور کہنا چھوڑ دیں، کیونکہ جب تک ایک مسلمان، ہندو کو کافر کہتا رہیگا، جب تک ایک ہندو مسلمان کو ملکش کے نام سے پکارتا رہیگا، جب تک ایک عیسائی سوائے اپنے جملہ دیگر اہل مذاہب کو گمراہ سمجھتا رہیگا اس وقت تک اتحاد ممکن نہیں۔

انسان کے تمام اخلاق تابع ہیں اس کے عقاید کے اور جب تک عقاید میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہو اخلاق کا بدلنا دشوار ہے۔ مسلمان کے دل میں جو نفرت ہندو کی طرف سے پائی جاتی ہے وہ صرف اس لئے ہے کہ اسکے نزدیک وہ کافر و بُت پرست ہے۔ ایک ہندو مسلمان کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانا بھی نہیں کھاتا کیونکہ اس کے عقیدہ میں وہ نجس و ناپاک ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس جذبۂ نفرت و استکراہ کے ہوتے ہوئے وہ باہم گر اخوت و ہمدردی کا

سلوک روا رکھیں گے اور روحوں کا یہ اختلاف تمدنی و معاشری تعلق کو کیونکر خوشگوار بنا سکتا ہے۔

ہندوستان کی تھیاسوفکل سوسائٹی بھی وہی مقاصد رکھتی ہے جو امریکہ کی اس سوسائٹی کا ہے، لیکن افسوس ہے کہ اس نے اس وقت تک جو کچھ کیا ہے وہ زیادہ تر فلسفۂ مذہب سے متعلق ہے اور عام طور پر یہی محسوس کیا جاتا ہے کہ اس کا میلان ہندو مذہب کی طرف ہے۔ امریکہ کی اس سوسائٹی کو بروئے کار لانے والے بھی بہائی مذہب کے پیرو ہیں اور ہر شخص کو یہ سمجھنے کا موقعہ ملتا ہے کہ شاید یہ سب کچھ بہائی مذہب کی ترویج کے لئے کیا جا رہا ہے۔

ہر چند جس حد تک صرف مقاصد کا تعلق ہے ہمیں یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں کہ کس مسلک یا مذہب کی طرف سے ان کا اعلان ہو رہا ہے، بلکہ صرف یہ غور کرنا چاہئے کہ وہ کس حد تک مفید و کار آمد ہیں لیکن مذہب کا نام آجانے کی وجہ سے چونکہ دوسرے مذاہب والوں کی مذہبی عصبیت تحریک میں آجاتی ہے اس لئے میرے نزدیک یہ کام صرف ان لوگوں کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے جو کسی مذہب کے پیرو نہیں ہیں اور اصولاً تمام مذاہب کی عزت کرتے ہیں۔

اس ماہ کی اشاعت میں ہمارے عزیز دوست مولوی عبدالمالک آروی کا مقالہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہر چند صاحب موصوف پابندی کے ساتھ بزم نگار میں شریک نہیں ہوتے، لیکن جب ہوتے ہیں تو اس انداز سے کہ ہر شخص پکار اُٹھتا ہے:۔

لو وہ برہم زن ہنگامۂ محفل آئے

حقیقت یہ ہے کہ عبدالماجد صاحب اپنے ذوقِ تحقیق و شغفِ علمی کے لحاظ سے جس امتیاز کے مالک ہیں وہ ہمارے نوجوانوں کو بہت کم حاصل ہوتا ہے۔ اور اس لئے صوبۂ بہار اُن کے وجود پر جتنا بھی فخر کرے کم ہے۔

ڈرامہ "جھانسی کی رانی" بھی اس ماہ میں ختم ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ ناظرین نگار نے کافی دلچسپی سے اسکا مطالعہ کیا ہوگا۔

چند ماہ قبل میں نے عقاید مہدویہ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اس کے جواب میں ایک صاحب مندوزئی مہدوی کا مضمون موصول ہوا تھا میں نے اسے اس لئے شایع نہیں کیا تھا کہ اول تو وہ غیر ضروری طور پر طویل ہے اور دوسرے یہ کہ میرے اصل اعتراض کا جواب بھی نہیں دیا گیا ہے۔ لیکن اب مہدوی جماعت کے متعدد افراد کے تقاضائے پیہم پر آیندہ دسمبر کے نگار میں اس کو شائع کر کے اپنی رائے پیش کروں گا۔

اگر کسی مضمون یا نظم کے ساتھ

جواب یا واپسی کے لئے ٹکٹ موصول نہ ہوں گے تو ناقابل اشاعت مضامین فوراً تلف کر دئے جائیں گے۔ اڈیٹر

نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

(مسلسل)

خاقانی کے کلام میں تصوف کا بھی گہرا اثر پایا جاتا ہے ہر چند صوفی شعرا عطار و رومی، عراقی و نظامی، کمال خجندی و اوحدالدین کرمانی ساتویں صدی اور اس کے بعد گزرے ہیں لیکن خاقانی سے پہلے صوفی شاعری کے دو بڑے علمبردار حضرت ابی سعید ابن ابی الخیر اور حکیم سنائی گزر چکے تھے، پھر بھی خاقانی کی شاعری پر ان کا کوئی اثر نہیں پایا جاتا، شعرائے متاخرین عرفی و نظیری، ظہوری و بیدل، درد و غالب سبھی نے رومی و عراقی سے صوفیانہ رنگ تغزل کا تتبع کیا لیکن خاقانی کی غزلیات و قصاید کسی میں کوئی تقلیدی عنصر نہیں ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے رنگ میں جو کچھ اس کا کلام ہے وہ خود اس کے محسوسات کا نتیجہ ہے اور اس میں وہی بنیادی و اصولی سادگی ہے جو ابتداً کسی صنف کلام میں پائی جاتی ہے وہی ترک طمع وہی عزلت و قناعت وہی وحدت و تجرید وہی موعظت و تزکیہ اسکے کلام میں بھی ہے جس کا نمونہ "حدیقہ" میں خاقانی سے پہلے موجود تھا اور جو آیندہ عطار و رومی کے یہاں کمال کو پہونچا ایک جگہ ترک طمع اور عزلت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

در جرم ماہ و قرصۂ خورشید منگرم
ہر گہ کہ دیدہ ہا شودم رہنمائے نان

یعنی شاعر "نان" کے بدلے چاند اور سورج کی نان ناصورت پر قانع ہو جاتا ہے دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

نتواں در خط دہر خط وفا یافتن
نتواں بر سطح آب نقش قلم ساختن

یا پھر ان کا یہ فرمانا

از داغ دل بسوز و زمرہم اثر مجوئے
باخویشتن بساز و زہمدم نشاں مخواہ

غالباً یہ سب اس زمانہ کا کلام ہے جب وہ دربار سے الگ ہو کر عزلت گزیں ہو چکے تھے، خاقانی کے یہاں پرشوکت قصاید کی طرح المناک مراثی بھی ہیں خاقانی نے اپنے مراثی میں فاجعہ نگاری کے ساتھ شاعرانہ تمثیلات اور خیالی بلند پروازیوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا اس کے مراثی میں بھی وہی رفعت خیال اور شوکت معنی موجود ہے جو اس کے قصاید میں ہے، اور اس لئے ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ان مراثی کو پڑھنے کے بعد ہم اپنے جذبات المیہ میں کوئی اُبھار نہ پاتے کیونکہ اس کے قصاید عموماً اشارات و تلمیحات کے باعث دماغ کو مشوش کر دیتے ہیں لیکن اس کے مراثی ایسے نہیں مثال کے لئے اس کا مشہور مرثیہ "ایوان مداین" پڑھ جائیے آپ نفس کے اندر ایک خاص گداختگی اور جذبات میں سرشاری پائیں گے، خاقانی کے "ایوان مداین" نے ایسا قبول عام حاصل کیا کہ آج یورپ میں اس کو علٰحدہ اصل کے ساتھ ترجمہ کر کے شایع کیا جاتا ہے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خاقانی کے "ایوان مداین" سے قبل فارسی میں کوئی نظم موجود تھی یا نہیں؟ اس سے قبل سنائی، معزی، عنصری بڑے بڑے شعرا گزر چکے تھے لیکن کسی کے یہاں "ایوان مداین" کے رنگ کی کوئی چیز نہیں ملتی، الغرض فارسی ادب میں خاقانی کی یہ نظم بالکل اچھوتی چیز ہے اور آج بھی فارسی زبان میں اس نوع کی آہنگ کا پتہ نہیں معلقات سبعہ کے ابتدائی اشعار ہمیں یقیناً "ایوان مداین" کی یاد دلاتے ہیں ہم امرؤ القیس کا یہ شعر پڑھتے ہیں۔

قفا نبک من ذکری حبیب و منزل — بسقط اللوی بین الدخول فحومل

ترجمہ:- اے میرے دونو دوستو! ٹھہیرو تاکہ ہم محبوبہ اور اس کی منزل کو یاد کر کے روئیں، وہ منزل جو مواضع دخول اور حومل کے درمیان ٹیڑھے ٹیلہ کے کنارہ ہے۔

اور بے اختیارہ ہمیں "ایوان مداین" کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

یکرہ ز سر دجلہ منزل بہ مداین کن — وز دیدہ دوم دجلہ برخاک مداین راں

یا پھر طرفہ بن عبد کا یہ شعر پڑھئے۔

لخولة اطلال ببرقة ثہمد — تلوح کباقی الوشم فی ظاہر الید

ترجمہ:- سنگلاخ زمین میں "خولہ" کے (ویران) گھروں کی نشانیاں موجود ہیں یہ نشانیاں مہ جبینوں کے نازک ہاتھوں کے نیلگوں نقش و نگار کی طرح نظر آتی ہیں۔

اگر آگے چلکر امرؤ القیس "عنیزہ" کے ساتھ اپنی ہوس رانیوں کا عریاں مظاہرہ نہ کرتا اور طرفہ اپنی محبوبہ "خولہ" کے حسن اور اس کے اُجڑے دیار کا تذکرہ کرتے کرتے اپنی ناقہ کی صفات نہ بیان کرنے لگتا تو ہم کہتے کہ "ایوان مداین" امرؤ القیس اور طرفہ کے نقوش سے مستفاد ہے، لیکن ایسا نہیں کہہ سکتے؟ اب آئیے غور کریں خاقانی نے یہ اسلوب نگارش کہاں سے سیکھا مصر جدید کا ایک مشہور فلسفی اور نقاد ادب ڈاکٹر زکی مبارک لکھتا ہے کہ نزول قرآن سے

پہلے شعراء کے یہاں عواطف اجتماعیہ (عام جماعتی رجحان) کا فقدان تھا ان کی شاعری میں اجتماعیت کے بدلے "فردیت" کا رنگ غالب تھا قرآن مجید نے عاد و ثمود و اقوام یونس و لوط وغیرہ اور ان کی ویران بستیوں کا تذکرہ کرکے ایک جدید موضوع تخیل پیش کیا اور اسی کے بعد سے شعراء کے یہاں "بکاء الممالک" مبحث شعر بن گیا چنانچہ علامہ موصوف لکھتے ہیں :-

کانت عواطف الشعراء عواطف فردیۃ لا اجتماعیۃ فکان الشاعر یبکی وجدہ ونعیمہ وہو یندب الرسوم و یتوجع للطلول، ولم یہتم العرب ببکاء الممالک والتفجع للشعوب اذ کانوا فی بدایۃ الحیاۃ وکان الرجل منہم قلما یعنی بغیر نفسہ واہلہ وذویہ فکانوا فی شغل بانفسہم عن بلایا الانسانیۃ التی تصرخ من حولہم وہم عنہا غافلون۔

ثم جاء القرآن فسلک فی الحدیث عن الممالک البائدۃ مسلک التخویف والترہیب فلم یعطف علیہا بکلمۃ ولم یستر لہا عورۃ لان القرآن لم یکن کتاب شعر یرمی الی روعۃ الفن وجمال الخیال وانما کان کتاب حکمۃ وعظمۃ فکان من حقہ ان یقول بجزم ورزانۃ اولم یسیروا فی الارض فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلہم کانوا ہم اشد منہم قوۃ وآثاراً فی الارض فاخذہم اللہ بذنوبہم وما کان لہم من اللہ من واق ذلک بانہ کانت تاتیہم رسلہم بالبینات فکفروا فاخذہم اللہ انہ قوی شدید العقاب" ولو لم یکن الزجر والردع من اغراض القرآن الاساسیۃ لکان لہ شأن غیر ہذا الشأن[1]

شعراء کا رجحان ذاتی تھا اجتماعی نہ تھا شاعر اپنے عشق اور ایام راحت کا رونا روتا تھا وہ آثار (قیام محبوبہ) پر آنسو بہاتا اور (محبوبہ کے قرب و جوار) کے ٹیلوں کیلئے بیتابیاں کرتا لیکن عربوں کے یہاں جب وہ اپنی زندگی کے آغاز میں تھے ملکی بکا کا اہتمام نہ تھا اور نہ وہ قوموں کیلئے بیقراریاں کرتے اور ان میں شاذونادر ہی کوئی شخص اپنی ذات، اپنے لوگوں اور اپنی جماعت کے علاوہ کسی دوسرے کو درخور اعتنا سمجھتا، اور وہ اپنے ذاتی ہی شغل میں معروف رہتے درانحالیکہ ان کے چاروں طرف انسانی مصیبتیں اور بلائیں چیخ رہی ہوتیں لیکن وہ ان سے غافل رہتے، پھر قرآن مجید نازل ہوا اور اس نے ڈرانے دھمکانے کے خیال سے قدیم ملکوں کا تذکرہ کیا اور نہ اس سے ادھر ادھر ہوا اور نہ اس کا نقص پوشیدہ کیا چونکہ قرآن شعر کی کتاب نہ تھا جو فن کی دلآویزی اور خیال کی خوبصورتی کو مدنظر رکھتا بلکہ وہ حکمت اور نصیحت کی کتاب تھا پس اس کا حق تھا کہ جو کچھ وہ کہے وثوق اور سنجیدگی کے ساتھ کہے "کیا وہ زمین میں نہیں پھرتے تاکہ دیکھتے کہ ان لوگوں کا کیسا انجام ہوا جو ان سے پہلے قوت اور آثار کے اعتبار سے زمین میں زیادہ بڑھے ہوئے تھے، پس اللہ نے ان کے گناہوں کے باعث ان کو پکڑ لیا اور اللہ سے چھوڑانے والا ان کا کوئی نہ تھا، یہ اس وجہ سے کہ پیغمبر کھلی ہوئی نشانیوں کے ساتھ ان کے پاس آئے پس انھوں نے کفر کیا پھر اللہ نے پکڑا

[1] "الموازنۃ بین الشعراء" مطبوعہ مصر ص ۱۲۷

میں خاقانی کا ساز در بیان اور والہانہ انداز دکھایا ہے، وہ کہتا ہے۔

مشت الحادثات فی غرف الحمرا　　مشی النعی بعد عرس
ہتکت عزۃ الحجاب وفضت　　سدۃ الباب من سیر وانس
عرصات تخلت الخیل عنہا　　واستراحت من احتراس وعس

وخطوط تکفلت للمعانی ،　　ولالفاظہا بازین لبس
وتری مجلس السباع خلاء　　مقفر القاع من ظباء وخنس
لاالثریا ولاجواری الثریا　　یتنزلن فیہ اقمار انس [1]

ان اشعار کا مطالعہ کرنے کے بعد ہمیں بے اختیار خاقانی کے وہ ابیات یاد آجاتے ہیں جو سطور بالا میں لکھے گئے، خاقانی کی طرح شوقی بھی قصر کی ویرانگی سے پند لے رہے ہیں وہی دربانوں کی یاد اور قصہ خوانوں اور ندیموں کا رونا ہے، وہی سنسان دربار کی وحشت سامانی اور خدام و درباریوں سے اس کا خالی ہونا شوقی پر بھی اثر کر رہا ہے اگلی سطر میں خاقانی کہہ چکے ہیں۔

این ہست ہماں ایواں کز نقش رخ مردم　　خاک در او بودے دیوار نگارستاں

اسی کے ساتھ شوقی کا یہ شعر پڑھئے۔

عرصات تخلت الخیل عنہا　　واستراحت من احتراس وعس

اسی طرح سطور بالا میں خاقانی کا وہ شعر نقل کیا گیا ہے جس میں اس نے "دندانۂ قصر" سے پند حاصل کرنیکا ذکر کیا ہے شوقی نے بھی "خطوط تکفلت للمعانی" کہا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے مصری شاعر کے سامنے نہ صرف بحتری کا قصیدہ تھا بلکہ اس نے ایک حد تک خاقانی سے بھی استفادہ کیا ہے اور اس صورت سے خاقانی نے عربی زبان کے اس احسان کی تلافی کردی جو فارسی پر تھا،

---

[1] خلاصہ ترجمہ:- قصر حمراء کے بالاخانوں کو حادثات نے اس طرح روند ڈالا ہے جس طرح شادی بیاہ کے گھر میں موت ہو گئی ہو نہ حاجبوں کی گرم نگاہیاں باقی ہیں نہ شام کے وقت دوستوں کی منڈلی ہے نہ گپ شپ ہے میدان گھوڑوں سے خالی پڑا ہے نہ کوئی مرزبان ہے نہ نگراں۔- خطوط بہترین خوشنما لباس میں معنی کا اظہار کر رہے ہیں، بھیڑیوں (درندہ) کی مجلس ہرنوں اور گورخروں کا سنسان وادی بن گئی، نہ تو یہاں عقد ثریا جیسی حسینان پریرو اور ان کی سہیلیاں باقی ہیں نہ پری پیکران نزطلعت محو خرام ہیں۔ ع۔م

اثیرو خاقانی کے معارضات

اگلے سطور میں لکھا جاچکا ہے کہ خاقانی شروان سے بیزار تھے، اور اہل شروان بھی ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے، چنانچہ شعراء کی ایک جماعت "روشنان" موجود تھی، یہ لوگ اس سے برہم تھے، مجازی اس کا معاند تھا، سلطان مغیث الدین ارسلان بن طغرل کے مداح اثیر کو بھی اس سے مخالفت تھی، اور حریفانہ چشمکیں کیا کرتا تھا دولت شاہ نے تفصیل کے ساتھ ان معارضات پر روشنی ڈالی ہے اور خاقانی اور اثیر کے درمیان جن تعلی آمیز اشعار کا تبادلہ ہوا ہے وہ بھی نقل کیا ہے ملاحظہ ہو

بہ گردگار کہ دور زماں پدید آورد	کہ دور دور من است وزماں زماں من است
منم کہ یوسف عہدم بہ قحط سال سخن	کہ میزبان گرسنہ دلاں زبان من است
بہ شرق وغرب رود نامۂ ضمیرم ازانکہ	کبوتر فلکی پیک رایگاں من است
ز تاثر خاقانی ہراسیے نہ ترسم ازانکہ	ہنوز در عدم است آنکہ ہمقران من است
منم بہ وحی معانی پیمبر شعرا	کہ معجز سخن امروز در بیان من است

خاقانی نے یہی قطعہ اثیر کے پاس بھیجا، اثیر نے بھی جواب میں یہ لکھ بھیجا،

گرہ کشائے سخن خامہ نوان من است	خزینہ دار رواں خاطر روان من است
کمان من نہ کشد دست ویار وئے شرواں	کہ تیر چرخ یک اندازی از کمان من است[1]

وفات

سطور بالا میں ان کی ولادت و وفات کے متعلق مفصل بحث ہو چکی ہے اتابک مظفر الدین قزل ارسلان کی مدح کے سلسلہ میں خود لکھتے ہیں۔

کردند ہمہ حکم کہ در پانصد و ہشتاد	اعجاز بدست آوری و روم کشائی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۵۸۰ھ کے قریب وہ زندہ تھے، اور تذکرہ نگاروں کی اکثریت نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ ۵۸۲ھ میں انھوں نے وفات کی، بہر حال شروان میں پیدا ہوئے اصفہان میں نشو و نما ہوئی، تبریز میں وفات پائی اور یہیں بمقام "سرخاب" دفن ہوئے، دولت شاہ لکھتے ہیں:۔

"ومرقد او الیوم مشہور و مقرر است و افضل الزمان ظہیر الدین طاہر بن محمد فاریابی و ملک الشعراء شاہپور بن محمد اشہری، نیشاپوری ہر دو در پہلوئے خاقانی است"

---

[1] تذکرہ دولت شاہ کے قلمی نسخہ میں جو پٹنہ لائبریری میں ہے کتابت کی بعض سخت غلطیاں پائی جاتی ہیں اثیر نے بھی خاقانی کے ہر شعر کا جواب دیا ہے لیکن نسخہ ہذا میں اکثر ابیات غلط درج ہیں اس لئے یہاں اس کا موقعہ نہیں کہ کتابت کی غلطیوں کی تصحیح کر کے پورا قطعہ لکھا جائے۔

ظہیر فاریابی کے متعلق تو اور تذکرہ نگاروں نے بھی لکھا ہے لیکن اشہری نیشاپوری کے بدلے صاحب "صحف ابراہیم" نے سید ذوالفقار ذہبی کا نام درج کیا ہے، بہر حال خاقانی کی قبر" ابعاد ثلاثہ" کی حیثیت سے اور بھی یادگار زمانہ ہے۔

خاقانی کے قصاید کا مطالعہ کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ نجوم میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور اس نے باضابطہ اس فن کی تکمیل کی تھی چنانچہ نظرات سیارگان، قران سبعہ سیارہ، خصایص و اثرات کواکب، عروج وہبوط انجم، ماہیات واشکال بروج پر اس نے مختلف پیرایہ میں روشنی ڈالی ہے۔

قران سبعہ سیارہ

۱۵ر جنوری ۱۹۳۴ء نے عام وخاص تمام نگاہوں کو علی قدر مراتب حوادث فلکی اور اثرات کواکب کی طرف متوجہ کر دیا ہے، اخبار وجراید میں اس موضوع پر بیشمار مقالات شایع ہو چکے ہیں اور فنی اور خیالی حیثیت سے بہت کچھ اس پر طبع آزمائیاں کی گئی ہیں بعض حضرات کا خیال ہے کہ کئی ہزار سال کے بعد قران سبعہ سیارہ ہوتا ہے چنانچہ حادثہ مہابھارت میں بھی اسی طرح سات ستاروں کا اجتماع ہوا تھا، اور ملک کو بے شمار حادثات ومصائب سے گزرنا پڑا تھا لیکن تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اس قران سبعہ سیارہ کے لئے ہزاروں برس کی طول مدت درکار نہیں بلکہ ایک صدی کے درمیان بھی اسی طرح قران ہوا ہے۔

خاقانی نے چھٹی صدی کے وسط یا آخر میں اپنے قصیدہ میں قران سبعہ سیارہ کے متعلق کافی روشنی ڈالی ہے اور اس کے بعد انوری ساتویں صدی میں بھی اسی طرح قران کے باعث خطرات ومصائب سے خوفزدہ تھا انوری کے متعلق روضتہ الصفا کی اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ہر چند کوئی مصیبت نازل نہ ہوئی، اور انوری کا خطرہ محض خیالی تھا لیکن یہ بالکل صحیح ہے کہ اس عہد کے منجموں نے فنی حیثیت سے حکم کیا تھا کہ قران ہوگا اسی طرح حمداللہ مستوفی نے تبریز کے سلسلہ میں جو واقعات درج کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ایک یا دو صدی کے درمیان برابر کوئی مصیبت آسمانی نازل ہوئی ہے، خاقانی کہتا ہے

هفت رخشان مه آبان بهم آیند چه باک　　　که سعود از مه آبان به خراسان یابم
بست ویک راه قران است به میزان همه را　　　من همان لهو ز میزان به خراسان یابم

یعنی منجموں نے حکم لگایا ہے کہ برج میزان میں سبعہ سیارہ کا قران ہوگا اور اسوجہ سے روم وخجند اور ایران تمام طوفان اور گرہن سے آفتیں برپا ہوں گی، خاقانی اس وقت خراسان کا تہیہ سامان کئے ہوئے تھے وہ اس منجمانہ حکم کا رد کرتے ہیں اور خراسان کو ان آفات و خطرات سے مامون بتاتے ہیں۔

نکنم باور کا حکام خراسان ایمنست　　　گرچه صد هرس دلقمان به خراسان یابم

حکم بو معشر مصر و ع نہ گیرم گرچہ — نامش ادریس رصد داں بہ خراساں یابم[۱]

مطلب یہ ہے کہ ہرمس (یونانی حکیم) اور لقمان جیسے سیکڑوں منجم متفقہ فیصلہ کر دیں اور ابو معشر کو حضرت ادریس کی سی استعداد فلکیاتی حاصل ہو جائے جب بھی خراسان کے باب میں مجھے اس منجمانہ حکم کا یقین نہ ہو گا۔

محمد بن خوند شاہ طغرل بن ملک ارسلان کے ضمن میں لکھتے ہیں۔

در زمان دولت او سبعہ سیارہ در اوایل میزان کہ از بروج ہوائی است دریک دقیقہ قران کردند منجمانہ گفتند کہ دریں سال بادے پیدا شود کہ عمارتہا خراب کند بلکہ جبال سختۃ البنیان از زمین برگیرد، وانوری دریں باب از سائر ارباب نجوم مبالغہ بیشتر داشت مردم از بیم جان در زیر زمیں ساختند و سر دابہا پر داختند و بحسب اتفاق دراں ایام کہ اوقات حکم ایشاں بود چنداں باد نہ وزید کہ خلق رفع محصول نمایند۔[۲]

چنانچہ اسی پر اس عہد کے ایک شاعر نے طنزاً کہا

گفت انوری کہ از سبب بادہائے سخت — ویراں شود عمارت و کہسار بر سری
در روز حکم او نہ وزید است ہیچ باد — یا مرسل الریاح تو دانی و انوری

لیکن محمد بن خوند شاہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہر چند تمام لوگوں پر ارباب نجوم کا جھوٹ ظاہر ہو گیا لیکن اسی سال تاتاریوں کے فتنہ اور چنگیز خاں کی بربریت نے دولت خوارزم شاہی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی، اور بالخصوص خراسان میں نہ تو کسی مکان کا مکین رہا اور نہ کسی گھر سے دھواں نکلا تعجب ہے کہ خاقانی اور انوری کے درمیان تقریباً دو سو سال کا فرق ہے، اور قران سبعہ سیارہ دونوں کے زمانہ میں میزان ہی میں ہوا اگر صاحب روضۃ الصفا انوری کے متعلق طنزیہ شعر نقل نہ کرتے تو کہا جاتا کہ یہ واقعہ خاقانی کے عہد کا تھا جس کو انوری کی طرف منسوب کرنے میں مورخ سے تسامح ہو گیا لیکن مرقومہ بالا شعر کی موجودگی میں تو اس کی بھی گنجائش نہیں رہی۔

برج میزان چونکہ "بادی" ہے اس لئے انوری نے "صرصر آتیہ" کی پیشین گوئی کی تھی جنوری ۱۹۳۴ء میں قران سبعہ سیارہ برج جدی میں ہوا تھا اور جدی خاکی ہے اس لئے زمین پر یہ آفتیں برپا ہوئیں زلزلہ آیا قصر و کوشک سرنگوں ہوئے اور "شمالی بہار" جو "گلشن ہند" تھا مساکن عاد و ثمود بنکر رہ گیا۔

---

[۱] یہ وہی "ہرمس" (Hermes) ہے جس کی کتاب "مفتاح النجوم" کا ایک عربی ترجمہ مخطوطہ ۱۲۵ھ "میلن" (Milan) کے کتب خانہ میں موجود ہے ابو معشر کی زیچ بقول امیر علی فلکیاتی معلومات کا ماخذ رہی ہے، ابو معشر کو یورپ والے (Albumazar) کہتے ہیں۔ [۲] روضۃ الصفا۔

خاقانی نے بعض دوسرے قصاید میں بھی اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قصاید کسی قدر تقدم و تاخر کے ساتھ ایک ہی عہد کی پیداوار ہیں فرماتے ہیں۔

کاندر سنہ ثون اختر سعد — در طالع کامراں بہ بینم
شش سال دگر قران انجم — در آذر و مہرگاں بہ بینم
ہر ہفت رسد بہ برج میزان — با لست و یکش قران بہ بینم
کیوان بہ کنارہ بینم ارچہ — ہر ہفت بہ یک مکاں بہ بینم
گر خطہ شمال خسف گیرد — زیں مکہ روم اماں بہ بینم

ان ابیات کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۵۵۰ھ میں مشتری (اختر سعد) برج اسد (طالع کامراں) میں ہوگا اور چھ سال تک برج قوس اور برج میزان میں قران رہیگا ساتوں ستارے برج میزان میں ۲۱ درجہ پر جمع ہوں گے گو زحل (کیوان) کنارہ پر ہے لیکن ایک برج میں اجتماع ہونا ہی کیا کم ہے منجموں نے حکم لگایا ہے کہ خراسان میں گر... لگیگا۔ لیکن مکہ میں اماں رہیگا، اس کے بعد خود فیصلہ کرتا ہے۔

حقا کہ دروغ داستانیست — بطلانی داستاں بہ بینم

دوازدہ بروج

جلال الدین اختسان شاہ کی مدح میں کہتے ہیں

در برہ مریخ گرزِ گاو افریدوں بدست — وز مجرۂ شب درفش کاویان انگیختہ
ثور زارے برفلک آب و کیواں بہر آں — دلو را از ثور زارش ریسماں انگیختہ
ساز آں دوعنائے صاحب بربط اندام چرخ — سوز ازاں قراء صاحب طیلساں انگیختہ
چشم بز عالہ براں خوشہ کہ خرمن کردہ شب — داس کز دنداں ز راہ کہکشاں انگیختہ
نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس — یا دو پیر برج الصنم از یک مکاں انگیختہ
نور ہر سرطاں ماندہ تا معجون سرطانی کند — زانکہ معلول صفرا از رخاں انگیختہ
مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست — آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ
بخت بر زہرائے انجم ور ترازوئے فلک — نام نقش اختسان کامران انگیختہ

خاقانی نے ان ابیات میں بروج اور سیاروں کے متعلق استعارات و تشبیہات کا کافی ذخیرہ جمع کر... ہے بروج اور سیاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے جس اسلوب جمیل کے ساتھ اس نے گریز کیا ہے وہ اسی کا حصہ... آئیے اب ہر شعر کے معنی پر غور کریں۔

در برہ مریخ گرز گاو افریدوں بدست — وز مجرہ شب درفش کاویان انگیختہ

خاقانی نے جس خوبی کے ساتھ خرافیات و مذہبیات، فلسفہ و تاریخ کے میدانوں سے خوشہ چینیاں کی ہیں اس کی نظیر کسی اور فارسی شاعر کے یہاں نہیں پائی جاتی، وہ اس روانی اور بے تکلفی کے ساتھ تلمیحات پیش کرتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے بہ یکوقت مختلف علوم کے مضامین کی طرف کیونکر اس کا ذہن منتقل ہوجاتا تھا اس سے اسکی سرعت ذہن اور اتقان حافظہ کا پتہ چلتا ہے وہ اس آزادی کے ساتھ دقیق سے دقیق علمی اشارے کرتا ہے کہ قاری کا ذہن بعض اوقات مشوش ہوجاتا ہے وہ جو کچھ لکھتا ہے اس وثوق کی بنا پر کہ سارا عالم گوش شنوا، اور دیدہ بنیا رکھتا ہے درانحالیکہ اس کی دقت بیانیاں بہتیرے مستعد ارباب ذوق کو بھی بہت زیادہ پریشان نظر اور آشفتہ خیال بنا دیتی ہیں سرسری طور پر ابیات بالا کا جائزہ لیجئے، فوراً ملٹن کی "فردوس مفقود" آپ کی نظروں کے سامنے آجائے گی، گرزگاؤں افریدون، درفش کاویان، قرا صاحب طیلسان، یبروج الصنم، معجون سرطانی یہ تمام فقرے ملٹن کے بدیعہ نگارش کی طرف ذہن منتقل کر دیتے ہیں۔

خاقانی نے یہاں "برہ" سے "برج حمل" مراد لیا ہے "گرزگاؤ" فریدوں کا مشہور حربہ تھا جس کی شکل گائے کے منہ کی طرح تھی، شیواجی کا "گاؤ مکھ" شاید اسی ایرانی حربہ کی نقل ہوگا "مجرہ" کہکشاں کو کہتے ہیں "درفش کاویان" ایرانیوں کا مشہور علم ہے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ سیارہ مریخ برج حمل میں گرزگاو لیکر آیا اور رات نے کہکشاں نہیں نکالی، بلکہ "درفش کاویان" کا پرچم پھیلا رکھا ہے مریخ کو کتب نجوم میں جوان غصہ ور خونی مزاج بتایا جاتا ہے۔

پنبہ زارے بر فلک بے آب و کیواں بہر آں   دلو را از پنبہ زارش ریسمان انگیختہ

یعنی آسمان بہ منزلہ پنبہ زار ہے، ایک ایسا پنبہ زار جہاں پانی اور کنواں ناپید ہے اسی لئے برج دلو اس پنبہ زار میں آبیاری کی خدمتیں انجام دے رہا ہے، برج دلو کی شکل یہ ہے کہ ایک عورت ہے جو ڈول رسی لیکر آب کشی کر رہی ہے۔

سازآں رعنائے صاحب بربط اندر بام چرخ   سوز از آن قرا صاحب طیلسان انگیختہ

"رعنائے صاحب بربط" سے سیارہ زہرہ مراد ہے، "قرا صاحب طیلسان" سے مشتری کی طرف اشارہ ہے۔ سیارہ زہرہ کے متعلق تو مشہور ہے، کہ ایک مغنیہ تھی جو ہاروت ماروت سے اسم اعظم سیکھکر ستارہ بنگئی اور آسمان پر چلی گئی، "مشتری" کو قاضی فلک کہتے ہیں اسی لئے "صاحب طیلسان" لائے، چونکہ اگلے وقت قاضی خطیب اور مذہبی پیشوا جسم پر ایک چادر ڈالے رہتے تھے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ایک مطربہ کی لحن نوازیاں کسی دل والے قاضی یا مذہبی پیشوا کے اندر "ہاؤ ہو" پیدا کر دیتی ہیں اسی طرح بام آسمان پر سیارہ زہرہ کی بربط نوازی اور موسیقیت سے قاضی فلک (مشتری) کے دل میں سوز و گداز پیدا ہو رہا ہے۔

چشم بزغالہ براں خوشہ کہ خرمن کردہ شب داس کز دندان زراہ کہکشان انگیختہ

"بزغالہ" سے برج جدی مراد ہے، خوشہ سے برج سنبلہ کی طرف اشارہ ہے، داس تو عموماً اس آلہ کو کہتے ہیں جس سے گھاس وغیرہ کرتے ہیں (یعنی ہنسیا) لیکن "داس" ایک دوسرے معنی میں بھی آتا ہے گیہوں اور جو کے ہر دانہ کے سرے پر ایک باریک سا "کھر" ہوتا اسی کو داس کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ برج جدی جو بکری کا بچہ ہے "خوشہ" یعنی برج سنبلہ کو بہ نظر طمع دیکھ رہا ہے اس خوشہ کو رات نے خرمن کیا ہے، اور وہ بزغالہ کہکشاں کی راہ سے اپنا دانت خوشہ کے ہر دانہ کی باریک ٹہنیوں پر جمائے ہوئے ہے۔

نقش جوزا چوں دو مغز اندر یکے جوز از قیاس یا دو بیروج الصنم از یک مکان انگیختہ

برج جوزا کی شکل یہ ہے کہ دو انسان باہم لپٹے ہوئے ہیں "بیروج الصنم" ایک قسم کی گھاس ہے، جو ختن و بلخ، یغما و تبت وغیرہ میں پیدا ہوتی ہے اس کی شکل انسان کی سی ہوتی ہے شعر کے معنی یہ ہیں کہ برج جوزا گیا ہے گویا ایک بادام کے دو دانے ایک چھلکے میں ہیں یا دو بیروج الصنم ایک ہی مقام میں اُگے ہوئے ہیں۔

خور بہ سرطان مانده تا معجون سرطانی کند زانکہ معلول است صفرا از زخان انگیختہ

اگلے زمانہ میں علم و ادب کے ساتھ ارباب ذوق طب کی تحصیل بھی لازمی جانتے تھے، چنانچہ اکثر ائمہ و شعرا نے بربنائے تفنن یا اضافۂ معلومات کی نیت سے طب کی تحصیل کی، ابن حبان، سیوطی، اور رازی جیسے ائمہ مذہب اور رکنائے کاشی، حزیں، اور مومن خاں جیسے شعرا نے بھی باضابطہ اس فن کی تکمیل کی، خاقانی نے جس روانی کے ساتھ طب کے متعلق فنی اشارے کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے یہ فن بھی سیکھا تھا اگلے سطور میں اسکا وہ شعر لکھا جا چکا، جس میں اس نے "عرق عراق" اور "شریان شروان" کا استعمال کیا ہے اس شعر سے جہاں علم الابدان سے اس کی واقفیت کا حال معلوم ہوتا ہے وہاں معانی کے اعتبار سے ایک بلاغت جمیل بھی پائی جاتی ہے صنایع و بدایع میں اس کو تجنیس ناقص کہا جاتا ہے اسی طرح اس کا مرقومہ بالا شعر بھی اس کی طبی واقفیت پر دال ہے سرطان کے ساتھ "معجون سرطانی" کا استعمال "عرق عراق" اور "شریان شروان" کی طرح تجنیس میں داخل ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب برج سرطان میں داخل ہوا تاکہ "معجون سرطانی" تیار کرے، معجون سرطانی ضعف رجولیت وغیرہ کے لئے مفید ہے۔

مشتری را ماہی صید و کمانے زیر دست آفت تیر از کمان ترکمان انگیختہ

ماہی سے مراد "برج حوت" ہے "تیر" سیارہ عطارد کو کہتے ہیں "کمان" سے "برج قوس" کی طرف اشارہ ہے برج حوت مشتری کا گھر ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری نے مچھلی کا شکار کیا ہے اور اس کے پاس کمان تھی، تیر کی آفت ترکمان کی کمان سے برپا ہے "ترکمان" سلجوقیہ کی ایک شاخ ہے،

یہ لوگ بڑے تیر انداز ہوتے ہیں اور برابر تیر و کمان اپنے ساتھ رکھتے ہیں مصرعہ ثانی کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ ترکانوں کی قدر اندازی نے آفت بپا کر رکھی ہے دوسرے یہ کہ "تیر" (سیارۂ عطارد) کو "کمان" (برج قوس) میں وبال ہوتا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ مشتری ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ایک ہاتھ میں کمان یعنی برج قوس ہے اور دوسرے میں ماہی (یعنی برج حوت) مشتری دونوں برجوں کا مالک ہے اور اپنی کمان سے عطارد کو وبال میں ڈال رکھا ہے کتب نجوم میں برج قوس کی تصویر یہ ہے کہ جنگلی گائے کے مثل ایک جانور ہے اس پر ایک نیم مرد سوار ہے اور اس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہے اژدہا کی شکل کا ایک حیوان اس مرد پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے اور وہ مرد اس کو تیر مار رہا ہے۔

بخت برزد ہائے انجم در ترازوئے فلک نام نقش اخستان کامران انگیختہ

ترازوئے فلک سے "برج میزان" مراد ہے یعنی اخستان شاہ ایسا کامران بادشاہ ہے کہ قسمت نے برج میزان میں ستاروں کو تولا اور سکہ بنایا اور اس پر اخستان شاہ کا نام نقش کر دیا۔

آفتاب کا داخلہ بروج اور اختلاف موسم

قدیم زمانہ سے آفتاب کے سکون و حرکت کا مسئلہ انسانوں کے زیر بحث رہا ہے چھٹی صدی قبل مسیح میں انغزاغورس نے یہ رائے دی کہ زمین متحرک اور آفتاب ساکن ہے لیکن یہ خیال مناظر کے اعتبار سے اسوقت ذہن انسانی کے لئے ناقابل قبول ثابت ہوا، لوگ اسی ظاہری مشاہدہ پر قائم رہے، کہ آفتاب کو حرکت ہے یہاں تک کہ بطالسہ مصر میں ایک بہت بڑا ماہر فلکیات پیدا ہوا اس نے نظام شمسی، اجرام سماوی اور جغرافیہ طبعی پر مختلف کتابیں لکھیں، بطلیموس کا نظریہ تھا کہ آفتاب ہی متحرک اور زمین ساکن ہے چنانچہ اسی نظام کے اصول پر اسلامی ہیئت دانوں، ابو معشر، البطانی (جس کو بطلیموس عرب کہا جاتا ہے) البیرونی وغیرہ نے اپنی کتابیں لکھیں لیکن آخر میں کوپرنیکس پیدا ہوا اور اس نے نظام بطلیموس کی تردید کردی، اور انغزاغورس کی رائے تسلیم کی۔

خاقانی نے اسی نظام بطلیموس کے مطابق آفتاب کی حرکت اور داخلہ بروج پر شاعرانہ روشنی ڈالی ہے اس کے ایک طویل قصیدہ کا ایک حصہ یہ ہے

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری عالم خاقہ بردہ را توشہ دہد توانگری

بادہ ساز داز برہ بر صفت توانگراں بزرہ گری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری

موسی وساحری شود گاو برہ بپرورد آب خضر برآورد ز آئینۂ سکندری

نیمگہ تیر از وشود روضہ صفت بہ تازگی خرگہ ماہ از وشود خلد وش از منوری

چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد روئے زمین شود ز تف پشت پلنگ بربری

تیز تراز کبوترے برج بہ برج می پرد — بیضۂ زرہی نہد در بدر از سبک پری
ہر سر مہ بہ برج نو بچۂ نو بر آورد — یکرہ برج از و شود قصر دوازدہ دری
از ہمہ کشتۂ فلک دانہ خوشہ خورد و بس — چوں سوئے برج خوشہ رفت از سر برج آذری
از سر خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو — گرد رگ گلوش را از سر داس نشتری
گوئی از آں رگ گلو ریختہ اندر رزاں — ایں ہمہ خون کہ می کشند آتشی و معصفری

ان ابیات میں خاقانی نے آفتاب کے داخلہ بروج اور اس کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے آیئے ہر شعر کی مختصراً وضاحت کی جائے۔

ماہ بہ ماہ می کند شاہ فلک کدیوری — عالم فاقہ بردہ را توشہ دہد توانگری

اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو ایک کسان سے تشبیہ دی ہے، جس طرح ایک کسان مہینوں محنت اور دوا دوش سے کام لیتا ہے اور اپنی جاں فشانیوں کے بعد دنیا کی فاقہ مستیاں دور کرتا ہے اسی طرح آفتاب بھی مہینوں ایک برج سے دوسرے برج میں مارا مارا پھرتا ہے تاکہ عالم کے لئے سامان رزق مہیا کرے چنانچہ آفتاب جب برج حمل میں آتا ہے تو بہار کی نشاط آفرینیاں ہوا کرتی ہیں اور جب وہ برج قوس میں آتا ہے تو خزاں کی ویرانیاں رہا کرتی ہیں۔

مایدہ سازد از برہ بر صفت توانگراں — بذر گری کند بہ گاؤ از قبل کدیوری

یعنی جس طرح ایک امیر آدمی بھیڑ وغیرہ ذبح کرکے مہمانوں کی دعوت کرتا ہے اور کسان لوگ گائے کے ذریعہ خرمن کرتے ہیں اسی طرح آفتاب بھی برج حمل (برہ) میں آکر امرا کی طرح اہل دنیا کی ضیافت کرتا ہے اور برج ثور (گاؤ) میں جب آتا ہے تو زراعت پیشہ کی حیثیت سے غلہ کا خرمن تیار کرتا ہے۔

موسیٰ و سامری شود گاؤ برہ بپرورد — آب خضر بر آورد ز آئینۂ سکندری

یعنی جس طرح موسیٰ بکریاں چراتے تھے، اور "سامری" نے "عجلاً جسداً" (بچھڑا) کی پرورش کی تھی اسی طرح آفتاب برج حمل و ثور (گاؤ برہ) کی پرورش کرتا ہے اور آسمان (آئینہ سکندری) سے مینہہ برساتا ہے۔

بنگہ تیر از و شود روضہ صفت بہ تازگی — خرگہ ماہ از و شود خلد وش از منوری

"تیر" فارسی میں سیارۂ عطارد کو کہتے ہیں "بنگہ" کے معنی رختگاہ "بنگہ تیر" کنایتہً برج جوزا کے معنی میں استعمال ہوا ہے "خرگہ ماہ" سے برج سرطان مراد ہے شعر کا مطلب یہ ہے، کہ اب جوزا کی نضارت آگینی اور چمن سامانی اور سرطان کی خلد وشی اور نور پاشی شروع ہوتی ہے۔

چوں بہ دہان شیر در خشم پلنگے آورد — روئے زمیں شود ز تف پشت پلنگ بربری

"دہان شیر" سے برج اسد مقصود ہے "پلنگ بربری" صحرائے افریقہ میں ایک قسم کا سیاہ شیر ہوتا ہے یعنی آفتاب جب برج اسد میں آتا ہے تو زمین حرارت اور خشکی کی وجہ سے بربری شیر کی طرح سیاہ ہو جاتی ہے۔

تیز تر از کبوترے برج بہ برج می پرد　　بیضۂ زر ہمی نہد در بدر از سبک پری

کوئی خاص معنی نہیں اوپر "ماہ بہ ماہ" والے بیت میں یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں لیکن اس بیت میں خاقانی نے آفتاب کو کبوتر سے تشبیہ دی ہے، اور جس طرح اگلے ابیات میں کسان اور زراعت کی مثالیں دیکر آفتاب کے فیوض وافادات کا تذکرہ کیا اسی طرح اب کبوتر کی مثال دیکر اس کی سبک پری اور دانہ چنیوں کا تذکرہ کرتے ہیں، "بیضۂ زر" سے روشنی مراد ہے، شعر کا مطلب یہ ہے کہ آفتاب کبوتر کی طرح ایک برج سے دوسرے برج میں اڑتا ہوا پہونچتا ہے، اور ان میں سونے کے انڈے دیتا جاتا ہے۔

از ہمہ کشتہ فلک دانہ خوشۂ خورد وبس　　چوں سوئے برج خوشہ رفت از سر برج آذری

آسمان بہ منزلۂ ایک کشت زار ہے، اور آفتاب مثل کبوتر ہے، اب ایک طایر کے لئے خوشہ چینی کرنا ضروری ہے اس لئے برج سنبلہ موجود ہے، برج آذری "برج اسد" کو کہتے ہیں ابیات بالا میں شاعر نے آفتاب کے داخلۂ اسد کا حال لکھا تھا "برج اسد" کے بعد چونکہ برج سنبلہ ہے اس لئے اب اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔

از سر خوشہ ناگہش داس شکستہ در گلو　　کرد رگ گلوش را از سر داس نشتری

یعنی "برج سنبلہ" (خوشہ) میں یکایک آفتاب کے حلق میں داس گڑ گیا اور اس وجہ سے اس کی گردن مجروح ہو گئی، "داس" اس باریک خس کو کہتے ہیں جو ہر دانہ کے سرے پر ہوتا ہے برج سنبلہ میں چونکہ آفتاب کو وبال ہوتا ہے اسی لئے اس کی جراحت کا تذکرہ کیا۔

گوئی از اں رگ گلو ریختہ اند در رزاں　　اینہمہ خوں کہ می کشند آتشی و معصفری

اب فرماتے ہیں کہ رگ گردن کا یہی خون انگور میں پیوست ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سے شراب سرخ و زرد تیار ہوتی ہے۔

نظرات سیارگان

خاقانی زندان میں ہیں ہاتھوں میں ہتکڑیاں، پیر میں بیڑیاں ہیں دل رنجور اور جسم سوگوار بنا ہوا ہے، اسی عالم میں شاعر نے ایک نہایت معرکۃ الآرا مرثیہ لکھا یا یوں کہئے نظم میں دربار شاہی میں اپیل کی اسی سلسلہ میں انھوں نے یہ ابیات بھی لکھے ہیں۔

بہ تثلیث بروج و ماہ و انجم　　بہ تربیع و بہ تثلیث و ثلاثا
کہ بہر دیدن بیت المقدس　　مرا فرماں بخواہ از شاہ دنیا

"تثلیث" "تربیع" "تسدیس" اور "مقابلہ" نجومی اصطلاحیں ہیں یعنی دو سیاروں کے درمیان

ایکسو بیس [۱۲۰] درجہ کا تفاوت ہو تو اس کو "نظر تثلیث" کہتے ہیں مثلاً ایک سیارہ برج حمل میں ہو اور دوسرا برج اسد میں۔ اگر ایکسو اسی درجہ کا تفاوت ہو تو "مقابلہ" کہیں گے، اگر ساٹھ درجہ کا فرق ہو تو "تسدیس" اور نوے درجہ کا فرق ہو تو "تربیع" کہتے ہیں مثلاً آفتاب برج حمل میں اور ماہتاب برج سرطان میں یہ تفاوت نوے درجہ ہو تثلیث و تسدیس کو سعد اور تربیع و مقابلہ کو نحس کہتے ہیں۔

شعر کے معنی ہیں کہ ماہ و انجم کے نظرات تثلیث و تربیع کی قسم بادشاہ سے میرے لئے بیت المقدس جانیکی اجازت حاصل کیجئے، خاقانی نے اس مرثیہ میں وزیر عزالدولہ کو مخاطب کیا ہے اور اسی وزیر سے فرمان شاہی حاصل کرنے کی التجا کی ہے۔

سعد ذابح خاقانی نے ایک قصیدہ میں دشت موقف ہشتم ذی الحجہ، مسجد خیف، جمرہ وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے اور فریضہ حج اور حجاج کے متعلق نہایت ہی لطیف اشعار لکھے ہیں اسی سلسلہ میں قربانی کے مسئلہ پر فرماتے ہیں۔

سعد ذابح بہر قربان تیغ مریخ آختہ — جرم کیوانش چوں سنگ کی افسان دیدہ اند

"سعد ذابح" برج دلو میں ایک ستارہ ہے اور دلو "زحل" کا گھر ہے مریخ کو ترک فلک کہتے ہیں جو تیغ و خنجر کی طرف منسوب ہے، "زحل" کو پتھر کی طرف نسبت دیتے ہیں چونکہ اس سیارہ کا جسم سخت و درشت ہے "افسان" ایک قسم کا سیاہ سبز رنگ کا پتھر ہوتا ہے جس پر چاقو اور خنجر وغیرہ تیز کرتے ہیں۔

شعر کا مطلب یہ ہے کہ سعد ذابح نے مریخ کی تلوار لی اور زحل کے جسم پر جو بمنزلہ "افسان" ہے اسکو تیز کیا اور فریضہ قربانی ادا کیا خاقانی نے حجاج کے فریضہ قربانی کے لئے ایک بے مثل منجمانہ تشبیہ دی ہے۔

دمدار ستارہ جلال الدین شروان شاہ کی مدح میں خاقانی نے "گنج رواں افشاندہ اند" "آسماں افشاندہ اند" کے قوافی و ردیف میں ایک طویل قصیدہ لکھا ہے اس میں بھی اس نے بہت سے منجمانہ اشارات کئے ہیں فرماتے ہیں۔

تا غبار از چتر شاہ اختران افشاندہ اند — فرش سلطانیش در بر تر مکان افشاندہ اند

شحنۂ نوروز نعل نقرہ خنگش ساختست — ہر زرے کاکیر سازان خزاں افشاندہ اند

رستہ چوں یوسف ز چاہ دلو پیش ابر و صبح — گوہر از الماس و مشک از پرنیان افشاندہ اند

در کابش ہفت گیسو دار وشش خاتون ردیف — بر سرش ہر ہفت وشش عقد جان افشاندہ اند

بست و یک پیکر کہ از سقلاب دارد خیلتاش — گرد راہ خیل او تا قیرواں افشاندہ اند

خاقانی نے ان ابیات میں آفتاب کے خروج دلو، اور داخلہ برج حمل کا تذکرہ کیا ہے اور ان سے جو

اثرات موسمی مترتب ہوتے ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی سلسلہ میں جلال الدین شروان شاہ کے جلو میں غلاموں اور کنیزوں کو دیکھکر ایک نہایت ہی پرلطف تشبیہ دی ہے اور بتایا ہے کہ بادشاہ کے رکاب میں جو غلام اور لونڈیاں ہیں وہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب کے گرد دمدار ستارے اور سیارے عقد ثریا نچھاور کر رہے ہیں اور بادشاہ کا جلال یہیں تک منحصر نہیں رکھتے بلکہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح فلک ہشتم میں کل ثوابت مرکوز ہیں اور چھتیس صورتیں ہیں اور ان میں ۲۱ صورتیں شمال کی طرف اور پندرہ صورتیں جنوب کی طرف ہیں اسی طرح جلال الدین شروان شاہ کے خدم وحشم نے سقلاب (جو شمال میں ہے) سے قیروان تک غبار بلند کر رکھا ہے مرقومۂ بالا ابیات میں ہر شعر تشریح طلب ہے لیکن ان صفحات میں اس کی گنجایش نہیں پھر بھی ایک شعر کی کسی قدر وضاحت کر دینا ضروری ہے فرماتے ہیں۔

در رکابش ہفت گیسو دار و شش خاتوں ردیف ۔ بر سرش ہر ہفت و شش عقد جمان افشاندہ اند

"ہفت گیسودار" سے دمدار ستارے مراد ہیں جو "میل مرکزی" (آفتاب کی کشش) کی قوت سے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں اسمیں شک نہیں خاقانی کے زمانہ میں بھی ان ستاروں کو "مایہ بخار دخانی" سمجھا جاتا تھا جو ایتھر کے تصادم سے مشتعل ہو جاتے ہیں قدیم ہیئت دانوں نے نظام شمسی کے سلسلہ میں ستارۂ دمدار کا تذکرہ نہیں کیا وہ سبعہ سیارہ کے قایل تھے، لیکن اب علم ہیئت کا یہ طے شدہ مسئلہ ہے کہ کثرت سے دمدار ستارے آفتاب کے گرد چکر لگا رہے ہیں ہاں ان میں بعض کی گردش معینہ ہے اور بعض کی غیر معینہ، دو سو دمدار ستاروں کا دائرۂ گردش دریافت ہو چکا ہے، ان میں چالیس ستارے جو ہمارے نظام شمسی میں داخل ہو چکے ہیں ایک زمانہ معینہ میں آفتاب کے گرد اپنی گردش پوری کرتے ہیں اور ایکسو ساٹھ سیاروں کا مرکز بدلتا رہتا ہے تحقیقات جدیدہ نے ثابت کر دیا ہے کہ ان دمدار ستاروں کا مدار بالکل بیضاوی ہے اور ان کا جسم مثل کہر کے بخارات نیم منجمد کا ہوتا ہے ان دمدار ستاروں میں کئی کے سر پر ایک روشن تارہ نظر آیا ہے جس کی ضیاپاشیوں سے خطوط شعاع پیدا ہو جاتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طاؤس آسمان پر مستانہ رقص کر رہا ہے، خاقانی نے ان دمدار ستاروں کی تعداد سات ہی بتائی ہے، لیکن دو ہزار سال کے درمیان چھ سو دمدار ستارے نظر آئے، بہر حال عربی میں ان ستاروں کو "ذوات الاذناب" اور یوروبی اصطلاح میں "کومٹ" (Comet) کہا جاتا ہے "شش خاتون ردیف" سے آفتاب کے علاوہ چھ سیارے مراد ہیں "عقد جمان" موتی کے ہار کو کہتے ہیں لیکن یہاں کنایۃً نجم "ثریا" سے ہے جو چھ ستارے برج ثور میں یکجا ہیں تو خاقانی کے شعر کا مطلب یہ ہوا کہ آفتاب جب برج حوت سے برج حمل میں آیا تو دمدار تاروں اور چھ سیاروں نے عقد ثریا کو "شاہ اختران" یعنی آفتاب پر نچھاور کیا۔

عبدالمالک آروی

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

ایکٹ ۴۔ سنہ ۱۸۵۸ء

منظر اول

(بالاخانہ کے نیچے جھانسی راج کے محل کا صحن، وقت شام، تاریخ ۲ مارچ سنہ ۱۸۵۸ء۔ لوگوں کا ہجوم رانی اور اُس کی فوج کا خیر مقدم جبکہ رانی، راجہ اورچھا اور اُس کے رفقا سے جنگ کرکے واپس آنے والی ہے۔ پردہ اُٹھتا ہے۔ سانپ کا تماشہ، مداری کا تماشہ اور بانس کی ورزش کا تماشہ شروع ہوتا ہے۔ تھوڑے وقفے کے بعد دیوان تارا سنگھ دروازہ سے گزر کر صحن میں پہونچتا ہے اور ایک گھوڑے پر جو اُس کے سامنے فوراً لایا جاتا ہے سوار ہوتا ہے۔ "دیوان صاحب کی جے" کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ اور وہ متانت سے مسکرا کر سلام لیتا ہے، لوگ اُس کے گھوڑے کے اردگرد جمع ہوجاتے ہیں اور وہ گھوڑے پر بیٹھے ہوئے اُن سے مخاطب ہوتا ہے)۔

تارا سنگھ:۔ بھائیو! چند منٹ میں ہمارا پیارا حکمراں ہمارے پاس آجائے گا۔ راج کے دشمنوں سے کئی مہینے کے سخت مقابلہ کے بعد واپس ہوگا۔ جھانسی راج کی نئی زندگی کے بعد سے نو مہینے تک جیسا آپ سب جانتے ہیں رانی لکشمی بائی راجدھانی کا انتظام کر رہی ہیں، یہ رانی ہی کی ذات ہے کہ راج کو اگر زیادہ نہیں تو کم از کم وہ استحکام حاصل ہے جو راجہ گنگا دھر کے زمانہ میں تھا۔ پھر کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم رانی کا خیر مقدم نہایت گرمجوشی اور دلی محبت کے ساتھ کریں۔ اور اپنے سپاہیوں کی شاندار فتح کی جو اُنھوں نے نتھے خاں اور مہاراجہ اورچھا کی فوجوں پر حاصل کی ہے خوشی منائیں۔ (دیوان صاحب کی جے کے نعرے) میں اب اپنے معزز حکمران کے خیر مقدم کے لئے شہر کے

باہر جاتا ہوں اور اُس کو یہاں لاتا ہوں۔ آپ کا رانی کو خیر مقدم کہنا، رانی کی اُن شجاعانہ کارگزاریوں کا تسلیم کرنا ہے جو اُنھوں نے اور اُن کے معزز باپ نے باشندگان جھانسی کے لئے انجام دی ہیں۔

(رانا صاحب روانہ ہوتے ہیں اور "دیوان صاحب کی جے" کے نعرے جاری رہتے ہیں۔

ایک بگل کی آواز سنائی دیتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ بڑھکر ایک سریلے راگ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس میں ہندوستانی ڈھول جھانجھ اور شہنائی کی آوازیں شامل ہیں اور وقتاً فوقتاً ناقوس کی بھی آواز آتی ہے۔ باجا وحشیانہ اور بے قاعدہ تھا۔ جب قریب آیا تو مردانی آوازیں جو ایک ساتھ پیدا ہو رہی تھیں کان میں آئیں اور فوراً مسلح آدمی چہار جانب سے صحن میں آ گئے۔ اُن کے آگے باجے والے۔ بگل والے اور ناقوس بجانے والے تھے۔ اکثر فوجی افغان اور روہیلہ تھے جو صاحب ریش تھے یا مغربی ہند کے مرہٹے تھے اور مختلف اقسام کے اسلحہ اور بندوق، رائفل تیر کمان بھالے تلوار اور برچھے وغیرہ مختلف اسلحہ سے آراستہ تھے، وہ وہاں بنگال کی فوجی سپاہیوں کی سی تھیں اور کچھ دوسری قسم کی ابتدائی وحشی اقوام والی شکاری پوشاکیں بھی تھیں۔ ڈھال زرہ بکتر بھی تھے۔ فوج صحن میں داخل ہوتے ہوئے چند اشعار گا رہی تھی اور اسلحہ کی جھنکار یا تالی بجا کر تال ملایا جاتا تھا۔

سرخ علم بلندی پر نصب کیا گیا جس کو ہر شخص نے دیکھا اور رانی لکشمی بائی کی حکومت سے خوش ہو کر "رانی کی جے، کمار کی جے" کے نعرے لگائے۔

لوگ راگ کا آخری حصہ فوج کے ساتھ غل مچا کر دوہرانے لگے، شور و غل بڑھتا گیا۔ اور جب حد سے زیادہ بڑھ گیا تو رانی اپنے جنگی ہاتھی پر سوار ہوئی، آگے سرخ علم تھا جو کسی وقت علٰحدہ نہ ہوتا تھا۔ برٹش گارڈ کے افسر کی وردی رانی نے زیب تن کی تھی جس میں چست کرتہ، سفید پائجامہ اور پگڑی تھی اور پٹکے سے تلوار لٹک رہی تھی۔ اور پگڑی میں ایک نیلے رنگ کا طرہ بھی تھا۔ اُس کے پاس ہاتھی پر انند راؤ بھی ہے اور وہ بھی ایسے ہی لباس سے مزین ہے۔ تارا سنگھ، راما صاحب راؤ آپا اور گنگا بائی رانی کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر ہیں۔ گنگا بائی رانی کی سی پوشاک پہنے ہے لیکن طرہ نہیں ہے۔ رانی اور انند راؤ ہاتھی پر بیٹھے ہیں۔ مجمع کے لوگ سلام کر کے ارد گرد آ جاتے ہیں۔ فوجیں اسی اثنا میں باجہ بجاتی ہوئی اپنے اپنے مقام پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ راما صاحب اُتر کر محل میں داخل ہوتے ہیں۔ تارا سنگھ راؤ آپا اور گنگا بائی بھی اُترتے ہیں لیکن وہ ہاتھی کے قریب کھڑے رہتے ہیں۔ رانی چاروں طرف سلام لیکر تقریر کی خواہش کرتی ہے۔

(مجمع خاموش ہو جاتا ہے اور عماری سے جہاں انند راؤ بھی بیٹھا ہے تقریر شروع کرتی ہے۔)

رانی :۔ پیارے دوستو! بھائیو! بہنو! آپ نے جو میری واپسی پر دلی مسرت کا اظہار کیا ہے اس سے میرے قلب پر گہرا اثر پڑا ہے۔ ہم کو بھی واپسی پر بہت غیر معمولی خوشی حاصل ہوئی ہے۔ ہم کو گزشتہ مہینوں میں سخت صعوبت اُٹھانی پڑی کیونکہ ہم نے گستاخ دشمنوں پر جو ہماری پاک زمین پر حملہ کر رہے تھے فتح پائی۔ مجھے فخر سے کہنے کا موقع حاصل ہے کہ شیوجی اور مہادیوجی کی مہربانی سے ہمارے بہادر سپاہیوں نے نتھے خاں اور راجہ اور چھا کی فوجوں کو ہر طرف سے پسپا کر دیا۔ (اس پر نعرے رانی لکشمی بائی کی جے کے بلند ہوتے ہیں اور رانی ہاتھ اٹھا کر پھر سب کو خاموش کرتی ہے) لیکن بھائیو! میں آپ کو متنبہ کرتی ہوں کہ ہماری مشکلات ابھی ختم نہیں ہوئی ہیں۔ ابھی ہم کو جلد ایک دوسرے دشمن کا جو مہاراجہ اور نتھے خاں سے زیادہ سخت ہے مقابلہ کرنا ہے۔ یہ خبر ہم کو راستے میں موصول ہوئی ہے کہ انگریزوں نے ساگر میں ایک بڑی فوج جمع کی ہے اور ہمارے مقابلہ کے لئے وہ روانہ ہو چکے ہیں۔ (مجمع کے لوگوں پر سنجیدگی چھا جاتی ہے) پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم راستی پر ہیں اور ہمارے ذرائع بھی کافی وسیع ہیں۔ ہمارے شہر جھانسی میں صرف غلہ ہی کا ذخیرہ کافی نہیں ہے بلکہ جملہ سامان جنگ بھی موجود ہے اور تانتیا ٹوپی اور رنبور کے راجہ نے بھی ہم کو آدمی اسلحہ اور توپیں دینے کا وعدہ کیا ہے۔ جب انگریز حملہ کریں گے تو ان کی مدد ہم کو مل جائیگی (نعرے جھانسی راج کی جے) کے لگتے ہیں۔ بس اگر دشمن ہمارے گھر کے قریب بھی آجائے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے سپاہیوں کے پیچھے کھڑے رہیں تو آپ نتیجہ سے واقف ہو جائیں گے۔

(فوج پھر نقل و حرکت کا راگ بجانے لگتی ہے۔ رانی اور انند راؤ ہاتھی سے اُتارے جاتے ہیں اور ہاتھی الگ لیجایا جاتا ہے۔ رانی مجمع کے بیچ میں مع انند راؤ کے گزرتی ہے اور دونوں ہاتھ پھیلا کر جو لوگ قریب ہیں اُن سے مخاطب ہوتی ہے۔)

رانی :۔ اب بھائیو! معاف کرنا، چونکہ مجھے مہادیوجی کے مندر جانا ہے اس لئے منھ ہاتھ دھونے کے لئے اندر جاتی ہوں، میں تھکی ہوئی ہوں اور میلی ہو رہی ہوں۔ میں نے ماما صاحب اپنے والد بزرگوار سے دریافت کر لیا ہے۔ اُن کی عاقلانہ حکمت کے باعث فتح نصیب ہوئی ہے۔ اس وقت میں جو کچھ کہہ سکتی ہوں یہ ہے کہ تم کو ہماری مہمات اور ہماری فوج کی شجاعت کا علم ہو جائے۔ آج شام کو میں رہنمایانِ شہر کو جمع کر کے ان سے مشورہ کروں گی تاکہ انگریزوں کے خلاف تحفظ کا سامان بہم پہنچ سکے اور آپ کو بتاؤں گی کہ جنگ کے لئے میں آپ سے کیا چاہتی ہوں جو آپ میں ہندو ہیں مندر ہو آئیں اور وہاں نذر چڑھائیں اور فتح کے لئے جو ہم کو حاصل ہوئی ہے شکریہ ادا کریں اور اس آئندہ کی جنگ میں فتحیابی کی دعا مانگیں۔ اور مسلمان میرے لئے اپنے اللہ سے مدد مانگیں۔ سلام۔ مستقبل سے نہ ڈرو نہ دل میں شک لاؤ۔ نتیجہ اچھا برآمد ہوگا۔ لیکن اپنا وقت غفلت اور آرام طلبی میں نہ گنوانا۔ ہمارے سامنے ایک

بڑا کام ہے۔ اور ہم کو اُس کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

(جونہی وہ تقریر ختم کرتی ہے "رانی صاحبہ کی جے" "کمار صاحب کی جے"، کے نعرے بلند ہوتے ہیں تمام سپاہی اپنا باجہ بجانے لگتے ہیں اور اُن کے اسلحہ سے جھنکار پیدا ہوتی ہے۔ اسی اثنار میں رانی ہاتھ جوڑ کر چاروں طرف گھومتی ہے اور پھر محل میں داخل ہوتی ہے اور اُس کے آگے سرخ علم اور انند راؤ چلتا ہے اور پھر تارا سنگھ گنگا بائی اور راؤ آبا چلتے ہیں۔ ماما صاحب بالاخانہ پر آتا ہے اور مجمع "ماما صاحب کی جے" کا غل شروع کرتا ہے۔ اور ماما صاحب سلام کرتا ہے۔ پردہ اُس غل مچانے والے مجمع پر گرتا ہے اور وہ سب مجتمع ہو کر بالاخانہ کے نیچے کھڑے ہوتے ہیں کہ ماما صاحب کی تقریر سنیں)۔

منظر دوم

(دربار کا کمرہ۔ تاریخ ۲ راپریل، وقت آدھی رات، انگریزوں نے سر ہیوگ روز کی ماتحتی میں جو بعد میں لارڈ اسٹراتنارن کے نام سے مشہور ہوا جھانسی کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ گدی دکھائی دیتی ہے۔ کمرہ غیر آراستہ ہے اور ہر چہار طرف بندوقیں تلواریں اور اسلحہ پھیلے ہوئے ہیں۔ باہر سے رائفل کے فیر کی آواز آتی ہے لیکن توپ کی کوئی آواز نہیں ہے۔ رانی اپنی پوشاک پہنے ہوئے گدی پر رونق افروز ہے اور انند راؤ اُس کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ آخری مرتبہ ذی اقتدار ہستیوں سے مشورہ کر رہی ہے۔ چہرہ پر پریشانی کے کے آثار نمایاں ہیں اور گو کہ وہ خاموش ہے تاہم اس کے چہرہ سے اندرونی حالت کا پتہ لگتا ہے۔ اُس کے سامنے اکابر کا مجمع ہے جن میں سے اکثر ہندو ہیں اور سب سنجیدہ ہیں اور گردن جھکا کر تارا سنگھ کی تقریر سن رہے ہیں۔ رانا سنگھ ایک چھوٹے اسٹول پر بیٹھا مجمع سے مخاطب ہو رہا ہے۔ ماما صاحب بھی بیٹھا ہوا مجمع سے خطاب کر رہا ہے۔ اور دیوان بھی بیٹھا ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی (وردی میں) گدی کی بائیں جانب بیٹھے ہیں۔ وہ یکے بعد دیگرے بالاخانہ پر جاتے ہیں اور حملہ کی علامات دیکھتے ہیں۔

تارا سنگھ:۔ (سسکیاں روک کر) بھائیو اور دوستو! وہ وقت قریب آ رہا ہے جب ہم کو انگریزوں سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ جب تک تانتیا صاحب کی امداد کی اُمید تھی ہم کو انگریزوں کے مقابلہ کا زیادہ خوف نہ تھا۔ ہمارے لئے انگریزوں سے مقابلہ آسان تھا۔ لیکن اب کہ تانتیا کی فوج ہماری آنکھوں کے سامنے شکست کھا چکی ہے اور وہ خود بیتوا سے کالپی کی طرف بھاگ چکا ہے تو ہماری شکست بھی یقینی ہے، ہمارا دوسرا حامی رنپور کا راجہ بھی شکست کھا چکا ہے۔

ایک سردار :- سچ ہے دیوتاؤں کا دلی منشا سمجھنا بہت مشکل ہے، یہ کون سمجھ سکتا تھا کہ تانتیا صاحب کی توی فوج کو کمپنی کے چند سپاہی دھوئیں کی طرح اُڑا دیں گے۔

ماما صاحب :- (پریشان ہوکر اور جھٹک کر) یہ کمبخت توپیں اور فوج کی قواعد دانی سب کام خراب کر دیتی ہے۔ یہ توپیں جو ہمارے قلعہ کی دیواروں کو ڈھا دیتی ہیں ہر چیز تباہ کر سکتی ہیں۔ ہمارے بہادر افغانی سپاہی بھی جبکہ توپوں کو دیکھکر کانپنے لگتے ہیں۔ ہمارے قلعہ کی دیوار میں اُنھوں نے گاڑی بھر کا راستہ بنا بھی لیا ہے۔ اور ہم مرمت کی جو کوشش کرتے ہیں بیکار ثابت ہوتی ہے۔ ہم بدقت تمام پتھر لگا کر اُس کی مرمت کرتے ہیں اور وہ اُس کو توپوں سے چکنا چور کر ڈالتے ہیں۔

راؤ آبا :- (خاموشی سے) ہماری توپ کی جگہ کے ساتھ بھی یہی ہوتا ہے۔ جب ہم کسی جگہ توپ رکھتے ہیں تو وہ اسکو برباد کرنے کی فکر کرتے ہیں اور کسی نہ کسی وقت برباد کر دیتے ہیں۔ اکثر ہمارے آدمی بھی جن کے پاس اچھے ہتھیار نہیں ہیں ضایع ہوتے ہیں۔ میدان جنگ کے لئے کوئی بھاری توپ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اگر یہ محل ہمارے پاس محفوظ جگہ پر نہ ہوتا تو کب کا اُڑا دیا جاتا۔

ماما صاحب :- (کمزور آواز سے) میں صرف اُن کی توپوں ہی کی تعریف نہ کروں گا۔ اصل چیز اُن کا قاعدہ قانون ہے۔ جب انگریز حاکم کسی کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ یا تو کام پورا ہوگا یا سپاہی اپنی جان ضایع کر دیں گے۔ ہمارے آدمی بھی انگریز سپاہیوں کی طرح بہادر ہیں لیکن تعمیل حکم نہیں کرتے۔ اگر میں کسی کام کا حکم دوں تو اُس کو پورا کرانے کے لئے مجھے کھڑا رہنا پڑے گا۔ ورنہ حکم بیکار ہو جائے گا۔ ہم فرداً فرداً جنگ کرتے ہیں وہ متحدہ کوشش کرتے ہیں۔ یہی اصل فرق ہے۔ اچھی توپیں اور مستعدانہ قواعد کی پابندی۔

رانی :- (تھکی آواز میں) کیا مناسب نہ ہوگا کہ ہم اُسوقت پر غور کریں جب انگریز یہاں گھس آئیں گے۔ ہم کو اُسوقت کیا کرنا چاہئے۔ ہماری قسمت پر مہر لگی ہوئی ہے بس ہم کو اُن واقعات کی بات چیت کرنی چاہئے جو تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے آنے والے ہیں۔

ایک سردار :- رانی صاحبہ! آہ! مستقبل کا کیا سوچنا۔ ہمارے دل خود اپنی بدقسمتی پر رو رہے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ انگریز بڑے بڑے لوگوں کو توپ سے اُڑا دیتے ہیں اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا میں چاروں طرف پھینکدیتے ہیں۔ پھر ہم اپنے لئے کیا سوچیں جبکہ ہم کو ڈر ہے کہ رانی لکشمی بائی کے لئے یہی مصیبت آنے والی ہے۔

(دوسرے سردار اس تقریر کی موافقت میں سر ہلانے لگتے ہیں اور کہتے ہیں۔ ہے! ہے! لکشمی بائی! بیچاری رانی لکشمی بائی)

رانی :- (غمزدہ ہوکر مسکراتی ہوئی اور چاروں طرف سلام کرتی ہوئی) دوستو! مت ڈرو! لکشمی بائی انگریزوں کو

اُن کی مہیب توپوں کے لئے بارود نہ مہیا کر دے گی۔ (اپنی کمر سے ایک خنجر نکالکر اور دکھاکر) اگر میرا مردہ جسم اُن کو اطمینان بخش سکتا ہے تو آئیں۔ لیکن مجھے وہ زندہ نہیں لے جاسکتے۔ (افسوس کے ساتھ سب نے تائید کی) لیکن، ہم ضرورت سے زیادہ پیشین گوئی کر رہے ہیں۔ تمھارا کیا ارادہ ہے۔ والد صاحب!

ماما صاحب:۔ جنگ کرنے والے سپاہی اپنی زندگی بیچنے کے لئے تیار ہیں۔ ہم انگریزوں کے ہاتھوں میں پہونچکر اُن سے کوئی رحم کی اُمید نہیں کر سکتے۔ پس بجائے اطاعت قبول کرنے کے ہم لڑتے لڑتے مرجانا پسند کرینگے

تیسرا سردار:۔ آبادی کے بھاگنے کا راستہ ہر طرف سے مسدود ہو چکا ہے۔ آج شام کو جب تانتیا صاحب کی شکست کی خبر ملی میرے چند احباب معہ اپنے بال بچوں کے شمالی پھاٹک سے بھاگ جانا چاہتے تھے۔ لیکن انگریزی فوج فوراً اس کو سمجھ گئی۔ اور جو نہیں مارے گئے تھے وہ قصبہ میں مضطرب ہوکر داخل ہو گئے۔ اب جو قسمت دکھائیگی دیکھنا پڑے گا۔

رانی:۔ والد صاحب! آپ کے خیال میں انگریز کتنی دیر میں حملہ کریں گے۔

ماما صاحب:۔ اب جسوقت چاہیں حملہ کر سکتے ہیں کیونکہ دیوار میں شگاف ہو چکا ہے۔ جنرل روز اگر سویرے حملہ کر دے تو مجھے تعجب نہ ہوگا کیونکہ فوج نے تانتیا کا مقابلہ کیا ہے۔ ان کا افسر بہت جوشیلا ہے اور ہمیشہ حملہ ابتدا ہی میں کرتا ہے۔

رانی:۔ (کھڑے ہوکر اور فیصلہ کن لہجہ میں) پس ہم کو اپنی ترکیب فوراً سوچ لینا چاہئے۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ شرفا کی آبادی اور اُن کے بال بچوں کو کسی طرح اذیت نہ پہونچنے پائے۔ بہت سی عورتوں کی زندگی دیوار کی مرمت میں ضائع ہوئی۔ پس جنوب میں جتنے مکانات ہیں اور جس طرف شگاف ہے سب خالی کر دئے جائیں جو لوگ جنگ میں شریک نہیں ہیں وہ شمالی حصہ میں جمع ہو جاویں۔ اُسی طرف دیوان صاحب رہیں گے اور جب انگریز اُدھر آویں گے تو وہ شکست تسلیم کریں گے۔ ہمارے لڑنے والے سپاہی جنوب میں رہیں گے اور ہر مکان کے مکین کو پورا مقابلہ کرکے جان دیدینا چاہئے۔ اور محل آخری دم تک نہ چھوڑنا چاہئے۔ جب انگریز شہر میں جنگ وجدل کریں اُسوقت ہم آسانی سے قلعہ چھوڑ سکتے ہیں اور محافظ سپاہی اور سوار بھی قلعہ سے علحدہ ہو سکتے ہیں اُن کا یہ فرض ضرور ہے کہ کمار انند کو دشمنوں کے ہاتھ میں جانے سے بچائیں۔

جب تک کمار آزاد ہے جھانسی راج کے دوبارہ قایم کئے جانے کی اُمید باقی ہے۔ تانتیا نے مجھے پیغام بھیجا ہے کہ اگر جھانسی ہاتھ سے نکل جائے تو میں کمار انند اور جتنے آدمی ہوسکیں اُن کو لیکر فوراً اُس سے کالپی میں ملوں ہمت نہ ہارو! دوستو! سیواجی مغلوں سے اپنی زندگی بچا کر لیگیا اور آخر میں اُن پر غالب آیا۔ جھانسی انگریزوں کے ہاتھ میں چلی جائے لیکن اگر ہم اپنے اعتقاد کو مضبوط رکھیں اور ہوشیاری سے کام لیں تو جھانسی پر پھر

ہماری حکومت ہوجائے گی۔

(رانی تھوڑی دیر تک اُن کی طرف دیکھتی ہے اور گدی سے اُتر کر آتی ہے اور ہر ایک کو کھڑا کر کے اُس کو ہنود طریقہ سے سلام کرتی ہے۔ ہر ایک رانی کے سلام کا جواب دیتا ہے اور جھک کر اُس کا پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ سر تک اُٹھاتا ہے۔ جب تمام اکابر رخصت ہو جاتے ہیں تو رانی واپس ہوتی ہے، اور ایک مرتبہ گھوم کر پھر سلام کرتی ہے۔ اکابر جو کمرہ میں ہیں رونا شروع کرتے ہیں اور کچھ کی سسکیاں بندھ جاتی ہیں۔ ان اکابر کے جانے کے بعد جو رہجاتے ہیں ماما صاحب ہے جو بے صبری سے رانی کی طرف جھپٹتا ہے اور سسکیاں لیتے ہوئے پیروں پر گر پڑتا ہے)۔

ماما صاحب:۔ (سسکیاں لیکر) بیٹی مجھے اس مصیبت کے لئے جو میری ذات سے تیرے سر پر آئی ہے معاف کر۔ اگر میری موت سے تیری مصیبت میں کوئی کمی ہو جائے تو میں اسی وقت مرنے کے لئے تیار ہوں۔

رانی:۔ (اپنے والد کو اُٹھا کر اور سپاہی کی طرح اُس سے چمٹ کر) والد صاحب! آپ کو اب کسی بات سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ آپ نے گزشتہ چند مہینوں میں جھانسی کی خدمت کی ہر دہی ماضی کے واقعات بھلا دینے کے لئے کافی ہے۔ آپ نے مجھے ایک معزز مرہٹہ عورت بننے کا سبق دیا ہے اور جب تک میرے جسم میں جان ہے میں آپ کی نصیحت کی عزت کروں گی۔ قسمت نے ہم کو آپ سے جدا ہونے کا سامان کر دیا ہے۔ آپ جب تک ہو سکے انگریزوں کا مقابلہ کیجئے اور میں انند کمار کو لیکر بھاگوں گی تاکہ پھر جنگ جاری کیجا سکے۔ دیوتاؤں اور دیویوں سے دعا کرتی ہوں کہ وہ لڑنے والوں کو طاقت عطا کریں جس کی کامیابی کیلئے ضرورت ہے۔

(ماما صاحب آستین باندھ کر تعظیم کرتا ہے اور سیدھے ہاتھ سے رانی کے پیر چھوتا ہے اور پھر ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے)

ماما صاحب:۔ (سر جھکا کر) بیٹی! میں منکسرانہ طور پر کہتا ہوں کہ میں تم سی بیٹی کا باپ ہو کر بہت فخر کر سکتا ہوں۔ میں اب مر سکتا ہوں مگر مرتے دم تک مجھے اس بات کا پورا یقین رہیگا کہ خواہ تمہارا اور انند کا مستقبل کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن رانی لکشمی بائی میری عزیز بیٹی کا قصہ مرہٹہ قوم کے دلوں پر ہمیشہ نقش رہیگا بلکہ ہندوستان کے بچوں اور بچیوں کی زبان پر رہیگا۔

(جھکتا ہے، سلام کرتا ہے اور کمرہ سے باہر جاتا ہے۔ تھوڑے وقفہ کے بعد تارا سنگھ سامنے آتا ہے اور جھک کر رانی کے پیر سیدھے ہاتھ سے چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے اور پھر کھڑا ہو کر تقریر کرتا ہے)

تارا سنگھ :- (سسکیاں چھپاکر) رانی صاحبہ! میں آپ کا مطیع اور غلام ہوں۔ میری التجا ہے کہ جو کام آپ نے میرے سپرد کیا ہے کسی دوسرے کے سپرد کر دیجئے۔ میں ماما صاحب اور فوج کے ساتھ اپنی موت کو پسند کرتا ہوں۔

رانی :- (دبدبہ سے) دیوان صاحب! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ تم مجھ سے پوری طور پر واقف نہیں ہو۔ میں ایک باعزت موت کا موقع کھو رہی ہوں جو کہ مجھے اپنی فوج کے ساتھ جنگ کرنے میں حاصل ہے۔ میرا صرف خیال یہ ہے کہ شاید ہم کو تانتیا صاحب کی مدد ملجائے اور ہم دوبارہ لڑ کر فتحیاب ہو سکیں جو کچھ میں کر رہی ہوں مجھے پسند نہیں ہے، لیکن ایسا کرنا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تم کو بھی میرے حکم کی تعمیل کرنا چاہئے ورنہ پھر تم لکشمی بائی کے نوکر نہیں ہو۔

تارا سنگھ :- (جھک کر اور سلام کر کے) شاہزادی! معاف کرو۔ میں نے سخت بیوقوفی کی۔ میں اپنے کام سے خود واقف نہیں۔ اگر انگریز مجھے زندہ رہنے دیں گے تو میرے دل میں ہمیشہ یہی ہوس رہیگی کہ وہ کونسا دن ہوگا کہ سرخ جھنڈا لہرائے اور لوگ رانی کی جے کے نعرے لگائیں۔ (یہ کہکر باہر جاتا ہے)

(تارا سنگھ جب اپنی تقریر ختم کرتا ہے توپ کے گولے کی آواز آتی ہے۔ اس آواز کے بعد پھر آواز آتی ہے۔ توپیں چلنے لگتی ہیں اور بیچ بیچ میں بندوق کی آواز آتی ہے۔ گنگا بائی بالاخانہ پر دوڑتی ہے اور راؤ آپا انند راؤ کا ہاتھ پکڑتا ہے۔ تارا سنگھ تب دربار چھوڑتا ہے اور رانی بالاخانہ کی سمت روانہ ہوتی ہے جہاں ایک سرخ جھلک دیکھتی ہے)

رانی :- (بالاخانہ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے) یہ انگریز ہی ہوں گے۔ انھوں نے پھرتی کی مگر لکشمی بائی کو گرفتار کرنا مشکل ہے۔ عزیز و جلدی کرو۔ چلو قلعہ میں اور وہاں سے گھوڑوں پر کالپی روانہ ہو جائیں۔ ہم کو دیواریں پھاندنا پڑے گا اور راستہ کاٹ کر بنانا ہوگا۔ لیکن حملہ کی گھبراہٹ میں ہم کو بھاگ جانے کا کافی موقعہ مل جائے گا جلدی کرو ایک لمحہ ضایع کرنے کا موقع نہیں ہے۔

(گنگا بائی جو کمرہ میں واپس آئی ہے اور راؤ آپا مل کر گٹھری اٹھاتے ہیں۔ وہ انند راؤ کو لیکر کمرہ سے بھاگتے ہیں۔ رانی پیچھے روانہ ہوتی ہے اور دروازہ پر ٹھہر کر گھومتی ہے اور حسرت کی نگاہ کمرہ پر ڈالتی ہے گویا کہ اس کا نقشہ صفحہ دماغ پر لے لینا چاہتی ہے۔ بالآخر سیدھی ہو کر ہاتھ جوڑ کر جھکاتی ہے اور ایک سسکی لیتی ہے)

منظر سوئم

(کوٹہ کی سرائے کا ایک باغ۔ شہر گوالیار کے قریب ایک خافلہ وقت غروب آفتاب تاریخ ۱۸ جون ۵۸ء)

برٹش افواج کا تانتیا ٹوپی اور رانی جھانسی سے جو دونوں تھوڑے عرصہ کے لئے گوالیار کے مالک بنگئے ہیں مقابلہ۔ مہاراجہ سندھیا نے اُس موقع پر اپنی سلطنت سے دست برداری کر لی ہے۔ رانی اپنی وردی میں ہے اور اُس کے بائیں ہاتھ میں گولی نے ایک سخت زخم کر دیا ہے اور سر پر بھی تلوار کا زخم لگا ہے۔ اُس کو باغ میں مرنے کے لئے لے گئے ہیں۔ اُس کے وفادار رفقا گنگا بائی اور راؤ آبا تیمار داری کر رہے ہیں۔ گنگا بائی بھی مردانہ وردی میں ہے اور سخت غمزدہ ہے۔ اُس کی گود میں رانی کا سر ہے۔ اُس کے زخم کو دھو رہی ہے اور تر کر رہی ہے۔ پانی باغبان نے ایک مٹی کے برتن میں لاکر دیا ہے۔ راؤ آبا ایک جانب کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔ اُس کا بھی جنگ میں ایک بازو کٹ گیا ہے اور بہت ہی مضطرب اور پژمردہ ہو گیا ہے۔ رانی کو ایک گدے پر لٹا دیا گیا ہے اور وہ بیہوش ہے۔ تھوڑے عرصہ میں وہ حرکت کرتی ہے اور کسی قدر ہوش میں آتی ہے اور غیر مسلسل تقریر کرتی ہے)

رانی :۔ (آنکھ بند رکھ کر) تانتیا صاحب کیوں حملہ نہیں کرتے ہیں۔ ہم ہمیشہ انگریزوں کو ابتدا کرنے کا موقع دیتے ہیں۔ ہم کو خود حملہ کرنا چاہئے۔ (ٹھہر جاتی ہے) انند! (پھر زور سے کہتی ہے) انند! (پھر ٹھہر کر اور زور سے کہتی ہے) انند!

(رانی بیٹھ جاتی ہے اور چاروں طرف دیکھتی ہے۔ پھر تکلیف سے بیتاب ہو کر بائیں جانب ہاتھ رکھ کر آہستہ سے آہ بھرتی ہوئی گدے پر گر پڑتی ہے۔ گنگا بائی اُس کا سر نرمی سے ہاتھ پر لے لیتی ہے)

رانی :۔ (کراہ کر) گنگا بائی! ہم کھو گئے!۔ کھو گئے! شیوجی نے ہم کو چھوڑ دیا۔ مہاراجہ سندھیا صحیح کہتے تھے۔ ہم جب لڑتے ہیں پیچھے ہٹا دئے جاتے ہیں۔ میرا باپ جا چکا ہے۔ انند بھی گیا۔ میں بھی اب جاتی ہوں۔ اُن کی طاقت کا بھید بڑی توپوں اور اُن کی تنظیم میں ہے۔

(خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ راؤ آبا اور گنگا بائی کی پریشانی بڑھ جاتی ہے۔ یکایک رانی بیٹھ جاتی ہے۔ اور پوری کوشش کرتی ہے کہ دوبارہ طاقت عود کرے۔ راؤ آبا سے کچھ کہنا چاہتی ہے راؤ آبا سر جھکا لیتا ہے)

رانی :۔ صوبے دار صاحب! میں آخری پیغام تمہارے ہاتھ تانتیا کو بھیجتی ہوں۔ جاؤ اور اُسے ڈھونڈھ کر کہدو کہ انگریز کوٹہ کی سرائے کی طرف کمزور ہیں۔ اُنھوں نے ہم کو بے شک ہمارے آدمیوں کی بزدلی کی وجہ سے شکست دیدی ہے۔ لیکن اگر وہ ادھر حملہ کریں تو سیپری تک کے مالک ہو جاویں گے۔ اور اس طرح مغرب کی طرف سے مرہٹہ راج میں داخل ہو جائیں گے۔ لکشمی بائی کا آخری سلام کہنا اور کہنا کہ میں حکم دیتی ہوں کہ جلد حملہ کر دیں۔ ورنہ دیر ہو جاویگی اور پھر کچھ نہ ہو سکیگا۔ جلد! جلد! تم اپنی وفادارانہ کارگزاریوں کے لئے دائمی نیکنامی کے مستحق ہو گے۔

(رانی تھک کر گر پڑتی ہے اور راؤ آبا زار و قطار رو کر زمین پر تعظیماً گر پڑتا ہے پھر وہ اُٹھ بیٹھتا ہے)

اور جھک کر رانی کے پیر چھوتا ہے اور ہاتھ پیشانی تک اُٹھاتا ہے۔ بالآخر اپنا سر جھکاتا ہے اور باغ سے باہر جاتا ہے۔ ذرا دیر کی خاموشی کے بعد رانی پھر کسی قدر ہوش میں آجاتی ہے)

رانی :۔ (آہستہ اور محبت کے ساتھ) انند! انند! جاؤ اور اپنی کتاب پڑھو۔ بیٹے! آج تم نے تلوار کی مشق خوب کی۔ ڈلہوزی صاحب نے جو کہا تھا اُس کو یاد رکھنا۔

(یکایک وہ بیٹھ جاتی ہے اور چلا اُٹھتی ہے۔ کمار انند کی جے۔ اور پھر گنگا بائی کی گود میں جان بحق تسلیم ہوتی ہے)

(رانی کی لاش کوٹہ سرائے کے باغ میں پڑی ہے۔ گنگا بائی اُس کے قدموں پر رو رہی ہے برٹش حکام چاروں طرف خاموش کھڑے ہیں۔ جنرل روز اندر آتا ہے۔ اور یکایک لاش کے سامنے ٹھہر جاتا ہے۔ اور کچھ لمحوں تک بغور لاش کو دیکھتا ہے۔ اور سیدھا کھڑا ہو کر اپنی تلوار میان سے کھینچ لیتا ہے اور رانی کو سلام کرتا ہے۔ دوسرے افسران بھی ایسا ہی کرتے ہیں اور سپاہی اسلحہ پیش کرتے ہیں۔

تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا

مدت سے ایک تذکرہ شعر کہنے والی خواتین کا ترتیب دے رہی ہوں گو بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔ تاہم مجھے خیال ہے کہ ابھی بہت سی خواتین نے اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کی ہے اس لئے سخن گو خواتین سے التماس ہے کہ جلد تر اپنے کلام بلاغت التیام سے معہ اِن حضرات کے اسماء گرامی کے جن سے مشورہ سخن اور اصلاح سخن فرماتی رہی ہیں اور وطن مقام پیدائش مئہ سن ہجری یا عیسوی تعلیم کہاں اور کس سے حاصل کی اب مشاغل کیا ہیں تمام امر کی مفصل کیفیت مرقومہ ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں۔

کلام وغیرہ بذریعہ رجسٹری روانہ کریں تاکہ گم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔

طاہرہ خاتون ذریعہ سید حسنین صاحب ہیڈ ماسٹر

گورنمنٹ ہائی اسکول بالاگھاٹ (سی۔ پی)

مسئلۂ خلافت

(ہر نام کے قلم سے)

مجھے یہ توقع ہرگز نہ تھی کہ میرے اُس خالص سلجھے ہوئے مضمون کے جواب میں جو "خلافت و امامت" کے عنوان سے "نگار" میں شایع ہوا تھا مضمون نگار اصحاب میری "شخصیت" کے متعلق بھی زورِ قلم ضرور صرف کریں گے۔

کوئی کچھ سمجھے۔ مجھے واقعی ہندو سمجھے اور یہ باور کرے کہ مجھے صرف بعض شیعہ احباب کی صحبت اور مطالعۂ کتب سے شیعی مذہب کے متعلق معلومات حاصل ہوئے اور میں نے محض ذوقِ تحقیق کی بنا پر کتابوں میں اُس کے بارے میں چھان بین کی اور غیر جانبدارانہ تصفیہ کی کوشش کی یا یہی خیال کرلے کہ میں شیعہ ہوں۔ اس کا اصل حقیقت مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

بے شک یہ اندازہ کرکے مجھے افسوس ہوا کہ مسلمانوں میں اب ذوقِ تحقیق اتنا گم ہوگیا ہے اور نظریں سطحی پہلوؤں کے دیکھنے کی اتنی عادی ہوگئی ہیں کہ باوجود ملک کے اخباروں اور رسالوں میں میرے مضمون کے متعلق غلغلہ بلند ہوجانے کے کوئی ایک مضمون بھی ایسا شائع نہیں ہوا جس میں میرے مضمون کے تمام جزئیات پر نظر ڈال کر تحقیقی حیثیت سے اُن کے جواب دینے کی کوشش کی گئی ہوتی۔

"نگار" مارچ ۳۵ء میں میرا مضمون شائع ہوا۔ اس کے پورے چار مہینہ کے بعد جولائی کے پرچہ میں میرے نادیدہ کرمفرما سید ابوسعید بزمی صاحب بھوپالی بی اے کا مضمون شایع ہوا جس کے ذیل میں حضرت مدیر نگار کا یہ نوٹ قابلِ لحاظ تھا کہ "ہر نام کے مضمون کا جواب متعدد حضرات نے بھیجا ہے ـــــ ان موصولہ مضامین میں ہم سب سے پہلے جناب بزمی بی اے کا مضمون شائع کرتے ہیں ـــــ اس کے بعد ہم اور مضامین بھی شائع کریں گے"

اس کے بعد قدرۃً مجھے انتظار پیدا ہونا چاہئے تھا اور یقیناً جواب الجواب کے لئے مجھے اُسوقت تک قلم اُٹھانے کا حق نہیں تھا جب تک میرے مخالف مضامین کا سلسلہ ختم ہو۔

لیکن افسوس ہے کہ اُس کے بعد نگار کے دو پرچے نکلے اور وہ بالکل اس بحث سے خالی ہیں۔ جناب نیاز کی وسیع الخیالی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ اگر دوسرے مضامین اُن کے معیارِ ذوق کے مطابق ہوتے تو وہ ضرور شایع کرتے۔

بہرحال اب میرا محورِ نظر صرف جناب بزمی کا مضمون ہے اس لئے کہ نگار کے بساط بحث پر سوائے اُسکے کوئی نہیں آیا ہے۔

پہلی بات جسے محل بحث قرار دیا گیا ہے اسلام میں "تعلیم اخلاق" اور "سیاست ملکی" کا باہمی تعلق ہے۔

نجانے میری کس لفظ سے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ میں پیغمبر اسلام کی زندگی سے "سیاست ملک" کو بالکل علٰحدہ کردینا چاہتا ہوں یا میں اسلام کو صرف ریاضت کرنے اور گوشہ میں بیٹھ کر عبادت کرنے کا ایک نظام قرار دینا چاہتا ہوں"۔

میرے الفاظ غور سے دیکھے نہیں گئے کہ "اگر رسول کی حیثیت صرف ایک بادشاہ کی سی نہ تھی بلکہ معلم روحانی ہونے کی خصوصیت بھی آپ میں پائی جاتی تھی تو ہم کو دیکھنا چاہئے کہ اس باب میں افضلیت کس کو حاصل تھی"۔

اس "صرف" اور "بھی" کے نظر انداز کردینے سے نقاد کے قلم کو دو صفحے نذرِ تحریر کرنا پڑے۔ یورپ کے مستشرقین خانۂ شہادت میں الگ بُلالئے گئے۔ جزیہ۔ ذمی۔ حربی۔ جہاد صد زنا و سرقہ وغیرہ کے ہدایات قرآنی کی دستاویزیں الگ پیش کردی گئیں اور اخلاق و سیاست کے باہمی ارتباط کی عقلی بحث الگ چھیڑ دی گئی۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں شیعہ اصحاب بھی ان دونوں چیزوں کو الگ الگ نہیں سمجھتے ہیں یعنے امامت کے حقوق کو صرف تعلیم اخلاق اور روحانی تربیت میں منحصر نہیں سمجھتے بلکہ سلطنت کو اُس کا لازمی جزو سمجھتے ہیں ورنہ انھیں خلفائے بنی اُمیہ و بنی عباس وغیرہ سے یہ شکایت کیوں پیدا ہوتی کہ اُنھوں نے صاحبان حقوق کے حق پر ناجایز قبضہ کرلیا۔ کیونکہ وہ چیز جس پر قبضہ کیا گیا سلطنت تھی۔ رہ گئی تعلیم روحانی اور ہدایت باطنی وہ کسی کے غصب کرنے کی چیز نہیں اور نہ اُس پر کوئی ناجایز قبضہ کرسکتا ہے۔

لیکن اس کے ساتھ پھر بھی جہاں تک میں نے تاریخ اسلامی اور فلسفۂ احکام اسلام کا مطالعہ کیا ہے میں اپنے ان الفاظ کا اعادہ کروں گا کہ "آنحضرت کی حیثیت ایک دنیاوی بادشاہ کی سی نہ تھی۔ آپ کا نصب العین کسی سلطنت کی بنیاد رکھنا نہیں تھا بلکہ ایک قوم بنا رہے تھے جو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ ہو۔ بظاہر یہی الفاظ شش و پنج میں ڈالنے والے ہیں تو سنئے۔

"دُنیاوی بادشاہت" میں اسے سمجھتا ہوں کہ جس کا مقصد اصلی صرف مادی اقتدار کا بڑھانا - آس پاس کے ممالک پر فوج کشی کرنا اور حدود مملکت کا وسیع کرنا کمزور اقوام کو مغلوب کرنا اور اپنی طاقت کا سکہ بٹھانا - مال و دولت سے سرکاری خزانہ کو بھرنا اور سرمایہ میں اضافہ کرنا ہوتا ہے -

اس بادشاہت کی پوری کامیابی کا معیار صرف سطوت و اقتدار کی زیادتی توسیع حدود سلطنت اور جاہ و حشمت کی فراوانی میں منحصر ہوتا ہے - جہاں نہ حق اور نہ ناحق کا سوال ہے - نہ عدل و انصاف کی شرط ہے - نہ اخلاق و آداب کی کوئی مراعات ہے -

اس کا معیار تفوق صرف جہانگیری و جہاں بانی ہے اور کچھ نہیں -

اس کے برخلاف "روحانی حکومت" جس کے نظام و قانون کو میں "سیاست الٰہی" کا مصداق سمجھتا ہوں وہ ہے جس میں ضروریات اجتماعی - لوازم تمدنی - انتظامات ملی سب بلندی اخلاق اور صحیح انسانیت کے سایہ میں انجام پائیں - وہاں اصل مقصد توسیع حدود مملکت کا نہو بلکہ قوم بنائی جارہی ہو انسانیت و اخلاق کے جوہر سے آراستہ - بے شک قوم کی تشکیل بغیر "قوانین اجتماعی" کے ہوتی ہی نہیں اور انھیں قوانین اجتماعی کا نام "نظام سیاسی" ہے - لیکن یہ "سیاست" اُس سیاست سے بالکل مختلف ہوتی ہے جو سلاطین دنیا کے پیش نظر ہوتی ہے -

یہ سیاست وہ ہے جو کسی طرح تربیت اخلاقی سے علٰحدہ جا ہی نہیں سکتی اور بالکل لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے -

---

یہ شیعہ اصحاب کی تنگ نظری سمجھئے یا بارگاہ رسالت میں حد سے زیادہ خوش اعتقادی یا جو کچھ کہ اُن کے خیال میں حضرت پیغمبر جس طرح اپنے زمانہ کے خود بہترین مصلح انفرادی و اجتماعی تھے اپنے مخصوصین میں وہی یہ سمجھ سکتے تھے کہ اُس روح اسلامی کی حفاظت کے ساتھ جو اُس کا اصلی طرۂ امتیاز ہے تمدنی و اجتماعی انتظامات کو کون درست کرسکتا ہے -

---

اُنھیں دُنیا کے اس عام اُصول میں کچھ تردد نہیں ہے کہ جو شخص کسی عہدہ کو بغیر کسی قباحت کے انجام دے اُسے اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا ہے لیکن اُن کا خیال یہ ہے کہ دنیا نے اُس عہدہ کے سمجھنے میں غلطی کی اس لئے انجام دینے نہ دینے کی حقیقت میں بھی دھوکا ہوا -

اُن کا مستقل خیال یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کے بعد جتنی بھی حکومتیں قائم ہوئیں اُن میں توسیع ملک - فتوحات - جاہ و حشمت کی فراوانی اور خزانہ و سرمایہ ملکی میں ترقی جتنی بھی ہوئی ہو لیکن اسلامی تعلیمات کی روح فنا ہوگئی اور

وہ باقی نہیں رہی۔

یعنے پیغمبری کی سنت کے بجائے کسروی و قیصری سنتیں قائم ہو گئیں اور اس لئے وہ ہرگز ہرگز ان حکومتوں کے دور کو کامیاب ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔

حضرت علی کے مختصر دور حکومت کے ظاہری حیثیت سے ناکامیاب رہنے کا پورا سبب یہ قرار دیتے ہیں کہ آپ بالکل اُسی سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے جو آنحضرت کی تعلیمات سے بالکل متحد تھا اور اس لئے آپ اجتماعات ملکی و تمدنی میں کلیتہً اُسی نظام کو بروئے کار لانا چاہتے تھے جو حضرت پیغمبر کا اصلی منشا تھا مگر اُمت اسلامیہ کے عام افراد کی پچیس ۲۵ برس کی طولانی مدت میں بالکل عادتیں و خصلتیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ آپ کے دور کی پوری کامیابی اُسی وقت کھل سکتی تھی جب آپ کی حکومت حضرت رسول اکرم کے بعد بلا فاصلہ تسلیم کر لی جاتی اور آپ برسر اقتدار ہو جاتے۔

پھر بھی اس حیثیت سے آپ کا دور انتہائی کامیاب ہے کہ اتنی مختصر مدت میں بھی آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ دنیاوی سلطنت والے بادشاہوں اور روحانی حکومت کے تاجداروں میں کیا فرق ہے اور "سیاست ملوکیہ" و "سیاست نبویہ" میں کتنا تفرقہ ہے۔

یہ کہنا کہ "حضرت علی ایک متقی، زاہد اور فداکار صحابی ہونے کے علاوہ نبی کریم کے چچیرے بھائی تھے۔ ابتدا سے آپ کے رفیق و معاون رہے۔ بعد میں داماد بھی ہو چکے تھے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ نبی کریم نے مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر آپ کے اوصاف بیان فرمائے ہیں"۔

اس کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو چند صفتیں حضرت علی کی شمار کرائی گئی ہیں ان میں سے "متقی" اور "زاہد" اور "فداکار" اور "صحابی" اور "رفیق و معاون" کی صفتوں میں تو جمہور اسلام دوسرے صحابہ کو حضرت علی کا ہم پلہ یا آپ سے چند قدم آگے قرار دیے ہوئے ہے۔ پھر اب رہ گیا جاتا ہے۔ چچیرا بھائی اور داماد ہونا۔ چچیرے بھائی ہونے کی صفت میں بھی عقیل اور جعفر شریک تھے اور داماد ہونے میں بقول مورخین اہلسنت حضرت عثمان حصہ دار تھے۔ پھر آخر مختلف اوقات میں مختلف حالات سے متاثر ہو کر حضرت علی ہی کے متعلق آنحضرت نے اُن اوصاف کا کیوں تذکرہ کیا۔ دوسرے صحابہ کے متعلق اُس طرح کے اوصاف کیوں ذکر نہیں فرمائے۔

اس کے علاوہ کیا پیغمبر اسلام صرف جذباتی انسان تھے کہ فقط اپنے چچیرے بھائی اور داماد ہونے کی

وجہ سے وہ تعریفیں کرنا شروع کر دیں۔ حالانکہ دوسرے صحابہ اُن اوصاف میں اُن سے بدرجہا بڑھے ہوئے ہوں۔

اگر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر بلا کسی دنیوی نفع کے اور بلا کسی رشتۂ قرابت و عزیزداری کے صرف اس لئے رسول پر جان دیتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے بھیجا ہوا ایک سچا راہنما ہے اور اپنی اس صداقت کے ثبوت میں اپنی حیات کے آخری سکون تک عشقِ رسول کا دم بھرتے رہتے ہیں۔ اپنی نوجوان لختِ جگر صاحبزادیوں کو اُس کے حبالۂ ازدواج میں دیدیتے ہیں۔ (بقول بزمی صاحب) اُس کے ایک ایک اشارہ پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچتے ہیں۔ اُس کے حکم کے سامنے اپنی ساری دھن دولت لٹا دیتے ہیں۔ غرضکہ وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ایک جانفروش کو کرنا چاہئے لیکن اس کے باوجود بھی جب موقع پڑتا ہے تو رسول علی کے اوصاف میں رطب اللسان نظر آتے ہیں اور ان حضرات کے لئے ویسے اوصاف اور اتنی کثرت سے کبھی بیان نہیں کرتے صرف اس لئے کہ یہ اُن کے مقابلہ میں رسول کا بھائی اور داماد ہے ـــــ تو پھر اس کا نام "متعصبانہ اعزہ پرستی" (Favouritism) نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اگر اس کو بدترین قسم کی "بیرحمانہ جانبداری" اور "غیر منصفانہ پاسداری" نہیں کہہ سکتے تو اور کیا کہیں گے؟ لیکن تاریخ اسلامی کا ہر اسٹوڈنٹ جانتا ہے کہ نبی کریم کی ذات گرامی اس قسم کی تنگ نظریوں سے بہت بلند ہے۔

میری جانب سے اس سوال کا جواب بہت آسان ہے۔

میں کہتا ہوں کہ نبی کریم قدم قدم پر اشارۃً اور تصریحاً حضرت علی کو اپنا قایم مقام بنانے کی رہبری کرتے رہے۔ لیکن مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کے ساتھ کیا اتنا بھی حسن ظن نہ رکھنا چاہئے کہ آپ کا یہ فعل کسی عزیزداری کے لحاظ اور بیجا پاسداری پر مبنی نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اس ذات میں کمالات و خصوصیات ایسے موجود ہیں جو پیغمبر اسلام کو آپ کی تعریف و توصیف پر آمادہ کرتے ہیں اور آپ کو اپنا قایم مقام بنانے کی دعوت دیتے ہیں۔

اگر ایمان بالنبی جو اسلام کا جزوِ اعظم ہے مسلمان ضروری سمجھیں تو اس کہنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ ایسا ہی سمجھنا ضروری ہے۔

یہ سوال کم از کم میرے سامنے عجیب و غریب ہے کہ "اگر فی الواقع نبی کریم حضرت علی کو اپنا خلیفہ بنانے پر مامور ہو چکے تھے تو پھر آپ نے علیٰ رؤس الاشہاد اس کا اعلان کیوں نہیں کیا۔

اس صورت میں یہ سوال کرنے کے آخر معنی کیا ہیں۔

یہ اسلام کا اتنا اہم داخلی مسئلہ۔ اُس کے حل کے لئے مستشرقین یورپ کے دامن سے تمسک۔ میری سمجھ میں تو نہیں آتا۔ کیا مستشرقین یورپ تعلیمات اسلام کی روح کو سمجھ گئے ہیں؟ تو پھر کیا حضرت پیغمبر کی ذات پر جو بہت اعتراضات اُن کی طرف سے وارد ہوتے رہتے ہیں اُنھیں صحیح تسلیم کیا جائے!

میرے تمام مضمون کو چھوڑ کر جس میں احادیث بالکل پیش ہی نہیں کئے گئے ہیں بلکہ صرف تاریخی واقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جناب بزمی صاحب نے موئیدین امامت کی ایک دلیل پیش فرمائی ہے۔ "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" اس کے مقابلہ میں آپ نے چند حدیثیں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے فضائل میں ذکر کی ہیں۔ مجھے میرے سنی احباب معاف فرمائیں گے۔ آپ حضرات کی بحث کا بھی انداز ایک غیر جانبدار کو آپ کی استدلالی قوت سے بدگمان بنا دیتا ہے۔ ہم ہمیشہ یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شیعہ اپنے مطلب کی جتنی باتیں پیش کرتا ہے نام لے لے کر صفحہ سطر کا حوالہ دے دیکر آپ کی کتابوں سے۔ آپ اُس کے جواب میں یہ کہدیتے ہیں کہ ہماری بس ایک صحیح بخاری ہے اور کچھ نہیں۔۔ (دیکھو وہ مضمون جو ہمارے جواب میں رسالہ "فاران" بجنور میں نکلا ہے) اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ صحیح بخاری کے علاوہ جتنی تفسیر۔ حدیث۔ علم رجال و سیر کی کتابیں ہیں وہ سب دریا برد کر دینے کے قابل ہیں۔ حالانکہ صحیح بخاری میں بھی شیعوں کے مطلب کی روایتیں مل ہی جاتی ہیں۔

لیکن آپ جب شیعوں کے مقابلہ میں حدیثیں پیش کرنے پر آتے ہیں تو وہی اپنی کتابوں سے یعنی صحیح بخاری اور دوسرے صحاح سے۔ اب بتائیے شیعہ اُن حدیثوں کو کیوں تسلیم کریں گے اور ایک غیر جانبدار پر اُن روایتوں کا کیا اثر پڑے گا؟

خدا بخش کی لائبریری کے قرآن کو جہاں تک مجھے معلوم ہے شیعہ بھی تسلیم نہیں کرتے۔ پھر اُس کے تذکرہ سے نتیجہ کیا؟۔ "ثانی اثنین اذ ہما فی الغار" کی آیت کے متعلق ہمارے مضمون میں کافی تبصرہ موجود ہے۔ اب آپ بغیر اُس پر کچھ نقد و تبصرہ فرمائے ہوئے یہ کہدیں کہ "یہ آیت غیر مشتبہ طور پر حضرت ابوبکر کی منقبت کو ظاہر کرتی ہے" تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اُسے کس طرح وقعت دی جائے؟

"سبقت اسلام" کے متعلق حضرت علی کی فضیلت کو سبک کرنے کے لئے جو خامہ فرسائی فرمائی گئی ہے وہاں "کاوش فکری" کے ساتھ "ژولیدگی خیال" کا اثر نمایاں ہے۔

"نوجوانی میں انسانی دماغ غیر پختہ ہوتا ہے" مگر انسان میں ذوق تحقیق ہوتا ہے اور قوت خیال وساوس و اوہام زیادہ پیدا کرتی ہے اس لئے ان تمام شکوک و اوہام کے مقابلہ میں کسی حقیقت پر سر تسلیم خم کر دینا کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔ "چچیرے بھائی" اور قریب کے عزیز دوسرے بھی موجود تھے لیکن اُنھیں وہ سبقت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ بہر حال سبقت ایک شرف ہے جو "السابقون السابقون اولئک المقربون" میں معیار تقرب قرار دیا گیا ہے۔ اُس میں عزیز اور غیر عزیز۔ نوعمر اور پختہ کار کی کوئی تفریق نہیں کی ہے لیکن ہمارا مضمون دیکھ لیا جائے۔ ہم نے اسکو

کوئی مستقل دلیل خلافت نہیں قرار دیا ہے۔ آخر ہمارے مضمون کے سلسلہ دلائل کو مرتب صورت سے سامنے رکھکر اُس پر تبصرہ کیوں نہیں کیا گیا!

کہا جا رہا ہے کہ "ابتدائے اسلام میں ایک مرتبہ نبی کریم نے اپنے اعزا کے سامنے اسلام کو پیش کرتے ہوئے حضرت علی کے متعلق کہا تھا " ان ہذا اخی و وصیی و خلیفتی فیکم " لیکن اس سے خلافت علی پر استدلال کیا جانا کسی صورت سے صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس وقت رسول کریم کی پوزیشن ایک بے یار و مددگار " لیڈر " سے زیادہ نہ تھی۔ اور اس لئے ان جملوں سے اس موقع کے لحاظ سے جو کچھ مراد لی جا سکتی ہے۔ وہ اس سے زیادہ نہ ہونا چاہئے کہ حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ اُن کو اُس حالت میں نبی کریم کا واحد معتمد علیہ قرار دیا گیا ہے "۔

یہ الفاظ جنھیں پورا نقل کر دیا گیا ہے مجھے بہت افسوس ہے کہ ایک مسلمان کے قلم سے دیکھ رہا ہوں۔ کیا نبی کریم مسلمانوں کی نگاہ میں مکّار لوگوں کی طرح دنیا دار۔ حیلہ باز۔ خود غرض۔ اور ابن الوقت تھے؟ انھوں نے بے یار و مددگار ہونے کی وجہ سے وقتی طور پر حضرت علی کی حوصلہ افزائی کے لئے کہدیا کہ یہ میرے وصی ہیں۔ یہ میرے خلیفہ و جانشین ہیں۔ اس طرح کام نکال لیا اور ان جملوں کے معنی کچھ بھی نہیں تھے؟

میں تو سمجھ سکتا ہوں کہ حضرت محمد مصطفےٰ کی سچائی۔ امانت اور دیانت اور بے لوث اخلاق قولی و عملی کو جاننے والا کوئی غیر مسلم بھی آپ کی نسبت اس خیال کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

اس جگہ حضرت علی کی امامت و خلافت کے تذکرہ میں بالکل بے جوڑ طریقہ سے یہ کہدیا گیا ہے کہ جو شخص حضرت علی کو صحیح تسلیم کریگا تو حضرت حسن کو بھی مانیگا لیکن آپ نے حضرت علی کے قاتل ابن ملجم سے جس طرح انتقام لیا ہے اُس کو دیکھکر اُن کی اخلاقی فضیلت کا معیار کیا قائم رہتا ہے۔

اس کے جواب میں پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ ایک غیر جانبدار شخص کے سامنے حضرت علی کی خلافت کی بحث میں امام حسن کی امامت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ بہت ممکن ہے وہ تحقیق کی بنا پر حضرت علی کی امامت کو تسلیم کرے اور حضرت حسن کو تسلیم نہ کرے۔ اس کے علاوہ جو واقعہ حضرت حسن کی نسبت پیش کیا جا رہا ہے اُس کو شیعہ فریق فرقۂ خوارج کی اختراع قرار دیتا ہے۔ لہذا قابل تسلیم نہیں ہے۔ پھر اسکے مقابلہ میں وہ متفقہ تاریخ کا واقعہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر نے فجاءِ سلمی کو زندہ آگ ڈالکر جلوا دیا۔ اس کے متعلق سوال پیدا ہوگا کہ اخلاقی معیار فضیلت کی بنا پر یہ فعل صحیح سمجھا جائے گا یا نہیں۔

مجھے بھی اب زیادہ تفصیلی بحث نہیں کرنا ہے۔ میرا گزشتہ مضمون درحقیقت ابھی تک بالکل کورا ہے اور

اُس تک دست نقد و اعتراض نہیں پہونچا ہے۔

شیعیت کے ایرانی سایۂ تربیت میں ایجاد ہونے کے فرضی افسانے بنانے سے حقیقت بدل نہیں جائے گی۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ان چیزوں سے بالکل علحدہ ہے۔

سب سے آخر میں مجھے اس فقرہ پر ریمارک کرنا ہے کہ "خلافت و امامت کا مسئلہ نہ تو کوئی ایسا مسئلہ ہو جو آج درخور اعتناء کہا جا سکے اور نہ "شیعیت" اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ۔ خلافت کو اہمیت ہے یا نہیں اسکو تو مسلمان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو اس بحث کی اہمیت مسلمانوں کی عملی اخلاقی و تعلیمی زندگی کے اعتبار سے سمجھی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے احکام و تعلیمات مذہبی میں کن پیشوایان دین کو اپنا راہنما قرار دیں اور اُن کے تعلیمات پر عمل کریں۔ اسی طرح یہ فقرہ کہ "نہ شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ"۔

اس کا جواب شیعہ ہی دے سکتے ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں میں افتراق اسی قسم کی تعبیری بے اعتدالیوں کی وجہ سے ہے۔ آپ کہئے گا "شیعیت اسلام کا کوئی مذہبی فرقہ نہیں" شیعہ کہیں گے "سنیت اسلام کا مذہبی فرقہ نہیں"۔ نتیجہ اس کا انتشار ہے اور کچھ نہیں۔ یہ کبھی ہو جائے کہ سنی سب شیعہ بن جائیں یا شیعہ سب سُنّی غیر ممکن — لیکن اتحاد و اتفاق کی صورت یہ ہے کہ آپ اُن کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کیجئے اور اُن کا احترام کیجئے۔ وہ آپ کی مذہبی حیثیت کو تسلیم کریں اور احترام کریں چلئے اس طرح یہ شیرازہ مجتمع رہیگا اور ملت اسلامیہ کا نظام درہم برہم نہوگا — خدا جانتا ہے مسلمانوں کا خیر خواہ ہوں اس لئے اتنا لکھ ہی دیا نہیں تو مجھ سے کیا مطلب۔ فقط

ہرنام

(نگار) "ہرنام" کے مضمون "مسئلۂ خلافت" پر ملک کے اخبارات و رسایل میں جو کچھ لکھا گیا اس کا مجھے تفصیلی علم نہیں ہیں تو صرف اسقدر جانتا ہوں کہ اس کے جواب میں اہل سنت کی طرف سے جو مضامین مجھے موصول ہوئے ان میں صرف ایک بزمی صاحب کا مقالہ ایسا تھا جو اشاعت کے قابل سمجھا گیا۔ (درانحالیکہ ہرنام کے مضمون کا وہ بھی کوئی معقول جواب نہ تھا) باقی اتنے پست تھے کہ نگار میں ان کی اشاعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکتا تھا۔ اس دوران میں زبانی و تحریری دونوں طرح مجھ پر تقاضہ کیا گیا کہ میں اپنی رائے اس مسئلہ پر ظاہر کروں، لیکن میں نے اس وقت تک اس لئے اس مطالبہ کو پورا نہیں کیا کہ جب شیعہ و سنی دونوں حضرات اپنی اپنی کہہ لیں تو یہ "کافر" اپنی رائے پیش کرے۔

پھر اب کہ اس انتظار میں کافی زمانہ گزر گیا ہے اور ہرنام صاحب کا دوسرا مضمون بھی بزمی صاحب کے جواب میں موصول ہو چکا ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مزید سوال و جواب کے لئے اس بحث کو جاری رکھا جائے، جبکہ اس موضوع پر حقیقتاً نہ سنی اپنے عقاید سے ہٹ کر فیصلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ شیعہ اپنے "حُبِ علیؓ" کے جذبہ کے ماتحت "بغض معاویہ" سے باز آسکتا ہے۔

جس اختلاف کی بنیاد خود رسول اللہ کے زمانہ میں پڑ چکی ہو، اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے والے اب تیرہ صدی سے زیادہ طویل زمانہ گزرنے کے بعد کہاں میسر آسکتے ہیں جبکہ وضع احادیث کی ٹکسال نے اس گتھی کو بجائے سلجھانے کے ہمیشہ اُلجھانے ہی کی کوشش کی۔

جیسا کہ میں اس سے قبل کی اشاعت میں عرض کر چکا ہوں اس امر کا فیصلہ نہ احادیث سے ممکن ہے اور نہ اُن تاریخی روایات سے جن کی بنیاد بھی حدیث پر قایم ہے، کیونکہ دونوں فریق میں سے ہر ایک دوسرے کی پیش کردہ روایات کو غلط قرار دیتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں فیصلہ وہی کر سکتا ہے جو دونوں فریق کی روایات کو غلط قرار دیکر یا دونوں کو صحیح سمجھ کر اپنی تحقیق و جستجو کی بنیاد بھی بالکل نئے اُصول پر قایم کرے ۔۔۔ یہی میرا مدعا ہے اور یہی چاروناچار مجھے کرنا ہے۔

ہرنام کا مضمون شایع کرنے کے بعد میرے متعلق جو رائیں لوگوں نے قائم کیں وہ خلاف توقع نہ تھیں، اہل سنت نے سمجھا کہ میں مصلحتاً شیعہ بننا چاہتا ہوں، حضرات شیعہ نے خیال کیا کہ یہ بدنصیب شیعہ کیا بن سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی نے نہ سوچا کہ وہ شخص جو اب سرے سے مذہب کی ضرورت ہی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے، شیعہ و سُنّی کے ان لغو مباحث کو کیا اہمیت دے سکتا ہے اور احادیث پر قائم کئے ہوئے ناکارہ دلایل پر وہ تشیع یا تسنن دونوں میں سے کسی ایک کو کیوں ترجیح دینے لگا۔

بہرحال قبل اس کے کہ میں اس موضوع پر قلم اُٹھاؤں، ناظرین نگار کو یقین دلا دینا چاہتا ہوں کہ میرا مسلک سنی و شیعہ کے تفرقہ سے بہت بلند ہے اور میں جو کچھ لکھوں گا وہ بالکل میری اپنی ذاتی رائے ہوگی، سنیوں کی روایات سے علحدہ، شیعوں کے دلایل سے بالکل جُدا ۔ ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو نہ سنی ہے نہ شیعہ، نہ ہندو ہے نہ مسلمان، بلکہ ایک انسان ہے اور انسانیت ہی کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھ کر اس مسئلہ پر گفتگو کرنا پسند کرتا ہے۔

ہر چند مجھے معلوم ہے کہ جو کچھ میں لکھوں گا وہ اہل سنت اور اہل تشیع دونوں کے لئے باعث برہمی ہوگا، لیکن مجھے یہ برہمی گوارا ہے اور تسنن و تشیع دونوں میں سے کسی ایک کی طرف منسوب کئے جانے کی ذلت مجھے منظور نہیں۔

جی چاہتا تھا کہ اسی مہینے میں برنام صاحب کے مضمون کے ساتھ ہی اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتا لیکن چونکہ ایک طویل سفر درپیش ہونے کی وجہ سے اور بہت سے کاموں کا ہجوم ہے، اس لئے میں اپنی مفصل رائے ماہ آیندہ تک ملتوی کرتا ہوں۔

اس دوران میں برہمن واڑی حیدر آباد سے ایک اور ہندو (برنام) کا مضمون موصول ہوا تھا جس میں انھوں نے مسئلۂ خلافت و امامت پر اپنے بعض شبہات پیش کر کے مجھ سے ان کا جواب چاہا تھا۔ لیکن چونکہ ان کا جواب دینا اپنی رائے کو ظاہر کر دینا تھا اس لئے میں نے اسکی اشاعت ملتوی رکھی تھی، اب میں اسی سلسلہ میں ان کو بھی لیلوں گا۔ امید ہے کہ برنام صاحب اس تعویق کو معاف فرمائیں گے۔

اگر برنی صاحب یا کوئی اور ابھی کچھ کہنا چاہتے ہیں تو وقت باقی ہے۔ میں ایک ماہ کی مہلت اور دینے کے لئے طیار ہوں، لیکن یہ خیال رہے کہ جو کچھ لکھا جائے وہ یا تو برنام کے اعتراضات کا کوئی مسکت جواب ہو، یا پھر مذہبی عقاید سے بالکل ہٹ کر ایسا جواب دیا جائے جو شیعہ و سُنّی دونوں کو مطمئن کر دینے والا ہو یا یوں۔

حکم قرار دئے جانے دیوالیہ

(دفعہ ۲۷- ایکٹ ۵ سنہ ۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بار ایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲، ۷ سنہ ۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان

۱۔ موتی ولد دنی
۲۔ مسماۃ بچھمن زوجہ موتی
} اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

موتی و مسماۃ بچھمن کی درخواست دیوالیہ مورخہ ۲۵ مئی سنہ ۳۵ء کو پڑھنے اور فریقین کے بیانات کو سننے کے بعدیہ حکم دیا جاتا ہے کہ مدیونان مذکور دیوالیہ قرار دئے گئے اور وقت ۶ ماہ کے اندر اپنی درخواست بریت گزرانیں۔ المرقوم ۲۰ ستمبر سنہ ۳۵ء

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

انتقام

کرشن دیال اس زمانہ کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا تھا، اُس نے اپنے بچپن کا زمانہ اپنے والدین کے ساتھ گاؤں میں گزارا جو اپنے خیالات اور عمل کے لحاظ سے بیحد قدامت پسند واقع ہوئے تھے، اس نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے پاٹ شالہ میں حاصل کی، اور انگریزی اُسوقت تک شروع نہ کر سکا جب تک وہ تیرہ برس کا نہو گیا، وہ گھر میں عورتوں کے ساتھ مویشیوں کا سا برتاؤ ہوتے ہوئے دیکھنے کا عادی تھا، اس لئے ہر شخص کو حیرت تھی کہ وہ کس طرح جدید خیالات کو اپنے ذہن میں جگہ دینے کے لئے آمادہ ہوگیا۔

وہ ایک برہمن پنڈت کا لڑکا تھا، یہ ممکن تھا کہ وہ اپنے گاؤں ہی میں رہ کر گزر کر لیتا، لیکن وہ ایک معمولی وظیفہ کی مدد پر کلکتہ انگریزی پڑھنے کے لئے چلا آیا، وہ برہمن ہی نہیں بلکہ کلن برہمن تھا۔ وہ ایک درجن شادیاں کر سکتا تھا، اور اس سے جو کچھ روپیہ ملتا، اس پر اپنی زندگی گزار سکتا تھا لیکن اس نے صرف ایک شادی کی، جب رادھا رانی اس کی شریک حیات ہوگئی، تب اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دینے اور کلکتہ میں مستقل قیام کا ارادہ کر لیا۔ اس کے باپ نے احتجاجاً اس کی امداد بند کر دی، اور خط و کتابت کا سلسلہ بھی ترک کر دیا، لیکن جب بیٹا ذرا بھی نادم نہ ہوا تو باپ کو بیحد خفت ہوئی۔ کرشن دیال ہوشیار طالب علم تھا، اس نے ہمیشہ وظائف اور ٹیوشن حاصل کئے اور اس طرح کبھی روپیہ کی زیادہ تکلیف نہ اُٹھائی، اُس کی اور اس کی بیوی کی زندگی بہر حال گزر رہی تھی۔ جب اس نے ایم۔ اے پاس کیا اور نوکری ملی، اسی سال اس کے پہلوٹی کی ایک لڑکی راجندر رانی پیدا ہوئی۔

کرشن دیال خوشی سے دیوانہ ہوگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اُس میں دُنیاوی دانائی نہیں تھی، لیکن اس کی بیوی رادھا رانی نے اپنے شوہر کی معیت و قربت سے اپنی یہ خصوصیت زیادہ ضائع نہیں کی تھی، اس نے ایک دن منہ بنا کر کہا:۔ "کیا بیوقوفی ہے، ایک لڑکی اور وہ بھی ایک کلن لڑکی، اس پر اس قدر ناز کرنے سے فائدہ؟ بیکار ایک ہنگامہ برپا کر رکھا ہے ــــ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عمر بیٹھی رہیگی، آج کل ایک معقول بر ڈھونڈھنا بہت مشکل ہے۔ بہت سے لوگ تھوڑی رقم کی وجہ سے اپنی لڑکیاں نیچ گھرانوں میں بیاہ دیتے ہیں۔

"کیا بُرائی ہے" کرشن دیال نے کہا "ہمیں اس وقت رنج ہوتا ہے جب لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں اس لئے کہ وہ پرائے گھر کی ہوتی ہیں۔ اس سے تو لڑکیاں اگر اپنے والدین کے ہی یہاں رہیں تو اچھا ہے"

رادھارانی کا شاداب چہرہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ ہو گیا۔ اس نے کہا:۔ تم ایک بچے کے باپ ہو چکے ہو اور تم اب بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ تمھیں کب عقل آئے گی؟

کرشن دیال نے ہنسی میں بات ڈال کر گفتگو ختم کر دی۔ لیکن اُسے دل ہی دل میں یہ سوچ ضرور پیدا ہو گیا کہ کہیں اس کی لڑکی، بیوی اور اس کے درمیان، نزاع کا باعث نہ ہو جائے۔

راجندر رانی بڑی ہوتی گئی اور والدین کی محبت میں بگڑتی بھی گئی، اس کے دو چھوٹے بھائی اور پیدا ہوئے اور اس طرح رادھارانی کی تمنائیں بہت کچھ پوری ہو گئیں لیکن اسے یہ شکایت بدستور رہی کہ راجندر رانی کو اسکے باپ نے بالکل بگاڑ دیا ہے۔ وہ اکثر شوہر سے کہتی:۔ "تم نے لڑکی کا بالکل چوچلوں میں ناس کر دیا بتاؤ اس کا کیا حشر ہو گا۔ لڑکیوں کو بہت مُنھ نہیں لگانا چاہئے بلکہ انھیں نظرانداز کر دینا بہتر ہے۔ اس طرح اگر انھیں آئندہ مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تو وہ آسانی سے بھگت لیں گی"

تو تمھاری منطق کے بموجب اُنھیں فاقے کرانا چاہئیں، اس اندیشہ سے کہ شاید انھیں آئندہ آسودگی سے کھانے کو نہ ملے"

رادھارانی کے الفاظ پرزور تھے لیکن اس کے دلائل میں زور نہ تھا، اس لئے وہ کچھ دیر کے بعد اپنے شوہر کو "الفاظ کا بادشاہ" اور "باتیں ملانے والا" کہکر خاموش ہو جاتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن دیال نے تھوڑا سا اپنی لڑکی کو بگاڑ ضرور دیا تھا لیکن وہ اس کی تعلیم کی طرف سے بے خبر نہ تھا۔ وہ اُسے خود بھی پڑھاتا اور ایک علٰحدہ اُستانی بھی اُس نے سینا پرونا اور گانا سکھانے کے لئے مقرر کر دی تھی، چند روشن خیال برہمو خاندانوں کو چھوڑ کر اس زمانہ میں کسی لڑکی کو یہ باتیں نہیں سکھائی جاتی تھیں اسی لئے کرشن دیال کے لئے یہ مشہور ہو گیا کہ وہ بالکل عیسائی ہو گیا ہے۔ اس کے رشتہ داروں نے اسے انتہائی تکبر کے ساتھ چھوڑ دیا، لیکن وہ اب بھی مالی امداد کے خواہشمند ہوتے اور جب کلکتہ آتے تو اس کے یہاں ٹھہرنے سے بھی دریغ نہ کرتے۔

راجندر رانی پورے بارہ سال کی ہو گئی — اس مرتبہ دونوں میاں بیوی میں خوب لڑائی ہوئی، رادھارانی نے عہد کر لیا کہ وہ جس طرح ہو گا لڑکی کی شادی کر دے گی۔ اس کا شوہر بیوقوف تھا، اس نے طے کر لیا کہ وہ اُسکی پیروی نہ کرے گی۔ اُس نے اپنے عزیزوں کی مدد سے راجندر رانی کے لئے شوہر کی تلاش شروع کر دی۔ کرشن دیال جمارہا اور اُس نے وہ تمام معقول پیام جو اس کی بیوی نے جمع کئے تھے، ایک ایک کرکے رد کر دئے۔

رادھا رانی پھر ایک لفظی جنگ کے لئے آمادہ ہوگئی "ہاں تو تمھارا ارادہ کیا ہے۔ کیا لڑکی کو عمر بھر بٹھائے رکھنے کی ٹھانی ہے؟" اس نے خطرناک سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں اُسے دریا میں جھونکنے سے رہا۔ میں کس سے اس کی شادی کروں؟"

"کیوں، میں نے اتنے لڑکے تبلائے، ان میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ تمھاری لڑکی کہیں کی شہزادی تو ہے نہیں کہ اُس کا اسقدر خیال کیا جاوے۔"

"میں نے تم سے ہزار بار کہدیا کہ میں اسقدر کم عمری میں اس کی شادی نہیں کرنا چاہتا، پھر تمھیں کیوں خواہ مخواہ ضد ہے کہ جو کوئی ملے اس سے تم اس کی شادی کرنے کے لئے آمادہ ہوجاؤ۔ میں نے اسی لئے ہر ایک پیام کوئی نہ کوئی عذر پیش کر کے رد کر دیا۔ تمھیں معلوم ہے کہ ایک کلن برہمن کی لڑکی ساٹھ برس تک بلکہ ساری عمر بغیر کسی بدنامی کے کنواری رہ سکتی ہے۔ پھر تم کیوں آخر اسقدر خفا اور پریشان ہو۔"

"اگر تم میری بات سمجھتے تو مجھے ذرا بھی دقت نہوتی — تمھاری لڑکی برہمو اور عیسائی لڑکیوں سے زیادہ بے حجاب ہوتی جارہی ہے۔ اگر تم اسے زیادہ عمر تک کنواری رکھو گے تو وہ خود اپنی پسند کی شادی کرے گی اور پھر اگر اس نے کسی خراب گھر کے لڑکے کو پسند کیا تب؟"

"وہی سب سے اچھا گھر ہوگا، جس کو وہ خود پسند کرے گی۔"

"تمھاری طرح نا — کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ اس کی شریف گھرانے اور اچھی ذات کے لوگوں میں شادی ہو۔"

"لڑکی خود ہر بات دیکھے گی۔ اپنے انتخاب سے تکلیف اُٹھانا اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ دوسروں کی پسند کا غلام ہو کر عمر بھر عیش سے گزار دے۔"

غرض دونوں میں اسی طرح کی نوک جھونک قائم رہی — راجندر رانی جوان ہوتی گئی — اُسے بیتھون اسکول میں داخل کر دیا گیا اس لئے کہ کرشن دیال کو اب پڑھانے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ آیندہ سال وہ میٹرک کا امتحان دینے والی تھی، اُس نے ہر شخص سے کہدیا کہ وہ یقینی پاس ہوگی اور پھر کالج میں داخلہ کرائیگی وہ اکثر اپنے بھائیوں کو تنگ کرتی اس لئے کہ جہاں تک پڑھنے کا تعلق تھا، اس کا اور اُن کا کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ اس کی ماں ان حرکتوں سے بہت ناراض ہوتی لیکن پھر بھی ایک تبسم صرف کئے بغیر نہ رہتی — راجندر رانی کی عمر میں وہ ماں بن چکی تھی۔

کرشن دیال محض عورتوں کی تعلیم ہی کا حامی نہ تھا بلکہ آزادئ نسواں کا بھی موافق تھا۔ رادھا رانی سوائے اپنے عزیزوں کے ہر شخص سے پردہ کرتی تھی۔ جو لوگ بہت بوڑھے اور ضعیف ہوتے تھے اُن کے سامنے بھی

وہ گھونگھٹ نکال کر جاتی تھی، مگر راجندر رانی نے کبھی اس قسم کی عادتیں اختیار نہیں کیں۔ وہ ہر شخص کے سامنے آتی تھی، اور ہر شخص سے بات کرتی تھی۔ ایک نوجوان رانیندر، اس کے دونوں بھائیوں کو شام کے وقت پڑھاتا تھا۔ وہ اس سے بے حجابانہ گفتگو کرتی اور اکثر پڑھائی میں اس کی مدد لینے سے احتراز نہ کرتی، رادھا رانی کو یہ باتیں بہت ناپسند تھیں لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کے باپ نے اسے اسقدر بگاڑ دیا ہے کہ اب زجر و ملامت بیکار ہے۔ رانندر برا آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک معقول اور مالدار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا اس کے اطوار نہایت پاکیزہ اور شریفانہ تھے۔ اسے اپنے باپ سے کچھ اختلاف تھا اور اسی بنا پر گھر بار چھوڑ دیا تھا اور یہ ارادہ کر لیا تھا کہ اب خود کما کر زندگی بسر کرے گا، چنانچہ اب وہ ٹیوشن کر کے گزارہ کر رہا تھا، وہ لڑکوں کو پڑھانے کیلئے رکھا گیا تھا لیکن در اصل وہ اپنا زیادہ وقت راجندر رانی کو دیتا تھا۔ اور یہ کئی مہینے سے ہو رہا تھا۔

پہلے پہلے تو رادھا رانی اس سے چشم پوشی کرتی رہی، اگرچہ اس نے کبھی یہ سلسلہ پسند نہیں کیا لیکن رفتہ رفتہ یہ اس پر ظاہر ہونے لگا کہ اب معاملات اس کے قبضۂ اختیار سے باہر نکل گئے ہیں اس نے سوچا کہ اگر راجندر رانی کو روکا نہ گیا تو خدا معلوم وہ کیا سے کیا کر بیٹھے۔ شوہر سے اُسے کسی مدد کی توقع نہ تھی اس لئے کہ وہ لڑکی کی ہر زیادتی پر ہمت افزائی کے لئے آمادہ تھا۔

راجندر رانی کی جانچ کا امتحان ہونے والا تھا، اس لئے اس نے نومبر سے ہی سخت محنت شروع کر دی وہ ذرا بھی آرام نہ کرنا چاہتی تھی اور نہ نریندر اسے آرام کرنے دیتا تھا۔ راجندر رانی کے بھائی البتہ مسلسل آرام کر رہے تھے۔

رادھا رانی کبھی کبھی اپنے بچوں کی پڑھائی دیکھنے کے لئے باورچی خانہ کا کام چھوڑ کر چلی آتی تھی۔ وہ روزانہ ایک ہی منظر دیکھتی ـــ راجندر رانی پڑھتی ہوتی، نریندر اُسے بتاتا ہوتا، دونوں لڑکے بیرن اور ہیرن ہر قسم کی شوخیوں میں مشغول ہوتے۔ رادھا رانی نریندر کے سامنے نہیں آتی تھی اس لئے باوجود ناگواری کے خاموش رہی۔

لیکن ایک روز اُسے اپنا سکوت توڑنا پڑا۔ وہ حسب دستور دروازہ میں سے جھانک رہی تھی کہ اس نے راجندر رانی کو دیکھا کہ سوال نکال رہی ہے اور نرمیندر اپنی تمام روح کو آنکھوں میں لئے ہوئے اُسے برابر دیکھ رہا ہے۔ لڑکے حسب معمول ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔

رادھا رانی اس منظر کی تاب نہ لا سکی، اس کا دماغ کھول رہا تھا۔ اپنے اوپر قابو نہ پاکر، وہ دوسرے کمرے میں زور سے چلائی:۔ "لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہیں یہی مناسب ہے، اگر ہمیں لڑکی کیلئے ماسٹر کی ضرورت ہوگی، تو ہم خود رکھ لیں گے۔" وہ زور سے کمرہ کے باہر چلی گئی ـــ تھوڑی دیر میں نوکرانی آئی

اور راجندر رانی سے کہا: - "چلئے بی بی آپ کو اندر بلا رہی ہیں"۔

اس مداخلت نے غیر متوقع نتائج پیدا کئے راجندر رانی، رامیندر سے الگ رہنے پر مجبور کی گئی۔ لیکن اس جبریہ علحدگی نے اسے اپنے احساسات کا اندازہ کرنے کا موقع دیا۔ اُسے اپنی جراحتوں اور بے چینیوں کو معلوم کر کے حیرت تھی، رامیندر روزانہ لڑکوں کو پڑھانے آتا تھا۔ لیکن اس کا ذرا بھی جی نہ لگتا۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنا کام پورا کرتا اور چلا جاتا۔ کبھی کبھار راجندر رانی کی ایک جھلک دکھائی دیتی اور کبھی وہ بھی نہیں۔ رادھا رانی نے اپنے شوہر کو یہ سمجھا دیا تھا کہ راجندر رانی کی موجودگی بچوں کی تعلیم میں بہت حارج ہوتی ہے، اس لئے اسنے اُس کو وہاں جانے سے منع کر دیا ہے۔ کرشن دیال کو اس کا یقین آگیا تھا اور اس نے راجندر رانی سے کہدیا تھا کہ وہ خود اس کو پڑھائے گا اگر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوگی۔

اس طرح دو تین مہینے گزر گئے۔ راجندر رانی نے جانچ کا امتحان بھی پاس کر لیا اور میٹرک بھی۔ لیکن اتنے اچھے طریقہ سے نہیں جیسی کہ اسے توقع تھی۔ اس کی صحت بھی دفعتاً خراب ہونے لگی۔

رادھا رانی کو ان سب باتوں کا گمان پہلے ہی سے تھا، آخر تو وہ اُس کی ماں تھی۔ ــــ اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوگیا، اس کے غصہ کی انتہا ہوگئی۔ وہ دوڑی ہوئی شوہر کے پاس گئی اور کہا: - "اب تمہیں صبر آیا؟ ــــ اس غریب کا آخر کیا ہونا ہے؟"

"تمہیں اسقدر کیوں اُلجھن ہے ــــ اگر تمہارا گمان صحیح بھی ہے تو اس میں اسقدر غصہ کی کیا بات ہے نرمیندر سے شادی کرنے میں کیا برائی ہے؟"

"خوب یہ کس طرح ممکن ہے، تم ذات، مذہب، برادری کنبہ ہر چیز قربان کر دینا چاہتے ہو"۔

"کیوں، وہ بھی تو برہمن ہے"۔

"برہمن!" رادھا رانی نے غضبناک ہو کر کہا: - "اگر چکروتی بھی برہمن ہونے لگے تو تمہارے یہاں جھینگر بھی چڑیاں کہلانے لگیں گی۔ مجھے یہ شوخیاں نہیں بھاتیں، اگر تمہیں یہی کرنا ہے تو مجھے پہلے سے بتا دو تاکہ میں کہیں کو منھ کالا کر جاؤں"۔

"لیکن خاندان سے زیادہ شخص خاص کا خیال کرنا چاہئے۔ کیا ایک بڑے خاندان سے کسی رذیل کو تجویز کر لینا، ایک چھوٹے خاندان سے شریف کے تجویز کرنے کے مقابلہ میں بہتر ہے؟ بتاؤ کون لڑکی کو زیادہ خوش رکھ سکے گا"۔

"یہ سب قسمت کی باتیں ہیں" رادھا رانی نے عقلمندانہ انداز میں کہا "ایک لڑکی کی مسرت خود اسکے بنائے نہیں بنتی ــــ وہ بے حیا لڑکیاں جو خود شوہروں کا انتخاب کرتی ہیں وہ بھی سب کی سب خوش نہیں رہتیں

اور نہ ہم، جنھیں ہمارے والدین بیاہتے ہیں، سب کی سب اسقدر آزردہ ہوتی ہیں۔ یہ سب فضول باتیں ہیں۔ ہمیں جو بڑوں سے ہوتی آئی ہے، اُسے نہ چھوڑنا چاہئے۔"

"یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ کون خوش ہے اور کون ناخوش" کرشن دیال نے کہا۔ "اس لئے کہ اس بارہ میں کسی قسم کے اعداد شمار سرکاری یا غیر سرکاری حاصل نہیں ہیں۔ میں تمھیں اپنی رائے بتا چکا ہوں میرے نزدیک اپنے انتخاب کے باعث تکلیف اُٹھانا بہتر ہے بہ نسبت اس کے دوسروں کے غلام ہو کر تمام عمر چین سے گزار دی جائے۔

رادھا رانی ذرا بھی مطمئن نہ ہوئی۔ اس نے یہ نزاع برابر قایم رکھی۔ اس نے بار بار یہ بات دھرائی کہ وہ اس سال کے اندر اندر راجندر رانی کی شادی کر دے گی۔ اب وہ کسی کی بھی نہیں سُنے گی۔ اسکے خاندان کی کوئی لڑکی کالج میں پڑھنے کا ارادہ نہیں رکھتی، اگر وہ ہر معاملہ میں اس طرح ڈھیل دئے جائے گی تو وہ خاندان میں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہے گی ۔۔۔ کرشن دیال سنجیدگی کے ساتھ اُٹھا اور چلا گیا۔

اب گھر کی فضا غیر یقینی ہوتی جا رہی تھی، بالکل وہی کیفیت تھی جو طوفان اُٹھنے سے قبل ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں کوئی لڑائی نہیں ہوئی اس لئے کہ کرشن دیال ذرا الگ ہی الگ رہا لیکن کوئی مفاہمت کی صورت بھی نہ تھی۔

بچے پوری پوری چھٹی منا رہے تھے۔ ہر شخص کو اس کا خیال تھا کہ وہ اپنا وقت کس طرح گزارے۔ غریب راجندر رانی کے لئے یہ سوال سب سے زیادہ تکلیف دہ تھا، اس کا نہ کوئی ساتھی تھا اور نہ اُسے کوئی کام تھا۔ زندگی اب اس کے لئے ریگزار کی سی وحشت کا نام تھا۔ رامیندر کو اس کے باپ نے بلا لیا تھا۔ اس لئے وہ گھر چلا گیا تھا۔ بچوں کے پاس وہ اپنا پتہ چھوڑ گیا تھا لیکن اُن کے دل میں کبھی اُسے لکھنے کا خیال بھی پیدا نہ ہوا۔ راجندر رانی اس کا حال معلوم کرنے کے لئے بیتاب تھی۔ اگر اس کی آنکھیں صرف دو لفظ اسکے لکھے ہوئے دیکھ لیتی تو اُسے تسکین ہو جاتی، لیکن وہ ایک بنگالی لڑکی تھی جو خاموشی ہی کے ساتھ مصیبتیں جھیلنے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔

راجندر رانی پہلے گھر کے کام میں ماں کو تھوڑی بہت مدد دیدیا کرتی تھی۔ اب رادھا رانی اس سے زیادہ امداد کی متمنی تھی اس لئے کہ وہ اسکول سے فارغ تھی لیکن اس کی ماں کو بالکل ناامید ہونا پڑا۔ اب اُسے گھر کے کام میں ذرہ برابر دلچسپی نہ تھی۔ راجندر رانی اس سے قبل گھر کو آئینہ کی مانند صاف اور ستھرا رکھتی تھی لیکن اب وہ ہفتہ میں چھ دن تک ہر چیز بے التفاتی کے ساتھ پڑی رہنے دیا کرتی تھی۔

تاہم وہ ایک دن ڈرائنگ روم اور مطالعہ کا کمرہ صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اس کے باپ کی

میز حسب دستور اس کے لئے ذوق نگاہ کا سامان رکھتی تھی، اُسے ہمیشہ یہ کونہ صاف کرنے میں دیر لگتی تھی، وہ بڑی بڑی کتابوں کی گرد صاف کرکے اُن کو ترتیب دینے سے قبل اُن کا ڈھیر لگا رہی تھی - کہ ایک کتاب میں سے ایک لفافہ گرا، اس نے فوراً اُٹھا لیا، اس کے طرز تحریر سے وہ آشنا تھی ـــــ وہ اُسے بیحد عزیز تھا۔

یہ خط اس کے باپ کو لکھا گیا تھا، وہ کبھی اس کا مضمون دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوتی لیکن ایک "جذبۂ بے اختیار شوق" نے اچھے بُرے کی تمیز اُٹھا دی ـــــ اس نے لفافہ چاک کیا اور دم بخود ہو کر پڑھنا شروع کر دیا۔

اُس نے پورا کمرہ صاف نہیں کیا، کسی نہ کسی طرح اس نے خط اس کی جگہ واپس رکھدیا، گئی اور جا کر اپنے پلنگ پر پڑ رہی۔ رادھا رانی نے کچھ دیر بعد راجندر رانی کو وہاں دیکھ کر مضطربانہ پوچھا :- "کیوں، کیا بات ہے؟"

راجندر رانی نے دیوار کی طرف منھ کئے ہوئے کہا "میری طبیعت بہت خراب ہے" کامل دو روز تک وہ اپنے کمرہ میں رہی، نہ اُٹھی، نہ کھانا کھایا، نہ پانی پیا - حتیٰ کہ کسی کو دیکھنے کی بھی متحمل نہ ہوئی۔

یہ خط جس کا ذکر ہے، رانیندر نے کرشن دیال کے کسی خط کے جواب میں لکھا تھا - اس میں اس نے لکھا تھا کہ وہ بچوں کو پڑھانے سے معذور ہے اس لئے کہ اس کے باپ نے اُسے گھر بلا لیا ہے اور اس کی ماں سخت بیمار ہے - اس نے کرشن دیال کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اُسے داماد بنانے کے لائق سمجھا لیکن چونکہ اس کے باپ نے اس کی شادی دوسری جگہ ٹھہرا دی ہے اس لئے وہ افسوس کے ساتھ معذرت خواہ ہے - آج کل چونکہ اس کا باپ پریشانیوں میں مبتلا ہے اس لئے وہ اس کی درخواست کو رد کرکے اُس کو رنج پہونچانا نہیں چاہتا۔

ایک انسان ہمیشہ رنج و غم میں بسر نہیں کر سکتا ـــــ راجندر رانی کا غم کم ضرور ہوا لیکن اس کا شباب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا - وہ ایک معمر عورت کی طرح سنجیدہ اور متین ہو گئی کچھ عرصہ میں رانیندر کی شادی کا دعوت نامہ آگیا اسی دن راجندر رانی اپنے باپ کو گھسیٹ کر اپنے ساتھ کالج لے گئی اور داخلہ کرا لیا - رادھا رانی نے بہت کچھ ہائے ویلا مچائی لیکن اُس نے ذرا بھی پرواہ نہ کی - اس کے بعد وہ گویا صرف اپنی تعلیم کے لئے زندہ تھی، لیکن راجندر رانی کی قسمت میں شاید سکون تھا ہی نہیں - ابھی سال ختم بھی نہ ہوا تھا کہ کرشن دیال بہت سخت بیمار ہوا ـــــ رادھا رانی کی آہ و بکا نے فضا کو اور مکدر کر دیا - وہ ہر آئے گئے کے سامنے سسکیاں لے لے کر اُس "بار گراں" کی شکایت کرتی جو اس کا شوہر اُس کے اوپر چھوڑے جا رہا ہے۔

راجندر رانی کے صبر کی انتہا ہو چکی تھی، اُس کے اور اُس کی ماں کے تعلقات کبھی خوشگوار نہیں تھے اب یہ ہر وقت کے طعنوں اور حوالوں نے اس کا دل چھلنی کر دیا - "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق وہ ایک دن چیخ اُٹھی :- "تو پھر تم میری شادی کر کیوں نہیں دیتیں - اس گھر سے تو کم از کم کوئی گھر خراب نہ ہو گا"

ان الفاظ پر رادھا رانی کے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی، لیکن وہ انھیں بھولی نہیں ـــــ بہت سی

حجامنیں، اور نائنیں آئیں، بہت سی باتیں ہوئیں۔ کرشن دیال اس قدر بیمار تھا کہ وہ کسی رائے کا اظہار ہی نہ کرسکا۔ اس لئے تمام معاملات کم وبیش راجندر رانی ہی کی خواہش کے بموجب طے ہوئے۔ بہت سے اچھے اور برے پیاموں میں سے اس نے ایک شخص کو پسند کیا جس کی پہلی بیوی مرچکی تھی اور جس کی عمر بہت زیادہ تھی۔ جس کے کوئی بچہ نہ تھا۔

ہر شخص کو اس کے انتخاب پر حیرت تھی، اور ہر شخص اس بات کا خواہشمند تھا کہ کسی طرح وہ اپنی رائے تبدیل کردے لیکن اس سنگدل میں ذرا بھی تبدیلی نہوئی ——— "اگر تمھیں میری شادی کرنا ہے تو سمجھ لو کہ میں اُسی شخص سے شادی کروں گی اور کسی سے نہیں" اس نے ایک آہنی عزم کے ساتھ صاف کہدیا۔

چنانچہ راجندر رانی کی شادی اسی معمر شخص سے ہوگئی۔ رخصتی کے وقت رادھا رانی نے اپنے آہ ونالہ کی انتہا کردی لیکن راجندر رانی کی آنکھوں میں ایک آنسو بھی نہ تھا۔ البتہ جب وہ اپنے نیم بیہوش باپ کے سامنے باادب جھکی، اسوقت وہ لوگوں سے چھپا کر اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔

وہ اپنے نئے گھر اُسی "سنگین" چہرہ کے ساتھ آگئی، گھر کی عورتوں نے تمام رسمیں برتیں۔ نئے عزیز تعارف کے لئے آئے۔ وہ عمر میں چھوٹی تھی، لیکن گھر میں بہت سے لوگوں کی بڑی تھی اسی لئے وہ ایک سکون آمیز طمانیت اور بردباری کے ساتھ کھڑی رہی اور دونوں اصناف اور ہر عمر کے لوگوں کے آداب قبول کرتی رہی۔ ایک نند کھڑی ہوئی سب کا تعارف کرا رہی تھی۔ راجندر رانی نے جب ایک شخص کو دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ یہ ایک نوجوان شخص تھا اور صورت سے ملول معلوم ہورہا تھا۔ "یہ تمھارا بھتیجا نریندر ہے" نند نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ نریندر نے ظاہر دارانہ طور پر آداب کیا اور جلدی سے کمرے کے باہر چلا گیا۔

راجندر رانی بڑی لڑکی تھی، اس لئے سسرال سے زیادہ عرصہ الگ رہنے کا کوئی عذر نہیں ہوسکتا تھا وہ ایک دو روز کو میکہ گئی اور پھر آگئی۔ جب دن کرشن دیال کا انتقال ہوا، وہ پھر ماں کے گھر چلی آئی تھی خوش قسمتی سے کرشن دیال کا انتقال بغیر دوبارہ ہوش میں آئے ہوئے ہوا اور اسے یہ کبھی نہ معلوم ہوسکا کہ اُس کی چہیتی بیٹی نے جان بوجھ کر زندگی بھر کا ایک عذاب اپنے سر مول لے لیا ہے۔

راجندر رانی اُسی دن واپس آگئی۔ وہ اپنے گھر سے زیادہ وقت کے لئے الگ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لئے کہ اس کی غیر موجودگی میں کوئی ایک دن کے لئے بھی گھر کا دیکھنے والا نہ تھا۔ اسی لئے اُس کے شوہر نے ایک جوان اور تعلیم یافتہ عورت سے شادی کی تھی جو آتے ہی گھر کی مالک بن جائے۔

چوتھے دن اس نے اپنے باپ کی سردھرڑے پیمانہ پر کی۔ وہ پچھلی رات نہ سو سکی تھی اس لئے کہ اپنے مرحوم باپ کی یاد میں برابر آنسوؤں کے ہار پروتی رہی۔ لیکن صبح کو اس کا چہرہ بالکل بے اثر تھا۔ جس پر رنج وغم کے

ذرا بھی آثار نہیں تھے۔ مہمانوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور آپس میں کہنے لگے "عجیب عورت ہے! اس کی آنکھوں میں آنسو کی ایک بوند بھی نہیں۔ ایک عورت کو اس قدر سنگدل نہیں ہونا چاہیئے"۔

تمام دن قریب قریب مہمانوں کو کھانا کھلانے میں صرف ہو گیا۔ شام کو قدرے خاموشی ہو گئی۔ راجندرانی اُس برآمدہ میں تنہا بیٹھی تھی جو اس کے سونے کے کمرے کے سامنے تھا۔ اس کا شوہر نیچے مہمانوں کے ساتھ تھا۔ اسوقت دفعتاً نرینڈر آیا۔ وہ راجندرانی کے قریب آیا اور کہا، "میں ان دنوں برابر تنہائی کا موقع ڈھونڈھتا رہا لیکن نہیں ملا۔ کیا میں تم سے ایک سوال پوچھ سکتا ہوں۔ یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، تم مجھے حقارت کے لائق بھی نہ سمجھ کر آسانی سے بھول جاتیں"۔

راجندرانی شاید اپنی شادی کے بعد پہلی بار ہنسی "میں نے تم سے دو باتیں سیکھی ہیں" اُس نے کہا "ایک یہ کہ آدمی کو اپنے والدین کے خلاف کبھی کچھ نہ کرنا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ روپیہ دنیا میں ہر چیز کے مقابلہ میں بڑی چیز ہے"۔

نرینڈر کچھ دیر خاموش رہا اور پھر کہا "میرے قصور کے لئے میرے سارے گھر والوں کو تو خطاوار نہ ٹھہراؤ۔ تم خوب جانتی ہو کہ ہماری سب کی زندگی کا سہارا اور بھروسا چچاہی جی ہیں"۔

"لیکن مجھے اپنے پرے بیلے کو پہلے دیکھنا چاہیئے"۔ راجندرانی نے کہا۔

راتیندر نے زیادہ گفتگو بیکار سمجھی۔ آج اُسے اپنے گناہ کبیرہ کا احساس ہوا۔ ایک وہ لڑکی جو پھول کی طرح نرم و نازک تھی اور نسیم سحری کی طرح پاکیزہ۔ آج وہ اس حرکت کی وجہ سے ناگن کی طرح بیرحم اور پتھر کی طرح جامد و سخت ہو گئی تھی۔ اب وہ مجبور تھا، ایک سنگین مجسمہ کے اندر وہ روح نہیں ڈال سکتا تھا وہ آہستہ سے چلا گیا۔

رادھارانی اپنی لڑکی کی عقل کا ماتم کرتی رہی، لیکن اُسے اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ وہ اُس سے زیادہ ہوشیار رہے گی۔ ایک سال ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ راجندرانی گھر کی تنہا مالکہ ہو گئی اور اُس تمام دولت کی قابض جو اس کے بوڑھے شوہر کی ملکیت تھی۔ کسی کو یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ اُس نے کس طرح کیا۔ تمام وابستگان کو الگ کر دیا انھوں نے بہتیرا برا بھلا کہا، کوسنے دئے لیکن راجندرانی نے ذرا پرواہ نہ کی۔ رادھارانی ان کوسنوں پر کانپ اُٹھتی لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ راجندرانی نے اُس سے تمام تعلقات قطع کر لئے تھے اسی طرح برس گزر گئے۔

ایک دن رادھارانی اپنی لڑکی کے گھر روتی ہوئی آئی اور اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔ راجندرانی بھی اب بیوہ تھی، وہ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک تھیں۔ اُسے ماں کے آنسو پسند نہ آئے

اور اس نے کہا:- "تم کیوں روتی ہو، انسان کو بہر حال ایک نہ ایک دن مرنا ہے"۔ رادھا رانی کے حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ "کیا تم پتھر کی بنی ہوئی ہو؟" اُس نے پوچھا "وہ پھر بھی تمہارا شوہر تھا۔ تم استنے عرصہ اس کے ساتھ رہی ہو۔ کیا اس کے لئے ذرا بھی دُکھ نہیں محسوس کرتیں"۔

راجندرانی نے خشمگیں چہرہ بنالیا اور ماں کے پاس سے اُٹھ کر چلی گئی۔

اُسے اپنی ماں کا مکان ناقابل برداشت معلوم ہونے لگا۔ وہ اب اس گھر کی تھی ہی نہیں لیکن اب وہ کہاں رہے؟ خود اپنا بڑا مکان سنسان اور ویران تھا، وہاں تنہا رہنے کی اس کی ہمت نہوتی تھی۔ اُسکے پاس کافی دولت تھی۔ اس کا کوئی مصرف نہ تھا۔ اُس کی گزرگاہ بدستور ایک بے آب وگیاہ سرزمین ہی تھی۔

وہ رفتہ رفتہ بالکل بت ہوتی جارہی تھی ـــ ساکت اور جامد ـــ اس کی ماں خفا بھی ہوئی کہ "اس قدر احساس نہ کرو۔ ذرا مجھے دیکھو اور صبر حاصل کرو۔ اگر قسمت سخت سے سخت مصیبتیں بھی ڈالے تب بھی زندہ رہنے کے لئے برداشت کرنا پڑتی ہیں"۔

"کیا تم میرے بھتیجے نرنیندر کو ایک دفعہ کے لئے بلادوگی؟" راجندرانی نے پوچھا،

"کیوں اب تمھیں اُس سے کیا لینا ہے؟" ماں نے سخت آواز میں کہا۔

رادھارانی نے مجبوراً اپنے چھوٹے لڑکے کو رانیندر کے بلانے کے لئے بھیجدیا۔

رانیندر نے اول اول آنے سے انکار کیا۔ لیکن لڑکا بغیر اس کے سرکنے والا نہیں تھا اس لئے وہ مجبوراً آگیا۔ بیرنندر نے اُسے ملاقات کے کمرے میں بٹھادیا۔ اس کے بعد اُس نے اپنی بہن کو بلوایا۔ راجندرانی اپنے ٹرنک میں سے ایک بھاری لفافہ نکال کر، رانیندر کے پاس پہونچی۔ جب وہ داخل ہوئی رانیندر کھڑا ہوگیا لیکن وہ کچھ بولا نہیں۔

راجندرانی نے لفافہ اُس کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھایا "اسے حفاظت سے رکھنا"۔ رانیندر اس کو قبول کرنے سے پہلے ذرا گھبرایا۔

"یہ کیا ہے" اُس نے پوچھا۔

"یہ ایک دستاویزی تحفہ ہے" راجندرانی نے کہا "جو میں نے دوسروں کا چرایا تھا، وہ میں واپس کرتی ہوں"۔

"کیوں؟ تم ایسا کیوں کرتی ہو؟" رانیندر نے پوچھا ـــ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "ابھی ہم مرے نہیں، تمہارا انتقام تو غیر مکمل رہے گا"۔

"نہیں اب یہ مکمل ہوچکا ہے۔ تم نے دولت کے غرور میں ایک عورت کے جذبات کو اسقدر مجروح کیا

کہ وہ موت کی طلبگار ہو گئی۔ لیکن اب تمھیں اُسی عورت سے ایک فقیر کی طرح یہ بھیک قبول کرنا ہے"۔

نریندر اس عطیہ کو پھینک دینا چاہتا تھا لیکن اس کا ہاتھ رُک گیا۔ سخت افلاس نے اس کے جذبات سرد کر دئے تھے۔

نریندر کچھ فاصلہ سے کھڑا تھا۔ وہ اب قریب آیا اور کہا "تم بالکل ترک و انکار پر آمادہ ہو۔ تم آخر زندگی کس طرح گزارو گی ؟"

"تم اندیشہ نہ کرو" راجندر رانی نے کہا "میں تمھارے اوپر نہیں رہوں گی۔ ماں نے مجھے غلامانہ تابعداری کا سبق سکھایا اور باپ نے وحشیانہ آزادی کا۔ لیکن ان میں سے ایک چیز بھی میرے سکون کا باعث نہ ہوئی مجھے ایک دوسرا راستہ تلاش کرنا پڑے گا"۔

"تم کہاں جاؤ گی ؟ راجندر رانی" ، نریندر نے دریافت کیا۔

"میں نے محبت کے راستہ میں بھی غلطی کی اور انتقام کے راستہ میں بھی۔ میں کوئی اور راستہ ڈھونڈھنے کی کوشش کروں گی۔ میں یہ مکان آج ہی رات کو چھوڑ دوں گی"۔

"کیا تم مجھے اپنا پتہ دیتی جاؤ گی ؟" نریندر نے پوچھا۔

"نہیں" راجندر رانی نے مختصراً کہا۔

(ترجمہ) خواجہ احمد فاروقی۔ بچھرایونی

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اُردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات، شوخی و رنگینی، سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف

مکتوبات نیاز

میں نظر آئیں گی۔ اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی۔ ضخامت ۸۰۸ صفحات کاغذ دبیز۔ قیمت معہ محصول ۴ؔ؎ ۔ کتاب مجلد شائع ہوئی ہے

منیجر نگار۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

شاعری کا معیار صحیح اور غالبؔ

(جناب لطافت حسین صاحب - مراد آباد)

میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کے نزدیک شاعری کا صحیح معیار کیا ہے اور غالبؔ کی شاعری اس معیار پر پوری اترتی ہے یا نہیں — میں دیکھتا ہوں کہ آپ کو بہت کم شعر کسی کی غزل کے پسند آتے ہیں اس لئے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کن اُصول کے ماتحت حُسن و قبح پر حکم لگاتے ہیں۔ ممکن ہو تو غالبؔ ہی کے اشعار مثالاً پیش کر کے جواب دیجئے۔

(نگار) آپ کے سوال کا جزو اول جس تفصیلی جواب کا مقتضی ہے اس کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں، لیکن جزو ثانی چونکہ ایک محدود و متعین بحث سے آگے نہیں بڑھتا اس لئے میں فی الحال اس کی طرف توجہ کرتا ہوں اور یہی غالباً آپ کا بھی مقصود ہوگا۔

یہ بالکل درست ہے کہ مجھے بہت کم شعر پسند آتے ہیں، لیکن ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب میں کیا دوں جبکہ اس کا تعلق صرف ذوق و وجدان سے ہے اور الفاظ سے ظاہر کرنے کی چیز نہیں۔ تاہم چونکہ ہر ذوق ایک استدلال خفی بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے، اسلئے میں دو چار مثالیں پیش کر کے اس کو واضح کرنے کی کوشش کرونگا۔

جو وقت غزل کا کوئی شعر میری نگاہ سے گزرتا ہے، تو سب سے پہلے میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس میں کس خیال کو پیش کیا گیا ہے اور اگر وہ خیال اچھا ہے تو پھر انتخاب الفاظ و انداز بیان کو دیکھتا ہوں کہ وہ اصل جذبہ کو کما حقہ ظاہر کرتا ہے یا نہیں — اگر ان دونوں میں کامل توافق پاتا ہوں تو سمجھتا ہوں کہ مکمل ہے، اور اگر اس میں کمی ہوتی ہے تو اسی نسبت سے اس کے حسن و قبح پر حکم لگاتا ہوں۔

اب رہا یہ امر کہ میں کس خیال یا جذبہ کو پسند کرتا ہوں اور کس اصول پر اسلوب بیان کی ہمواری یا ناہمواری

پر حکم لگاتا ہوں، اس کے تمام جزئیات کی تفصیل تو دشوار ہے، لیکن مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ میرے نزدیک وہی جذبہ زیادہ پسندیدہ ہے جو واقعیت سے زیادہ قریب ہے اور اس لئے وہی اسلوب بیان مجھے پسند آنا چاہئے جو اس حقیقت سے زیادہ متاثر کرنے والا ہو ــ خیال کی دقت اور بیان کی ژولیدگی غزل میں میرے نزدیک نہایت مکروہ چیز ہے۔ ایک غزل کے شعر کا لطف یہ ہے کہ اس کو سنتے ہی مفہوم ذہن نشین ہو جائے اور انسان کو سوچنا نہ پڑے کہ کہنے والا کیا کہنا چاہتا ہے اور الفاظ سے اس کا مدعا کیونکر ظاہر ہو سکتا ہے۔ الغرض خیال کی پاکیزگی اور انداز بیان کی حلاوت و سلاست جب دونوں پورے توازن کے ساتھ ایک جگہ جمع ہو جائنگی تو میں اسے بہترین نمونۂ تغزل قرار دوں گا اور اگر ان دونوں میں سے کسی میں اصلاح یا حذف و اضافہ کی گنجایش ہوئی تو یقیناً میرا ذوق پوری طرح آسودہ نہ ہوگا۔

اب میں آپ ہی کی خواہش کے مطابق کلام غالب سے چند مثالیں پیش کر کے اس کو زیادہ واضح طور پر بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

مثلاً آپ غالب کی اولین غزل کو سامنے رکھئے۔

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ
صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہئے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنی عالم تقریر کا

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

پہلا شعر جس حد تک صرف الفاظ کا تعلق ہے، قابل شکایت نہیں لیکن چونکہ خیال بہت بعید الفہم ہے، اسقدر بعید الفہم کہ خود غالب کا بیان کیا ہوا مطلب بھی اچٹا ہوا سا نظر آتا ہے، اس لئے یکسر تغزل سے علٰحدہ ہے دوسرے شعر کا دوسرا مصرعہ نہایت سلجھا ہوا ہے اور اس میں کسی اصلاح کی گنجایش نہیں۔ شعر کا مفہوم بھی حدود تغزل میں آتا ہے، اور پہلا مصرعہ بھی غنیمت ہے۔ میں نے غنیمت اس لئے کہا کہ اسرا مر، لفظ "کاو کاو" اچھا نہیں، اگر اس مفہوم کو لفظ کاوش سے ادا کیا جاتا جو کاو کاو کا مترادف ہے تو یہ نقص دور ہو جاتا۔ مثلاً یوں:۔

کاوشیں اب سخت جانیہائے ہجراں کی نہ پوچھ

تیسرے شعر کے دونوں مصرعے علٰحدہ علٰحدہ اچھے ہیں، لیکن چونکہ دونوں کا تعلق بالکل لفظی رعایت اور مفروضہ باتوں پر منحصر ہے اس لئے شعر مہمل ہے۔ محض اس لئے کہ دم شمشیر تلوار کی تیزی و آبداری کو کہتے ہیں اور لفظ دم سانس کے معنے میں بھی آتا ہے "سینۂ شمشیر" پیدا کر کے اس کا باہر ہونا دکھایا گیا ہے۔ علاوہ اس کے

کسی کے جذبۂ شوق کا اثر کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ تلوار اپنے آپ میں نہ رہے۔ الغرض یہ شعر بہ لحاظ تغزل بالکل قابل اعتنا نہیں۔ چوتھے شعر کا مفہوم صرف اسقدر ہے کہ میری بات کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی اور ظاہر ہے کہ غزل سے اس خیال کو کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پانچویں شعر میں ایک ادعا ہے بغیر کسی ثبوت کے محض لفظ آتش کی رعایت سے حلقۂ زنجیر کو "موئے آتش دیدہ" کہا گیا ورنہ یوں بیتابی کے لحاظ سے جو "آتش زیرپا" ہونے کا صحیح مفہوم ہے، حلقۂ زنجیر قیامت تک "موئے آتش دیدہ" نہیں بن سکتا۔ الغرض مفہوم و بیان دونوں حیثیتوں سے یہ شعر تغزل سے خارج ہے۔

اب میں غالب کے چند اشعار ایسے پیش کرتا ہوں جو بہت مقبول و مشہور ہیں لیکن اس قسم کے نقائص سے خالی نہیں۔

کہیں نظر نہ لگے اُسکے دست و بازو کو ۔۔۔ یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

شعر بہ ظاہر نہایت مکمل معلوم ہوتا ہے اور حدود غزلگوئی کے اندر بھی ہے، لیکن ایک غائر نگاہ انتقاد سمجھتی ہے کہ اس میں کیا نقص ہے۔ شعراء کے یہاں زخم و جراحت، خنجر و شمشیر کا ذکر صرف بہ سبیل مجاز و کنایہ ہوا کرتا ہے یعنی نہ تلوار سے مراد آہنی تلوار ہوتی ہے اور نہ زخم سے واقعی وہ زخم جو گوشت پوست کو متاثر کرتا ہے اسلئے اگر کوئی شاعر ان چیزوں کا ذکر کرتے ہوئے کسی ایسی چیز کو بھی شامل کر دے جو مجاز و کنایہ کو واقعہ و حقیقت میں بدلدے تو یہ شاعری کا نقص ہے۔ غالب دوسرے مصرعہ میں زخم جگر کے الفاظ لکھتا ہے جو ہمیشہ بہ صورت مجاز و کنایہ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ میں دست و بازو کی تعیین ہمیں مجبور کرتی ہے کہ زخم جگر کا مفہوم وہی لیں جو حقیقتاً ایک زخم کا ہوا کرتا ہے۔ اس لئے یہ شعر غزل کی لطافت سے بالکل علحدہ ہو کر فنون سپہ گری کی حد میں آگیا کہ تلوار سے حملہ کرنے کی وہ کونسی صورت ہو سکتی ہے کہ ایک ہی ہاتھ میں جگر تک کاٹ کر جائے۔ اگر اس شعر کا پہلا مصرعہ یوں ہوتا:۔

نگاہِ ناز کو اسکے کہیں نظر نہ لگے

تو یہ نقص باقی نہ رہتا۔

مومن نے بھی اسی مضمون کو ایک شعر میں باندھا ہے لیکن حد درجہ لطافت کے ساتھ لکھتا ہے:۔

میرے تغیر رنگ کو مت دیکھ ۔۔۔ تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے

دیر نہیں حرم نہیں، در نہیں آستاں نہیں ۔۔۔ بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اُٹھائے کیوں

اس شعر کو صرف ایک لفظ غیر نے پایۂ تکمیل سے گرا دیا۔ کیونکہ غیر، در سے اُٹھا سکتا ہے آستان سے اُٹھا سکتا ہے، لیکن دیر و حرم سے اسے کیا تعلق۔ اس لئے اگر بجائے غیر کے لفظ کوئی استعمال ہوتا تو وہ

دیر و حرم پر بھی حاوی ہو سکتا تھا۔ علاوہ اس کے لفظ کوئی کا اشارہ خود محبوب کی طرف ہوتا اور اس صورت میں شعر کا سوز و گداز زیادہ بڑھ جاتا۔

ابھرا ہوا نقاب میں ہے اُنکے ایک تار مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

اس شعر میں صرف ایک لفظ تار نے جو نگاہ، اور نقاب دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے، غالب کو جادۂ اعتدال سے ہٹا دیا، اور رعایت لفظی سے کوئی مفہوم پیدا ہونے نہ دیا ورنہ ظاہر ہے کہ تار نگہ کوئی مرئی و مادی چیز نہیں کہ نقاب کے ابھرے ہوئے تار پر اس کا شبہ ہو سکے۔

یہ چند مثالیں میں نے ان اشعار سے لی ہیں جو عام طور پر بہت مشہور ہیں اور نہایت پاکیزہ سمجھے جاتے ہیں۔ ورنہ غالب کا وہ حصۂ کلام جو اس رنگ کا ہے۔

کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے برق خرمنِ راحت خون گرم دہقاں ہے

گرم فریاد رکھا شکل نہالی نے مجھے تب اماں ہجر میں دی برد لیالی نے مجھے

بالاتفاق یکسر تغزل سے خارج ہے۔ اسی طرح غالب کے بعض ایسے اشعار جو مفہوم کے لحاظ سے کھلے ہوئے پست در کیک ہیں۔ ان کا بھی ذکر فضول ہے۔[1]

یہ تو ہوا غالب کی شاعری کا تاریک پہلو، لیکن اب روشن پہلو کو بھی دیکھئے کہ وہ کس قیامت کا ہے۔ ایک اچھے شعر کی صفت یہ ہے کہ کسی حیثیت سے اس میں کسی رد و بدل کی گنجایش نہ ہو یعنی اگر آپ چاہیں کہ کوئی ایک لفظ بدلکر اس کی جگہ دوسرا رکھدیں تو ممکن نہ ہو۔ اس قسم کے اشعار غالب کے یہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ مثالاً چند یہاں پیش کرتا ہوں۔

رہے آزردہ ہم اُس شوخ سے چندے تکلف سے تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

اس شعر میں الفاظ آزردہ، شوخ، تکلف، انداز جنوں اور ان سب کا محل استعمال اتنا دلکش ہے کہ نہ کوئی دوسرا لفظ ان کی جگہ استعمال ہو سکتا ہے اور نہ اُن کی ترکیب کو بدلا جا سکتا ہے۔ پورا شعر سانچہ میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دکھ تری مژہائے دراز کا

بالکل یہی رنگ اس شعر کا بھی ہے۔ الفاظ کیا ہیں گویا نگینے جڑے ہوئے ہیں۔

---

[1] مثلاً — صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

اس قسم کے چند اشعار اور ملاحظہ ہوں :-

وائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو — آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں — زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا — تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

غالب خستہ کے بغیر کونسے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

قہر ہو یا بلا ہو جو کچھ ہو — کاشکے تم مرے لئے ہوتے

بعض غزلیں پوری کی پوری اسی رنگ کی ہیں خصوصیت کے ساتھ وہ جو سہل زمین اور چھوٹی بحروں میں لکھی گئی ہیں۔

مجموعۂ استفسار و جواب جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب، تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے۔ اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:

مسئلۂ جبر و اختیار — خواب کی حقیقت — معاد و خلود — طبقۂ نسوان اور غزلگوئی —

برج بابل — فاسسٹ جماعت — سامری کون تھا — باغ ارم کی حقیقت —

فلسفۂ محبت — بھوت پریت — اصحاب کہف — سالویشن آرمی —

ہالہ کا سبب — معجزہ و کرامات — فرقۂ معتزلہ — مذہب و عقل —

طوفان نوح — یاجوج و ماجوج — برہمو سماج — طبقۂ نسواں اور تعلیم —

مریخ کی حقیقت — منصور حلاج — چند الفاظ کی تحقیق — اصطلاحات تصوف کا ترجمہ —

قیمت معہ محصول خریداران نگار سے ۲ غیر خریداران سے ۳ روپے۔

مینجر نگار لکھنؤ

باب المراسلۃ والمناظرہ

عورت اور موجودہ آزادی

(جناب احمد کریم صاحب علیگ۔ ڈھاکہ)

آج جبکہ انسانی ترقیاں کمال کو پہونچ چکی ہیں۔ زندگی کا ہر مسئلہ نئے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے۔ عورتوں کی موجودہ حالت بھی اسی سلسلہ میں زیر بحث رہتی ہے۔

اس دور میں عورت کی آزادی اپنی جگہ پر مفید ہے یا غیر مفید اس سے بحث نہیں۔ اور نہ یہ کسی کے احتجاج یا منطقی دلائل سے رکنے والی چیز ہے۔ عورت آزاد ہوگی اور کامل آزاد۔

یہاں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی گفتگو کرنی نہیں ہے بلکہ خالص اخلاقی اور معاشرتی پہلو سے ہندوستانی عورتیں ابھی آزادی کے اُس درجہ کو نہیں پہونچی ہیں جہاں مغربی عورتیں پہونچ چکی ہیں۔ لیکن موجودہ رفتار آزادی سے ظاہر ہے کہ اس صدی کے آخر تک یہاں بھی وہی صورت ہوگی جو آج یورپ کی ہے۔ ممکن ہے کوئی صورت ایسی نکل آئے (جس کی کوئی اُمید نہیں) جو یورپ کی طرح آزاد ہونے سے روک دے۔ کاش یہ نہ ہوا تو اُسوقت یہاں کے اخلاق کا معیار کیا ہوگا؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کمل آزادی کا آخری نتیجہ "عصمت ریزی" ہے اور پھر جب عورت کا شیوہ یہ ہو جائے کہ وہ مرد کے جذبات کو ٹھکرا دے اُس وقت معاشرتی اور خانگی زندگی کا کیا حشر ہونا ہے؟

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ جب عورت اپنے جائز حقوق سے آگاہ نہ تھی اور جہالت کی تاریکی میں زندگی بسر کر رہی تھی اُسوقت مرد کا سلوک بھی اُس کے ساتھ یہی تھا۔ قدرت نے اب عورت کو اس سلوک کا

انتقام لینے کا موقع دیا ہے لیکن یہ انتقام کا جذبہ خانگی زندگی کی خوشگواریوں کو اور بھی مکدر کر دے گا کیونکہ مرد کا سلوک انتقامی جذبہ کے ماتحت نہیں تھا بلکہ اپنی خواہشات کے ماتحت - لیکن جب عورت ہر قدم پر مرد کو اُس کی گزشتہ بے عنوانیوں کے سبب ذلیل کرنے کی انتہائی کوشش کرے گی اُس وقت سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی؟ -

ہندوستان کس رنگ میں رنگے گا اس کا قطعی فیصلہ ابھی کر لینا ایک گونہ محال ہے لیکن مغرب پر کیا گزر رہی ہے؟ وہاں کی عورتیں کامل آزادی حاصل کر چکی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے نزدیک عصمت کا مفہوم کوئی حقیقت نہیں رکھتا - پھر وہاں خانگی زندگی کوئی چیز نہیں - اگر ہے بھی تو ایسی کہ آئے دن ناخوشگوار بدعنوانیاں ہوتی رہتی ہیں -

انسان جس سوسائٹی میں پیدا ہوتا ہے - جس ماحول میں بڑھتا ہے اور جو فضا اُس کے سامنے ہوتی ہے اسی کے زیر اثر رہتا ہے - اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغرب میں عورتوں کی آزادی کے سبب جو باتیں پیدا ہو گئی ہیں وہ سوسائٹی کے لئے اب ضروری سمجھی جا رہی ہیں اور اس کے تاریک پہلو کو وہاں بری نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اور نہ اس کی کوئی اہمیت ہے -

تو کیا موجودہ ترقیوں کا یہی نتیجہ ہے؟ -

پھر یہ کہنا کہ "موجودہ تہذیب نام ہے نفرت - دہریت - خود غرضی اور آوارگی کا" غلط تو نہ ہوگا؟ -

---

(نگار) یہ بالکل درست ہے کہ ہندوستان کی عورت کی آزادی کا مسئلہ اب "کاش" اور "مبادا" کے حدود سے گزر کر "کن فیکون" کے منازل سے گزر رہا ہے اور اس لئے اب سوال اس کے رواج و انسداد پر غور کرنے کا نہیں ہے بلکہ انتظار نتیجہ کا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے تحفظ یا عورت کے ساتھ نباہ کرنے کا -

اس سے انکار ممکن نہیں کہ ہمارے ملک کی عورتوں میں آزادی کا جذبہ براہ راست خود ملکی ترقی یا قوم کے ذہنی عروج کا نتیجہ لازم نہیں ہے بلکہ وہ پیدا ہوا ہے مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب و معاشرت سے اور ظاہر ہے کہ جس ترقی یا آزادی کی ابتدا ایک خاص اصول کے ماتحت ہوگی، اس کا انجام بھی اسی کے زیر اثر مترتب ہوگا -

لہٰذا اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ مغرب کی عورت کا نقطۂ نظر کیا ہے - اور اُسے کیوں برا سمجھا جائے -

میں یہ سمجھتا ہوں کہ مغرب کی عورت اس وقت ترقی و آزادی کے ایسے پُر ہیجان دور سے گزر رہی ہے کہ اُسے خود بھی نہیں معلوم اس کا نصب العین کیا ہے - تاہم کسی نہ کسی منزل تک پہونچکر ٹھہرنا اس کو ضرور ہے اور اسی کے مالہ و علیہ پر غور کرنا ہر شخص کا فرض ہے -

مغربی عورت کی ذہنی آزادی کی تاریخ اس میں شک نہیں اب سے بہت پہلے شروع ہوتی ہے، لیکن عملاً آزاد ہونے کا سب سے پہلا موقعہ اُسے گزشتہ جنگ عظیم کے سلسلہ میں ہاتھ آیا اور چونکہ اس نے اپنی اس اہلیت کو بڑی حد تک مرد سے تسلیم بھی کرالیا اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ وہ پوری طرح نہ کُھل کھیلتی اور حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی لذت ہی ایسی قیامت کی لذت ہے کہ ایکبار اس سے آشنا ہونے کے بعد اس کو ہاتھ سے دیدینا کسی طرح ممکن ہی نہیں۔

پھر جنگ کے بعد جس تیزی سے اس نے عملی دنیا میں قدم اُٹھایا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ آج کونسا شعبۂ حیات ایسا ہے جس پر عورت قابض ہونا نہیں چاہتی اور مرد سے بے نیاز رہنے کی کونسی صورت ایسی ہے جو اس کے پیش نظر نہیں، یہاں تک کہ مرد کا احسان لئے بغیر بچہ جننا بھی اسے منظور ہے (اگر واقعی اس تیغ وتفنگ والی ہلاکت آفریں فضا میں بچہ جننے اور اس کی پرورش کرنے کا سوال کبھی اسکے سامنے آسکتا ہے)۔

عورت کی خواہش یہ ہو یا کچھ اور، لیکن اس کا کھلا ہوا نتیجہ یہی ہے کہ نظام تمدن کے ہر شعبہ میں اسکی نیابت کو تسلیم کرنا پڑے گا اور جس طرح پہلے عورت کو مرد کی ہر خواہش کے سامنے سر عجز جھکا دینا پڑتا تھا اسی طرح اب مرد کو اس کے مطالبات کے حضور میں گردن خم کرنا پڑے گی اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں دنیا معاشرت و اخلاق کے قانون میں ایسا ردوبدل کرنے پر مجبور ہوگی کہ بہت سے ایسے "نوشش" جو اس سے قبل عورت کے لئے ممنوع تھے اب جایز قرار دئے جائیں اور بہت سے ایسے "نیش" جن سے مرد محفوظ رہتا تھا اب اسے گوارا کرنا پڑیں — بہرحال مغربی عورت کی آزادی خواہ وہ اچھی ہو یا بُری، مرد کو پسند آئے یا نہ آئے ایک واقعہ کی صورت اختیار کر چکی ہے اور اگر ہندوستانی عورت بھی اسی کے نقشِ قدم پر چلی (جیسا کہ بظاہر نظر آرہا ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ بھی آخر کار مرد کیلئے (آپکے نقطۂ نظر سے) "بلائے جاں" نہ ثابت ہو (اگر اسکا "بلائے جاں" ہونا واقعی کوئی "بلا" ہے)۔

آپنے سب سے زیادہ زور اس امر پر دیا ہے کہ عورت کی آزادی کا لازمی نتیجہ سوائے "عصمت ریزی" کے اور کچھ نہیں اور آپ کے نزدیک یہی ایک سب سے بڑی وجہ معاشری وخانگی زندگی کو تباہ کرنے کی ہے، مجھے ان دونوں سے اختلاف ہے، یعنی اول تو میرے نزدیک یہ ضروری نہیں کہ عورت کی آزادی کا لازمی نتیجہ "عصمت ریزی" قرار پائے اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو بھی نظام معاشرت وتمدن کی برہمی کا سبب اس کو قرار دینا درست نہیں۔ کیونکہ عصمت وحفاظتِ عصمت کے جس قانون سے عورت کو جکڑا گیا ہے، اصولاً مرد بھی اسی کا پابند ہے، یعنی اگر عورت کی "عصمت ریزی" کوئی بُری چیز ہے تو مرد کی "عصمت ریزی" بھی اس سے کم مکروہ نہیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرد نے اپنے لئے کبھی اس کی پابندی کو اتنا ضروری نہیں سمجھا اور نظام معاشرت وتمدن جوں کا توں قایم رہا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ اس باب میں عورت کی پابندی کوئی اور نتیجہ پیدا کرے۔

کہا جاتا ہے کہ عورت و مرد کے خدمات و فرائض، اور ان دونوں کی فطرت میں بڑا فرق ہے اس لئے مرد کی بے عصمتی اتنی ضرر رساں نہیں جتنی عورت کی، لیکن اس دلیل میں بڑا زبردست مغالطہ پایا جاتا ہے کیونکہ مرد کی بے عصمتی مستلزم ہے کسی نہ کسی عورت کی عصمت ریزی کو اور اگر عورت کی عصمت ریزی معاشری زندگی کو برباد کرنے والی ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہیں کہ مرد بھی اس میں برابر کا شریک ہے۔ پھر یہ کہنا کہ اس باب میں مرد و عورت کے درمیان بہت فرق ہے مرد کی ایک ایسی مستبدانہ دلیل ہے جو اس دور آزادی میں کوئی وقعت نہیں رکھتی۔

اس لئے عورت کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی عصمت کا سوال اتنا ہی غیر اہم ہے جتنا مرد کی عصمت کا اور اصل خطرہ کی جستجو ہم کو کسی اور جگہ کرنا چاہئے اگر واقعی عورتوں کی آزادی میں کوئی خطرہ پنہاں ہے۔

وہ لوگ جنھوں نے یوروپ کی تاریخ ترقی کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ وہاں جس چیز کو ترقی و تنزل سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ یکسر مادی نفع و ضرر سے متعلق ہے۔ صنعت و تجارت، اخلاق و سیاست، علوم و فنون الغرض ہر ذہنی اکتساب اپنے نتیجہ کے لحاظ سے کسب دولت کے حدود سے آگے نہیں بڑھتا اور اس لئے وہاں عورت کی آزادی کا بھی صرف یہی مفہوم ہے کہ وہ مرد کے برابر تگ و دو کرے اس کے برابر کمائے اور اس کے دوش بدوش زندگی کے تمام کاموں میں دلچسپی لے۔ پھر اگر روحانیات یا اخلاق کو نظر انداز کر دیجئے (جس کا مشرق اتنا دلدادہ نظر آتا ہے اور جس کا حقیقتاً کوئی مفہوم اس دنیا میں متعین نہیں ہو سکتا) تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ عورت کی یہ خواہش کیوں مذموم سمجھی جائے اور اگر وہ دنیائے سعی و عمل میں مرد سے بے نیاز ہو کر زندگی بسر کرنا چاہتی ہے تو اسے کیوں قابل الزام ٹھہرایا جائے۔

میں نے دیکھا ہے کہ اکثر حضرات اس گفتگو کے سلسلہ میں مغربی عورت کے اخلاق اور اس کی طرف سے مرد کی بیزاری کو ضرور بطور دلیل پیش کرتے ہیں، درانحالیکہ حقیقتاً نہ وہاں کا مرد اپنی عورتوں سے بیزار ہے اور نہ وہاں کی عورتیں محض آزادی کی وجہ سے اتنی زیادہ بداخلاق ہیں جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اگر ہوں بھی تو اس کا سبب محض آزادی کو قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ غیر آزاد ملکوں کی غیر آزاد عورتوں میں بھی اس نوع کی کمزوریاں بکثرت مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ وہ لوگ جو اپنی عورتوں کو پردہ میں رکھنے کے عادی ہیں اور غیر عورتوں سے نہ یہ آزادی مل سکتے ہیں، نہ بے پردہ انھیں دیکھ سکتے ہیں، عورت کے باب میں حد درجہ حریص و بیتاب واقع ہوتے ہیں اور ان کا یہ "ندیدہ پن" نفسیاتی طور پر ہر عورت کو بُری نگاہ سے دیکھنے کا عادی بنا دیتا ہے۔ اس لئے جس وقت وہ آزاد عورتوں کو مردوں کے ساتھ ہنستے بولتے، چلتے پھرتے دیکھتے ہیں تو وہ ان مردوں کی جگہ اپنے آپ کو رکھ کر اپنے ہیجانہ شوق کے اضطراب کے لحاظ سے حکم لگاتے ہیں اور ان کی سمجھ میں یہ بات کسی طرح نہیں آتی کہ

مرد و عورت کا باہم ملنا اور پاکباز رہنا بیک وقت کیونکر ممکن ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر پردہ نشین عورت پاکباز نہیں ہے اسی طرح ہر آزاد عورت بد اخلاق نہیں، اور محض آزادی و بے پردگی کو "عصمت ریزی" کا سبب قرار دینا نادرست ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یورپ کی خانگی زندگی بہ نسبت مشرق کے صرف اسی آزادی کی وجہ سے تباہ ہے اور اس کے ثبوت میں طلاق کی کثرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ میں اس کے ماننے کے لئے بھی طیار نہیں، کیونکہ جس طرح مغرب میں اہلی زندگی کی ناخوشگواری کی مثالیں ملتی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی نظر آتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ یہاں اس بلا کو برابر اپنے اوپر مسلط رکھتے ہیں اور وہاں اس سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لیا جاتا ہے۔ اگر آج ہندوستان میں بھی خلع و طلاق کی آسانیاں وسیع ہو جائیں اور یہاں کی عورت بھی اپنی معاش کی خود کفیل ہونے کی اہلیت حاصل کر لے تو یہاں یورپ سے زیادہ اس کی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اگر جستجو کی جائے تو ہندوستان میں اس وقت پچاس فی صدی سے زیادہ ایسے گھرانے ہوں گے جو زن و شو کے مزاجی اختلاف کی وجہ سے جہنم کا نمونہ بنے ہوئے ہیں، لیکن چونکہ مرد رسم و رواج کی بنا پر عورت کو طلاق دینا غیرت کے خلاف سمجھتا ہے اور عورت بھی طلاق حاصل کرنے کے بعد اپنی معاش کی خود کفیل نہیں ہو سکتی اس لئے دونوں اپنی اپنی جگہ خاموشی سے اس سوہان روح کو برداشت کرتے رہتے ہیں اور خلع و طلاق کی نوبت نہیں آتی۔

الغرض عورت کی موجودہ تعلیم و آزادی کی مخالفت صرف اس لئے کرنا کہ وہ مستلزم ہے عصمت ریزی کو یا یہ کہ وہ اہلی زندگی کو ناخوشگوار بنا دینے والی ہے۔ میرے نزدیک کسی طرح درست نہیں لیکن جیسا کہ میں نے ابتدائی سطروں میں بیان کیا ہے یہ مسئلہ ضرور قابل توجہ ہے کہ چونکہ یہاں کی عورت کی آزادی خود ملکی ترقی یا قومی آزادی کا نتیجہ نہیں بلکہ تقلید ہے مغربی اقوام کی، اس لئے نہ اس پر ہم کو فخر کرنے کا حق حاصل ہے اور نہ حقیقتاً ہماری تہذیب و معاشرت اس کو گوارا کر سکتی ہے۔

مشرق و مغرب کا جغرافی اقتضا طبیعی ماحول تاریخی و روایتی نظام تمدن، مذہبی احساس اور اخلاقی نشو و نما بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لئے یہاں کی عورت کا وہ تعلیم و تربیت حاصل کرنا جسے یہاں سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں اور اس کا مغرب کے نقش قدم پر چل پڑنا کبھی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔

جس حد تک نفس آزادی اور نفس تعلیم کا تعلق ہے، اس کی مخالفت حماقت ہے، لیکن آزادی و تعلیم کی نوعیت ضرور بحث طلب امر ہے۔

اس وقت لڑکیوں اور خصوصیت کے ساتھ مسلمان لڑکیوں کی تعلیم جس نہج سے ہو رہی ہے وہ یقیناً مضرت رساں ہے۔ تعلیم کا سب سے پہلا مقصود یہ ہے کہ انسان میں جذبۂ خود اعتمادی اور احساس قومیت و

پاسِ عزت پیدا ہو لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ انگریزی تعلیم ان میں بجائے خود اعتمادی کے خود فروشی، بجائے احساسِ قومیت کے، انفرادی خود غرضی اور بجائے عزت و خودداری کی جگہ ہلکاپن پیدا کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ تعلیم کا اصل مقصود صرف چہرہ کا غازہ، ملبوس کا حُسن اور زیبائش ظاہری ہے احساس کی سنجیدگی، جذبات کی گہرائی، اور اجتماعی ہمدردی کوئی چیز نہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ لڑکیوں کی تمام تعلیم ایک غیر زبان کے ذریعہ سے ہوتی ہے اور وہ بھی حد درجہ ناقص و نامکمل اس لئے قدرتاً وہ انگریزی معاشرت کی طرف مایل ہو جاتی ہیں اور انھیں یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ وہ انگریزی بولیں اس حال میں کہ پاؤں میں شلوار ہو اور سر پر دوپٹہ۔

یورپ اور ہندوستان کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے وہاں کی فضا میں جو پیدا ہوتا ہے آزاد پیدا ہوتا ہے اور وطنی محبت، اور قومی خودداری کے آغوش میں اس کی پرورش ہوتی ہے، اس لئے اگر وہاں کی عورتیں نمائش ظاہری پر جان دیتی ہیں تو ساتھ ہی ساتھ وہ ملک و قوم کی خدمت کے لئے بھی ہر وقت سربکف نظر آتی ہیں، برخلاف ہندوستان کے کہ یہاں مردوں میں بھی یہ جذبہ نہیں پایا جاتا، چہ جائیکہ عورتیں جن کی تعلیم مردوں سے زیادہ ناقص و نامکمل ہے۔

الغرض عورتوں کی بیجا آزادی ہو یا مردوں کی گمراہی سب غلط تعلیم کا نتیجہ ہے اور جب تک کسی قوم کا نظام تعلیم خود اس کے ہاتھ میں نہ ہو، وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔ آپ عورتوں کے حال پر سر دُھن رہے ہیں حالانکہ سب سے پہلے آپ کو مردوں کے اخلاق کا ماتم کرنا چاہئے اور قبل اس کے کہ آپ اپنی لڑکیوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی طرف توجہ کریں، اپنے لڑکوں کو دیکھئے کہ اُن کا کیا حال ہے۔ آپ کو اس کی فکر تو بہت ہے کہ عورتیں مرد ہوتی جا رہی ہیں اور اس کی پرواہ نہیں کہ مرد، عورت بنے جا رہے ہیں۔

شہوانیات یا ترغیباتِ جنسی

(اڈیٹر نگار کے قلم سے)

اُردو زبان میں بالکل پہلی کتاب ہے جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے، اگر آپ "گناہ کی دنیا" کی سیر کرنا چاہتے ہیں تو اس تصنیف کو ملاحظہ فرمایئے اور خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا چیز ہے۔ فحاشی کی تمام صورتیں اور اُن کی مفصل تاریخ عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک مع ان سیکڑوں عجیب و غریب واقعات کے جن کی طرف یوں کبھی آپ کا ذہن بھی منتقل ہوا ہوگا، اس کتاب میں موجود ہیں۔ الغرض یہ کتاب "جنسیات" کے موضوع پر ایک سائکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے اور ممکن نہیں کہ آپ ایکبار اس کو شروع کرنے کے بعد آخر تک دیکھنے پر مجبور نہ ہوں۔ قیمت غیر مجلد تین روپیہ، مجلد ہے علاوہ محصول۔ خریداران نگار سے ایک روپیہ کی رعایت۔

منیجر نگار - لکھنؤ

چاند کا سفر

فضائے بسیط کا سب سے زیادہ دلکش اور قریب تر سیارہ جو ہماری نگاہوں اور ہمارے خیالوں کو روز اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے، چاند ہے۔ بچے دیکھتے ہیں اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، عورتیں اس کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور اپنے جگر گوشوں سے "چندا ماموں" کہلا کر اس کو اپنا بھائی بنانے میں خاص مسرت محسوس کرتی ہیں، بڑی بوڑھیاں دیکھتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انھیں کے سن و سال کی کوئی عورت بیٹھی ہوئی چرخا کات رہی ہے اور سوختہ دل عشاق کا تو ذکر ہی کیا کہ ہجر و وصال دونوں کی کیفیتیں بہت کچھ اس سے وابستہ ہیں۔ لیکن اب جدید دنیا کے جدید علوم و فنون جنھوں نے خیالی دنیا کی بہت سی لذتوں کو غارت و برباد کیا ہے، ہماری اس لذت کو بھی برباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ کسی طرح وہ چاند تک پہونچ جائیں اور ہمیں یہ خبر سُنائیں کہ یہاں تو ویرانی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اگر ہم علوم جدیدہ کے تمام کارناموں پر نظر ڈالیں تو چاند تک پہونچنا کیسا وہ اگر تارے توڑ لانے کا دعویٰ کریں تو بھی ان کو نہیں جھٹلا سکتے، کیونکہ پندرہ ہزار مٹر کی بلندی تک تو عہد حاضر کا انسان پہونچ ہی گیا ہے اور "ہوائیوں" کے اختراع نے انسانی پرواز کی طاقت کو کئی گنا زیادہ کر دیا ہے۔ لیکن یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا کہ وہ چاند تک پہونچنے میں کامیاب ہو جائے گا آیئے علمی نقطۂ نظر سے بھی اس مسئلہ پر نگاہ ڈالکر دیکھیں کہ اس سفر میں انسان کو کن مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ اگر انسان نے کسی وقت سیاروں کی طرف اپنے سفر کی ابتدا کی تو ظاہر ہے کہ اس کا سب سے پہلا اسٹیشن چاند ہو گا کیونکہ وہی ہم سے قریب تر واقع ہے۔ (یعنی ۲۳۹۰۰۰ میل) اور زمین کی جاذبیت اسے اپنا تابع بنائے ہوئے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ چاند کے سفر میں صرف اسی حد تک دشواریاں پیش آئیں گی، جس حد تک ہوا کا وجود پایا جاتا ہے کیونکہ فضا میں یہی ایک چیز حرکت کا مقابلہ کرنے والی ہے لیکن جب ہوا کے حلقہ سے باہر ہو گئے تو پھر جوں جوں زمین سے دور ہوں گے، اس کی قوت کشش ضعیف ہوتی جائے گی اور چاند کی کشش ہماری رفتار کو اور زیادہ تیز کر دے گی۔ ہوا کا حرکت کے مزاحم ہونا شہاب ثاقب سے بخوبی ثابت ہو سکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فضا میں دفعتہً روشنی نمودار ہوئی

اور دور تک ایک لکیر بناتی ہوئی غائب ہو گئی۔ اس کو ہم اپنی اصطلاح میں ستارے ٹوٹنا کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ کیا ہے۔ یہ حقیقتاً اجرام سماوی کے بڑے بڑے ٹکڑے ہیں جو ہزاروں بلکہ لاکھوں سال سے فضا میں نہایت سرعت کے ساتھ اپنا سفر طے کر رہے ہیں لیکن جب وہ کرۂ ارض کے قریب آتے ہیں تو ہوا کے تصادم سے مشتعل ہو کر گیس میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ الغرض ہوا کا غلاف جس طرح فضا کی دوسری چیزوں کو زمین تک پہونچنے سے باز رکھتا ہے، اسی طرح زمین والوں کو بھی فضائے بسیط میں بہت زیادہ سرعت کے ساتھ پرواز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اس لئے اگر انسان ہوا کے حلقہ سے باہر نکل جائے تو پھر اس کے لئے آگے بڑھنے میں واقعی بہت سی آسانیاں ہیں۔

بظاہر یہ امر زیادہ مشکل نہیں کہ چاند تک پہونچنے کے لئے ایک غبارہ طیار کر لیا جائے لیکن اس میں ایسی زبردست قوتِ دافعہ پیدا کرنا کہ وہ برابر کام کرتی جائے دشوار ہے کیونکہ جس طرح سمندر کی تہ تک پہونچنے کے لئے پانی کا دباؤ مانع آتا ہے، اسی طرح فضائے بسیط میں پہونچنے کے بعد ہوا کے دباؤ کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہے۔ علاوہ اس کے ایک دشواری اور یہ پیدا ہوگی کہ غبارہ کا وہ حصہ جو سورج کی طرف رہیگا اس میں تو گرمی اتنی پیدا ہو جائے گی کہ آپ انڈا ابال لیجئے لیکن دوسری جانب درجۂ حرارت صفر سے بھی ۴۵۹ درجے نیچے گرا ہوا ہوگا اور اس کے لئے ضرورت ہوگی کہ اسبسٹاس (Asbestos) کے ذریعہ حرارت کو ناقابل نفوذ بنایا جائے اور دورۂ حرارت کا توازن دونوں جانب یکساں رہے۔

چاند کے مسافر کو عادتاً کھانے پینے کی بھی ضرورت ہوگی، سانس لینے کے لئے آکسیجن کی بھی کافی مقدار درکار ہوگی۔ پھر سوال یہ ہے کہ سانس سے جو کاربن نکلے گا وہ کہاں جائے گا، ظاہر ہے کہ غبارے کے باہر تو جا نہ سکے گا (کیونکہ وہ تو چاروں طرف سے بالکل بند ہے)، اس لئے کوئی اور طریقہ کیمیاوی تحلیل کا اختیار کرنا پڑے گا اور ان تمام باتوں کا اہتمام آسان نہیں۔ اسی کے ساتھ اب اور دشواریوں کو لیجئے جو علمی نقطۂ نظر سے پیش آنے والی ہیں۔ دنیا میں جس چیز کو ہم وزن سے تعبیر کرتے ہیں وہ نام ہے صرف کشش زمین کا، ہمارا چلنا پھرنا، ایک جگہ سیدھا کھڑا ہو جانا یہ سب جاذبیت ارض کے طفیل میں ہے اس لئے جس وقت غبارہ کشش زمین کی حد سے علیحدہ ہو جائے گا تو اس کے اندر انسان کا وزن گھٹ کر دھوئیں کے برابر بلکہ اس سے بھی کم ہو جائیگا اور غبارہ کے اندر سطح پر چلنے سے معذور ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے چلنے کی کوشش کی تو وہ فوراً گر پڑے گا، یہاں تک کہ چھینک اور کھانسی کی حرکت سے بھی اس کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ غبارہ کے اندر بجائے چلنے کے بالکل دھوئیں کی طرح تیرتا ہوا اور اڑتا ہوا نظر آئے گا۔ اب خورونوش کے انداز کو دیکھئے کہ کیا ہوگا۔ کھانا تو خیر کسی طرح کھا لیا جائے گا، لیکن پانی پینے کی کوئی صورت نہیں کیونکہ گلاس یا صراحی سے پانی انڈیلنا ناممکن ہوگا اور پانی

کے قطروں کو اُنگلی سے سرکا کر منھ تک لانا پڑے گا یا کسی نلکی کے ذریعہ چوسنا پڑے گا۔ علاوہ اس کے پانی اگر منھ تک پہونچ گیا تو وہ خود حلق کے اندر اُترے گا نہیں جب تک عضلات کی جدوجہد سے کام نہ لیا جائے۔ یہی دشواری نیند میں بھی ہوگی کیونکہ زوال جاذبیت کی وجہ سے خون کا دورہ صرف دماغ کی طرف رہیگا اور خواب سے جو راحت حاصل ہوتی ہے وہ میسر نہ آئے گی۔

البتہ جب جاذبیت زمین کے حدود سے گزر کر کرۂ قمر کے حدود کشش میں غبارہ پہونچے گا تو یہ کیفیت بڑی حد تک دور ہو جائے گی لیکن اصلی حالت پھر بھی پیدا نہ ہو سکے گی، کیونکہ چاند کی کشش بہ نسبت زمین کے کم ہے اور اس لئے ہر چیز کا وزن ہلکا رہیگا۔

اس کے بعد جب غبارہ چاند کے قریب پہونچے گا تو کشش بڑھتی جائے گی اور اسوقت ضرورت ہوگی کہ غبارہ کو آہستہ آہستہ اُتارنے کے لئے مخالف سمت میں ہوائیاں سر کر کے اس کشش کا مقابلہ کیا جائے جو آسان کام نہیں۔ اور اگر اس میں کامیابی حاصل ہو بھی گئی تو جسوقت غبارہ سطح قمر پر اُترے گا تو سب سے بڑا اہم سوال اس سے باہر نکلنے کا ہوگا کیونکہ جس وقت دروازہ کھلیگا تو اس ہوا کی قوت سے جو غبارہ کے اندر ہے ہر شخص اور غبارہ کے اندر رکھی ہوئی ہر چیز گولی کی طرح باہر نکلے گی اس لئے ظاہر ہے کہ پہلے کسی چھوٹے سوراخ کے ذریعہ سے اس ہوا کو نکالنا پڑے گا اور کوئی ایسا معدنی ملبوس استعمال کرنا ہوگا جیسا پانی میں غوطہ لگاتے وقت استعمال کرتے ہیں، کیونکہ ہوا نہ ہونے کی وجہ سے معمولی لباس کا استعمال کرنا دشوار ہوگا۔

اب ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد جس وقت انسان سطح قمر پر قدم رکھے گا تو بہت ممکن ہے کہ وہ اس باریک غبار سے بالکل اٹ جائے جو لکھو کھا سال سے بغیر بارش اور ہوا کے وہاں پایا جاتا ہے اور وہاں کی سطح کرۂ ارض کے سطح کی طرح سخت و جامد نہ ہو، یا پھر یہ کہ وہاں کی سطح کانچ کی طرح ٹوٹ جانے والی ہو اور اس پر چلنا دشوار ہو۔

اسی کے ساتھ ایک بڑا مسئلہ حرارت و برودت کا ہے جس سے انسان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ کیونکہ چاند کا وہ حصہ جو آفتاب کی طرف ہے وہ آگ کی طرح گرم ہوگا اور مخالف سمت میں حرارت صفر سے بھی ۲۵۹ درجے کم پائی جائے گی۔ اس لئے انسانی زندگی کے لئے دونوں سمت موافق نہیں۔

کھانا پکانے یا اپنے آپ کو گرم کرنے کے لئے آگ روشن کرنے کی بھی ضرورت ہوگی لیکن چاند میں اس کا امکان نہیں، کیونکہ اول تو وہاں ایندھن کہاں اور اگر ہو بھی تو ہوا اور آکسیجن کیونکر میسر آئیں گے جن کے بغیر آگ مشتعل نہیں ہو سکتی۔ ایک بڑی زحمت اور یہ ہوگی کہ اگر کھانا کسی طرح پکا لیا گیا تو اس کے کھانے کی کوئی تدبیر نہیں کیونکہ ظرف کا منھ کھولکر منھ کے اندر نوالہ رکھتے ہی ایسی تیز ہوا پیدا ہوگی کہ آنکھیں باہر نکل آئیں گی

ناک، کان پھٹ کر خون بہنے لگے گا اور انسان فوراً مر جائے گا۔

بعض کا خیال ہے کہ سطح قمر پر ہوا برف کی طرح منجمد ہے۔ اور اس لئے اس منجمد برف کو غبارہ کے اندر رکھنے سے وہ آہستہ آہستہ گیس میں تبدیل ہو جائے گی اور انسان اس سے کام لے سکیگا۔ لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کیونکہ آفتاب کی طرف جو حصہ چاند کا رہیگا وہاں ہوا کے منجمد ہونے کا کوئی امکان نہیں اور گردش کے سلسلہ میں چاند کے دونوں سمت کا یکے بعد دیگرے آفتاب کی حرارت سے متاثر ہونا ضروری ہے۔

چاند میں چونکہ کسی ذیحیات کا وجود نہیں ہے اس لئے درندے اور جراثیم بھی وہاں نہ ہوں گے اور اس لحاظ سے انسان وہاں محفوظ ہے لیکن درندوں سے زیادہ خطرناک وہاں کے شہاب ثاقب اور چٹانیں ہیں جو اکثر گرتی رہتی ہیں اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ کوئی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی اس لئے اس خطرہ کی اطلاع بھی پہلے سے ہونا ممکن نہیں۔

چاند کے سیاح کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ وہ اپنے ساتھ ایک گاڑی کے تمام اجزا لیجائے تاکہ انھیں جوڑ کر ایک گاڑی طیار کر سکے جس کی ہوا باہر نہ نکلے اور ایسی قوت سے اسے چلائے جس کے لئے ہوا کی ضرورت نہ ہو۔

آخر میں سوال وہاں سے واپس آنے کا پیدا ہوتا ہے، لیکن اس سوال پر وہاں پہونچنے سے قبل کوئی گفتگو کرنا بیکار ہے۔ الغرض چاند کا سفر ایسا آسان نہیں ہے اور وہ لوگ جو "چاند کی بڑھیا" کے سکون میں خلل ڈالنا پسند نہیں کرتے انھیں مطمئن رہنا چاہئے کہ علوم و فنون کی دنیا میں اکثر حضرات خواب بھی دیکھا کرتے ہیں اور یہ تمام باتیں اسی خواب کی ہیں۔

جمالستان

حضرت نیاز کے اُن ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ جو انشاء عالیہ کی جان ہیں۔۔۔ ادب اُردو میں جو خصوصیت حضرت نیاز کی طرز نگارش کو حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ اس ۵۰۵ صفحات کے مجموعہ کا ہر ہر لفظ اپنی جگہ ایک ایسی دلکش حقیقت کا مالک ہے جو صرف مطالعہ کے بعد ہی واضح ہو سکتی ہے۔

قیمت فی جلد خریداران نگار سے تین روپیہ اور غیر خریداران نگار سے چار روپیہ علاوہ محصول۔

مینجر نگار۔ لکھنؤ

مطبوعات موصولہ

نجم السحر انگریزی ناول نویسوں میں رائڈر ہیگرڈ خاص شہرت کا مالک ہے اور مصر قدیم کے متعلق تو اسکے افسانوں نے غیر معمولی درجۂ قبول حاصل کیا ہے۔ اسی کا ایک ناول ہے جس کا ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی نے نجم السحر کے نام سے کیا ہے (صبح کا ستارہ شاید اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ اس نام کا ایک جرمن خضاب موجود ہے اور ستارۂ سحری اس لئے نہیں کہ یہ بالکل عجمی ترکیب ہے اور مصریات کی پُرہیبت داستانوں کی رعایت کے لحاظ سے اس میں وہ ثقل نہیں پایا جاتا جو نجم السحر میں ہے)

مولوی عنایت اللہ صاحب عرصہ تک دارالترجمہ حیدر آباد کے ناظم رہ چکے ہیں اور انگریزی کتابوں کے ترجمہ میں مہارت خصوصی رکھتے ہیں۔ ان کے ترجمہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ حتی الامکان اصل کتاب کا کوئی لفظ ترک نہیں ہوتا اور باوصف اس پابندی کے بہت صاف و شگفتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب میں بھی یہی خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے اور اگر ان اُلجھنوں کو نظر انداز کر دیا جائے جو خود رائڈر ہیگرڈ کے مشکل و دقیق انداز تحریر میں پائی جاتی ہیں تو کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس کتاب کو ترجمہ کی حیثیت حاصل ہے۔

اس فسانہ میں مصر قدیم کی نہ صرف تہذیب و معاشرت اور مذہبی زندگی کو نمایاں کیا گیا ہے بلکہ اس عہد کی سحر کاریوں کو بھی اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قم وجاہ کی داستان طلسم ہوشربا سامنے آجاتی ہے۔ کتابت و طباعت نہایت پسندیدہ ہے اور ۸ میں ساقی بک ڈپو دہلی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے پنشنر ڈپٹی کلکٹر کی تصنیف ہے جو سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی اور ان کی شاعری سے بحث کرتی ہے۔

بہادر شاہ ظفر اس لحاظ سے کہ وہ مغل فرمانرواؤں میں سب سے آخری فرمانروا تھا، عہد مغلیہ کی تاریخ میں بالکل مقطع الکلام کی حیثیت رکھتا ہے اور اس لئے بہت زیادہ توجہ کا مستحق تھا، لیکن اسوقت تک کوئی کتاب مخصوص اس موضوع پر اردو میں ایسی نہیں لکھی گئی تھی جو تاریخی و ادبی دونوں حیثیتوں سے قابل ذکر ہو۔ اس کتاب میں نہ صرف ظفر کی ولادت سے لیکر ان کی وفات تک کے تمام حوادث سیاسی پر ناقدانہ و

محققانہ نظر ڈالی گئی ہے بلکہ بہادر شاہ ظفر کی محلی زندگی اور اس وقت کی معاشرت کو بھی نہایت خوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ آخری حصہ ظفر کی شاعری کے لئے وقف ہے اور اس پر حد درجہ لطیف تبصرہ کیا گیا ہے۔ الغرض تاریخی و تنقیدی حیثیت سے یہ کتاب اسوقت کی بہترین تصانیف میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اگر ہم اس تصنیف کی زبان و انشار اور اس کی ادبی خوبیوں کو سامنے رکھیں تو ہم کو ماننا پڑتا ہے کہ اردو زبان میں شاید ہی اسوقت تک دو چار کتابیں ایسی شایع ہوئی ہوں جن میں تاریخ ایسے خشک بحث کو محض زور انشا سے اتنا دلچسپ بنا دیا گیا ہو۔

منشی امیر احمد صاحب علوی، متعدد تاریخی تصانیف کے مصنف ہیں اور ان کے انداز تحریر کی یہ دلکش خصوصیت سب میں پائی جاتی ہے، لیکن چونکہ ظفر کے حالات خود بہت دلدوز ہیں، اس لئے منشی صاحب کی تحریر کی اثر آفرینی بھی اس میں اپنی انتہائی درجہ کو پہونچ گئی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس کی پہلی سطر پڑھنے کے بعد آخری سطر تک پہونچنے پر مجبور نہ ہو۔

ناظرین نگار میں سے بعض حضرات اب بھی نگار کے ظفر نمبر کی جستجو میں ہیں اس لئے ان کو خوش ہونا چاہئے کہ اس ظفر نمبر سے بہتر ایک چیز ان کے سامنے موجود ہے اور وہ امیر محل لائبریری، کاکوری لکھنؤ سے عہ میں اسے حاصل کر سکتے ہیں۔

سحر بنگال

مجموعہ ہے جناب طاہرہ دیوی شیرازی کے ان چند افسانوں کا جو اسوقت تک مختلف رسایل و جراید میں شایع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین افسانے تو وہ ہیں جو نگار میں شایع ہوئے ہیں اور باقی وہ جو ساقی اور ہمایوں وغیرہ کے لئے باعث زینت ہوئے۔

طاہرہ دیوی شیرازی اپنے نام کی اس عجیب و غریب ترکیب کے لحاظ سے کیا ہیں، اس کا ذکر میں نگار میں ایک بار کر چکا ہوں اور بہ حیثیت ادیب ہونے کے ان کا کیا مرتبہ ہے۔ اس پر بھی اپنی رائے ان کے ایک افسانہ (سکون کی جستجو) کو شایع کرتے ہوئے میں نے ظاہر کر دی تھی۔ چونکہ طاہرہ دیوی نے سرزمین بنگال کی فسانہ خیز فضا میں پرورش پائی ہے اس لئے یوں بھی انھیں ایک اچھا فسانہ نگار ہونا چاہئے تھا، لیکن خوش قسمتی سے انھیں فرانسیسی و فارسی ادبیات کے مطالعہ کا موقعہ بھی مل گیا اس لئے ان کے اس ذوق میں اور زیادہ لطافت و پاکیزگی پیدا ہو گئی ہے۔

اس کتاب کو انھوں نے میرے نام سے منسوب کیا ہے یعنی عمر میں بالکل پہلی مرتبہ مجھ کو اس حقیقت پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے کہ "بلبل" کا ہم قافیہ "گل" ہونا واقعی کوئی قابل فخر امر ہے یا قابل رحم ——

اس مجموعہ میں مصنفہ کی تصویر بھی شامل ہے اور میری بھی لیکن دونوں میں پورے چھ صفحات کی دیوار حایل ہے —— یہ کتاب بھی ساقی بک ڈپو کے منشورات ادب میں سے ہے اور نفیس کتابت و طباعت

کے ساتھ مجلد شایع کی گئی ہے۔ قیمت عہ ہے۔

آہنگ رزم مجموعہ ہے جناب وقار انبالوی کی چودہ رزمیہ نظموں کا۔ رزمیہ نظموں کے لئے الفاظ وخیالات دونوں خاص ہوا کرتے ہیں اور جب تک ان میں توافق نہ ہو، کامیابی مشکل ہے۔

اس مجموعہ میں اکثر نظمیں ایسی ہیں جو اس توافق سے خالی ہیں اور بعض میں اگرچہ ہم آہنگی پائی بھی جاتی ہے تو اس قدر ضعیف کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ جذبات حماست آورد کی چیز نہیں ہے بلکہ پیدا ہوتے ہیں دل کے اس جوش سے جو انسان کو سرفروشی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہند اور اہل ہند کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے ہم وقار صاحب کی نظموں میں اس جوش کا فقدان محسوس کرتے ہیں تو مورد الزام وہ نہیں ہیں بلکہ ساری قوم ہے جو اس جذبہ کو عرصہ ہوا کھو چکی ہے۔

اس سے قطع نظر، محض ادبی، شاعرانہ محاسن کے لحاظ سے البتہ اس مجموعہ میں بہت سی چیزیں ایسی پائی جاتی ہیں جو جناب وقار انبالوی کی قدرت نظم کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں محاورہ یا فن کی غلطیاں بھی اس میں ہیں لیکن نہ اسقدر کہ محاسن پر غالب آجائیں، یہ مجموعہ ایک روپیہ میں جناب وقار انبالوی سے مزنگ لاہور کے پتہ پر مل سکتا ہے۔

نوائے تلخ اس کے مصنف کوئی صاحب مسٹر اشفاق ہیں اور تصنیف کا موضوع عورتوں کی معاشری اصلاح ہے۔ مصنف نے ایک خیالی جلسہ کرکے اس میں اس موضوع پر تقریر کی ہے اور پھر خواتین نے اس کا جواب دیا ہے۔ تقریر اپنی تفصیل کے لحاظ سے بہت جامع ہے اور اسی طرح عورتوں کا جواب بھی ہندوستان کی نسائی ذہنیت کے اعتبار سے بہت مکمل۔ اس میں چند خطوط بھی شامل ہیں جن میں عورتوں نے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

کتاب فی الجملہ مطالعہ کے قابل ہے اور چونکہ ہندوستان کی عورت کا مستقبل اس وقت کا نہایت اہم موضوع ہے اس لئے اس اشاعت کے برمحل ہونے سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

عربوں کی جہازرانی مجموعہ ہے سید سلیمان ندوی کے چار خطبوں کا جو اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن بمبئی نے کتابی صورت میں پیش کئے ہیں۔ ان خطبوں میں نہایت تحقیق و وضاحت کے ساتھ عربوں کی بحری خدمات اور فن جہازرانی کی ترقیوں کا ذکر کیا گیا ہے اور اردو میں اس موضوع پر یہ بالکل پہلی کتاب ہے جو اسقدر بسط وتفصیل کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب اسوسی ایشن نے مجلد شائع کی ہے اور کاغذ وطباعت وغیرہ کے لحاظ سے نہایت دلکش ہے۔ ایک روپیہ میں سکرٹری اسلامک ریسرچ اسوسی ایشن ۳۴ چوپاٹی روڈ بمبئی سے مل سکتی ہے۔

یادگار اظہر سید دلدار حسین صاحب اظہر الہ آبادی کی منظوم مناجات ہے جس میں تمام مشہور اسماء الٰہی کے جمع کرنے کا اہتمام خاص طور پر کیا گیا ہے، زبان صاف ہے اور طرز بیان اثر آفریں۔ اخیر میں بعض تلمیحی اشعار کی شرح بھی شامل کردی ہے اور مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی۔---

یہ کتاب نفیس کاغذ پر مجلد شایع ہوئی ہے اور طباعت بہت پاکیزہ ہے۔ اس کے مصنف مدرسہ دار الشفاء حیدر آباد میں فارسی پڑھاتے ہیں، جن صاحب کو ضرورت ہو اُن سے طلب کرلیں۔ قیمت درج نہیں ہے۔

مصری افسانے مصر کے مشہور فاضل و اہل قلم سید مصطفیٰ لطفی کے چند افسانے ہیں جنھیں قاضی زین العابدین صاحب سجاد میرٹھی نے اُردو کے ملبوس میں پیش کیا ہے۔---

تمام مصری اہل قلم اس خصوصیت میں مشترک ہیں کہ ان کی ہر تحریر کا منشاء آزادی وطن، اور حُب قومی کا جذبہ ہوا کرتا ہے، چنانچہ زیر نظر افسانے بھی ان جذبات سے مالا مال ہیں، ترجمہ بڑی حد تک صاف و سلیس ہے گو زبان اور محاوروں کی غلطی سے پاک نہیں۔ مترجم نے اپنی تصویر تو اس میں شامل کردی ہے لیکن لطفی غریب کو اس قابل نہیں سمجھا۔

یہ کتاب مترجم سے مطبع مجتبائی میرٹھ کے پتہ پر ۸ر میں مل سکتی ہے۔

ترکی میں مشرق و مغرب کی کشمکش ترجمہ ہے خالدہ ادیب خانم کے اُن آٹھ لکچروں کا جو انھوں نے چند ماہ پہلے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دئے تھے۔ خالدہ ادیب خانم بین الاقوامی شہرت رکھنے والی خاتون ہیں اور بہ لحاظ علم و فضل خاص مرتبہ کی مالک سمجھی جاتی ہیں۔---

انھوں نے اپنے خطبات میں ترکوں کی تمام تاریخ پر (عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک) وہ واقفکارانہ تبصرہ کیا ہے جو ایک غیر ترک سے کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ یہ خطبات انگریزی میں دئے گئے تھے، جنکا ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے کیا ہے یعنی جیسا خطبہ دینے والا تھا ویسا ہی ترجمان اسکو نصیب ہوا۔ اسوقت مصطفیٰ کمال اتا ترک نے ترکی کو تمام دنیا کی توجہ کا مرکز بنا رکھا ہے یہاں تک کہ ہندوستان میں بھی اکثر حضرات ترکی کی تاریخ انقلاب اور اس کے حال و مستقبل سے دلچسپی لینے والے ملجاتے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کی اشاعت نہایت برمحل ہے اور ہر اس شخص پر اسکا مطالعہ فرض ہے جو سلطنت ترکی سے کچھ بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے اسے شائع کیا ہے اور دو روپیہ میں وہیں سے مل سکتی ہے۔

دو خدائی خدمتگار ترجمہ ہے مہادیو ڈیسائی کی کتاب کا جس میں انھوں نے خان عبد الغفار خاں

اور ان کے بھائی ڈاکٹر خاں کے حالات خود انھیں کے زبانی قلمبند کئے ہیں - ان دونوں بھائیوں کو سیاسیات ہند میں جو شہرت حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں اس لئے قدرتاً ہر شخص ان کے حالات معلوم کرنے کا متمنی رہتا ہے اور ضرورت تھی کہ ایسی کوئی کتاب مرتب کی جاتی - یہ حالات مہاتما گاندھی کی فرمایش پر مہادیو ڈیسائی نے انگریزی میں مرتب کئے تھے اور اب اس کا ترجمہ محمود علی خانصاحب نے کیا ہے - ترجمہ شگفتہ اور سلیس ہے - یہ کتاب بارہ آنے میں مکتبۂ جامعۂ ملیہ اسلامیہ دہلی سے ملسکتی ہے -

انجام ڈراما ہے جناب محمد مجیب بی اے (آکسن) پروفیسر جامعہ ملیہ دہلی کا جو اس سے قبل رسالۂ جامعہ میں شائع ہو کر بہت پسند کیا جا چکا ہے -

اس ڈرامہ کا موضوع یہ ظاہر کرنا ہے کہ طاعت و مذہب کا عام طور پر کتنا غلط مفہوم سامنے ہوتا ہے اور اس پردہ میں لوگ کیا کیا حرکتیں کرتے ہیں -

مجیب صاحب کو ڈرامہ لکھنے میں خاص سلیقہ حاصل ہے اور وہ اس فن کی تمام خصوصیات کو سامنے رکھکر پلاٹ کو اس قدر دلچسپ بناکر پیش کرتے ہیں کہ شروع سے اخیر تک ذوق کی آسودگی یکساں قایم رہتی ہے -

اس کی قیمت بارہ آنے ہے اور مکتبۂ جامعہ ملیہ دہلی سے ملسکتا ہے -

خوشۂ پروین یعنی جناب فضل الدین فدا کے سو منتخب اشعار جنھیں سید کاظم دہلوی اڈیٹر کہکشاں نے شایع کیا ہے - ابتدا میں جناب کاظم اور بریمی جہاں آبادی نے حضرت فدا کی شاعری کے محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے اور کافی حسن ظن کے ساتھ -

اس مجموعہ میں بہت کم شعر ایسے ہیں جو صحیح معنے میں شعر کہلائے جائیں، لیکن ان کے مطالعہ سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جناب فدا کی موجودہ شاعری اپنے اندر ایک اچھا مستقبل پوشیدہ رکھتی ہے اور اس لئے بہتر ہوتا اگر انتخاب کی اشاعت میں چندے اور توقف کیا جاتا - یہ انتخاب ۴ر میں دفتر کہکشاں دہلی سے مل سکتا ہے -

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا - جس وقت یہ مجموعہ شائع ہوگا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائے گی اور اسی وقت قیمت بھی اس کی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اسکی ضخامت و قیمت کیا ہوگی - مینجر نگار، لکھنو

شیلے سے خطاب

نیاز صاحب قبلہ!

حُسنِ عقیدت کے جوش میں ذیل کی مختصر سی نظم جس میں شیلے سے زیادہ آپ کے مشن کی وضاحت و اشاعت ملحوظ ہے، ارسال خدمت کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف — رضوی

ترجمانِ روحِ فطرت، شاعرِ حسن و شباب
ساقیِ بزمِ محبت، ماہرِ چنگ و رباب!
دیکھ کر منظر تری چشمِ محبت پاش کا
ہوگیا کس ناز سے حُسنِ حقیقت بے حجاب!
موجِ دریا تیری فرقت میں سراپا جوش ہے
رنجِ دوری سے شعاعِ مہر کیسر اضطراب!
منکشف چینِ جبیں سے تیری رازِ کائنات
آدمِ حُریت، اے ابجد نویسِ انقلاب!
کجروی تیری صراطِ منزلِ مقصود ہے
مصدرِ صد امن و راحت تیرا آئینِ "خراب"!
رعشہ بر اندام ہیں رسم و رواجِ دنیوی
کوئی دے سکتا نہیں تیرے سوالوں کا جواب!
تو ہوا کے بازوؤں پر مائلِ پرواز ہے
تکتے تکتے تیری صورت پھوٹ جاتا ہے حباب!

روح تیری کر رہی ہے غسل موجِ نور میں
اور تو لپٹا ہوا سوتا ہے زلفِ حور میں

رضوی اسرادی بی اے

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے حسبِ ذیل قیمت پر علاوہ محصول مل سکتے ہیں

سنہ ۲۲ء ستمبر ۳ر — سنہ ۲۴ء جنوری ۸ر — فروری ۴ر — مارچ ۸ر — اپریل ۸ر — مئی ۸ر — اگست ۸ر — سنہ ۲۶ء جنوری ۴ر —
مئی ۳ر — جون ۲ر — اکتوبر ۳ر — نومبر ۳ر — سنہ ۲۷ء مارچ ۲ر — اپریل ۶ر — مئی ۳ر — جون ۳ر — سنہ ۳۰ء مارچ ۸ر — مئی ۶ر —
ستمبر ۸ر — اکتوبر ۸ر — نومبر ۸ر — سنہ ۳۱ء جولائی ۴ر — اگست ۴ر — ستمبر ۴ر — اکتوبر ۴ر — نومبر ۴ر — دسمبر ۴ر — سنہ ۳۳ء فروری ۴ر
جولائی ۶ر — ستمبر ۸ر — اکتوبر ۶ر — دسمبر ۸ر — سنہ ۳۴ء فروری ۸ر — مارچ ۸ر — اپریل ۸ر — جون ۸ر — اکتوبر ۸ر —

دو روپیہ یا اس سے زیادہ قیمت کے پرچے وی پی کے ذریعہ سے بھی بھیجے جا سکتے ہیں، اس سے کم کے لئے پیشگی رقم ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر وصول ہونا ضروری ہے۔

سنہ ۳۲ء کا پورا فائل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں۔ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

سوگند!

ادھر بھی آ تجھے اپنے وقار کی سوگند! — خمارِ چشم و رخِ جلوہ بار کی سوگند!
نگاہِ لطف کے پرتو سے زندگانی دے — نیازِ عشق کے ہر اعتبار کی سوگند!
خرامِ ناز سے فتنوں کو دے نویدِ حیات — ادائے حسن و قدِ عشوہ کار کی سوگند!
ستارۂ سحری کی لطافتوں کی قسم! — فسانۂ شبِ مشکیں بہار کی سوگند!
سکونِ خاطرِ ناشاد بن خدا کے لئے — وفورِ دردِ شبِ انتظار کی سوگند!

شمیم نعمانی نیازی

نازنینانِ حرم

نگاہِ مست کا پیغام سن لیا میں نے — جہانِ قدس کا "الہام" سن لیا میں نے
حسین نغموں کی رَو میں تجلیوں کا بہاؤ — فروغِ بادہ سے بیباکیٔ نظر کو لگاؤ
نگاہیں غرقِ شرابِ طہور کیا کہنا! — جوانیاں مئے و مستی سے چُور، کیا کہنا!
نگاہِ ناز نے ابرام کا پیام دیا — سرورِ مے سے چھلکتا ہوا سا جام دیا
تمام جذبۂ پندار دل اُبھر آیا — جگر میں دردِ دو عالم شمیم در آیا
"حرم" سے تیر چلائے ہیں نازنینوں نے — غریب جان کے لوٹا ہے مہ جبینوں نے

شمیم نعمانی نیازی

جنوری ۳۶ء کے نگار میں کیا ہوگا

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ — ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب — اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات
برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ — ہر رنگ شاعری کے بے مثل نمونے — ہندی کے عاشقانہ
رنگ کے عجیب و غریب دوہے — ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری — قیمت فی پرچہ دو روپیہ —
نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں — نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے

مینیجر نگار، لکھنؤ

جستجو

اے مرے گریۂ خوںناب کہاں پاؤں تجھے

شوق بیتاب ہے مدت سے ہم آغوش سکوں
عشق ہشیار ہے نامحرم اسرار جنوں
اب نہ وہ جوشِ تمنا ہیں نہ اشکوں میں وہ خوں
سرنگوں ہیں مگر شوخ کے سارے افسوں

اے مرے گریۂ خوںناب کہاں پاؤں تجھے

آ کہ اب عشق ہے بیداری مدہوشئ دل
حرم ہوش میں مسدود ہے سرگوشئ دل
خندۂ مہر بن اور توڑ خنک جوشئ دل
یاد بھی ہے تجھے وہ کیف ہم آغوشئ دل

اے مری مستئ نایاب کہاں پاؤں تجھے

بزم انجم مجھے پھر سر بگریباں دیکھے
خندہ ماہ مرا سوز درخشاں دیکھے
دل کو طول شب خاموش پریشاں دیکھے
آمد صبح مری دید کا ارماں دیکھے

اے مری کشمکش خواب کہاں پاؤں تجھے

چاند کی خواب اثر نظریں ہوں لب دوز نشاط
برق کی زندہ دلی ہو طپش آموز نشاط
شعلۂ چشم فسونگر ہو چمن سوز نشاط
اے محبت کی سحر حاصل صد روز نشاط

کاوشیں ہیں مری بیتاب کہاں پاؤں تجھے

سید رشید احمد صہبا واسطی

ڈراما اصحاب کہف

ابھی طیار نہیں ہوا ہے- اس لئے کوئی صاحب اس کا آرڈر ابھی نہ دیں یہ ڈراما ۳۱ جنوری ۳۶ء کے بعد شایع ہوگا اور صرف انھیں حضرات کو ملسکے گا جو نگار کے خریدار ہیں-

جو اصحاب اس کی قیمت بھیج چکے ہیں وہ اسے واپس لے سکتے ہیں اگر اتنا انتظار انھیں گوارا نہ ہو-

منیجر نگار- لکھنؤ

مُفلِس

رعد ہوں، برق ہوں، طوفان ہوں، پارہ ہوں میں
خود پرستار، خود آگاہ، خود آرا ہوں میں

گردنِ ظلم کٹے جس سے، وہ آرا ہوں میں
خرمنِ جور جلا دے، وہ شرارہ ہوں میں

میری فریاد پہ اہلِ دول انگشت بہ گوش؟
لا تبر خون کے دریا میں نہانے دے مجھے

سرِ پُر نخوتِ اربابِ زماں توڑوں گا
شورِ نالہ سے درِ ارض و سماں توڑوں گا

ظلم پرور روشِ اہلِ جہاں توڑوں گا
عشرت آبادِ امارت کا مکاں توڑوں گا

توڑ ڈالوں گا میں زنجیرِ اسیرانِ قفس
دہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے

رسمِ کہنہ کو تہِ خاک ملانے دے مجھے
برق بن کر بتِ ماضی کو گرانے دے مجھے

تفرقے مذہب و ملت کے مٹانے دے مجھے
خوابِ فردا کو بس اب حال بنانے دے مجھے

آگ ہوں، آگ ہوں، ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ
آگ ہوں، آگ، بس اب آگ لگانے دے مجھے

مخدوم محی الدین۔ بی۔ اے (عثمانیہ) حیدرآباد دکن

گزشتہ جنوری کا نگار

اُردو شاعری کے لئے وقف تھا اور ۲۳۲ صفحات پر شائع ہوا تھا۔ اربابِ قلم کی متفقہ رائے ہے کہ نگار کے اس اشاعت نے اُردو شاعری کے متعلق تمام تذکروں سے بے نیاز کر دیا ہے، چنانچہ بعض کالجوں میں صرف اسی کا پڑھانا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس نمبر کا تقریباً نصف حصہ اڈیٹر کے قلم کا ہے اور اپنی جامعیت و اندازِ بیان کے لحاظ بالکل نئی چیز ہے۔ اس سے قبل مومن نمبر، ظفر نمبر وغیرہ نگار کے نکلے اور ختم ہو گئے۔ اب لوگ طلب کرتے ہیں اور وہ کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ چند دن کے بعد یہی حال اس نمبر کا بھی ہوگا۔ اس لئے اب بھی وقت ہے کہ اس کی ایک جلد آپ طلب کر لیں۔ قیمت علاوہ محصول دو روپیہ (عہ)

منیجر نگار لکھنؤ

نگار

رسالہ ہر مہینے کی ۱۵ تاریخ تک شایع ہوتا ہے

رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں ۲۵ تاریخ تک دفتر میں اطلاع ہونی چاہئے۔ ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ ہوگا

سالانہ قیمت پانچ روپیہ (صہ) ششماہی تین روپیہ (سے)

بیرون ہند سے بارہ شلنگ سالانہ پیشگی مقرر ہے

جلد ۲۸	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۳۵ء	شمارہ ۶

ملاحظات ـــــــــ ۲

حریت فکر اور اشاعت علم کے خلاف مذہب کی جنگ ـــــــــ ۹

فلسفۂ محبت ـــــــــ سید ابوسعید بزمی۔ ایم۔ اے ـــــــــ ۱۴

افسانہ کی تکمیل ـــــــــ الیاس اسلامپوری ـــــــــ ۳۴

ہندوستان میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری ـــــــــ بشیر احمد خاں بی۔ اے (علیگ) ـــــــــ ۳۷

بعض تاریخی کتبیوں کے خطوط ـــــــــ ۴۵

محسن کاکوروی ـــــــــ مشیر احمد علوی۔ بی۔ اے۔ کاکوروی ـــــــــ ۴۷

ڈھائی سیر آٹا ـــــــــ محمد حیات اللہ انصاری۔ بی۔ اے (علیگ) ـــــــــ ۵۷

باب المراسلۃ و المناظرہ ـــــــــ ۶۹

باب الاستفسار ـــــــــ ۷۶

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

شمار ۶	دسمبر ۱۹۳۵ء	جلد ۲۸

ملاحظات

ڈاکٹر امبدکر کو کونسا مذہب اختیار کرنا چاہئے

جس وقت سے ڈاکٹر امبدکر نے ہندو مذہب کی طرف سے اپنی بیزاری کا اعلان کیا ہے اُسوقت سے تمام دوسرے مذاہب کے سربرآوردہ لوگ کوشش کر رہے ہیں کہ ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن جماعت کو اپنے مذہب کے دائرہ میں لے آئیں۔

چونکہ ڈاکٹر امبدکر کا ہندو مذہب کو ترک کرنا احتجاج ہے اس عدم مساوات کے خلاف جو ہندو سوسائٹی میں پائی جاتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ ڈاکٹر امبدکر اسی مذہب کو اختیار کریں گے جو زیادہ سے زیادہ حقوقِ مساوات دیسکے اور اسی بنا پر جو دعوت نامے ڈاکٹر صاحب موصوف کے نام دیگر مذاہب کی طرف سے بھیجے گئے ہیں ان میں اس بات کا وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ پوری مساوات دینے کے لئے طیار ہیں، اور مسلمانوں کی طرف سے بھی اسی نوع کا تبلیغی لٹریچر ان کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔

الغرض ڈاکٹر امبدکر نے اس وقت ہندوستان کے مذہبی کھیل میں ایک جام زریں (گولڈ کپ) کی حیثیت اختیار کرلی ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس مسابقت میں یہ نشانِ فتح و کامرانی کس کو ملنے والا ہے۔

اس مسئلہ میں سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ اُصولاً مذہب اور اجتماعی معاشرت کا قانون دونوں ایک ہی

چیز ہیں یا مختلف اور اگر دونوں ایک ہی چیز ہیں تو ہمارا عمل اس کا موید ہے یا نہیں۔

اس سے غالباً کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ہندو مذہب، مذہب ہونے کی حیثیت سے کوئی مستقل وجود نہیں رکھتا، بلکہ وہ ایک نظامِ معاشرت ہے، سوسائٹی کے قواعد کا ایک جال ہے جس میں ہر طبقہ کا ہندو جکڑا ہوا ہے اور اس سے چھٹکارا اس وقت تک نہیں ملسکتا جب تک کسی اور سوسائٹی میں اس کو پوری جگہ نہ مل جائے۔ اسلئے ڈاکٹر امبدکر کا یہ خیال کہ وہ ہندو سوسائٹی میں شامل رہنے کے بعد مساوات کبھی حاصل نہیں کر سکتے، بالکل صحیح و درست ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہریجن جماعت کوئی اور مذہب اختیار کرنے کے بعد عملاً اس بلا سے نجات حاصل کر سکتی ہے یا نہیں۔ اور غالباً اسی فیصلہ کا انھیں بھی انتظار ہے۔

جس وقت میں اسلام کے نقطۂ نظر سے اس مسئلہ پر غور کرتا ہوں تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے علماء کا ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن جماعت کو یہ کہکر مسلمان بنانے کی کوشش کرنا کہ وہ حقیقی مساوات دینے کے لئے طیار ہیں کس حد تک درست ہے۔ اس سے غالباً انکار ممکن نہیں کہ اسلام اور اسلام کیا دنیا کا ہر مذہب چند مخصوص عقاید کا مجموعہ ہوا کرتا ہے اور چونکہ عقاید کا تعلق صرف وجدانی اعتراف و یقین سے ہے، اس لئے کوئی شخص یا کوئی گروہ اسوقت تک اُصولاً کسی مذہب میں شامل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس کے مخصوص عقاید کا اعتراف زبان سے اور انکی تصدیق قلب سے نہ کرے۔ یعنی اگر میں صرف زبان سے خدا کی وحدانیت اور رسول کی رسالت کا اظہار کروں اور دل میں میرے تذبذب ہو تو میں کبھی مسلمان نہیں ہو سکتا۔

اب اس حقیقت کو سامنے رکھکر غور کیجئے کہ مسئلہ زیر بحث کی صورت کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ میں ہندو مذہب سے صرف اس لئے بیزار ہوں کہ مجھے اس کے ماننے والے حقیر و ذلیل سمجھتے ہیں، آپ کہتے ہیں کہ آؤ ہم تمھیں ذلیل نہیں سمجھیں گے تمھیں پورے حقوق مساوات دیں گے اور وہ آپ کی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے، تو کیا وہ شخص حقیقتاً مسلمان ہو گیا، اور کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ اس کا اس طرح مسلمان ہو جانا اِس کو بھی متلزم ہے کہ اس نے آپ کے رسول کے نبی آخر الزماں ہونے کو بھی تسلیم کر لیا، آپ کے "ملائکۃ وکتبہ" کو بھی مان لیا، آپ کے یوم آخرت پر بھی ایمان لے آیا، اور "بعث بعد الموت" کا بھی قایل ہو گیا۔ اور اگر ایسا نہیں ہے تو مذہب کے صحیح نقطۂ نظر سے ہم ایسے شخص کو کیونکر مسلمان باور کر سکتے ہیں۔

اگر اس وقت ڈاکٹر امبدکر یا پوری ہریجن جماعت مسلمان ہو بھی جائے (جس کی مجھے کوئی توقع نہیں ہے) تو ظاہر ہے کہ اس کا اسلام لانا صرف معاشرتی و سیاسی مصالح کی بنا پر ہو گا نہ کہ مذہبی نقطۂ نظر سے، یعنی وہ اپنے معاشری حقوق تو مسلمانوں سے برابر کے حاصل کر لیں گے لیکن اُن کے دل و دماغ میں وہی مندر اور اس کے وہی بُت بسے ہوں گے جن کی پوجا کی انھیں اجازت نہ دیجاتی تھی، پھر یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہریجن جماعت کے

اسلام لانے کے بعد مردم شماری کے تختہ میں مسلمانوں کی اقلیت کچھ کم ہو جائے، لیکن شاید لوحِ محفوظ میں اُن کا نام کہیں نظر نہ آئے گا۔

اول تو مذہب جن عقاید سے تشکیل پاتا ہے ان کا تعلق زیادہ تر قومی روایات سے ہوا کرتا ہے جو گہوارہ ہی سے انسان کے دل و دماغ میں مرتسم کئے جاتے ہیں اور جن کا محو ہونا تقریباً محال ہے، لیکن اگر مذہب میں عقل و فراست کا درخور ہو بھی تو ظاہر ہے کہ اس کے لئے نہایت وسیع مطالعہ، حد درجہ عمیق فکر و غور کی ضرورت ہے جس کی توفیق اسوقت تک ہریجن جماعت کیا شاید خود ڈاکٹر امبدکر کو بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس لئے اگر اس وقت ڈاکٹر امبدکر (مع اپنے اُن چند مقلدین کے جو حقیقتاً خود اپنے مذہب سے بھی واقف نہیں ہیں چہ جائیکہ عقاید اسلام) مسلمان ہو بھی گئے تو میرے نزدیک وہ کبھی صحیح معنے میں مسلمان نہ ہوسکیں گے اور مسلمانوں کا اُن کو یہ کہکر مسلمان بنانا کہ ہم تمکو حقوق مساوات دینے کے لئے طیار ہیں، کبھی دیانت کی صحیح مثال میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔

ہمارے علماء اور مبلغین بخوبی واقف ہیں کہ ہریجن جماعت کا اس وقت مسلمان ہونا — (اگر وہ مسلمان ہوئے) صرف اس طمع سے ہوگا کہ ممکن ہے ان کی معاشرتی سطح بلند ہو جائے اور ان کے سامنے یہ کوئی سوال نہیں ہے کہ مسلمانو کے عقاید کیا ہیں اور وہ کس حد تک ان کے لئے قابل قبول ہیں۔ اس لئے کیا میں مسلمانوں سے دریافت کر سکتا ہوں کہ کوئی ایسی جماعت جو اُن کے "ایمان مجمل و مفصل" سے ناواقف رہنا چاہتی ہے، جو اُن کی مذہبی روایات کے متعلق کوئی جذبۂ احترام اپنے دل میں نہیں رکھتی جو اُن کے اُصول مذہب کی خوبی کی صحیح معنی میں قایل نہیں ہے، جو اُن کے معاد و حشر و نشر کے عقاید کو مطلق نہیں سمجھتی، کیا وہ صرف اس لئے مسلمان سمجھی جاسکتی ہے کہ اس نے کسی سوسائٹی کے خلاف احتجاج کرنے یا اس سے انتقام لینے کے لئے مذہب اسلام میں شامل ہونے کا اعلان صرف زبان سے کر دیا ہے۔

اگر ایک مسلمان ہونے کے لئے صرف یہی شرط درکار ہے، اگر مذہب اسلام ایسے شخص کو مسلمان سمجھ سکتا ہے جو زبان سے کعبہ کا اعتراف کرے اور دل میں بُت ہی بُت بھرے ہوں، تو مجھے حیرت ہے کہ خود اُن مسلم افراد کو کافر و ملحد کہکر اپنی برادری سے نکالنے کے کیا معنی ہیں جو کعبہ کا احترام تو ویسا ہی کرتے ہیں جیسے تمام مسلمان، لیکن وہ اس کو صنمکدہ کی حیثیت سے پوجنے کے لئے طیار نہیں۔

الغرض ہریجنوں کا مسلمان ہونا یا اُن کو اسلام کی دعوت دینا صرف یہ کہکر کہ مسلمان اُن کو اپنی برادری میں شامل کرکے برابر کے حقوق دینے کے لئے آمادہ ہیں، خالص مذہبی نقطۂ نظر سے کوئی معنی نہیں رکھتا اور اگر ڈاکٹر امبدکر کا یہ اعلان کہ وہ ہندو مذہب ترک کرنے والے ہیں حقیقتاً کوئی چال نہیں ہے تو مسلمانوں کا اُن کو اسلام کی دعوت دینا یقیناً صرف سیاسی چال ہے اور میں کبھی اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ہریجن جماعت "تصدیق بالجنان"

کے لحاظ سے اب یا کسی وقت مسلمان کہلائی جا سکتی ہے۔ البتہ اگر مسلمانوں کا ایمان مفصل و مجمل صرف یہ ہوتا کہ تمام انسان برابر ہیں، جملہ افرادِ نوعِ انسانی ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور اس عقیدہ میں کسی اور خیال کا دخل نہ ہوتا تو بیشک مسلمانوں کی طرف سے دعوتِ اسلام صحیح ہو سکتی تھی اور ہریجن جماعت اسلام لانے والی بھی کہلائی جا سکتی تھی، لیکن چونکہ مذہباً اسلام کا مفہوم یہ نہیں ہے اس لئے یہ دعوت ہی سرے سے غلط ہے اور اسکے ردو قبول پر غور کرنا اس سے زیادہ غلط۔

یہاں تک مذہبی نقطۂ نظر سے گفتگو ہوئی۔ اب سماجی حیثیت سے اس مسئلہ پر غور کیجئے تو اس کی لغویت اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ مسلمانوں کا ہریجن جماعت سے یہ وعدہ کرنا کہ وہ اُن کو حقوق مساوات دینے کیلئے طیار ہیں، صرف مقالاً تو درست ہو سکتا ہے لیکن عملاً اس کی کوئی امید نہیں۔

یہ بالکل درست ہے کہ اسلام کی تعلیم کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے کہ نسل و رنگ کا امتیاز مٹ جائے، سوسائٹی کا غلط فرق مراتب محو ہو جائے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسوقت جو تویں صدہا سال سے مسلمان چلی آ رہی ہیں اُن میں کب مساوات کے اُصول پر عمل کیا جاتا ہے کہ آئندہ ہریجنوں کو کوئی تازہ توقع پیدا ہو سکے۔

اس وقت مسلمانوں کا طبقہ بھی سوسائٹی کے لحاظ سے اتنا ہی قابل اعتراض ہے جتنا ہندوں کا۔ جس طرح اونچی ذات کے ہندو نیچی ذات کے ہندوؤں سے علحدہ رہنا چاہتے ہیں بالکل اسی طرح اونچے درجہ کے مسلمان بھی پسند نہیں کرتے کہ وہ معمولی درجہ کے مسلمانوں سے معاشرتی تعلقات قایم کریں۔ ہندوؤں میں اگر ایک جماعت اُن بدنصیب افراد کی پائی جاتی ہے جو کوری، چمار وغیرہ کے نام سے موسوم ہیں تو مسلمانوں میں بھی دھنئے، جلاہے اور مہتر وغیرہ اس لحاظ سے خوش نصیب نہیں کہلائے جا سکتے۔۔ مساوات کی پہچان صرف یہ نہیں ہے کہ ہم سب ملکر ساتھ کھانا کھالیں، یا "بھائی بھائی" کہکر عید کے دن ایک دوسرے سے گلے مل لیں، بلکہ اس کا تعلق صرف احساس سے ہے اور اس کی سب سے بہتر کسوٹی رشتۂ ازدواج ہے۔۔۔ پھر مسلمانوں کی جماعت میں وہ کون سب سے بڑا مسلمان ہے جو اس معیار پر پورا اُتر سکتا ہے اور وہ کونسا مدعیِ مساوات "مولانا" ایسا ہے جو اپنی لڑکیوں کو مسلمان مہتروں یا نومسلم ہریجنوں کے ساتھ بیاہ دینے کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے۔ جو قوم ابھی تک نکاح کے باب میں شیخ و سید، فاروقی و صدیقی کا امتیاز نہ اُٹھا سکی ہو وہ کیا مساوات کا دعویٰ کر سکتی ہے اور وہ غریب نومسلم ہریجنوں کو کیا برابر کے حقوق دے سکتی ہے۔

میں نے ابتدائی سطور میں ظاہر کیا تھا کہ اُصولاً سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ مذہب اور سوسائٹی دونوں ایک ہی چیز ہیں یا مختلف اور غالباً اب اتنی بحث کے بعد یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ مذہب سوسائٹی سے بالکل علحدہ چیز ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کسی قوم کا مذہب اختیار کرنے کے بعد اس کی سوسائٹی میں بھی

شامل کر لیا جائے - مساوات کا دعوے کرنے والے مذاہب میں اسلام و عیسویت کو خاص امتیاز حاصل ہے لیکن ان کی سوسائٹی کے قانون میں وہی عدم مساوات پائی جاتی ہے جو دیگر مذاہب میں۔

جس طرح ایک نومسلم مہتر مسلمانوں کی معاشرت میں بدستور مہتر ہی بنا رہتا ہے، اسی طرح عیسائیوں میں ایک نوعیسائی چمار، چمار ہی رہتا ہے، نہ وہ مسلمان امرا کی مجلسوں میں شریک ہو سکتا ہے اور نہ یہ یوروپین ڈنرول میں، نہ اُسے کوئی شیخ سید اپنی لڑکی دے سکتا ہے نہ اس کے ساتھ کوئی ڈپٹی کمشنر اپنی مس گرجا میں بھیج سکتا ہے۔

جس حد تک خدا کی وحدانیت اور عیسے کے ابن اللہ ہونے کا تعلق ہے ایک مسلمان مہتر، ایک عیسائی چمار یقیناً شمس العلما مولانا رحمت اللہ اور لارڈ آکلینڈ کے برابر ہے، لیکن تمدن و معاشرت میں وہ کبھی یکساں نہیں سمجھے جا سکتے یعنی آخرت میں جب سوال نعائم بہشت کی تقسیم کا ہوگا تو ممکن ہے دونوں کو برابر کا حصہ مل جائے، لیکن اس دنیا کے جہنم زار میں ان دونوں کی سطح بالکل مختلف ہوگی - اس لئے اگر ڈاکٹر امبدکر صرف اس لئے مسلمان ہونا چاہتے ہیں کہ انہیں اسلام کے حور و قصور سے زیادہ رغبت ہے یا بہشت کا تصور اُن کے لئے زیادہ فرحت بخش ہے تو اہلاً و سہلاً شوق سے تشریف لائیں اور مسلمان ہو کر کوثر و سلسبیل میں برابر کے حصہ دار ہو جائیں لیکن اگر وہ اس بات کے آرزومند ہیں کہ مسلمان اس دنیا میں ہریجنوں کو اپنے برابر سمجھنے لگیں تو مجھے افسوس ہے کہ ان کی یہ تمنا کبھی پوری نہیں ہو سکتی ———

"وعدۂ فردا" ضرور اُن کے لئے حاضر ہے لیکن آج کوئی نقد سودا اُن سے نہیں کیا جا سکتا۔

اب اس سلسلہ میں بحث کے دو پہلو اور رہ جاتے ہیں ایک یہ کہ مسلمانوں کے لئے ہریجنوں کا اسلام لے آنا واقعی کوئی مفید بات ہے یا نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر ڈاکٹر امبدکر واقعی ہندو مذہب ترک کرنا چاہتے ہیں (درانحالیکہ ہندو کوئی مذہب نہیں ہے بلکہ صرف سوسائٹی کا نظام ہے) تو پھر انھیں کونسا مذہب اختیار کرنا چاہئے۔

امر اول کے متعلق بھی میری رائے وہ نہیں ہے جو عام طور پر ظاہر کی جاتی ہے - یعنی مسلمانوں کا یہ خیال کہ وہ ہریجنوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے اپنی سیاسی اہمیت کو قائم کر سکیں گے میرے نزدیک بالکل نادرست ہے۔

میں اس سے قبل بھی بارہا عرض کر چکا ہوں اور پھر اسی کی تکرار کرتا ہوں کہ نظام تمدن و سیاست میں تعداد کا سوال کبھی اہم نہیں سمجھا گیا بلکہ ہمیشہ صلاحیت و اہلیت کو دیکھا جاتا ہے - بھیڑوں کے گلہ کو خواہ وہ دس کا ہو یا بیس کا ایک ہی آدمی ہانک کر جہاں چاہے لیجا سکتا ہے اور صرف ایک شیر کو قابو میں لانے کے لئے درجنوں آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے - اگر کسی جماعت میں صرف سو آدمی ہیں لیکن ہیں سب کے سب ذی فہم و ذی شعور تو وہ یقیناً اس جماعت سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جس میں ہزار افراد شامل ہیں لیکن ہیں سب ناتراشیدہ - تاریخ اُٹھا کر دیکھئے آپ کو اس نظریہ کی صداقت ہمیشہ اور ہر جگہ نظر آئے گی۔

خود تاریخ اسلام میں متعدد واقعات ایسے ملیں گے کہ چند نفوس نے بڑی بڑی جماعتوں پر غلبہ حاصل کر لیا - اسلئے مسلمانوں کا یہ خیال کہ وہ جاہل و غیر مہذب ہریجنوں کو اپنے اندر شامل کر کے کوئی خاص قوت حاصل کر سکیں گے اصولاً و تاریخاً دونوں

طرح بالکل غلط ہے۔ ضرورت تو حقیقتاً یہ ہے کہ اپنے ناکارہ افراد کو بھی اپنے سے علٰحدہ کر دیا جائے نہ یہ کہ ان میں اور اضافہ کیا جائے۔ آج مسلمانوں کے ادبار و انحطاط کا بڑا سبب یہ ہے کہ ان کے موجودہ افراد میں سے اکثر جاہل و غیر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے قوم کی گردن پر ایک ناگوار بار بنے ہوئے ہیں چہ جائیکہ ہریجنوں کو اپنے میں شامل کرکے اس بار کو اور زیادہ ناقابل برداشت بنا لیا جائے۔ حیرت ہے کہ ضرورت تو بوجھ ہلکا کرنے کی ہے اور ہم اس کو اور بڑھانے کی فکر میں ہیں۔

اب رہا یہ مسئلہ کہ ڈاکٹر امبدکر اور ہریجن کونسا مذہب اختیار کریں، سو اس کے متعلق میں ان کو مشورہ دوں گا کہ اگر سوشل اصلاح کے لئے وہ کسی مذہب کا اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں (درانحالیکہ یہ بالکل غیر ضروری ہے) تو ان کو بدستور ہندو ہی رہنا چاہئے کیونکہ ممکن ہے ان کا موجودہ اضطراب کسی وقت ہندو سوسائٹی میں کوئی مفید تغیر پیدا کر سکے، لیکن اگر وہ اس کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکے ہیں اور ترک تعلق کا فیصلہ ہی کر چکے ہیں تو مناسب یہ ہوگا کہ وہ کوئی مذہب نہ اختیار کریں بلکہ اپنا مسلک صرف لامذہبیت قرار دیں جس کا آغاز و انجام سوائے "انسانیت" کی پرستش کے اور کچھ نہ ہو

اگر خدا کے وجود کا عقیدہ ان کے دل سے نہیں نکل سکتا (اور نکلنا بھی نہیں چاہئے) تو خدا کو پابند سمجھنے کے بجائے آزاد و مطلق سمجھیں اور ایک ایسی ہستی سمجھ کر اس سے رشتہ قائم کریں جو مسجد میں بھی ہے اور مندر میں بھی، کلیسا میں بھی ہے اور آتشکدہ میں بھی، اور جو برہمن و شودر کے امتیاز سے بہت بلند ہے۔ ان کا مذہب تمام مذاہب کے اصول کو صحیح و صادق سمجھ کر سب کا احترام کرنا ہو اور خود کسی کا پابند نہ ہونا۔ اپنی سوسائٹی سب سے علٰحدہ بنائیں، ایک مستقل جداگانہ اہمیت اس میں پیدا کریں جس کا بہترین طریقہ تعلیم کا رواج ہے۔ ہندوؤں کے خلاف محاذ جنگ قائم کرنا کبھی اتنا سودمند نہیں ہو سکتا جتنا ہریجنوں کے اندر صحیح تعلیم کی اشاعت کرنا جو انسان کو خود اپنے اوپر اعتماد کرنا سکھاتی ہے اور جو بجائے کعبہ و مندر کے اس خدا کی پرستش کا درس دیتی ہے جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔ عزم و ولولہ کی صورت میں صداقت و انسانیت کی صورت میں اور اس "انانیت" کی شکل میں جو خدا کو انسان تو نہیں لیکن انسان کو خدا ضرور بنا سکتی ہے۔

معذرت

میں نے پچھلے مہینے کے نگار میں دو وعدے کئے تھے ایک یہ کہ مسئلہ خلافت و امامت پر اس ماہ کی اشاعت میں اپنا محاکمہ پیش کروں گا اور دوسرے یہ کہ جناب مندوزئی صاحب مہدوی کے مضمون کو شائع کرکے اس کا جواب دوں گا، لیکن افسوس ہے کہ ان میں سے کوئی وعدہ پورا نہ کر سکا۔

اس کا سبب یہ ہوا کہ ٹھیک اس وقت جب یہ مضامین کاتب کے سپرد کرنا چاہیئے تھا، مجھے معلوم ہوا کہ ایک خاص ضرورت سے مجھے بہت جلد حیدرآباد جانا ہوگا اور میں تمام کام چھوڑ کر اُن کاغذات کی طیاری میں مصروف ہو گیا جنکی تکمیل پر میرا حیدرآباد جانا منحصر تھا۔ نگار کی کتابت تو بہرحال رُک نہ سکتی تھی، اس لئے دسمبر کا پرچہ میرے ان دونوں مضمونوں سے خالی رہا۔ ہرچند مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے کیوں دوسرے کام کی طرف توجہ کی، جبکہ ہنوز نہ میں حیدرآباد جا سکا ہوں اور نہ آئندہ یقین کے ساتھ اپنے جانے یا نہ جانے کے متعلق کچھ کہہ سکتا ہوں۔ بہرحال اس کو غلطی کہئے یا مجبوری میں معذرت خواہ ہوں اور اُن تمام احباب کو جو ان دونوں مضامین کے منتظر ہیں، یقین دلاتا ہوں کہ فروری کے نگار میں حتماً دونوں مضامین شایع ہوں گے اور بالکل ممکن ہے کہ اس فرصت و مہلت میں زیادہ تکمیل و اہتمام کے ساتھ میں انھیں طیار کر سکوں۔ جنوری کا نگار چونکہ ہندی شاعری کیلئے وقف ہے اسلئے اس میں کسی اور موضوع پر بحث کا موقعہ ہی نہیں۔

جنوری سنہ ۳۶ء کا رسالہ

تقریباً مرتب ہو چکا ہے اور کتابت شروع ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ جنوری کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا۔ جو حضرات جنوری سنہ ۳۵ء کا نگار ملاحظہ فرما چکے ہیں ان کے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ جنوری سنہ ۳۶ء کا نگار کیا چیز ہوگا۔

اس میں سب سے پہلا مضمون تین جزو کا "ہندی شاعری کی تاریخ" پر ہے اور اس کے بعد متعدد انتقادی مضامین مختلف مباحث پر درج کئے گئے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ ہندی کی عاشقانہ شاعری اس کی لطیف و شیریں تشبیہات، اس کی جذبات نگاری اور پاکیزہ طرز بیان اتنی مشہور چیز ہے کہ ہر شخص اس کا معترف ہے۔ اس لئے پوری کوشش کی گئی ہے کہ اس نوع کا بہترین انتخاب ناظرین نگار کی خدمت میں پیش کیا جائے ابھی تک اس کی ضخامت کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکا ہے، لیکن دو سو صفحات تک اس کا پہونچ جانا یقینی ہے، ممکن ہے اس سے بھی زیادہ بڑھ جائے۔

ڈراما اصحاب کہف ابھی تک جناب نیاز کی مصروفیت کی وجہ سے ختم نہیں ہو سکا، لیکن امید ہے کہ فروری میں شایع ہو جائے گا اور جن حضرات کا نام ۳۱ جنوری سنہ ۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں درج پایا جائیگا ان کی خدمت میں بشرط طلب معہ محصول ۱۲ر میں روانہ کر دیا جائیگا۔ افسوس ہے کہ غیر خریداران نگار اسکو کسی قیمت میں بھی حاصل نہیں کر سکتے یہ ڈراما اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہوگا اور اس قدر بلند و نازک جذبات محبت کا حامل ہوگا کہ مشکل سے آپکو کوئی دوسری نظیر اسکی مل سکے گی۔

مجموعہ استفسار و جواب جلد دوم بھی زیادہ سے زیادہ فروری میں شائع ہو جائے گا اور اسکی قیمت بھی معہ محصول خریداران نگار کے لئے ۱۲ر ہوگی۔ غیر خریداران نگار سے ایک روپیہ زاید لیا جائے گا۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

حریت فکر اور اشاعت علم کے خلاف مذہب کی جنگ

ہیکل منروا سے متصل خانقاہ سنتا میریا کے درمیانی کمرہ میں ایک لانبی میز بچھی ہوئی ہے اور اس کے چاروں طرف مفتیان مذہب علیسویت کی جماعت حلقہ کئے ہوئے بیٹھی ہے۔ سامنے ستر سال کا ایک ضعیف انسان جس کے بال برف کے گالے کی طرح سفید ہیں سر جھکائے ہوئے دوزانو نظر آتا ہے۔ کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ دفعتاً مفتی اعظم کھڑا ہو جاتا ہے اور ایک کاغذ کھولکر بلند آواز سے اس فیصلہ کو سناتا ہے جو مذہب کی طرف سے اس ضعیف گنہگار کے خلاف صادر ہوا ہے۔

ایک دوسرا کاغذ مجرم کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ بلند آواز سے پڑھکر سب کو سنائے، چنانچہ وہ اسے پڑھتا ہے اور انجیل مقدس پر ہاتھ رکھ کر اس کاغذ پر دستخط کرتا ہے اور خانقاہ سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔

یہ تھا مقدس منظر اُس مقدس فیصلہ کا جو معمر گلیلو کے خلاف سنایا گیا اور صرف اس معصیت پر کہ وہ اپنے عہد کا سب سے بڑا ہیئت داں تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ زمین آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔

فروری ۱۵۶۴ء کی ۱۸ تاریخ تھی کہ گلیلو بمقام پیسا (Pisa) پیدا ہوا۔ یعنی ٹھیک اس تاریخ میں جب میکائیل اینجلو کا انتقال ہوا اور جس کے چند ہفتے بعد شیکسپیر عالم وجود میں آیا۔ اسی سال جان کالون کا ابھی انتقال ہوا۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ گلیلو کی پیدائش اس زمانہ میں ہوئی جب دنیا کچھ بہتر ہو چلی تھی۔

اس کا باپ (ونسنزو گلیلی) فلارنس کے ایک شریف گھرانے کا آدمی تھا اور اس کی ماں (جولیا) بھی ایک قدیم معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

گلیلو ابھی بہت چھوٹا تھا کہ اس کے والدین فلارنس چلے آئے جہاں ان کی مستقل سکونت تھی۔ اسکا باپ خاصہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور اس نے موسیقی پر ریاضی کے نقطۂ نظر سے کچھ جدید نظریے پیش کر کے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ گلیلو کی ابتدائی تعلیم اول اول ایک پرائیویٹ ٹیوٹر کے ذریعہ سے ہوئی اور اس کے بعد خانقاہ ولمبروسا بھیجدیا گیا۔ یوں تو اُسے ادب قدیم کے مطالعہ کا بھی شوق تھا، نظم سے بھی لگاؤ تھا، لیکن سب سے زیادہ رجحان علوم حکمیہ کی طرف تھا۔ اسی لئے اس کے باپ نے کلیۂ پیسا میں فن طب کی تعلیم کے لئے اسے بھیجدیا (۱۵۸۱ء)

یہ وہ زمانہ تھا جب یوروپ کی یونیورسٹیوں میں صداقت کا معیار صرف ارسطو کے نظریوں کو سمجھا جاتا اور یونان قدیم کے اس مفکر کے خلاف کچھ کہنا گویا خدا کی خدائی سے انکار کرنا تھا۔ لیکن گلیلو ان معمولی لوگوں میں سے نہیں تھا جو ارسطو کے اقوال پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آتا۔ وہ ان پر غور کرتا تھا اور بہت سی باتوں میں اُس کا مخالف تھا۔

اس کی غیر معمولی ذہانت اور اخذ نتائج کی قوت کا ایک واقعہ اس جگہ بیان کرنا غالباً دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ایک دن اپنے عنفوان شباب کے زمانہ میں گلیلو کسی گرجا میں پہونچا اور اس کی نگاہ ایک فانوس پر پڑی جو محراب میں لٹکا ہوا تھا۔ ملازم کلیسا نے اس فانوس کو ایک طرف ہٹا کر روشن کیا اور چھوڑ دیا۔ فانوس اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ یہ منظر گلیلو سے قبل ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے سامنے آیا ہوگا، لیکن اس نے جس نگاہ سے دیکھا وہ کچھ اور تھی۔ اس نے غور کیا کہ فانوس کے اہتزاز میں رفتہ رفتہ کمی پیدا ہوئی یہاں تک کہ وہ عمودی خط میں پھر اپنی اصلی جگہ آ گیا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اس کے تمام اہتزازات میں وقت ایک ہی صرف ہوا، یعنی اگر پہلا لمبا اہتزاز ایک سکنڈ میں ہوا تھا تو دوسرا اس سے کم لمبا بھی ایک ہی سکنڈ میں ختم ہوا یہاں تک کہ اس کی آخری جنبش بھی جس نے بہت ہی کم جگہ لی تھی اتنے ہی وقفہ میں پوری ہوئی۔ اس کا یہ اکتشاف Isochronism (تساوی الزمن) کہلاتا ہے اور سب سے پہلے اسی نے کلاک میں وقت کی پیمایش کے لئے اس اُصول کو استعمال کیا۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں اس کی ملاقات ایک مشہور ریاضی داں ونسنزو (Vincenzo) سے ہوگئی اور اس نے باوجود اپنے باپ کی مخالفت کے ریاضیات اور طبیعیات کا مطالعہ شروع کر دیا، لیکن چونکہ اقتصادی حالت عرصہ تک یونیورسٹی کی تعلیم جاری رکھنے کی موافق نہ تھی اور لوگوں کی مخالفت کے خیال سے ٹسکنی کے ڈیوک نے بھی کوئی مدد اس کی نہیں کی اس لئے اُسے یونیورسٹی کی تعلیم ترک کرنا پڑی۔

اب اس نے گھر بیٹھ کر اپنا مطالعہ وسیع کرنا شروع کیا اور علمی تجربات و تحقیقات میں پورے انہماک کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے آرشمیدس کا بھی مطالعہ کیا جسے یوروپ عرصہ سے فراموش کر چکا تھا اور اسی سلسلہ میں اپنے "توازن مایعات" (Hyrostatic balance) کا اکتشاف کیا جس کی مدد سے جواہر کا ثقل نوعی نہایت صحت کے ساتھ دریافت ہو سکتا تھا۔

اس دوران میں گلیلو کی رقاص والی گھڑیاں کثرت سے بننے لگی تھیں اور بجائے دھوپ گھڑی کے ان کا رواج تمام یوروپ میں ہو گیا تھا۔ از روزہ اس قدر مشہور ہو گیا کہ پیسا یونیورسٹی نے اس کو ریاضی کا پروفیسر بنانا منظور کر لیا۔ اس وقت اُس کی عمر ۲۵ سال کی تھی۔

اب اسے زیادہ اطمینان کے ساتھ کام کرنے کا موقعہ ملا اور اسی زمانہ میں اس نے وہ زبردست انقلاب انگیز انکشاف کیا جسے "کشش ثقل" کہتے ہیں اور جس کا نام ہی "قانون گلیلو" پڑ گیا۔ اس سے قبل ارسطو نے جو نظریہ "کشش ثقل" کا قائم کیا وہ یہ تھا کہ کسی ٹھوس چیز کی رفتار جب وہ زمین کی طرف مایل ہو منحصر ہے اس چیز کے وزن پر۔ یعنی ایک چیز جس قدر زیادہ وزنی ہوگی اتنی ہی سرعت کے ساتھ زمین کی طرف جائے گی۔ دو ہزار سال سے اسی نظریہ پر سب کا ایمان تھا اور کسی میں ہمت نہ تھی کہ وہ اس کے خلاف کوئی لفظ مُنھ سے نکال سکے۔ لیکن گلیلو نے منارۂ پیسا پر چڑھکر خود اس کا عملی تجربہ کیا اور آخر کار اس نے ارسطو کے اس نظریہ کی تردید کر کے اعلان کیا کہ جو اجسام ہلکے ہوں یا بھاری سب کو زمین تک پہونچنے میں ایک ہی وقت درکار ہوتا ہے اور اس طرح ایک اور اہم قانون فطرت کا انکشاف اس نے کیا۔

اس پر لوگوں میں بہت برہمی پیدا ہوئی اور ارسطو کے طرفداروں نے اسے یونیورسٹی چھوڑنے پر مجبور کر دیا اس کے بعد وہ مارکوئس ڈل مانٹی کی مدد سے جو گلیلو کا بہت معرف تھا پڈوا یونیورسٹی میں ریاضی کا پروفیسر ہو گیا یہ واقعہ سنہ ۱۵۹۲ء کا ہے۔

یہاں پہونچکر وہ اپنے تجربات میں زیادہ انہماک کے ساتھ مصروف ہو گیا اور سنہ ۱۵۹۹ء میں ایک ہوشیار میکانک کی خدمات حاصل کر کے عملی طور پر اپنے تمام نظریوں کا امتحان کرنے لگا۔ گلیلو کے اختراعات و انکشافات بہت ہیں اور انھیں میں سے ایک تھرما میٹر ہے جسے سنہ ۱۶۰۲ء میں اس نے ایجاد کیا۔[ملہ]

لیکن اس کی اہم ترین ایجاد جس نے فلکیات کے قدیم نظریوں کو درہم برہم کر کے رکھدیا اور جو اس کے تکالیف و مصائب کا باعث بھی ہوئی "دوربین" تھی۔ سنہ ۱۶۰۹ء میں جب شیکسپیر ڈرامے لکھنے میں مصروف تھا، گلیلو دوربین کے شیشوں کو اپنے ہاتھ سے گھس گھس کر چکنا بنا رہا تھا۔ ہر چند دوربین کا خیال اس سے قبل ڈچ کا ایک عینک ساز پیش کر چکا تھا، لیکن گلیلو نے اس سے بالکل علحدہ خود اپنی قوت فکر سے کام لے کر اس کام کو شروع کیا۔ گلیلو نے اسی زمانہ میں اپنے برادر نسبتی لان ڈوسی کو ایک خط لکھا جس کا اقتباس یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

> "دو مہینے ہوئے جب یہاں ایک خبر اُڑی کہ فلانڈرس کے کسی آدمی نے ایک ایسا آلہ طیار کیا ہے جس سے دور کی چیز بھی صاف نظر آتی ہے۔ میں یہ سنکر بہت متعجب ہوا اور سوچنے لگا کہ ایسا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ آخر کار میں اس میں کامیاب ہو گیا اور ایسی قوی دوربین

ملہ اوّل اوّل درجۂ حرارت کی پیمایش میں پانی سے مدد لیگئی، بعد کو اسپرٹ سے اور پھر اس کے بہت زمانہ بعد پارہ سے کام لیا گیا۔

طیار کرلی کہ وینس۔ کے تمام اکابر و امرا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ اس سے پچاس میل کا فاصلہ صرف پانچ میل رہجاتا ہے۔"

دوربین طیار کرنے کے بعد گلیلو نے سب سے پہلے آسمان اور اس کے ستاروں کا مشاہدہ اس کے ذریعہ سے کیا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہگیا کہ جتنے ستارے عُریاں آنکھ سے نظر آتے ہیں اُن سے کہیں زیادہ دوربین سے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ایجاد نے ہیئت کے نظام بطلیموسی کو سخت صدمہ پہونچایا جس کا یورپ معتقد تھا اور جو بتاتا تھا کہ ستارے کسی ایسی ٹھوس دیواروں میں جڑے ہوئے ہیں جو زمین کے چاروں طرف قایم ہے۔ کیونکہ گلیلو نے اپنی دوربین کے ذریعہ اس امر کو ثابت کیا کہ ستارے زمین سے مختلف دوریوں پر واقع ہیں اور اس لئے ان کا ایک ہی سطح پر جڑا ہوا سمجھنا درست نہیں۔ اسی سلسلہ میں اس نے کہکشاں کا مطالعہ بھی دوربین سے کیا اور لوگوں کو بتایا کہ یہ روشن سڑک مجموعہ ہے بیشمار ستاروں کا جو فضا میں مختلف دُوریوں پر پائے جاتے ہیں۔ اس نے یہ بھی دریافت کیا کہ کرۂ مشتری کے چار چاند ہیں[1]۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ زحل کے چاروں طرف ایک منور حلقہ پایا جاتا ہے اور چاند کے جغرافیہ پر بھی کچھ روشنی ڈالی۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ دنیا سنکر حیران رہگئی اور دوربینوں کی مانگ اسقدر بڑھ گئی کہ اس کا پورا کرنا مشکل ہوگیا۔

اب گلیلو کی شہرت اتنی وسیع ہو گئی کہ ٹسکنی کے گرانڈ ڈیوک نے اسے فلارنس واپس بلالیا اور یہاں اسنے اطمینان سے سیاروں کی گردش کا مطالعہ کر کے نظام کوپرنیکس کا اعلان کیا جو زمین کی گردش کا حامی تھا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت جب اس کے علمی انکشافات دنیا سے خراج تحسین وصول کر رہے تھے، فلارنس اور روم کی قدامت پرست مذہبی جماعتیں اس سے بیزار تھیں اور سمجھتی تھیں کہ گلیلو مذہب کا دشمن ہے اور صحف مقدسہ کے بتائے ہوئے اُصولِ ہیئت کے خلاف اس کے انکشافات دنیا میں بیدینی پھیلانے والے ہیں چنانچہ فلارنس ہی میں ایک جلسہ اس کے خلاف منعقد ہوا اور اس میں ایک مذہبی واعظ نے لوگوں کو سمجھایا کہ زمین کی حرکت کا قایل ہونا انجیل کی مخالفت ہے اور اس لئے تمام ایسے لوگوں کو جو علم کے نام سے مذہب و تعلیمات مذہب کی مخالفت کرتے ہیں سخت سزا دینا چاہئے۔

گلیلو نے یہ حالات معلوم کر کے پادری کاسٹلی کو ایک دوستانہ خط لکھا کہ "حرکت زمین کی تردید کسی جگہ انجیل میں نہیں پائی جاتی اور اسی کے ساتھ یہ بھی التجا کی کہ خدا کے لئے علمی تحقیقات میں رخنہ اندازی نہ کیجئے۔" اتفاق سے یہ خط راہب فادر لورینی کے ہاتھ پڑ گیا اور اس نے اس کی ایک نقل روم کی مذہبی عدالت

---

[1] اب زیادہ قوی دوربینوں کی مدد سے ان اقمار کی تعداد بجائے چار کے نو معلوم ہوئی ہے۔

کو بھیجدی جہاں فوراً اس کے خلاف کارروائیاں شروع کردی گئیں۔

گلیلیو کے دوستوں نے اسے سمجھایا کہ خاموش رہو اور کوئی جوابدہی ان الزامات کی نہ کرو، لیکن چونکہ وہ اپنے آپ کو بیگناہ سمجھتا تھا اس لئے وہ روم چلا گیا اور وہاں اپنا پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اُدھر یہ کارروائی ہوئی کہ گلیلیو کے خط کی نقلیں مذہبی عدالت کے تمام ججوں کے پاس روانہ کرکے ان سے دریافت کیا گیا کہ وہ شخص جو آفتاب کو دنیا کا مرکز بتاتا ہے اور جو زمین کی گردش کا قایل ہے اس کے ساتھ کیا سلوک ہونا چاہئے۔ سب نے بالاتفاق یہی کہا کہ ایسا شخص مذہب کا دشمن ہے اور اس کو وہی سزا دینا چاہئے جو ایک عدوئے دین وایمان کے لئے مقرر ہے۔

آخر کار ۲۵ فروری (۱۶۱۶ء) کو عدالت گاہ میں گلیلیو کو طلب کیا گیا اور حکم سُنا دیا گیا کہ اگر وہ اپنے اس خیال سے باز نہ آئے گا تو قید خانہ بھیجدیا جائے گا۔ گلیلیو نے وعدہ کیا کہ آیندہ وہ ایسا نہیں کریگا اور چلا آیا۔

اس کے بعد تھوڑے عرصہ تک گلیلیو خاموش رہا لیکن اتفاق سے دو سال بعد ۱۶۱۸ء میں تین دُمدار ستارے ظاہر ہوئے اور گلیلیو نے اپنی رائے ان کے متعلق ظاہر کی۔ اس کی مخالفت فادر گراتسی نے کی اور اس کے جواب میں گلیلیو نے ایک مستقل رسالہ تصنیف کرکے شایع کیا جس میں بہ صورت مکالمہ نظام بطلیموس و نظریۂ ارسطو کی تردید کی گئی تھی۔ اس کا شائع ہونا تھا کہ مذہبی حلقوں میں ہنگامہ بپا ہو گیا اور مذہبی عدالت گاہ میں گلیلیو طلب کیا گیا یہ وہ زمانہ تھا جب مجرموں سے زبردستی اقبال جرم کرایا جاتا تھا اور کوڑے مار مار کر خاردار شکنجوں میں دبا دبا کر حالات پوچھے جاتے تھے۔

اس وقت گلیلیو کی عمر ۷۰ سال کی تھی اور ہر چند کوئی رکارڈ ایسا موجود نہیں ہے جس سے یہ پتہ چلے کہ اس کو اپنی علمی تحقیقات سے باز رکھنے اور اپنے نظریوں سے توبہ کرانے کے لئے کیا کیا سختیاں استعمال کی گئیں، لیکن بہرنوع اس کو سب تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نہایت سخت قید تنہائی میں ڈالدیا گیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ گلیلیو کی یہ کمزوری تھی کہ وہ مذہب کے مقابلہ میں ثابت قدم نہ رہ سکا اور تعزیر کے ڈر سے اس نے دونوں مرتبہ اپنے نظریوں سے توبہ کی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ درندگی کا مقابلہ دانشمندی سے کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ جتنی فرصت اسے مل سکے اس کو ہاتھ سے نہ دے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بہ صورت انکار وہ پہلی مرتبہ فنا کردیا جاتا اور دنیا اس کے علمی اکتشافات سے محروم رہتی۔

ضرورت ہے

نگار مارچ و اپریل ۳۵ء کے پرچوں کی۔ جو صاحب علٰحدہ کرنا چاہیں اطلاع دیں ۔۔۔۔۔۔ منیجر نگار

فلسفۂ محبت

مشرق و مغرب میں محبت کی جو صدہا تعریفیں کی گئی ہیں اگر ان کے مفہوم کو اختصار کے ساتھ چند لفظوں میں پیش کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ ــــ محبت نام ہے ایک خالص، بے لوث اور بے غرض انہماک کا۔

پھر محبت کی مختلف تقسیمیں کی گئی ہیں، مثلاً والدین کی محبت، احباب کی محبت، حُسن کی محبت وغیرہ وغیرہ۔

لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا نے کسی انسانی جذبہ کی تحلیل میں اتنی بے راہ روی سے کام نہیں لیا جتنا محبت کی تحلیل میں۔

اوپر جو تعریف بیان کی گئی ہے وہ حقیقتاً محبت کی صحیح تعریف ہو سکتی ہے لیکن اس تعریف کے لحاظ سے ۹۹ فیصدی محبتیں محبت کی تعریف سے خارج ہو جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بالعموم محبت کو ایک کشش سے عبارت کیا جاتا ہے۔ یعنی جو چیز اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے اور آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اُس سے محبت کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شعرا و ادبا نے تو اس سارے سلسلۂ کائنات ہی کو محبت کی زنجیروں میں جکڑ دیا ہے، اُن کے نزدیک آفتاب، زمین، ستارے، پہاڑ، درخت، دریا غرضکہ کائنات کی ہر چیز کا بقا و قیام ایک غیر شعوری محبت پر مبنی ہے، ہر جرم دوسرے جرم کی طرف ایک فطری کشش رکھتا ہے اور یہی محبت ہے۔ گویا اُن کی دانست میں ساری کائنات کی تفسیر ایک لفظ محبت پر منحصر ہے۔

لیکن اگر آپ تفصیل کے ساتھ اس مسئلہ پر گفتگو کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ محبت ایک ایسا مبہم اور غیر واضح لفظ ہے کہ اُس کے تحت میں انسان کے بہت سے مختلف جذبات کو داخل کیا جا سکتا ہے۔

مگر محبت کی ان تمام انواع کے باوجود "صنفِ نازک کی محبت" ہی صرف ایک ایسی محبت ہے جس نے اس لفظ کو اتنا "ہوش ربا" اور "مرد افگن" بنا رکھا ہے۔ آپ کسی کے سامنے محبت کا نام لیجئے اور اُسکے تخیل میں ایک رنگین دنیا بس جائے گی، اور اس لئے ہر چند آپ محبت کی ضمن میں والدین یا اعزا و احباب کی محبت کو داخل کریں لیکن اس کا غالب مفہوم وہی ہے جو دو نوجوان دلوں کی دھڑکن میں پنہاں ہوتا ہے۔

مناسب تو یہی ہے کہ اس رومانی لفظ کی پُراسرار لطافت کو تحقیق کی موشگافی سے غارت نہ کیا جائے

اور ولولوں سے بھرے ہوئے دلوں کی شیرینیاں ٹیس کو اُن سے نہ چھینا جائے، وہ رنگین فضا میں رہیں، گلابی ماحول میں جھومیں، سہانے سایہ میں مست رہیں حتیٰ کہ خود بخود اُن کی آنکھوں سے پردہ اُٹھنے لگے لیکن عیش وسکون کی طویل زندگی اور تمدن کی برکات نے محبت کے نام پر دل و دماغ کی بازی لگانے والوں کی تعداد میں اتنا اضافہ کر دیا ہے کہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس جذبہ کو شک و ابہام کے دھندلکے سے نکال کر اسکے ایک ایک جزو کو آپ کے سامنے بکھیر دیا جائے تاکہ آپ دیکھ سکیں کہ :-

"چیست آں شعلہ کہ ایں درجہ حرارت دارد"

افسوس ہے کہ اس جذبہ پر نفسیات کے فاضل مفکرین نے کوئی مبسوط اور جامع بحث نہیں کی، حتیٰ کہ جذبۂ شہوت پر بھی جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی کافی حد تک تشنۂ تکمیل ہے۔ اور اس لئے آیندہ صفحات میں مختلف مصنفین کی زلہ ربائی کرنے کے بعد میں نے سعی کی ہے کہ اپنی قوت فکر سے کام لے کر ایک مستقل اور جامع مقالہ آپ کے سامنے پیش کروں جس میں اس جذبہ کے متعلق تمام قدیم و جدید تحقیقات کو ایک سلک میں منظم کر کے اُس کے ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ روشنی میں لے آیا جائے۔

بالعموم جن جذبات پر محبت کا اطلاق کیا جاتا ہے اُن کو مندرجۂ ذیل چار انواع میں تقسیم کر سکتے ہیں:-

۱۔ والدین کی محبت۔

۲۔ بھائی، بہن، اعزا اور احباب کی محبت۔

۳۔ حُسن کی محبت۔

۴۔ صنفِ لطیف کی محبت۔

اب ان میں سے ہر ایک پر ذرا تفصیل کے ساتھ غور کیجئے۔

۱۔ والدین کی محبت :-

اس محبت کی تحلیل کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت شفقت و رحم کا جذبہ ہوتا ہے جسے غلطی سے محبت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

جب آپ کے سامنے آپ سے ضعیف تر ہستی عجز و انکسار کے ساتھ دوزانو ہو جاتی ہے، آپ کی سطوت و ہیبت کے آگے سرنگوں ہو کر آپ کے روبرو پوری پوری عجز و نیایش کا مظاہرہ کرتی ہے تو آپ کے قلب میں ایک خاص قسم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے جس کے ماتحت آپ بیساختہ اُس کی بیکسی سے متاثر ہوتے ہیں، اُسکی مدد کرتے ہیں اور اپنی امکانی طاقتیں اُس کی حمایت میں صرف کر دیتے ہیں۔

بالکل یہی وہ جذبہ ہے جو والدین کو اپنے بچّہ کی پرورش اور اُن کی کفالت پر مجبور کرتا ہے۔ پھر بادشاہ

اپنی ضعیف رعایا کے ساتھ، فوجی افسر اپنے مطیع و فرمانبردار سپاہیوں کے ساتھ، ایک آقا غلام کے ساتھ، غرضکہ ہر زبردست اپنے سے زیردست داد خواہ کے ساتھ شفقت و رحم کے ساتھ پیش آتا ہے۔ مگر والدین کی شفقت و رحمت ان تمام شفقتوں سے بدرجہا بلند ہوتی ہے۔ حقیقۃً والدین کی شفقت اس جذبہ کی مکمل ترین صورت ہے بلکہ بعض اوقات تو افراط کے درجہ تک پہونچ جاتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ رہتی شفقت ہی ہے۔

آپ سوال کریں گے کہ "آخر والدین کا جذبۂ شفقت اتنا طاقتور کیوں ہوتا ہے؟" اس کو پوری طرح سمجھنے کے لئے پہلے ذیل کی چند مثالوں پر غور کر لیجئے:-

ایک مشکیزہ کو پانی سے بھر دیجئے اور پھر اُس میں کسی طرف سے ایک سوراخ کر دیجئے اور دیکھئے کہ پانی کی دھار کتنی طاقت و شدت کے ساتھ باہر نکل رہی ہے لیکن اگر آپ اسی مشکیزہ میں چار پانچ سوراخ اور کر دیں تو آپ دیکھیں گے کہ پانی کے نکلنے میں وہ شدت باقی نہیں رہی حتیٰ کہ اگر آپ اُسکو لاتعداد سوراخوں سے چھلنی کر دیں تو گو پانی اب بھی نکلیگا مگر بہت سست رفتاری کے ساتھ پہلے کی طرح قوت و جھندگی اس میں مطلق نہ رہیگی۔ یہی حال انسانی جذبات کا ہے۔ انسانی سینہ جذبات کا ایک سمندر ہے۔ اگر اُس کو کسی ایک آدھ راستہ سے اپنے کسی جذبہ کے اظہار کا موقعہ ملتا ہے تو وہ دیوانہ نظر آتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی ساری ہستی اُس جذبہ کے کُہر میں غائب ہو گئی ہے۔ لیکن اگر اسی جذبہ پر چاروں طرف سے مطالبے شروع ہونے لگیں تو پھر اُس کی طاقت گرتے گرتے اُس مشکیزہ کی سی ہو جاتی ہے جس میں سے سوراخوں کی کثرت کے بعد پانی اُچھلکر نکلنے کے بجائے دھیرے دھیرے رستا رہتا ہے۔

اس کی واضح مثال ایک اور طرح سمجھئے:-

کسی ضعیف و نزار کراہتے ہوئے مریض کو دیکھکر آپ کے دل میں کتنا درد پیدا ہوتا ہے۔ آپ بیقرار ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُس کے آگے بچھ جائیں، اُس کی خدمت میں اپنی جان تک سے دریغ نہ کریں لیکن کسی اسپتال میں وہاں کی نرسوں اور ڈاکٹروں کو جاکر دیکھئے کہ وہ کتنے سکون اور کتنی بے پرواہی کے ساتھ مریضوں کی کراہوں میں بیٹھے رہتے ہیں۔

کسی دم توڑتے ہوئے نوجوان کو دیکھ کر آپ کا دل دہل جاتا ہے۔ آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ اُبل پڑتا ہے۔ آپ کے قلب میں درد و سوز کا ایک طوفان بپا ہو جاتا ہے، دُنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آپ کے سامنے کھنچ جاتا ہے، ساری دنیا ایک عبرت گاہ بن جاتی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ہسپتالوں کے ڈاکٹر روزانہ کتنے نوجوانوں کو اس طرح دیکھنے کے بعد اپنے قلب میں کرب و اضطراب کی ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا ہوتے نہیں پاتے؟

یہی حال دنیا میں ہر انسان کا ہے۔ جب کسی جذبہ پر ضرورت سے زیادہ دباؤ ڈالا جاتا ہے تو اُس کا ذخیرہ خالی ہو جاتا ہے۔ اور آپ سمجھنے لگتے ہیں کہ اُس انسان میں وہ جذبہ ہی نہیں، حالانکہ واقعہ اس کے خلاف ہوتا ہے۔ ہر ڈاکٹر اُتنا ہی دردمند دل رکھتا ہے جتنا آپ، لیکن اس کے باوجود دیکھئے کہ آپ میں اور اُس میں کتنا فرق پیدا ہو گیا!

ایک بادشاہ دن رات رعایا کی فریادیں سُنتا ہے، شب و روز اُن کی کراہ سے دوچار ہوتا ہے اس سے اُس کے جذبۂ رحم کی شدت روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔

اگر زندگی میں آپ کو صرف ایک شکستہ حال فقیر ملتا تو شاید آپ اپنی دولت کا ایک معتدبہ حصہ اُسکی نذر کر دیتے لیکن آپ دن رات اُن کی صدائیں سنتے ہیں اور بے اعتنائی کے ساتھ گزر جاتے ہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ ظالم ہو گئے؟

بعینہٖ یہی حال والدین کی شفقت کا ہے۔ اُن کی شفقت اُس وقت سے شروع ہوتی ہے جب بچہ ناتوانی کا ایک مجسمہ بنکر اُن کی آغوش میں پناہ لیتا ہے۔ پھر اس کے ساتھ اُس سے آئندہ توقعات، سوسائٹی کی نظروں میں عزت اور اسی قسم کی اور بہت سی باتیں اس جذبہ کو شدید سے شدید تر بنا دیتی ہیں۔ حتیٰ کہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے۔ اُس کے بازوؤں میں والدین کی سی سختی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اب فطری جذبہ کے ماتحت رحم و شفقت یا تو بالکل ختم ہو جاتا ہے یا بہت ضعیف و کمزور حالت میں باقی رہتا ہے۔ دیکھئے! جانوروں میں اُسوقت ماں باپ کا امتیاز اُٹھ جاتا ہے اور وہ سب ایک سطح پر آجاتے ہیں۔

لیکن انسانی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اگر بچہ والدین کی خواہشات کے مطابق ہو تو اُن کی شفقت اُس وقت بھی قائم رہتی ہے اگرچہ اس وقت اُس کی ذات سے آرام و راحت پہونچنے اور اسی قسم کے دیگر اُمور کی بناپر خودغرضی کا ایک جذبہ بھی خاموشی کے ساتھ اس میں شامل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ اگر بڑے ہونے پر اولاد کے اطوار و عادات والدین کی طبعی اُفتاد کے خلاف ہوتے ہیں تو وہ بعض اوقات اُن کو گھر سے بھی نکال دیتے ہیں، اُنھیں "عاق" کر دیتے ہیں، دنیا بھر میں اُن کی بُرائیاں کرتے ہیں اور صراحتہً اپنے آپ کو اُن سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔

آپ اپنے چاروں طرف مختلف والدین پر ایک نظر ڈال جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جہاں صرف ایک بچہ ہوتا ہے وہاں شفقت و ایثار اُن والدین کے مقابلہ میں بہت بڑھا ہوا ہوتا ہے جن کے کئی اولادیں ہوتی ہیں۔

پھر اگر والدین کی توجہات مستقلاً کسی اور طرف بٹی ہوئی ہوں تب بھی بچہ کے ساتھ یہ جذبہ کمزور ہو جاتا ہے

یہی وجہ ہے کہ باپ کی توجہات چونکہ کسبِ معاش کی جانب مبذول رہتی ہیں اس لئے بچہ کے ساتھ اُس کا جذبۂ رافت بہ نسبت ماں کے بہت کم، در ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یورپ کی ماں کے مشاغل چونکہ ایشیائی ماں کے مقابلہ میں زیادہ متنوع ہوتے ہیں اس لئے جو مادرانہ ایثار و شفقت آپ کو مشرق میں ملیگا وہ آپ مغرب میں نہ پائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ امراء اور رؤسا میں اولاد کے ساتھ وہ والہانہ شفقت نہیں ہوتی جو غرباء و فقراء ہی میں پائی جاتی ہے۔ والدین کی طبائع کے اُسی اُتار چڑھاؤ اور مختلف ماؤں اور باپوں کے مختلف سلوک کو دیکھ کر بعض علمائے نفسیات نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ والدین کی محبت بھی فطری نہیں ہوتی۔ لیکن حقیقۃً اُنکی اس رائے میں ایک بنیادی غلطی یہ ہے کہ اُنھوں نے شفقت اور محبت کے دو جدا جدا جذبات کو ایکدوسرے کے ساتھ خلط کر دیا ہے اور اس لئے جب وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا میں والدین کو اپنے اطاعت شعار بیٹے سے زیادہ محبت ہوتی ہے، سب سے چھوٹی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے، وہ سرکش، خودرائے، ضدی اور بد دماغ بچوں سے علانیہ اپنی بے نیازی کا اعلان کر دیتے ہیں اور تاریخ سے ایسی سیکڑوں مثالوں کا پتہ چلتا ہے جس میں باپ نے بیٹے کو تاج و تخت کی خاطر یا دولت و زر کی طمع میں یا مذہبی اختلافات کی بنا پر قتل تک کرنے سے دریغ نہیں کیا ہے ——— تو وہ سمجھتے ہیں کہ والدین کی وہ محبت بھی جس کے اتنے بلند بانگ دعاوی کئے جاتے ہیں درحقیقت ایک تصنع ہے جو خود غرضی کے سایہ میں پرورش پاتا ہے۔ لیکن حقیقت بیں نظریں جانتی ہیں کہ ان علمائے نفسیات کا یہ فیصلہ کس درجہ گمراہ کن ہے۔ اگر وہ "محبت" کے اُس عام لفظ سے دھوکہ میں نہ آجاتے جس کا اطلاق بالعموم ہر "لگاؤ" پر کیا جاتا ہے تو اُن کو معلوم ہوتا کہ ماں اور بیٹے کے درمیان جو رابطۂ موانست ہوتا ہے وہ شفقت و رحم کے جذبہ پر قایم ہوتا ہے نہ کہ محبت پر۔ پھر جس طرح شفقت پیدا ہوتی ہے دوسرے کی کمزوری اور مظلومی کو دیکھ کر اور اُس کی رحم طلب نگاہوں اور عطوفت طلب حال و قال سے اسی طرح وہ اُسوقت فنا بھی ہو جاتی ہے جب یہ چیزیں ختم ہو جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ اگر اولاد میں یہ تمام صفات ایک ایک کر کے ناپید ہو جائیں تو والدین کی شفقت کا آفتاب بھی سیاہ پڑ جاتا ہے اور اُن کے دل کی آگ اپنے بچوں کی طرف سے ٹھنڈی ہو جاتی ہے۔

الغرض والدین کی محبت جذبۂ شفقت کا دوسرا نام ہے جس کو مستقبل کی خوش آیند توقعات، سوسائٹی کی ہمت افزا نظریں اور عزت افزائیاں زیادہ قوی اور طاقتور بنا دیتی ہیں۔

۲ —— بھائی، بہن، اعزا اور احباب کی محبت:-

اس "تعلق" پر بھی بالعموم محبت کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ لیکن واقعۃً اس قسم کے تمام تعلقات کا انحصا

اکثر تو خالص جذبۂ "غرض پرستی" پر منحصر ہوتا ہے اور کبھی ایک ایسے جذبہ پر جو شفقت و غرض پرستی دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔

بڑے بھائی، بڑی بہن یا خالو، ماموں، چچا وغیرہ کی محبت بالعموم "غرض پرستی و شفقت" دونوں جذبات سے مرکب ہوتی ہے، لیکن انسان کے ہم عمر دوست احباب اور بھائیوں کی محبت ایک ایسی غرض پرستی کا نتیجہ ہوتی ہے جس میں کسی حد تک جذبۂ ہمدردی کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔

لیکن غرض پرستی کا لفظ اتنا نفرت انگیز ہے کہ آپ اس کو باور کرنا شاید بمشکل گوارا کریں گے کہ آپ کے اعزا و احباب کی محبتیں حقیقۃً خود غرضی کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ چند منٹ اس پر سنجیدگی سے غور کیجئے۔

انسانی دماغ کی ساخت میں دو جدا جدا حصے ہیں جو الگ الگ دو مختلف کیفیات کا مظہر ہیں۔ ایک کیفیت کا نام شعوری ہے اور دوسری کا نیم شعوری یا تحت الشعوری۔

آپ کے سامنے ریاضی کا ایک مسئلہ پیش کیا جاتا ہے۔ آپ کا دماغ اُس کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور بالآخر سمجھ لیتا ہے۔ یہ ہے آپ کے دماغ کی شعوری حرکت۔

لیکن دماغ کی نیم شعوری یا تحت الشعوری حرکات اُن کو کہتے ہیں کہ جن میں آپ کا دماغ علت و معلول کے منطقی سلسلہ سے بیخبر ہو لیکن اس کے باوجود کسی چیز کو جانے، اُس سے بچے یا اُس کی طرف بڑھے۔

آپ کئی مرتبہ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ "ہر مثلث کے کوئی سے دو ضلعے مل کر تیسرے ضلعے سے بڑے ہوتے ہیں" لیکن آپ نے اس پر کبھی غور نہ کیا ہوگا کہ "حقیقی بہن سے شادی کرنا بُرا ہے" مگر اس کے باوجود آپ اس دوسری حقیقت پر پہلی حقیقت سے بھی زیادہ اذعان و یقین رکھتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ بچپن سے یہ جملہ اس کثرت کے ساتھ مختلف طریقوں سے آپ کے سامنے دُہرایا گیا کہ رفتہ رفتہ وہ آپ کے دماغ کے شعوری حلقہ سے نکلکر نیم شعوری حلقہ میں چلا گیا۔ اور چونکہ ہر چیز جو یہاں آتی ہی بلا دلیل ہے اس لئے نہ تو اُس کے قیام کے لئے دلیل و حجت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ دلیل و حجت اُس کو نکال سکتی ہے۔

مذہب، سوسائٹی اور جماعت کے تمام فیصلے دھیرے دھیرے آپ کے شعور سے نکلکر تحت الشعور میں پہونچ جاتے ہیں اور پھر خود آپ نہ اُن پر غور کرتے ہیں نہ کر سکتے ہیں۔ بلکہ جس طرح سوسائٹی نے اُن کو آپ کے دماغ میں نقش کر دیا ہے آپ اُسی طرح اُن کو ماننے پر مجبور ہیں، ڈاکٹر لیبان کہتا ہے کہ "سوسائٹی کے فیصلوں کے آگے انسانی دماغ بالکل بے بس ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیکڑوں مشرق کے باشندے ہر سال مغربی ممالک میں آتے ہیں، یہاں کی تہذیب و تمدن کو دیکھ متاثر بھی ہوتے ہیں (ا.علم)

عقل کی روشنی میں اُن کے خیالات میں کافی اصلاح بھی ہوجاتی ہے۔ لیکن جب پھر وہ اپنے ملک میں جاتے ہیں تو آہستہ آہستہ پہلے نقوش پھر عود کر آتے ہیں اور وہ بہت جلد اپنے رسم و رواج کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن جاتے ہیں[۱]۔

بالکل یہی حال اعزا اور اقربا کی محبت کا ہے۔ انسان مدنی الطبع ہے[۲]۔ اُس کو ضرورت ہے کہ وہ خود دوسروں کی امداد حاصل کرے اور دوسروں کے سامنے اپنی امداد پیش کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اُسکی زندگی خود اُس کے لئے وبال ہو جائے گی۔ اور اس لئے بقائے نفس اور بقائے ذات کے لئے ضروری ہے کہ وہ آپس میں تعاون و اشتراک سے کام کرے۔ "بقائے نفس" کا یہی وہ جذبہ ہے جس کو ہم نے اوپر خود غرضی سے تعبیر کیا ہے اس لئے کہ اس میں انسان کی ساری کوششیں یہ ہوتی ہیں کہ دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ دیر تک قائم و برقرار رکھے۔

لیکن خالص خود غرضی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے ایک مذموم جذبہ ہے اور اُس کے مقابلہ میں ایثار و قربانی ایک جذبۂ محمود۔ سوسائٹی نے اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ اگر "خود غرضی" کے نام پر انسانی تعاون و اشتراک کو قایم کیا جائے تو اس میں بہت سی تباہ کن صورتیں پیش آجائیں گی اور اس طرح ایثار و قربانی کا وجود ہی دنیا میں باقی نہ رہے گا اس لئے اُس نے نہایت ہوشیاری سے اس جذبہ کا نام محبت و خلوص رکھا۔ اور اس طرح "نظریۂ تکرار"[۳] کے ماتحت سوسائٹی نے بچپن سے آپ کے دماغ میں یہ چیز اسدرجہ پیوست کرائی کہ اب آپ میری زبان سے یہ سُننا بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ "آپ کی تمام دوستیاں در اصل خود غرضیاں ہیں"۔

لیکن یہاں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اعزا و احباب کی محبت میں ہمدردی کا عنصر بھی شامل رہتا ہے۔ اور اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بعض خاص لوگوں میں یہ جذبہ اتنا ترقی یافتہ ہوتا ہے کہ وہ غرض پرستی کے جذبہ کے بالکل خلاف صرف اسی جذبۂ ہمدردی کے ماتحت نہ صرف احباب و اعزا کا بلکہ سارے عالم کا درد سمیٹ کر اپنے قلب میں بھر لیتے ہیں۔ ملک و ملت کے بلند پایہ لیڈروں میں بالعموم یہی جذبہ اپنی انتہائی طاقت کے ساتھ جلوہ نما ہوتا ہے۔

۳۔ حُسن کی محبت:-

حُسن کی محبت میں وہ تمام محبتیں داخل ہیں جو ہم کو دنیا کے کسی حسین منظر سے ہو سکتی ہیں، مثلاً تاروں بھری رات سے، لہلہاتے ہوئے سبزہ زار سے، بہتے ہوئے چشمے سے، چہچہاتی ہوئی بلبلوں سے، کوئل

---

[۱] روح الاجتماع مصنفۂ ڈاکٹر لیبان۔ [۲] اخلاق جلالی باب سوم۔ [۳] اس نظریہ کی مزید تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "روح الاجتماع" مصنفۂ ڈاکٹر لیبان

کی کوک سے، اُچھلتے ہوئے پانی سے، خوبصورت پھول سے، لچکتی ہوئی ٹہنیوں سے وغیرہ وغیرہ

لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسانی قلب و نظر کا یہ استحسان بھی درحقیقت "محبت" نہیں کہلایا جاسکتا بلکہ اس کے برخلاف اس کا تعلق انسان کی اُس حس سے ہے جس کو "جمالیاتی حس" (Aesthetic touch) کہتے ہیں۔

اس وقت جمالیاتی احساس پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کا موقعہ نہیں ہے۔ یہاں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ اس احساس کے ماتحت ہر حسین و جمیل چیز کو استحسان و قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انسان کا یہی جذبہ ایک جداگانہ جذبہ کی حیثیت سے حال ہی میں پہچانا گیا ہے۔ اس سے پہلے لوگ کما حقہ اس سے واقف نہ تھے اور اسی لئے اُنھوں نے اس کو جذبات انسانی کی ایک جدا نوع قرار نہ دیا تھا۔ وہ حسین چیز کو استحسان و پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ضرور تھے مگر وہ اس جذبہ کو محبت کی ذیل میں شامل کرتے تھے۔

قاضی بیضاوی نے ایک جگہ اپنی تفسیر میں لکھا کہ "ہر کامل چیز کی جانب قلب انسانی کا جو میلان ہوتا ہے اُسے محبت کہتے ہیں"[1]۔ قاضی موصوف کی یہ تعریف ہمارے تمام مشرقی علمائے اخلاق و تصوف کی تحقیقوں اور موشگافیوں کا لب لباب ہے لیکن اگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس تعریف کے ذریعہ "جمالیاتی احساس" کو محبت کے دائرہ میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قدرت کے بنائے ہوئے حیرت انگیز مناظر اور خدا کی عظمت کے تصور سے دل میں احترام و مرعوبیت کا جو جذبہ پیدا ہوتا ہے اُس کو محبت سمجھا گیا ہے لیکن آجکل اس قسم کے تمام جذبات کو "جمالیاتی احساس" کی تحت میں شمار کیا جاتا ہے۔

اس جذبہ کی تحلیل میں ماہران فن اسوقت تک اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکے ہیں کہ انسان میں ایک ناقابل تحدید اندرونی حس ہے جو ہر چیز کے حُسن و قبح کا معیار مقرر کرتی ہے۔ اسی حس کو ہم بعض اوقات "ذوقِ سلیم" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے ماتحت انسان ہر جمیل چیز کو قدردانی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اگر اُس کی یہ حس زیادہ طاقتور ہوجائے تو پھر ہر حسین منظر اُس کے لئے وجد آفریں بنجاتا ہے۔

انسان حالات (Circumstances) اور ماحول کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتا ہے اور اُس کے جذبات و خیالات، دونوں اُسی کے پیدا کردہ ہوتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ حالات کے اختلاف کی بنا پر لوگوں کے جذبات و خیالات میں بھی زمین و آسمان کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ "جمالیاتی احساس" بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ بعض لوگوں میں یہ جذبہ حد سے زیادہ نشوونما پاجاتا ہے اور وہ شاعر کہلاتے ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی، سورہ آل عمران۔

وہ سمندر کی لہروں کو دیکھکر جھومنے لگتے ہیں، آبشار کو دیکھ کر مست ہو جاتے ہیں، پپیہے کی "پی کہاں" سے انہیں وارفتگی کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن دوسروں پر اس کا بہت کم اثر ہوتا ہے۔

لوگوں نے اس حسن کے سمجھنے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ آپ جنگل میں تنہا گھوم رہے ہیں، صبح کا سہانا وقت ہے۔ ہوا کے نرم نرم جھونکے چل رہے ہیں۔ دفعتہً کسی جھاڑی سے ایک ہرن نکلتا ہے۔ آپ کو دیکھکر ٹھٹک جاتا ہے۔ گردن موڑ کر کچھ دیر آپ کی طرف دیکھتا ہے پھر چوکڑی بھرتا ہوا غائب ہو جاتا ہے۔ آپ کو یہ منظر بہت دلفریب معلوم ہوا۔ اُس کی حسین آنکھیں، اُس کی لمبی گردن اور اُس کی تحیر انگیز نظریں آپ کے قلب پر گہرے نقوش چھوڑ گئیں۔ آپ نے کوشش کر کے اُس کو زندہ پکڑ لیا۔ اور اپنے گھر میں ایک جگہ بند کر دیا اور آپ سمجھے کہ آپ نے اُس لطف کو قید کر لیا۔ لیکن واقعہ اس کے خلاف ہے۔ حقیقتہً آپ یہ سمجھے ہی نہیں کہ آپ کے اُس لطف کے اجزائے ترکیبی کیا تھے۔ آپ کو ہرن کا مڑ کر دیکھنا اچھا معلوم ہوا۔ آپ نے اسی کا ادراک کیا اور آپ سمجھے بس یہی اس کا حسن ہے۔ یہ بالکل ایسا ہے جیسے آپ پیسٹری کی شیرینی سے متلذذ ہوں اور یہ سمجھ لیں کہ پیسٹری نام ہے شیرینی کا۔

ایک اور مثال لیجئے:-

ایک حسین پھول ٹہنی پر کھلا ہوا ہے اور ہوا کے نازک جھونکوں سے اُس میں ہلکا ہلکا اہتزاز پیدا ہو رہا ہے۔ اُس کے چاروں طرف سبز پتے ہیں اور اُس کی خوشگوار خوشبو چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ آپ اس سے محظوظ ہو کر پھول کو توڑ لیتے ہیں۔ اُسے سونگھتے ہیں، کوٹ میں لگاتے ہیں۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ اس طرح آپ نے اُس لطف کو حاصل کر لیا جو پھول کی ٹہنی پر ہونے کی صورت میں تھا؟

حقیقتہً ہرن اس لئے اچھا تھا کہ وہ جنگل کے فطری منظر میں تھا، اور پھول اس لئے خوشنما تھا کہ وہ ٹہنی پر لہلہا رہا تھا۔ آپ اس فلسفہ کو سمجھ نہ سکے اور اُس کے حُسن کو غارت کر بیٹھے۔

ڈارون کے نزدیک جمالیاتی طور پر کسی شے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنا بھی اُس "جنسی جذبہ" کی بنا پر ہوتا ہے جو ہر شخص میں خاموش طور پر پایا جاتا ہے۔ لیکن موجودہ تحقیقات سے پتہ چلا ہے کہ جمالیات کو "جنسیات" سے کوئی تعلق نہیں ورنہ ظاہر ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو ابتدائے پیدائش ہی سے رجولیت کی قوتیں لیکر نہ آیا ہو کسی چیز کے حسن و قبح سے متاثر نہ ہونا چاہئے۔ حالانکہ وہ بھی ایک جمیل شے سے ٹھیک اُسی طرح اثر پذیر ہوتا ہے جتنا دوسرے۔

خیر یہ تو جمالیاتی احساس کی بحث[1] ہے۔ یہاں کہنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اس قسم کی تمام پسندیدگیاں

[1] جمالیاتی احساس کی مزید تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہوں فٹ نوٹ صفحہ ۲۳ پر

جن کو جذبۂ محبت کے ماتحت شمار کیا جاتا ہے درحقیقت ایک بالکل مختلف جذبہ سے متعلق ہوتی ہیں۔

۴۔ صنفِ لطیف کی محبت:-

محبت کی یہ نوع بہت دلچسپ ہے۔ لیکن شاید آپ کو مایوسی ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اس محبت کا دار و مدار خالص جذبہ "نفسانیت" یا "شہوت پرستی" پر ہوتا ہے۔

انسان کے اور جذبات کے علاوہ اُس کا ایک بڑا طاقتور جذبہ "جذبۂ ہوس رانی" یا "شہوت پرستی" ہے جس طرح ایک بھوکا انسان ہر کھانے کی چیز کے حصول کی کوشش کرتا ہے اسی طرح اس جذبہ کے ماتحت آدمی کی نظر میں ہر عورت ایک بے پناہ جذب و کشش رکھتی ہے۔ اب اگر کوئی عورت حسن ظاہر سے بھی بہرہ مند ہو تو آپ کی "بیقراری" کو جذبۂ ہوس رانی کے علاوہ جمالیاتی احساس بھی تقویت پہونچاتا ہے۔ اور اگر حالات سازگار ہیں اور آپ اپنے "مرکز کشش" تک پہونچ سکتے ہیں تو پھر آپ کے خیالات کی ساری رو صرف اُسی کی جانب مایل ہو جاتی ہے۔ آپ کے جذبات و احساسات میں ایک مرکزیت آجاتی ہے اور آپ اس کا نام عشق یا محبت رکھتے ہیں اس وقت آپ محبوب کے حصول میں مجنوں بنکر آوارۂ دشت و بیاباں ہونا اپنا فخر سمجھتے ہیں، فرہاد کی طرح تیشہ مار کر مرجانے کو حیات جاودانی سے تعبیر کرتے ہیں۔ آپ چلا اُٹھتے ہیں کہ:-

مانمے خواہیم ننگ و نام را

آپ کا نفس آپ کو دھوکہ دیتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آپ کی محبت پاکیزہ ہے۔ اور آپ کا جنون مستحسن، حالانکہ جس طرح غصہ کی افراط میں آدمی سرخ ہو جاتا ہے۔ دیوانہ وار چیزوں کو پھینکنے لگتا ہے، میز کے اوپر کی ہر چیز کو منتشر کر دیتا ہے اسی طرح آپ کا بھی عالم ہے۔ آپ پر "ہوس رانی" کے جذبہ کی حکمرانی ہے۔ وہ آپ کے تمام دوسرے جذبات و حسیات پر اتنا غالب آچکا ہے کہ آپ جو کچھ کرتے ہیں اُسی کے ماتحت کرتے ہیں۔ آپ کو چاروں طرف محبوب ہی محبوب نظر آتا ہے۔ آپ روتے ہیں، چیختے ہیں، سر ٹپکتے ہیں، کپڑے پھاڑتے ہیں، حتیٰ کہ "دامن کے چاک اور گریباں کے چاک" میں فرق باقی نہیں رہتا۔ پھر خوش قسمتی سے اگر آپ کی تمنا پوری ہو جائے اور آپ کا جذبہ مطمئن، تو رفتہ رفتہ چڑھی ندی اُتر جاتی ہے۔ آندھی ختم ہو چکتی ہے

بقیہ فٹ نوٹ صفحہ ۲۲ ——

1- Dialogues in Aesthetics, by Aristotle,
2- Conquest of Happiness, by B. Russel.
3- Creative intelligence (the last chapter) by J. Dewy.
4- Aesthetics, by Croce.

بادل چھٹ جاتے ہیں اور آپ عام انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتے ہیں ــــ ناکامی کی صورت میں بھی آہستہ آہستہ آپ کے خیالات وجذبات کی مرکزیت میں فرق آتا جاتا ہے - آپ کی توجہ منتقل ہو جاتی ہے اور کچھ دنوں کے بعد آپ کے سامنے آپ کا عشق صرف ایک بھولا ہوا افسانہ بنکر آتا ہے -

یہ ہے آپ کے اُس جذبۂ محبت کی کل کائنات جس نے آپ کی زندگی پر بری طرح قبضہ پا رکھا ہے جو آپ کے شباب کے ساتھ "موت" بنکر آتا ہے اور سیکڑوں طرح کے درد پنہاں تقسیم کرتا ہوا چلا جاتا ہے -

محبت بیک نظر:-

بعض اوقات صرف "ایک نظر" قلب میں ایک عجیب طوفان بپا کر دیتی ہے اور یہ طوفان اس درجہ شدید ہوتا ہے کہ بعض مفکرین نے اسی بنا پر "محبت" کے متعلق یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ــــ دنیا میں ہر شخص "زوج" بنا کر پیدا کیا گیا ہے - لیکن یہ فطرت کی ستم ظریفی ہے کہ وہ بہت کم ان دونوں مزدوج اور توام روحوں کو آپس میں ملنے کے اسباب پیدا کرتی ہے بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ زید ہندوستان میں ہے اور اُس کی "توام روح" امریکہ میں ہے - اب اگر اتفاق سے یہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ پائیں تو پہلی نظر ہی میں مقناطیسی طور پر ایک دوسرے کی طرف کھنچ جائیں گے -

"محبت" کی یہ توضیح بہت رومانی اور پُر کیف ہے اور کیسا اچھا ہوتا کہ رعنائی خیال کی اس رنگین وادی سے ہم اپنے آپ کو علحدہ نہ کرتے لیکن حقیقت کے چہرہ سے بہرحال نقاب دور کرنا ہے -

واقعہ یہ ہے کہ بعض اوقات بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات ملکر غیر شعوری طور پر کسی جذبہ میں آہستہ آہستہ مشتعل ہونے کی صلاحیت پیدا کرتے رہتے ہیں - چنانچہ جب وہ پوری طرح اشتعال کے قابل ہو جاتا ہے تو ایک معمولی سے "اکساؤ" پر بھڑک اُٹھتا ہے - مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ اگر اُس فیتلہ میں جس کا ایک سرا "بارودخانہ" سے میلوں دور ہو آگ لگا دی جائے تو دھیرے دھیرے سلگتا رہیگا اور بالآخر سلگتے سلگتے جب بارود کے قریب پہونچے گا تو دفعۃً فضا میں شعلے ہی شعلے نظر آئیں گے - یا مثلاً اگر بارود "سیلی ہوئی" ہو اور موسم بھی مرطوب ہو تو وہ بدیر آگ پکڑے گی لیکن وہی بارود گرم آب و ہوا میں بالکل مختلف نظر آئے گی -

آپ دیکھتے ہیں کہ کسی وقت ہم معمولی سی بات پر سخت غضبناک ہو جاتے ہیں - اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ کبھی ہمارا جذبۂ غضب اشتعال کے لئے تیار رہتا ہے اور جلد بھڑک اُٹھتا ہے اور کبھی تیار نہیں ہوتا اور اس لئے بدیر بھڑکتا ہے -

یہی حال "محبت بیک نظر" کا ہے - آپ شعوری یا غیر شعوری طور پر عورت میں خاص قسم کی صفات کو بہتر سمجھتے ہیں - فرض کیجئے کہ شام کا وقت ہے - آپ باغ میں تنہا بیٹھے ہیں - آپ کا دماغ تفکرات سے خالی ہو

اور "جنسی جذبہ" کے مبادیات پوری طرح مکمل ۔ دفعتہً آپ کے سامنے ایک نوجوان لڑکی گزرتی ہے ۔ اور اتفاق سے آپ کے اسی "نقطۂ پسندیدگی" پر چٹکی لے لیتی ہے جس کو آپ کے دماغ نے عرصہ سے پکار رکھا تھا ۔ اب کیا ہے ۔ "دل گیا ، دین گیا ، چین گیا ، عیش گیا"

نورجہاں کا سادگی کے ساتھ کبوتر اُڑا دینا ایک خاص ماحول میں جہانگیر کے لئے بلائے جان ہو گیا ۔ اس قسم کے بہت سے واقعات آج بھی پیش آتے ہیں ۔

برجستگی کے ساتھ صرف ایک شعر پڑھ دینا ، خاص تبسم کے ساتھ گردن جھکا دینا ، کسی چیز کو لات مار کر گرا دینا "الھڑپنے" کا بے محل جواب دینا ، کتاب کو اُٹھا کر پھینک دینا ، چائے کی پیالی کو دیتے وقت ذرا جھٹکا دیکر چھلکا دینا ، پان کی تھالی کو خفیف مسکراہٹ کے ساتھ منہ پھیر کر آگے کو بڑھا دینا ـــــ اس قسم کے سیکڑوں واقعات آپ کے سنجیدہ ترین لمحوں میں کوئی قیمت نہیں رکھتے لیکن انھیں میں سے کچھ ہیں جن کے تیر ہمارے ہزاروں نوجوانوں کے دلوں کو چھلنی کئے ہوئے ہیں ۔

بعض اوقات آنکھ ، بال ، چہرہ کی ساخت ، بازوؤں کی گولائی ، رفتار کی نوعیت وغیرہ وغیرہ آپ کی "جنسیت" کے نیم پختہ احساس کو دفعتہً پختہ کر دیتے ہیں ۔ اور گو کسی لڑکی میں ہزاروں ہزاروں عیب ہوں لیکن صرف ایک چیز کی دلکشی آپ کے خرمنِ قلب پر بجلی بنکر گر پڑتی ہے ۔

المختصر اس قسم کی محبت بھی درحقیقت محض "جذبۂ شہوت" کا نتیجہ ہوتی ہے جسکو "جمالیاتی احساس" قوی تر بنا دیتا ہے ۔ اور اس لئے دیگر جذبات کی طرح ابتداءً نہایت شدید ہوتی ہے لیکن بہت جلد فنا ہو جاتی ہے ۔ عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ "صنفِ لطیف کی محبت" کی کامیاب ترین شکل "ازدواجِ محبت" ہے چند منٹ اس پر بھی غور کیجئے :۔

ازدواجِ محبت :۔

"ازدواجِ محبت" سے بالعموم جو مفہوم سمجھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ "مناکحت سے پہلے نوجوان زوجین آپس میں ایکدوسرے کی طرف غیر معمولی کشش پاتے ہوں ۔ عام طور پر اس جذبہ کا نام "محبت" رکھا جاتا ہے لیکن ہماری مذکورہ بالا تقریر کو پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ بآسانی نکالا جا سکتا ہے کہ "ازدواجِ محبت کی بنیادیں جس جذبہ پر قائم ہوتی ہیں وہ درحقیقت مرکب ہوتا ہے نفسانیت اور جمالیاتی احساس سے"

پھر جس طرح انسان کے تمام جذبات تغیر پذیر اور فانی ہوتے ہیں اور آہستہ آہستہ اُن میں پژمردگی اور اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے اسی طرح ان جذبات کا حال ہے ۔ ازدواج سے پہلے زوجین ایکدوسرے کے اتصال کو فردوس سمجھتے ہیں اور اُن کے قلب کی گہرائیوں سے یہ چیخ اُٹھتی ہے کہ :۔

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہوگئیں

چنانچہ اگر وہ اپنی تمناؤں میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ کائنات کی ساری مسرتیں اُنکو حاصل ہوگئیں - اور زندگی کے رنج والم کا احساس اب کبھی اُن کے قلب پر گھر نہ پائے گا۔ لیکن بہت جلد ہی اُنکی آنکھوں سے پردے اُٹھنا شروع ہوتے ہیں، نشہ اُترتا ہے اور اُن کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں عام انسانوں سے زیادہ خوش نہیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ شوپنہار کہتا ہے کہ ازدواجِ محبت ہمیشہ ناکام ہوتا ہے[1]۔ عام ازدواجوں کی بنیاد رواداری اور اعتماد پر قائم ہوتی ہے۔ اور ابتدا سے دونوں یہ سمجھ کر ایک گھر میں قدم رکھتے ہیں کہ اب اُن کو زندگی بھر ایک دوسرے کے ساتھ بنا ہنا ہے۔ لیکن اس کے برخلاف کیوپڈ کے مارے ہوئے زوجین لیلے مجنوں بنکر زندگی کی سرسبز وادی میں داخل ہوتے ہیں، گلابی فضا میں اُڑتے ہیں۔ رنگین لہروں میں ناچتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اُنکی مسرتوں کا یہ ذخیرہ کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اُن میں سے ہر ایک "پرستش و سجود" بنا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن جب جذبات کی سیلابی میں کمی آتی ہے، اُن کا دلچسپ خواب ختم ہوتا ہے، آنکھ کھلتی ہے، اور دنیا کی تلخ حقیقتیں اپنے چہرہ کو اُن کے سامنے بے نقاب کرتی ہیں تو اُن کے غم و غصہ کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ چاہتے ہیں کہ اگر پھر اُسی طرح سو جائیں اور اُسی خواب کو پھر دیکھنے لگیں لیکن وہ اس میں ناکام رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر ایک دوسرے کو تغافل و بے اعتنائی کا مجرم قرار دیتا ہے اور خانگی و معاشرتی زندگی روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتی جاتی ہے۔

حُسن کو دیکھکر انسان مرعوب و متاثر ہوتا ہے۔ اور فطرتاً اُس کے دل میں اُس سے پوری پوری طرح لطف اندوز ہونے کی خواہش پیدا ہوجاتی ہے۔ اب اگر محبوب بھی التفات سے پیش آنے لگے۔ یا کم از کم "جان بوجھکر" بے اعتنائی ہی برتے تو آپ کی یہ آتشِ اشتیاق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اور آپ یہی کہہ کہہ کر اپنا دل بہلاتے رہتے ہیں کہ :-

غصہ سے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے تو ہیں،
خوش ہوں کہ ہوں تو میں بھی کسی کی نگاہ میں

لیکن شادی ان تمام جذبات کا مآل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ میں تو یہاں تک یقین رکھتا ہوں کہ خود مجنوں لیلے

---

[1] ملاحظہ ہو:- Story of Philosophy by W. Durant.

بنے لڑتا اگر وہ دونوں سلکِ ازدواج میں منسلک کر دئے جاتے۔

نارما شیرر، کانسٹنس بنیٹ، سلوچنا اور زبیدہ دُنیا کی اُن حسین عورتوں میں ہیں جن کے مثیل بہت کم ملیں گے۔ اور آپ میں سے ہر شخص اُن کے خدوخال کی رعنائی اور اُن کے اعضا و جوارح کی جنبش کو فدا ہو جانے کی حد تک پسند کرتا ہے اور شاید آپ پر شادیِ مرگ طاری ہو جائے اگر حالات آپ کے اتنے مساعد ہو جائیں کہ آپ اُن سے ہمیشہ کے لئے قریب ہو سکیں۔ لیکن اس کے باوجود باور کیجئے کہ ان کے ساتھ آپ کا ازدواج دنیا میں ناکام ترین ازدواج ہوگا۔

آپ کے شہر کی وہ غریب لڑکی جس کے پاس نہ دولت ہے نہ حُسن آپ کے ازدواج کو نارما شیرر اور سلوچنا کے ازدواج کے مقابلہ میں کہیں زیادہ کامیاب اور فائز المرام بنا سکتی ہے اس لئے کہ پہلے ازدواج کی بنیادیں معاشرتی حقیقتوں کی بھرپور روشنی میں رکھی جائیں گی اور اُسی میں ہمیشہ رہیں گی۔ لیکن دوسرا ازدواج صبح کے ٹھنڈے اور سہانے سماں میں منعقد ہوگا اور ظاہر ہے کہ یہ وقت بہت جلد ختم ہو جانے والا ہے۔

ایک دفعہ ایک نوجوان لڑکی نے نہایت دردناک لہجہ میں میرے سامنے اپنے شوہر کی شکایت کی، حالانکہ میرے نقطۂ نگاہ سے اُس کے شوہر میں کوئی بات بھی عام شوہروں کے مقابلہ میں کم نہ تھی۔ وہ نہ اُس پر غیر معمولی سختی کرتا تھا اور نہ ادائے کفاف میں کوئی تساہل برتتا تھا۔ لیکن جب میں نے اپنا یہ خیال اُس لڑکی پر ظاہر کیا تو اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اُس نے حسرت و یاس کے بیشمار تاثرات کے ساتھ مجھے یہ جواب دیا کہ:۔

”آپ کو کیا معلوم کہ ہم نے کس طرح زندگی شروع کی تھی۔۔ ہم لیلےٰ مجنوں تھے......“

اُس کی زندگی کی طویل داستان کو اس مختصر سے جملہ میں سُنکر مجھے افسوس ضرور ہوا مگر میں اُسے یہ نہ سمجھا سکا کہ فطرتاً یونہی ہونا چاہئے تھا۔

جن لوگوں کو دنیائے فلم سے دلچسپی ہے وہ جانتے ہیں کہ میری پکفورڈ اور کانسٹنس بینٹ جیسی غیر معمولی حسین لڑکیوں کے ازدواج کتنے مایوس کن ثابت ہوئے ہیں۔

اسی وجہ سے ایک طبقہ کی یہ رائے ہے کہ ”شادی محبت کی موت ہے۔ اس لئے محبت میں شادی نہ کرنا چاہئے“۔ لیکن اُن کا یہ فیصلہ بھی اس غلط فہمی پر مبنی ہے کہ وہ محبت کو ایک ”الوہی جذبہ“ سمجھتے ہیں۔ اور اسلئے محبت ہو جانے پر اُن کا مشورہ یہ ہوتا ہے کہ ”چونکہ شادی کرنے سے یہ ”الوہیت“ فنا ہو جائے گی اس لئے شادی نہ کیجائے“۔ لیکن وہ اس پر غور نہیں کرتے کہ جس طرح انسانی جذبات کا طوفان سکون و اطمینان پا لینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے اسی طرح مکمل ناکامی و یاس کے بعد بھی رفتہ رفتہ وہ فنا ہو جاتا ہے۔ اور اس لئے اگر

آپ کو کسی لڑکی سے محبت ہے اور شدید محبت ہے لیکن اس کے علی الرغم اُس کی شادی کسی دوسری جگہ ہو جاتی ہے تو ممکن ہے کہ آپ کچھ دنوں تک دیوانے رہیں۔ لیکن اگر آپ کا دماغ عام انسانوں کی طرح حالت اعتدال میں (Normal [illegible]) ہے تو پھر آہستہ آہستہ آپ کے اور آپ کی "مرکز نگاہ" کے درمیان غیریت واجنبیت کا ایک پردہ حائل ہوتا جائے گا۔ اور آپ کی محبت کا جوش ہمیشہ کے لئے رخصت۔

اور اس لئے وہ لوگ صریح غلطی پر ہیں جو محبت کو تکمیلِ انسانیت کا ذریعہ سمجھ کر اُس کو صرف ہجر کی کراہ میں باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایسی محبت انسانی فطرت کے بالکل منافی ہے۔ بلکہ فطرت کے خلاف ایک ایسی بغاوت ہے جس میں باغی کی تباہیاں یقینی ہیں۔

محبت کا صحیح مفہوم:۔

اِن تمام بحثوں کے بعد اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا حقیقۃً محبت کا وجود دنیا میں ہے بھی یا نہیں، یعنی وہ محبت جس کی تعریف ابتدا میں بیان کی گئی ہے ـــــ "ایک خالص، بے غرض اور بے لوث انہماک"۔

اس تعریف پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے یہ معنے ہیں کہ باہم دو شخصوں میں ہر اعتبار سے حقیقی اتحاد پایا جائے۔ "حقیقی اتحاد" سے میرا مطلب یہ ہے کہ اُن کے جذبات واحساسات، خیالات ومشاعر، امیال وعواطف اور طبعی ذوق آپس میں اسدرجہ متحد ہوں کہ کسی مسئلہ میں ایکدوسرے کے ساتھ اُنکا اختلاف ممکن نہ ہو۔

لیکن دنیا میں اس قسم کے اتحاد کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، دو سبب سے، اول تو دو انسانوں میں اس قسم کا مکمل اور تام اتحاد ہوتا ہی بہت کم ہے، دوسرے اگر ہوتا بھی ہے تو پھر یہ کیا ضروری ہے کہ اس قسم کے دو شخص آپس میں ایک دوسرے سے متعارف بھی ہوں۔ گوئٹے کہتا ہے کہ حافظ کے خیالات مجھ سے اسدرجہ متحد ہیں کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں میری ہی روح تو حافظ کے قالب میں نہ پھونک دی گئی تھی۔ لیکن گوئٹے اور حافظ میں مکانی اور زمانی دونوں اعتبار سے جو بعد تھا وہ ظاہر ہے۔

اس اتحاد کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مرد وعورت ہی کے درمیان ہو بلکہ جس طرح وہ مرد وعورت کے مابین ہو سکتا ہے اسی طرح دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان بھی ممکن ہے۔

میرے نزدیک حقیقی محبت اسی اتحاد کا نام ہے۔

اگرچہ دنیا میں ایسے خوش نصیب لوگ پائے جاتے ہیں جن کو یہ اتحاد اپنے مرد دوستوں میں سے کسی ایک میں نصیب ہو جائے لیکن ایسے نفوس کی تعداد بہت کم ملے گی جہاں اس اتحاد کا مرکز جنسِ مقابل کا کوئی فرد ہو۔

اس قسم کا اتحاد درحقیقت بہت طویل تعلقات اور مراسم کے بعد پیدا ہوتا ہے۔ جب دو قلب آہستہ آہستہ ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیتے ہیں اور بالآخر ایسا محسوس کرتے ہیں کہ ایک کی تکمیل دوسرے کے بغیر ناممکن ہے۔

لیکن اس اتحاد میں ایک خاص چیز قابل غور ہے۔

شوپنہار کہتا ہے:۔

"دو دل صحیح معنی میں اُسی وقت محبت سے متحد ہو سکتے ہیں جب اُن میں سے ایک کی کمی دوسرا پوری کرے"[1]

زیادہ واضح الفاظ میں اس کو یوں سمجھئے کہ دونوں کے مزاج کچھ اس قسم کے ہوں کہ اگر ایک میں غیر معمولی کرختگی و سختی ہے تو دوسرے میں اُسی تناسب سے اتنا لوچ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے دوست کے مزاج کی اس ناخوشگواری کو برداشت کر سکے۔ اگر ایک دوست جلد باز اور زود رنج ہے تو دوسرے کو اتنا مستقل مزاج اور ذی شعور ہونا چاہئے کہ وہ اپنے رفیق کی مناسب مدد کر سکے۔ اگر ایک کی طبیعت میں احمقانہ ظرافت و شوخی ہے تو دوسرے کو ایک معین حد تک سنجیدہ ظرافت کا حامل ہونا چاہئے، اگر ایک ہر وقت باتیں کرنے کا شائق ہے تو دوسرے کو اُس کی باتوں کے سننے میں لطف آنا چاہئے ——— غرضکہ اُن دونوں مزاجوں کی نوعیت ایسی ہونا چاہئے کہ اگر اُن دونوں کو ملا کر ایک نیا مرکب تیار کیا جائے تو ایک مکمل ترین انسان کی تشکیل ہو سکے۔

لیکن یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ جہاں ایک دوسرے کے مزاج میں اتنا لوچ ہونا چاہئے وہاں اس کی بھی ضرورت ہے کہ دونوں کے امیال و عواطف متضاد نہ ہوں اور نہ اُن کے رجحاناتِ طبعی میں باہم کوئی بنیادی اختلاف ہو۔ اُن کے عزائم و مقاصد، اعتقادات و خیالات، تصورات و مشاعر غرضکہ اُن کی ساری ذہنی زندگی ایک دوسرے سے کہیں نہ ٹکراتی ہو۔ گویا یوں سمجھئے کہ اُن دونوں کے مزاج و طبیعت کے اہم پہلو آپس میں یکساں ہوں۔ اور گو بظاہر اُن میں اختلاف نظر آئے لیکن درحقیقت دونوں میں ایک ہی قسم کی "برقی رو" دوڑ رہی ہو، دونوں کی طبیعت ایک یکساں شعلہ سے حرارت پذیر ہو اور دونوں کے مزاج کے بنیادی اصول بالکل ایک ہوں۔

بات یہ ہے کہ انسانی نفسیات کا یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ انسان ہمیشہ اُس چیز کو مستحسن و پسندیدہ سمجھتا ہے جو خود اُس کے پاس موجود نہ ہو بشرطیکہ اُس کے امیال و عواطف کے اعتبار سے اُسے اُس چیز کے خلاف کوئی طبعی عناد نہ ہو بلکہ وہ ہر وقت اُس کے حصول کا متمنی رہے مثلاً اگر آپ آزاد خیال اور روشن ضمیر بننے کے آرزومند اور سوسائٹی کی تمام

[1] ملاحظہ ہو Story of Philosophy. by W. Durant

دقیانوسی اور قدیم رسم و رواج کے خلاف مستقل بغاوت کا جذبہ اپنے دل میں رکھتے ہیں تو آپ کو اُس دوست کی معیت بہت پُرلطف معلوم ہوگی جو ان صفات سے متصف ہو۔ لیکن اگر آپ بذات خود کہنہ اور فرسودہ خیالات کے حامی ہوں تو پھر کوئی بلند نظر اور وسیع المشرب انسان آپ کی دوستی کے لئے موزوں نہ ہوگا۔

ایک دوسری مثال لیجئے:۔

گورے رنگ کو آپ حسین ترین سمجھتے ہیں لیکن افریقہ کے کسی حبشی سے پوچھئے کہ اُس کے نزدیک ایک سیاہ چمکیلے جسم کے مقابلہ میں گورے رنگ کی کیا وقعت ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ایک مخصوص آب و ہوا اور ماحول کے اثر سے اُس کے ذہن و دماغ میں سیاہ رنگ کی زیبائی و رعنائی اس درجہ پیوست ہو چکی ہے کہ اب اُس کے نزدیک کلیوپٹرا بھی ایک حبشی لڑکی کے مقابلہ میں درخور اعتنا نہیں ہو سکتی۔

بہرحال دو طبیعتوں کے کلی اتحاد کے ساتھ ساتھ یہ جزئی اختلاف انسانی محبت کو استوار کرنے کے لئے لازمی ہے یعنی بحیثیت مجموعی ایک کی طبیعت کے تمام پہلو دوسرے کی طبیعت کے تمام پہلوؤں کے ساتھ اتحاد تام رکھتے ہوں گر ایک فریق جن اُمور میں کامل ہو دوسرا بھی اُن کے حصول کا ساعی ہو اور اس لئے ایک سنجیدہ اور خاموش انسان کسی ظریف و پُرشور شخص کا دوست بن سکتا ہے بشرطیکہ وہ ظرافت سے لطف اندوز ہونا جانتا ہو۔ اپنے دوست کی ظرافت کے باریک نکات کی قدر کرتا ہو اور اُسے زندگی میں ایک مفید فعل سمجھتا ہو ——— "دل الافلا"

لیکن اگر اس کے برخلاف اگر آپ کی سنجیدگی اس درجہ پر پہونچ جائے کہ آپ اپنے دوست کی ظرافت کی قدر نہ کر سکیں، اُس کو داد نہ دے سکیں۔ اُس کے لطائف کے گہرے نکات کو نہ سمجھ سکیں تو آپ دونوں میں کبھی بھی اتصال حقیقی صورت پذیر نہ ہو سکیگا۔ مثلاً اگر ایک خشک فلسفی کو جون کرافورڈ سے ملا دیا جائے تو زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایگا کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے متنفر نظر آئیں گے۔

ان تمام بحثوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد محبت کے مسئلہ میں ہم جس نتیجہ پر پہونچتے ہیں وہ یہ ہے کہ:۔

"محبت نام ہے ایک خالص، بے لوث اور بے غرض انہماک کا جو دو شخصوں کے امیال و عواطف جذبات و رجحانات اور احساسات و مشاعر کے حقیقی اتحاد و اتصال کے بعد پیدا ہوتا ہے"

اس تعریف کے ماتحت محبت میں مرد و عورت کی تخصیص باقی نہیں رہتی۔ لیکن اگر خوش قسمتی سے یہ اتصال دو مقابل جنسوں میں ظہور پذیر ہو تو پھر اس کو "جذبہ نفسانی" کی تائید بھی حاصل ہو جاتی ہے ——— پھر اگر جنس مقابل ثروت حسن سے بھی بہرہ مند ہو تو انسان کا "جمالیاتی احساس" اس محبت کو اور زیادہ تقویت پہونچا کر اس شراب کو سہ آتشہ بنا دیتا ہے ——— گر یہ تینوں چیزیں ——— طبائع اختلاف جنسیت اور حسن ——— شاذ و نادر ہی جمع ہوتی ہیں۔ لیکن اگر خوش نصیبی سے کبھی جمع ہو جائیں تو پھر دنیا ایک فردوس ہوتی ہے اور زندگی کی تمام لذتیں سمٹ کر اس "مبارک اتحاد" میں جمع ہو جاتی

ہیں۔ اور یہی وہ مرتبہ ہوتا ہے جب انسان کو کائنات کے ہر ذرہ میں ایک "الوہی نشاط" کا جلوہ نظر آتا ہے اور زندگی کا ہر سانس اُس کے لئے ایک مستقل نوید بہار ہوتا ہے۔

دنیا کی تاریخ میں اس قسم کی مکمل محبتیں بہت کم نظر پڑتی ہیں تاہم مثال کے طور پر براؤننگ اور ایلزبتھ یا میڈم کوری اور اُس کے شوہر کی محبت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

محبت کے متعلق ان تمام ابحاث کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل منطقی نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:۔

ا۔۔ محبت دو نگاہوں کے بیک وقت ملنے یا غیر معمولی حسن کو دیکھنے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نتیجہ ہوتی ہے ایک طویل صحبت و ہمکلامی کا۔

۲۔۔ محبت میں حسن اور جذبات نفسانی ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔۔ محبت ایک مرتبہ مستحکم ہو جانے کے بعد پھر کبھی ختم نہیں ہوتی۔

۴۔۔ محبت اپنے ساتھ ایک ابدی سکون و سرور لیکر آتی ہے اور زندگی کو اُس کے تمام مصائب و آلام کے باوجود ہمیشہ کے لئے خوشگوار بنا دیتی ہے۔

لیکن ممکن ہے کہ فطرت کی یہ گرانمایہ ترین نعمت اپنے پورے جلوؤں کے ساتھ یورپ میں نصیب ہو سکے مشرق میں تو اس کی توقع فضول ہے اس لئے کہ یہاں مرد و عورت کی دماغی اور ذہنی تربیت میں اتنا اختلاف ہے کہ وہ دونوں کبھی صحیح معنے میں "اتحاد طبائع" کے حامل نہیں بن سکتے۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ محبت کا گوہر لطیف مشرق کے ریگزار میں دستیاب نہیں ہو سکتا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم میں اس جذبہ کے پرورش و ارتقا کی سرے سے صلاحیت ہی مفقود ہے۔ اس کے برخلاف ہم اس جذبہ سے متاثر ہونے کی اتنی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جتنی دنیا کے کرہ پر کسی ایک انسان کو بھی حاصل ہے۔ لیکن جس طرح آپ دہلی میں بیٹھکر ٹوکیو اور نیویارک کے کسی باشندے سے رابطۂ اُلفت و محبت پیدا نہیں کر سکتے اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ آپ ہمارے رسم و رواج کی پیدا کردہ خلیجوں کے باوجود جو ہماری اور عورت کی بے تکلف ملاقاتوں میں حائل ہیں اس جذبہ کی نشو و نما کر سکیں۔

چونکہ ہم نے محبت کی بہت غلط تعریفیں ذہن نشین کر رکھی ہیں اس لئے ہم میں سے اکثر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی ہے کہ اُن کے اور اُن کی بیویوں کے درمیان کامل اتحاد و محبت ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ایک لاکھ شریف گھرانوں میں سے شاید ایک گھر بھی ایسا نہ نکل سکے جہاں زوجین میں صحیح رابطۂ موانست و محبت ہو۔ بالعموم "رواداری" اور "یکطرفہ پرستش" ہے جس کو ہم غلطی سے محبت سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔

محبت میں ضروری ہے کہ محب و محبوب دونوں ایک دوسرے کی صحیح قدر کریں اور ایک دوسرے کی

واقعی قیمت کو جانتے ہوئے اُس کو عزیز رکھیں۔ لیکن اگر آپ روشن دماغ ہیں، سنجیدہ اور ذہین ہیں، بہترین لیکچرار اور مقرر ہیں، فلسفہ کے باریک اور دقیق مسائل میں موشگافیاں کرنا خوب جانتے ہیں، نہایت پاکیزہ ذوقِ ادب رکھتے ہیں، اعلےٰ پایہ کے شاعر و انشا پرداز ہیں ـــ تو دنیا میں سب سے پہلی شخصیت جو آپ کے اِن تمام کمالات کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیگی، جو آپ کی مایۂ فخر استعدادوں پر تمسخر اُڑائیگی اور جو آپ کی صحیح حیثیت سے ہمیشہ ناواقف رہیگی وہ آپ کی بیوی ہوگی[۱]۔

ایک دفعہ میرے ایک دوست کو یہ خبط پیدا ہوگیا کہ اُن کے ازدواج کی بنیاد محبت پر ہونا چاہئے۔ اور بدقسمتی سے وہ ہندوستان ہی میں اپنے اس عزم کی تکمیل بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اپنی اس کوشش میں اُنھوں نے دیکھا کہ اس وادی میں اُن سے کہیں زیادہ کامیاب ایسے نوجوان ہیں جن کا اخلاق و ضمیر گندہ ترین ہے اور جن کے رومان کا تمامتر انحصار صرف مکر و فریب اور اسی قسم کے سیکڑوں حیا سوز جرائم پر ہوتا ہے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ وہ نوجوان جن سے عام مجالس و محافل میں وہ مصافحہ کرنا بھی اپنی پاکیزگیِ نفس کی توہین سمجھتے تھے اس میدان میں اُن کے شریکِ مسابقت ہیں۔ تاہم ایک مستقل مزاج "طلبگار" کی حیثیت سے اُنھوں نے اپنی مساعی کو جاری رکھا۔ لیکن جب مسلسل تجربوں کے بعد اُن کو یہ معلوم ہوا کہ ہر بارگاہ سے اُن کا سرِ نیاز صرف اس لئے ٹھکرا دیا جاتا ہے کہ اُنکے اعضا و جوارح میں وہ ورزشی طاقتیں جمع نہیں ہیں جو ایک بیفکرہ ہوا پرست ہی میں پائی جاسکتی ہیں تو جنت سے نکالے ہوئے آدم کی طرح اُن کو بصد یاس و ناکامی اس بوستانِ محبوبی سے واپس آنا پڑا۔ چنانچہ اُنکی بیکسی کے خیال سے میرا دل اب بھی تڑپ اُٹھتا ہے جب میں اُن کے ان حسرت آگیں جملوں کو یاد کرتا ہوں کہ ـــ

"ہماری سوسائٹی میں ایک مرد کی عظیم ترین ذاتی صلاحیتوں کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہر نوجوان لڑکی اُس سے نفرت کرے اور بے تکلف صحبتوں میں اُسے اپنے لئے وبال سمجھے....."

اس کے مقابلہ میں ایک مغربی سائنٹسٹ کا یہ قول یاد کیجئے کہ "...... شادی سے پہلے میں اور میری ہونے والی بیوی کئی کئی دن مسلسل اختبار خانہ کے ایک کمرہ کے اندر کسی علمی تجربہ میں ہمہ تن منہمک رہے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے بحث کرتے رہے ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ اس دوران میں ہم نے ایکدوسرے کو ہاتھ بھی لگایا ہو"۔

بہرحال مشرق میں مرد و زن کا اتصال موقوف ہوتا ہے صرف جذبۂ جنسی اور رواداری پر جس میں عورت کی جانب سے "نیائش و پرستش" کا عنصر ایک اہم ترین حیثیت رکھتا ہے۔

ہم جس زندگی کو بسر کر رہے ہیں وہ ایک ایسی ٹھوس، بے مغز اور بے کیف زندگی ہے جس کی ساری لذتیں

---

[۱] اس موضوع پر مصر کے مشہور فاضل قاسم بک امین نے اپنی کتاب "تحریر المراۃ" میں بہت فاضلانہ اور پر از معلومات بحث کی ہے۔

سلب کر لی گئی ہیں اور گو ہم دن رات محبت کا راگ الاپتے رہیں لیکن آپ نے دیکھا کہ حقیقتاً محبت سے ہمیں کوئی دور کا علاقہ بھی نہیں۔ قفس کی اُس چڑیا کی طرح جس کے بازو اُڑنا بھول چکے ہوں ہم محبت کے مفہوم سے قطعًا نا آشنا ہو چکے ہیں، ہماری گفتگو "خوش ذوقی"، ادبیت، شاعری غرضکہ سب کچھ خالص "نفسانیت" پر مبنی ہوتی ہے۔ گو کبھی کبھی "جمالیاتی ذوق" کے ترانے بھی کانوں میں پڑ جاتے ہیں مگر وہ چیز جس کو "زندگی کی بجلی" کہتے ہیں، ہم سے مفقود ہو چکی ہے۔

میرے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں کامیاب محبت صرف اُس لڑکی سے کیجا سکتی ہے۔ جس کی طبعی شوخی سے تمام گھر نالاں ہو جس کی بیباکیاں گھر کی چہار دیواری کو عبور کر کے باہر تک پہونچ چکی ہوں۔ اور جس کی اخلاقی حالت اتنی مشتبہ ہو کہ کوئی شریف انسان اُس کو رفیق حیات بنانے کے لئے تیار نہ ہو"

میں نے پوچھا:۔ "کیوں؟"

کہنے لگے:۔ "حقیقتہً یہ لڑکی جنیس (Genius) ہوتی ہے۔ موجودہ معاشرت کی تنگ و تاریک کوٹھری میں اُس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اپنی بیقرار طبیعت سے مجبور ہو کر قفس کی ان تیلیوں کو توڑ ڈالتی ہے وہ اپنے سینہ میں طوفانی موجوں کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی اور بالآخر اُس کے رُکے ہوئے احساسات شرار بنکر ہر امکانی روزن سے آتش فشان مادہ کی طرح پھوٹ پڑتے ہیں۔

وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ:۔ "سوسائٹی کی یہی لڑکیاں ہیں جن کو اگر صحیح تربیت دیجاتی تو وہ لینن اور نپولین کی طرح دنیا کے طول و عرض پر چھاجاتیں"

بہرحال یہ صحیح ہو یا غلط اتنا ضرور صحیح ہے کہ ہماری موجودہ معاشرت میں مرد و عورت کے دماغی توازن میں اختلاف تربیت کی بنا پر اتنا عظیم اختلاف ہو گیا کہ ان دونوں میں باہمدگر محبت کا جذبہ نشو و نما نہیں پا سکتا۔

کاش انسان اُسی دور وحشت میں رہتا جب مرد و عورت دونوں ایک آسمان کے نیچے کھیلتے تھے، اور فطرت کے ایک اُستاد کے آگے زانوئے ادب تہہ کرتے تھے۔ ایک طرح کی ذہنی و طبعی تربیت پاتے تھے اور اس طرح آپسمیں زندگی کے گراں سے گراں بار کو رنگینیوں اور مسرتوں میں تبدیل کر سکتے تھے۔ کاش ہم اُن آزاد چڑیوں کی طرح خوش رہتے جو اپنے آشیانہ میں دنیا کے لطف و انبساط کا عطر نچوڑ کر بیٹھی رہتی ہیں اور کائنات کی بڑی سے بڑی خوشی اُن کے دو دھڑکتے ہوئے دلوں میں چمکتی نظر آتی ہے!! ـــــ کاش خدا ہم کو پھر ہزاروں سال پیچھے لوٹا دے۔ یا مشرقی مرد کو اتنی صلاحیت دے کہ وہ عورت کو محض "کنیز" بنا کر زندگی کی یہ تنہا مسرت ہم سے نہ چھینے۔ کاش اُسے ہوش آئے ـــــ اس سے پہلے کہ ان وادیوں میں موت کے قہقہے گونجیں!!

سید ابو سعید بزمی، ایم۔ اے

افسانہ کی تکمیل

احمد سعید ٹرکی کا مشہور افسانہ نویس اپنے کمرہ میں میز پر بیٹھا ہوا ایک افسانہ کی تکمیل میں محو ہے۔

ہیرو گاؤں کے ایک مکان میں تنہا بیٹھا ہوا ہے۔ یہ مکان عام آبادی سے علٰحدہ ایک میدان میں واقع ہے تقریباً نصف شب گزر چکی ہے۔ وہ کچھ سراسیمہ نظر آرہا ہے۔ خوف زدہ ۔۔۔۔۔ بے انتہا خوف زدہ۔ چاروں طرف نظر دوڑاتا ہے کوئی آدمی نظر آتا ہے نہ حفاظت کا کوئی دوسرا سامان۔ ایک چھڑی بھی موجود نہیں جدید آہنی یا آتشیں آلات کا کیا ذکر۔ اس حال میں وہ بے حد متوحش نظر آتا ہے اور بالآخر مایوس ہوکر میز پر کہنی ٹیک کر بیٹھ جاتا ہے۔

سعید کا قلم یہاں پہونچکر رک جاتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس جگہ افسانہ میں کسی ایسے واقعہ کو پیش کرے جو ناظرین کو فوراً متوجہ کرے۔ لیکن اس کی ساری ذہانت بیکار ثابت ہو رہی تھی اس نے ہزار سر مارا لیکن کوئی بات سمجھ میں نہ آئی وہ اسی فکر میں محو تھا کہ ایک شخص کمرہ میں داخل ہوا ــــ دراز قد، مضبوط اعضاء۔ چہرہ پر لانبی اور گھنی داڑھی۔ ہاتھ میں بھرا ہوا پستول۔ سعید کو اسوقت تک مطلقاً خبر نہوئی جب تک کہ آنے والے کی مہیب آواز نے اسے چونکا نہ دیا۔

اجنبی ــــ تم کیا کر رہے ہو۔

سعید ــــ لکھ رہا ہوں۔ لیکن تمھیں میرا نام کس طرح معلوم ہوگیا۔ میں تو تمھیں پہچانتا بھی نہیں۔

اجنبی ــــ تمھیں پہچاننے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں تمھیں اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمھاری تصنیفات ایک ایک کرکے میری نظر سے گزر چکی ہیں۔ تمھیں کیا خبر کہ تم کس شہرت کے مالک ہو۔ ملک کا بچہ بچہ تم سے واقف ہے۔ تمھاری جائے قیام کی جستجو میں مجھے سخت دقتیں پیش آئیں۔ میری کتنی خوش نصیبی ہے کہ اسوقت تم بالکل تنہا ہو تمھارے ملازم تم سے بہت دور چین سے سو رہے ہیں۔

سعید ــــ اچھا تو تم نے میرے تمام افسانوں کا مطالعہ کیا ہے! بتاؤ میری کتاب "فلسفۂ حیات" کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے۔

اجنبی ــــ ہر اعتبار سے کامیاب ہے۔ کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ آج روپیہ کی طمع نے دنیا کے گوشہ گوشہ میں

قتال وجدال برپا کردیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کو جانے دو جنگ عظیم پر نظر ڈالو بجز اس کے اور کونسا جذبہ کارفرما تھا ہر قوی ملک کمزور کو صرف اس لئے غلام بنانے کی فکر میں ہے کہ اس کے لئے نیا بازار پیدا ہو جائے اور سرمایہ دار اپنی مشینوں کی پوری قوت وہاں کی دولت چھین لینے میں صرف کردے۔

سعید —— لیکن تمھیں معلوم نہیں مزدور بھی اب غافل نہیں ہیں۔ آہستہ آہستہ منظم ہوتے جارہے ہیں گو یہ رفتار بہت سست ہے۔ میں تمھیں سمجھاؤں گا کہ ان کی یہ تنظیم کسی کی سعی و کاوش کی مرہون منت نہیں بلکہ از خود ہوتی جارہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکثر مقابلہ کا جذبہ انھیں مغلوب کرکے اس اتحاد میں رخنہ پیدا کر دیتا ہے۔ لیکن وہ دن دور نہیں جب ایک بین الاقوامی اتحاد مزدوروں میں رونما ہوکر سرمایہ داری کو ہمیشہ کے لئے فنا کردے گا۔ متوسط طبقہ بھی مزدوروں سے متحد ہوتا جارہا ہے اس لئے کہ ان کی معیار زندگی کا برقرار رہنا دوسری صورت میں ممکن نہیں ...... اچھا اب اس اجمال کی تفصیل ......

اجنبی —— خیر ہوگا میں ان فضول باتوں میں زیادہ وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا کام کی بات کرو۔

سعید —— میں تمھیں کتنی کام کی بات بتا رہا تھا جس پر دنیا کی تمام آیندہ نسلوں کی حیات و موت کا انحصار ہے۔

اجنبی —— یہ باتیں میرے کس کام کی مجھے تو اس زمانہ کے مطابق چلنا ہے اور زندہ رہنے کے لئے جان پر کھیل کر روپیہ حاصل کرنا۔ میرے یہاں آنے کی غرض تم سے افسانہ سننا نہیں ہے۔

سعید —— پھر کیا چاہتے ہو۔ ایں! تمھاری یہ داڑھی بھی مصنوعی معلوم ہو رہی ہے!!

اجنبی —— چاہتا کیا ہوں؟ یہ تمھاری سمجھ میں نہیں آیا، انسانی دماغ کے بڑے بڑے راز ترجمان بنتے ہو لیکن ایسی معمولی بات نہیں سمجھتے! میری داڑھی نقلی سہی کام تو اصلی کے برابر ہی دیتی ہے۔

سنو! اور کان کھولکر سنو!! میں جانتا ہوں کہ آج تم بنک سے ایک ہزار کے نوٹ برآمد کرکے لائے ہو۔ اسوقت سے برابر میں تمھیں تاکتا رہا ہوں، ابتک کمرہ سے باہر کہیں نہیں گئے بتاؤ کس بکس میں ہے۔ لاؤ کنجی لاؤ۔

یہ کہتے کہتے اجنبی نے پستول کی نالی اس کے سر سے لگادی۔

سعید —— (کچھ سوچکر) اچھا بیٹھ جاؤ میرے دوست جلدی کیا ہے۔ میں خود تمھارے حوالے کئے دیتا ہوں۔ بکس کھولنے کی زحمت تمھیں کیوں دوں۔

اجنبی —— خبردار! اپنی جگہ سے اگر ذرا بھی حرکت کی تو میں تمھیں ہمیشہ کے لئے خاموش کردوں گا۔

سعید نے چپ چاپ کنجی کا گچھا اس کے حوالے کیا اور ایک بکس کی طرف اشارہ کیا۔ اجنبی آگے بڑھا سعید نے میز سے ٹیلیفون اٹھایا۔

اجنبی —— ہا ہا ہا ...... تم نے مجھے اسدرجہ بیوقوف سمجھ رکھا تھا۔ تمھارے ٹیلیفون کا سلسلہ منقطع کردیا گیا ہے

تمھاری گھنٹی بیکار کر دی گئی ہے۔ اور سنو یہاں سے بہت قریب ایک نہایت تیز رفتار موٹر کھڑا ہے اس لئے کہ جب میں تم سے رخصت ہو کر جانے لگوں اور کہیں تم پولیس کو خبردار کر دو تو میں تم لوگوں کی دسترس سے جلد از جلد باہر ہو جاؤں۔

سعید ہکا بکا رہ گیا۔ اجنبی نے بکس کھولا، اور بکس کو خالی دیکھ کر غصہ سے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔

اجنبی — کیوں سعید! تم نے مجھے دھوکا دیا، خیر چاہتے ہو تو اب بھی وقت ہے، مجھے بتاؤ کہ روپیہ کہاں ہے، صاف بتاؤ روپئے کہاں ہیں؟ (یہ کہکر وہ پستول کی لبلبی پر انگلی رکھ دیتا ہے)

سعید — ٹھہرو! خدا کے لئے ایسا نہ کرنا ورنہ قوم اور اس کے ساتھ خود تم میرے افسانوں سے محروم رہجاؤ گے روپئے میں خود تمھارے حوالے کئے دیتا ہوں۔ لو یہ کنجی، اسی میز کی دراز میں روپئے موجود ہیں، جلدی سے نکال لو اور میرے دماغ کو کام کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دو۔

اجنبی — شاباش! اچھا ذرا تم اپنا ہاتھ تو اوپر اٹھا لو۔۔۔۔۔ اوپر۔۔۔۔ سر سے اوپر۔۔۔۔ بالکل سیدھا رکھو اور یاد رکھو اگر ذرا بھی حرکت کی تو۔۔۔۔

سعید نے ہاتھ اوپر اٹھا لیا اور کرسی سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔

اجنبی داہنے ہاتھ سے میز کی دراز کھول رہا تھا اور بائیں ہاتھ سے پستول سعید کی کنپٹی سے لگائے ہوئے تھا سعید میز کے نیچے نیچے آہستہ آہستہ پاؤں اٹھا رہا تھا اور ٹھیک جسوقت اجنبی نے نوٹوں کے بنڈل پر ہاتھ ڈالا سعید نے تیزی سے پاؤں اٹھا کر دراز پر ایک لات اس زور سے رسید کی کہ دراز جھٹکے سے بند ہو گئی اور اجنبی کا ہاتھ کچلکر رہ گیا۔ درد سے بلبلا اٹھا اور ہاتھ کھینچ کر کراہنے لگا۔ پستول بھی زمین پر گر پڑا تھا۔ سعید نے اسے اٹھا لیا۔

سعید — میرے اچھے دوست! اب تمھیں یہاں ٹھہرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔ میں تمھارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میرے افسانہ کو مکمل کرا دیا۔

الیاس اسلام پوری

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

چھپ کر طیار نہیں ہوا ہے، اس لئے دوسری طیار شدہ کتابوں کے ساتھ اس کا آرڈر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ جسوقت یہ مجموعہ شائع ہو گا، اس کی اطلاع ذریعہ نگار سب کو ہو جائیگی اور اسی وقت قیمت بھی اسکی ظاہر کر دی جائے گی، فی الحال نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ضخامت و قیمت کیا ہو گی۔ منیجر نگار

ہندوستان میں متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری

قبل اس کے کہ اس موضوع پر کوئی بحث کی جائے ہم یہ واضح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقہ سے ہمارا کیا مفہوم ہے۔ "تعلیم یافتہ" اور "متوسط" ایسے الفاظ ہیں جو زبان زدِ عام ہیں لیکن ان کی منطقی تعریفیں مشکل سے کی جا سکتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جاہل مزدور۔ جاہل ہوشیار ساہوکار اور جاہل خوشحال کسان پر لفظ "تعلیم یافتہ" کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح باحیثیت زمیندار۔ مالدار تاجر اور غریب کاشتکار متوسط نہیں کہے جا سکتے۔ لہذا "متوسط تعلیم یافتہ طبقہ" لوگوں کی وہ جماعت ہوئی جو نہ بہت امیر ہے نہ غریب اور جس نے ایک معیار معینہ تک تعلیم حاصل کی ہے۔

پس بے روزگاری کا تعلق ہمارے تمام بیکار تعلیم یافتہ نوجوانوں سے نہیں ہے بلکہ اس کا سروکار انھیں لوگوں سے ہے جو کہ مجبوراً بے روزگار ہیں۔ وہ تعلیم یافتہ حضرات جن میں روزگار کی تلاش نہیں ہے بحث سے خارج ہیں۔

بے روزگاری کے خراب نتائج کے متعلق پروفیسر پِگو (Pigou) اپنی کتاب "بے روزگاری" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

> "مستقل کام کرنے کی عادت جاتی رہتی ہے اور جذبۂ خودداری و خود اعتمادی معدوم ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اگر کام کرنے کا موقع بھی حاصل ہو تو وہ شخص جو کبھی بے روزگار تھا اب اس قابل نہیں رہتا کہ اس کو کسی کام سے لگایا جائے۔"

ہم دیکھ رہے ہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد میں حیرت انگیز اضافہ ہو گیا ہے۔ رائج الوقت طریقۂ تعلیم بقول شخصے ہمیں کسی دفتر کی محرری کے علاوہ مشکل سے کسی اور کام کے قابل بناتا ہے۔ ملازمت نہایت اہم پیشہ تصور کی جاتی ہے۔ اس لئے ہمارا تعلیم یافتہ گروہ نوکری کی تلاش میں حیران و سرگرداں پھرتا ہے۔ قانون قیمت کا اطلاق یہاں بھی ہوتا ہے۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد ان کی مانگ سے زاید ہے لہذا ظاہر ہے کہ بازار میں ان کی قیمت ارزاں ہو گی۔ بعض اوقات لوگ مجبور ہو کر نہایت حقیر اور قلیل تنخواہیں قبول کر لیتے ہیں۔ مالکانِ کارخانہ صورت حالات سے فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور وہ بڑی تنخواہ کی اسامیوں پر ایسے لوگوں کا تقرر کرتے ہیں جو کم تنخواہ پر کام کرنے کے لئے رضامند ہو جاتے ہیں۔

باکار لوگوں کی جماعت میں یہ چیز خطرہ سے خالی نہیں ہے کیونکہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کی جگہ پر کب کسی دوسرے آدمی کی تعیناتی ہوجائے گی تنخواہ کی قلت کا اتنا ڈر نہیں ہے جتنا کہ روزگار سے بے روزگار ہوجانے کا خدشہ ہے۔

گزشتہ چند سالوں میں مسئلۂ بے روزگاری نے ایک نہایت اہم شکل اختیار کرلی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اور عوام دونوں کی توجہ اس جانب مبذول ہوگئی ہے۔ یہ ایک ایسی وبا ہے جس میں تمام ہندوستان مبتلا ہے۔ جنگ عظیم کے بعد متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری بڑھتی ہی گئی۔ دوران جنگ میں معیار معاشرت بلند ہوگیا اور اس کے اختتام کے بعد بھی بلند رہا۔ صوبہ جاتی اور مرکزی حکومتوں اور بعض نیم سرکاری مجلسوں نے اس مسئلہ میں کافی دلچسپی لی۔ اور طبقہ متذکرہ بالا کی بے روزگاری کے اسباب دریافت کرنے کے لئے مختلف صوبوں اور ریاست ٹراونکور میں وقتاً فوقتاً مختلف تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔

اگر ہم ان صوبجاتی کمیٹیوں کی رپورٹوں کا اجمالی طور پر مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مسئلۂ بے روزگاری کا تعلق کسی خاص صوبہ سے نہیں بلکہ تمام ہندوستان سے ہے۔ مدراس کمیٹی کی رائے میں ہر تین طلبہ میں جو اسکولوں اور کالجوں سے باہر نکلتے ہیں دو نوکری کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور دوسری تحقیق کی بموجب سو فیصدی نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

پنجاب کمیٹی (سنہ ۱۹۲۶ء) بھی اسی نتیجہ پر پہونچی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کی پیداوار پانچ سال کے زمانہ میں (سنہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۲۷ء) دونی سے زائد ہوگئی ہے۔ لیکن روزگار میں اس کے تناسب سے بہت قلیل فرق واقع ہوا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر کہیں کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہزاروں کی تعداد میں درخواستیں گزرتی ہیں۔ حال کا واقعہ ہے کہ رزرو بینک آف انڈیا (Reserve Bank of India) نے ۸۰ محرروں کے لئے ساٹھ روپیہ کے مشاہرہ پر اشتہار دیا اور دس ہزار درخواستیں موصول ہوئیں۔

مندرجہ بالا مثال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس قدر بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے اور ملازمت کس قدر عنقا ہو رہی ہے۔

بمبئی کمیٹی کی رائے میں نوجوانوں کی کثیر تعداد بے روزگار ہے اور تعلیم یافتہ گروہ میں جن کی عمریں ستائیس (۲۷) سال سے کم ہیں بہت زیادہ لوگ بیکار ہیں۔ حالانکہ بے روزگاری کا سلسلہ ۴۲ سال کی عمر تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ نوجوان جو انٹرنس یا اس کے برابر کا امتحان پاس کرنے سے قاصر رہے ہیں ان میں بے روزگاری بدرجہ اتم ہے کیونکہ سرکاری ملازمت کے واسطے انٹرنس یا اس کے برابر کا امتحان پاس کرنا نہایت ضروری ہے۔ انڈر گریجویٹ اور گریجوئٹ میں انٹرنس والوں کی بہ نسبت بے روزگاری کم ہے۔ وکالت کے پیشہ میں اب کچھ نہیں رہا کتنے وکیل ایسے ہیں جو کچہریوں میں جاتے ہیں، دن بھر بیٹھے رہتے ہیں اور شام کو انھیں یکہ کا کرایہ بھی میسر نہیں آتا۔

جن لوگوں نے کوئی پیشہ سیکھ لیا ہے ان کی حالت ادبی تعلیمیافتہ لوگوں کے مقابلہ میں بدرجہا بہتر ہے۔ لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ بے روزگاری روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے خواہ اعلیٰ تعلیم یافتہ گروہ کو لیجئے یا ادنےٰ تعلیم یافتہ جماعت کو۔

صوبہ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے بھی حال ہی میں اس مسئلہ کے حل کرنے کے لئے ایک تحقیقاتی کمیٹی بصدارت رائٹ آنریبل جناب ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو مقرر کی ہے جسکی رپورٹ عنقریب شایع ہونے والی ہے تعلیم یافتہ گروہ کی اس تند و وسیع بے روزگاری خالی از خطرہ نہیں۔ اور حکومت کو سمجھنا چاہئے کہ اگر وہ اس بے روزگاری کے انسداد کا معقول انتظام نہیں کر سکتی تو بہت جلد اُس کو ایک نہایت اہم مسئلہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ابھی تک تو گورنمنٹ کمیشن مقرر کر کے اس مسئلہ کو ٹالدیا کرتی تھی لیکن اب یہ چال کام نہ دیگی لوگ حقیقت سے آشنا ہو چلے ہیں۔ تاریکی کا پردہ ان کی آنکھوں سے اُٹھ گیا ہے۔ لہذا آنے والے خطرہ کا انسداد شطرنج کی ان چالوں سے نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت اور جماعت بندی کی روح ہر ہندوستانی تعلیم یافتہ کی رگ و خون میں پیوستہ ہوتی جا رہی ہے اور بہت جلد ان کے جمود و سکون میں انقلاب پیدا ہونے والا ہے۔ اس جذبہ کا پیدا ہونا کچھ ہندوستان ہی کے لئے مختص نہیں ہے بلکہ ہر جگہ جہاں بے روزگاروں کی نگہداشت نہیں کیجاتی ان کو کام پر نہیں لگایا جاتا یہی صورت پیدا ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے، بیکار کا دماغ شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔

۱۹۳۰ء میں تمام ہندوستانی یونیورسٹیوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اُنھوں نے بے روزگاری کے مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی اور آخر میں۔ یہ قرار پایا کہ ہر یونیورسٹی اپنی پیداوار کی بے روزگاری کے اعداد و شمار فراہم کرے۔

حکومت ہند بھی اس مسئلہ کی اہمیت سے غافل نہیں ہے ۱۹۳۱ء کی مردم شماری میں ایک اور خانہ کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں ۲۰ سال کی عمر سے لیکر ۴۰ سال کی عمر تک کے تعلیم یافتہ بے روزگار لوگوں کا اندراج کیا جائیگا تا کہ بے روزگاروں کی تعداد معلوم ہوتی رہے اور اُن کو کام پر لگائے جانے کی سبیل نکالی جائے۔

بے روزگاری کے اسباب

یوں تو تھوڑی بہت بے روزگاری پہلے بھی تھی لیکن جنگ عظیم نے پڑھے لکھے لوگوں کی بے کاری میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے، جنگ کے اختتام پر بہت سے لوگوں کو اپنی ملازمتوں سے مجبوراً مستعفی ہونا پڑا کیونکہ اب ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں تھی۔ اسلئے بہت سے محرر جو کہ دوران جنگ میں مختلف دفتروں میں نوکر تھے لڑائی کے ختم ہونے پر بیکار ہو گئے۔ جنگی اخراجات کی زیادتی کی وجہ سے بہت سے محکموں میں تخفیف ہونی شروع ہوگئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگ جو برسرکار تھے آج بیکار نظر آتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ تعلیم یافتہ لوگوں کو جن کی تعداد دمبدم رے

مد کی طرح بڑھ رہی ہے اور جن کی نوکریاں اس کے جزر کی طرح گھٹ رہی ہیں ملازمت مشکل سے میسر آسکتی ہے

موجودہ ناقص طریقۂ تعلیم بھی بے روزگاری کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے، موجودہ تعلیم جو ہمارے اسکولوں اور کالجوں میں رائج ہے صرف ادبی حیثیت رکھتی ہے، حالانکہ ہم کو نہ ورڈس ورتھ کی نیچرل شاعری کی ضرورت ہے اور نہ شیلے کے پرواز تخئیل کی۔ ہمارے لئے یہ چیزیں بیکار ہیں۔ یہ مشغلہ کسی خوشحال ملک کے باشندوں کا ہونا چاہئے جو اطمینان سے کھاتے ہیں اور آرام کی نیند سوتے ہیں۔ ملک بہانگ دہل پکار رہا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو فنی تعلیم کی ضرورت ہے اور اسی میں ہندوستان کے فلاح وبہبود کا راز مضمر ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی۔ ملک میں جو چند درسگاہیں ایسی ہیں بھی تو وہ ہندوستان کے مناسب حال نہیں۔ کیونکہ ان مدارس کے طلبہ اس قابل نہیں ہوتے کہ پیشہ ور لوگوں کی طرح فوراً کام پر لگائے جاسکیں۔

اس سلسلہ میں فنی درسگاہوں کے عیوب اور اُن کی ناکامیابی کے اسباب کا تذکرہ کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ان درسگاہوں کی تعلیم میں نقص یہ ہے کہ عملی زندگی کا خاکہ پیش نظر نہیں ہوتا بلکہ نظریوں پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ جب طلبہ ایسے اسکولوں سے پاس ہوکر نکلتے ہیں تو وہ اس قابل نہیں ہوتے کہ پیشہ ور کاریگروں کی طرح کام کرسکیں۔ فنی مدارس کی ناکامیابی کا سبب اچھے کارخانوں کی عدم موجودگی بھی ہے طلبہ اسکول سے سند لیکر ملازمت کی جستجو کرتے ہیں لیکن کارخانوں کی کمی کے باعث ناامید ہوکر بیٹھ رہتے ہیں اسکا اثر صرف اُنھیں طلبہ تک محدود نہیں رہتا بلکہ دوسرے بچّے بھی اس سے متاثر ہوکر ایسے اسکولوں کی جانب رخ نہیں کرتے۔ تلاش معاش کی مایوسیوں سے خود اعتمادی جاتی رہتی ہے اور یہی لڑکے ان مدارس سے متنفر ہوکر ان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں۔

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کے بعد سے ملازمت کو ایک نہایت ہی معزز پیشہ بلکہ یوں کہئے کہ ایک خاص امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ لہذا سب سے ضروری چیز لوگوں کو اس ذہنی غلامی سے آزاد کرانا ہے جب تک کہ ہندوستانی تعلیم یافتہ کی غلامانہ ذہنیت نہ بدلے گی بے روزگاری کا تدارک بہت ہی مشکل ہے۔ ڈارلنگ صاحب فرماتے ہیں کہ "ہندوستانی تعلیم یافتہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے میں اپنی ذلت سمجھتا ہے" اس بیان میں کوئی مبالغہ نہیں۔

تعلیم یافتہ گروہ کی بے روزگاری کا ایک اور سبب ہماری معاشری زندگی سے متعلق ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ افتراقِ ذات، اوائل عمر کی شادی، ہندوستانی کی اپنے خاندان سے غیر معمولی محبت اور یکجائی بود و باش ایسی چیزیں ہیں جو ہمیں بے روزگار پڑے رہنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر خاندان کی یکجائی بود و باش کو لیجئے کہ جہاں یہ بعض حیثیتوں سے مفید ہے وہیں اپنے ساتھ برائی کا پہلو بھی لئے ہوئے ہے

اس یکجائی بود و باش ہی کا نتیجہ ہے کہ ہم روزی حاصل کرنیکے واسطے ہاتھ پاؤں نہیں چلاتے اور اس سے انفرادی خودمختارانہ جذبہ کا خون ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے والدین اور سرپرستوں کی زندگی میں مشکل سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھتے ہیں اور اُنکے مرنے کے بعد ہمیں ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ الاماں۔ اس کے بعد اوائل عمر کی شادی کو لیجئے جو ہماری شاہراہ عمل میں بڑا روک ثابت ہوتی ہے کیونکہ یہ رسم زندگی کے پہلے ہی دور میں ہمیں خاندانی ذمہ داریوں کا حامل بنا دیتی ہے۔

اسی کے ساتھ آبادی کے مسئلہ کو بھی لیجئے۔ ہندوستان کی آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے اور بے روزگاروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء کے اعداد مردم شماری کا مطالعہ کرنے سے پتہ لگتا ہے کہ ملک کی آبادی ۳۵ کرور سے زائد ہے اگر ان اعداد کا گزشتہ (۱۹۲۱ء) کے اعداد مردم شماری سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آبادی میں کم و بیش تین کروڑ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ اور اگر ان اعداد کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیا جاوے تو ایک عجیب بات کا انکشاف ہوگا اور وہ یہ کہ متوسط تعلیم یافتہ طبقہ کی آبادی گزشتہ دس سال میں (۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۱ء) بہت بڑھ گئی ہے بچپن کی شادی اور شباب کی نادان اُمنگوں کا نتیجہ اضافۂ آبادی ہے۔

بیچارے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان کی حالت بہت دردناک ہے۔ بیوی کے طعنے، خاندان والوں کی زجر و توبیخ عزیز و اقارب کی بے توجہی کوئی کب تک سہے۔ انسان آخر کار خوددار ہے۔ اسکی غیرت جوش میں آتی ہے۔ اور وہ ایسے بہیمانہ کام کر بیٹھتا ہے کہ روح کانپ اُٹھتی ہے۔ اور اس بلا کے شکار ہو کر متعدد تعلیم یافتہ نوجوان خودکشی کر لیتے ہیں۔ جیسا کہ روزانہ آپ اخباروں میں پڑھتے ہیں۔

آبادی کے چڑھتے ہوئے دھارے کی روک تھام ضبطِ تولید سے کیجا سکتی ہے۔ ہر چند اس سے مسئلہ بے روزگاری حل نہیں ہوتا تاہم بے روزگاروں کی تعداد میں آئندہ اضافہ کا ہونا رک جائے گا۔

بے روزگاری کا تدارک

ہر چند بے روزگاری کا حل نہایت دقت طلب مسئلہ ہے لیکن اگر عوام اور حکومت کی توجہ نیک نیتی کے ساتھ اس جانب مبذول ہو جائے تو اس کا تدارک کچھ مشکل نہیں ہے۔ جنگ عظیم کے بعد جرمنی کی جو حالت تھی وہ سب پر ظاہر ہے۔ ۱۹۱۸ء میں جرمنی بربادیوں کا نہایت ہولناک منظر تھا، قوم بھوک سے مر رہی تھی اور جنگی قرض حکومت کو پیسے ڈالتا تھا۔ تنخواہوں میں شدید تخفیف ہو گئی تھی۔ ملک کے تاجروں اور کارخانوں کے مالکوں کا دیوالہ نکل گیا تھا اور مصیبت زدہ رعایا کی گردن پر ٹیکس کی ادائگی کا بار حد سے زیادہ تھا۔ لیکن ریپبلک حکومت کے برسر اقتدار ہوتے ہی ترقی نمودار ہوئی اور ایک مرتبہ پھر جرمنی کے تاخت و تاراج، خزاں رسیدہ گلشنِ صنعت و حرفت میں بہار آئی واضح رہے کہ مغربی ممالک

میں سب سے زیادہ گنجان آبادی جرمنی کی ہے- ایک مربع کیلومیٹر میں ۴۳۱ آدمی آباد ہیں، برخلاف اسکے روس فرانس اور انگلستان میں (بہ شمول نوآبادیات) ۷،۸۰، ۴۱- آدمی فی مربع کیلومیٹر آباد ہے- جرمنی کے لوگ کہیں ہجرت بھی نہیں کرسکتے کیونکہ جرمنی کا مشرقی غیرآباد حصہ ورسلیز کی صلح کے بموجب پولینڈ کو دیدیا گیا تھا- دوران جنگ میں جرمنی سے اسکی نوآبادیات چھِن گئی تھیں- ایسی صورت میں جرمنی کی پریشانیوں کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے-

اگرچہ موضوع بحث ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی بے روزگاری تھا لیکن جرمنی کی بے روزگاری کا قصہ درمیان میں مصلحتاً شامل کیا گیا ہے کہ شاید کوئی راہِ عمل ایسی نکل آئے جس سے ہندوستان کی بیروزگاری کا تدارک ہوسکے-

یوں تو بے روزگاری کا مسئلہ آجکل تمام دنیا میں عام ہو رہا ہے اور مختلف حکومتیں اس کی تخفیف کی کوشش بھی کر رہی ہیں لیکن نازی حکومت نے اس کام کو جس خوبی کے ساتھ انجام دیا وہ قابل ستائش ہے- ہر ہٹلر نے بے روزگاروں کی کھپت کے واسطے حکومت کی جانب سے رفاہ عام کے کام شروع کئے- حکومت نے اپنے سرمایہ سے امداد دیکر شخصی کارخانوں کو فروغ دیا اور اس طریقہ سے بے روزگاروں کی ایک اچھی خاصی جماعت کو ان کارخانوں میں کام مل گیا- جب سے تجارت میں انحطاط شروع ہوا ہی لوگوں میں بے روزگاری پھر پھیلنے لگی ہے، لیکن نازی حکومت نے اس کا بندوبست یہ کیا ہے کہ کارخانے سے بڑھے ہوئے آدمیوں کو زراعت پر لگادیتی ہے- اور اس طرح بے روزگاری کے پھیلنے کا اندیشہ جاتا رہا-

حکومتِ ہند جنگ عظیم کے بعد سے جرمنی کی طرح خستہ حال نہیں ہے اور ہر طور پر مستحکم ہے- گورنمنٹ کو اگر ملک کے باشندوں کے ساتھ ہمدردی ہے تو وہ اُن کے مفاد کے لئے سب کچھ کرسکتی ہے- خلوص نیت اور قوتِ ارادی کی ضرورت ہے- ملک کے اندر ریل اور پختہ سڑکوں کی بہت کمی ہے- اس زمانہ میں بھی آپ کو ایسے مقامات ملیں گے جو ریل اور پختہ سڑکوں سے پچاس پچاس میلوں کی دوری پر واقع ہیں- اور ان مقامات تک پہونچنے کا کوئی معقول انتظام نہیں ہے- ہندوستان جیسے وسیع ملک میں چالیس ہزار میل ریل کی پٹریاں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں- لہذا اگر ریل اور سڑکوں کی تعمیر کا کام شروع کردیا جائے تو ہمارے بہت سے بے روزگار تعلیم یافتہ نوجوانوں کی کھپت ہوسکتی ہے- کیونکہ دورانِ تعمیر میں محرروں اور منشیوں کی ضرورت ہوگی اور جب ریلیں بنکر تیار ہوجائیں گی تو اسوقت اسٹیشن ماسٹر- کلرک- تار محرر- اور گارڈوں کی ضرورت ہوگی اور بے روزگاروں کی کافی تعداد کو کام مل جائے گا-

اسی طرح مرکزی حکومت اور بہت سے رفاہ عام کے کام کرسکتی ہے مثلاً خشک اور غیرآباد حصوں میں نہروں کی تعمیر ہوسکتی ہے اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نوآبادی بسائی جاسکتی ہے- حکومت اپنے سرمایہ سے

ملک کے اندر بڑے بڑے کارخانے کھول سکتی ہے اور اس میں بہت سے لوگوں کی کھپت ہو سکتی ہے ساتھ ہی ساتھ حکومت یہ بھی کر سکتی ہے کہ ملک کے ہونہار نوجوانوں کو وظائف دیکر غیر ممالک میں فنی تعلیم کی تکمیل کے واسطے بھیجے اور جب وہ وہاں سے واپس آویں تو ملک کے اندر فنی مدارس قایم کرے تاکہ باہنر لوگوں کی کمی کارخانوں میں نہ محسوس کیجائے۔ اور ہندوستان کی صنعت و حرفت آسانی کے ساتھ ترقی کرتی رہے۔

ہندوستانی سرمایہ عروسِ نو کی طرح "شرمیلا" کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستانی سرمایہ دار اپنی رقم کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سرمایہ کی حفاظت کا معقول انتظام نہیں ہے اگر حکومت سرمایہ داروں کو اطمینان و ہمت دلائے اور اُن کے سرمایہ کی حفاظت کا ذمہ لے تو ملک میں خارجی سرمایہ کی ضرورت نہ رہے گی۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اندرونی سرمایہ سے جو کارخانے کھولے جائیں گے۔ ان کے اندر تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ٹریننگ کا انتظام بحیثیت اُمیدوار نہایت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ خارجی سرمایہ کے جتنے کارخانے ہیں ان میں اُمیدواروں کو کام سکھلانے کی کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ اور ان کارخانوں کو دیسی امیدواروں کے ساتھ کوئی ہمدردی بھی نہیں ہوتی — حکومت اگر ایسے قوانین وضع کردے کہ یہ کارخانے ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مقررہ تعداد کو ہر سال کام سکھائیں تو اس سے بڑا فائدہ ہوگا اور بے روزگاری بھی ایک حد تک کم ہو جائے گی۔

بے روزگاری کی تخفیف کے واسطے ایک اور تجویز پیش کی جاتی ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کاشتکاری کی طرف راغب کیا جائے لیکن میرا خیال ہے کہ یہ طریق کار بالکل بے سود ثابت ہوگا کیونکہ ہندوستان کی آبادی کا $\frac{9}{10}$ حصہ فی الحال کاشتکاری کر رہا ہے اور زمین پر آبادی کا بوجھ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ ایسی حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ زراعت سے ہٹاکر لوگوں کو دوسرے کاموں پر لگایا جائے نہ کہ اسی پیشہ میں ملک کی بقیہ دس فیصدی آبادی کا بار بھی اس پر ڈال دیا جائے علاوہ بریں اس میں اور نقصانات کا بھی اندیشہ ہے مثلاً:-

۱- اس تجویز پر عمل کرنے سے ان لوگوں میں بے روزگاری پھیلنے کا اندیشہ ہے جو پہلے سے کاشتکاری میں لگے ہوئے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ اگر ایک جماعت بارزگار ہو جاتی ہے تو دوسری جماعت بے روزگار ہو جائیگی اور یہ بے روزگاری کا کوئی حل نہ ہوگا۔

۲- اگر فرض کر لیا جائے کہ تعلیم یافتہ بے روزگار طبقہ زراعت پیشہ بننے میں کامیاب ہو جائے گا تو ایسی صورت میں غریب کاشتکار طبقہ بڑی مشکل میں پھنس جائے گا۔ کیونکہ تعلیم یافتہ اشخاص کے مقابلہ

میں بیچارہ جاہل کسان نہیں ٹھہر سکتا ہے۔ الغرض اسوقت بے روزگاری کا مسئلہ ملک کا نہایت اہم مسئلہ ہے اور ضرورت کہ سب سے پہلے اس طرف توجہ کی جائے، لیکن افسوس ہے کہ نہ حکومت اس پر سنجیدگی سے غور کرتی ہے اور نہ ہمارے قومی ادارے کوئی پروگرام ایسا پیش کر سکتے ہیں جو صحیح معنے میں اس درد کا علاج ہو سکے۔

بشیر احمد خاں بی اے (علیگ)

مجموعۂ استفسار و جواب

جلد اول

یوں سمجھئے کہ دائرۃ المعارف کی ایک جلد ہے جس کے ۵۱۲ صفحات میں علم و ادب تاریخ و مذہب نقد و تبصرہ اور عام معلومات کا ایک بے بہا خزینہ پوشیدہ ہے اس جلد میں تقریباً ۲۰۰ مسایل پر آپ کو وہ مواد ملیگا جو برسوں کی کتب بینی کے بعد بھی حاصل نہیں ہو سکتا، چند مباحث کی فہرست ملاحظہ ہو:—

مسئلۂ جبر و اختیار — خواب کی حقیقت — معاد و خلود۔ طبقۂ نسواں اور غزلگوئی — برج بابل — فاسسٹ جماعت۔ سامری کون تھا — باغ ارم کی حقیقت — فلسفۂ محبت۔ بھوت پریت — اصحاب کہف — سالویشن آرمی۔ ہالہ کا سبب — معجزہ و کرامات — فرقۂ معتزلہ۔ مذہب و عقل — طوفان نوح — یاجوج و ماجوج — برہمو سماج۔ طبقۂ نسواں اور تعلیم — مریخ کی حقیقت — منصور حلاج۔ چند الفاظ کی تحقیق — اصطلاحات تصوف کا ترجمہ۔

قیمت مع محصول خریداران نگار سے ۱۲؍ غیر خریداران سے ۱۴؍

منیجر نگار لکھنؤ

اردو میں بالکل نئی اور پہلی کتاب

شہوانیات یا ترغیبات جنسی

حضرت نیاز کے قلم سے

اس میں تاریخی و نفسیاتی نقطۂ نظر سے فواحش و عصیاں نگاری پر عہد قدیم سے لیکر اسوقت تک ایک بسیط تبصرہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ کن کن قوموں میں کس وقت تک کیسی کیسی فحاشیاں رائج ہوئیں اور اخلاق انسانی پر اسکا کیا اثر پڑا۔ یہ کتاب نہایت نادر معلومات اور عجیب و غریب واقعات تاریخی کا مجموعہ ہے۔ اور اس موضوع پر اسوقت تک کوئی کتاب اردو میں پیش نہیں کی گئی — اسمیں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات اور انکی تاریخ و نفسیاتی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اور آیندہ اخلاق انسانی کے بنیادی کن اصول پر قائم ہوتا ہے۔ الغرض اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ کتاب بالکل نئی چیز ہے اور ایکبار شروع کرنیکے بعد بغیر ختم کئے ہوئے آپ اسے چھوڑ نہیں سکتے۔ اس کتاب میں ایسے ایسے حیرت انگیز حالات و واقعات درج ہیں کہ آپنے کبھی نہ سنے ہونگے۔ اگر آپ نگار کے خریدار ہیں تو علاوہ محصول ۸؍ کے مجلد کتاب صرف ۸؍ میں — اور غیر مجلد ۴؍ میں ملیگی — اور اگر آپ نگار کے خریدار نہیں ہیں تو مجلد ۱؍ میں اور غیر مجلد ۸؍ میں علاوہ محصول ۸؍ کے ملے گی۔ اگر ارشاد ہو تو کتاب بذریعہ وی پی روانہ کی جائے — منیجر نگار لکھنؤ

بعض تاریخی کسبیوں کے خطوط

دوسری صدی عیسوی میں السفران، یونان کا مشہور انشاپرداز تھا اور اس کی انشارپردازی کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فرضی خطوط کے ذریعہ سے کردار نویسی کیا کرتا تھا اس کے ایک خط کا ترجمہ ناظرین نگار کی دلچسپی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ نیاز

تھایس کا خط، یوتھائی ڈیمس کے نام ——

جب سے تم نے فلسفہ پڑھنا شروع کیا ہے، تمھاری حالت ہی عجیب ہوگئی ہے۔ یتوریاں چڑھی ہوئی بھویں تنی ہوئی، گویا جینا وبال ہے! جسوقت تم عبا پہنے، ہاتھ میں کتاب لئے اکاڈمی جاتے ہو تو تم میرے گھر سے اس طرح گزر جاتے ہو گویا مجھ سے واقف ہی نہیں، کبھی اس گھر میں قدم رکھا ہی نہیں۔

یوتھائی ڈیمس تم پاگل ہو اور مطلق واقف نہیں کہ یہ تمھارا پروفیسر جو یقیناً تم سے عجیب وغریب باتیں کرتا ہوگا کیا چیز ہے —— مجھ سے سنو۔

ایک زمانہ سے یہ کمبخت مجھ سے ملنے کی التجائیں کر رہا تھا لیکن میں نے ہمیشہ اس کی دولت کو تم پر قربان کردیا اور اب وہ میگارا کی نوجوان کنیز پر ڈورے ڈال رہا ہے۔ لیکن چونکہ اب تم اس کے زیر اثر مجھ سے دور دور رہنا چاہتے ہو، میں اس کی التجا قبول کرلوں گی اور اگر تم پسند کرو تو یہ بھی ثابت کردوں گی کہ وہ لذتِ یک شب سے زیادہ کچھ اور بھی مجھ سے چاہتا ہے۔

کیا تم سمجھتے ہو کہ ایک پروفیسر، کسبی سے مختلف کوئی چیز ہے۔ طریقے میں اختلاف ہو تو ہو، لیکن مدعا دونوں کا وہی ایک ہے —— دولت سمیٹنا ۔ اور سچ پوچھو تو ہم کسبیاں اس سے بہتر ہیں کہ ہمارے دلوں میں خدا کا ڈر تو ہے، ہمارے چاہنے والے جب قسم کھا کر اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں تو ہم اسے باور کرلیتے ہیں —— بیشک ہمیں یہ نہیں معلوم کہ بادل کیونکر بنتے ہیں، جوہر و دقایق کی کیا حقیقت ہے، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے اس کا علم اور ہمارا جہل دونوں برابر ہیں۔

میں نے بارہا ایسے لوگوں سے باتیں کی ہیں، گھنٹوں ان کی صحبت میں صرف کئے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ جب وہ ہمارے پاس ہوتے ہیں تو دس بجے صبح سے پہلے ان کی آنکھ نہیں کھلتی اور بغیر شراب کے نوالہ نہیں توڑتے۔

میرے پیارے، یہ برہمی چھوڑ دو۔ ایسی خوبصورت آنکھوں میں جیسی تمھاری ہیں غصہ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ آجاؤ، کسی دن اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے آجاؤ، پہلے ایک دو شیشے شراب کے خالی کریں گے اور پھر دونوں ملکر سوچیں گے کہ زندگی کا مقصود کیا ہے۔

زمانہ زیادہ جینے کی بھی مہلت نہیں دیتا، لذت و مسرت کیسی، اس لئے مہلات میں بیکار وقت نہ ضایع کرو، میرے پاس آؤ، کام کی باتیں کریں۔

اطلاعنامہ بنام دائنان دربارہ ادخال درخواست بریت

(دفعہ ۴۱ (۱) ایکٹ نمبر ۵ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب بابو شیو گوپال صاحب ماتھر جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۱۳ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمی بلاقی ولد پتو قوم خاکروب ساکن مصطفےٰ منزل فراشخانہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ

بنام { گوپال ولد جے نراین گنگادھر ولد رامداس اقوام رستوگی ساکنان رستوگی ٹولہ تھانہ چوک شہر لکھنؤ بلدیو داس ولد لچھمن داس قوم رستوگی ساکن بیگم گنج تھانہ چوک شہر لکھنؤ لالہ متھری و سندر لال اقوام رستوگی ساکنان باغ مکا تھانہ چوک لکھنؤ، سندر لال قوم بقال ساکن شیوالہ بھوانا سنگھ محلہ ٹاٹ پٹی تھانہ چوک لکھنؤ و منموہن قوم رستوگی ساکن بازار کھالہ تھانہ چوک لکھنؤ }

مطلع ہو کہ دیوالیہ مذکور الصدر نے اپنی بریت کی درخواست عدالت ہذا میں گزرانی ہے اور عدالت ہذا نے سماعت درخواست کے واسطے تاریخ پانچ ماہ دسمبر ۱۹۳۵ء بوقت دس بجے دن مقرر کی ہے۔

تاریخ ۲ ماہ نومبر ۱۹۳۵ء۔

بحکم عدالت

بشمبر دیال منصرم

عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

محسن کاکوروی

پیدائش ۱۸۲۳ء ——— وفات ۱۹۰۵ء

ازل میں جب ہوئیں تقسیم نعمتیں محسن
کلام نعتیہ رکھا میری زباں کے لئے

لکھنؤ کی خوشامدانہ شاعری کا دور ناسخ کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے جس نے دنیائے ادب میں اگر مرثیہ نگاری کے بعد کوئی قابل ذکر، دیرپا کارنامہ پیش کیا ہے تو وہ یقیناً صوفیانہ شاعری اور نعت گوئی ہے۔ جس کو حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندرؒ، مولانا غلام امام شہید، مولانا امیر احمد امیر مینائی، اور حسان الہند علامہ محسن سے تعبیر کرنا کچھ بیجا نہیں ہے یہ واقعہ ہے کہ اگر غزل گوئی میں میر، صوفیانہ شاعری میں شاہ تراب علی اور مرثیہ نگاری میں میر انیس کا مقابل و مماثل دار السلطنت دہلی پیدا نہ کرسکا تو حضرت محسن کی نعت گوئی کا بھی جواب آج تک نہ ہوسکا۔ اساتذۂ دہلی نے تو خیر اس صنف سخن میں دلچسپی ہی نہ لی البتہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اساتذۂ لکھنؤ نے ضرور اس صنف کو قابل اعتنا خیال کیا جو بعد میں شاہانہ زرپاشیوں کی بدولت منقبت نگاری میں تبدیل ہوگئی۔

حضرت محسن خالص لکھنوی تھے۔ انھوں نے وطنی جوش میں عجم پرستی کی کورانہ تقلید کے ذہنی خط غلامی کے خلاف علی الاعلان پرچم بغاوت بلند کیا بلبلوں کی نغمہ سرائی اور طائف کی شب ماہ کی جگہ برسات کے جگنو اور ہندوستان کے کالے بھونروں کی موسیقی سے کام لیا۔ کنہیا جی اور گوپیوں کی عارفانہ داستان عشق، لیلیٰ مجنوں شیریں فرہاد کی فرسودہ اور پامال تمثیلات کو افسانۂ کہن بنادیا۔ اور تموج اور گنگا کی طغیانی سے جیحون اور شیحون کو گونگے کا خواب ثابت کردکھایا۔

یہی وہ ذہنی انقلاب تھا کہ محسن نے ایک انداز خاص سے اپنے خالص مذہبی قصیدے میں انوکھی وطنی تشبیب

استعمال کر کے ہمیشہ کے لئے ایک طرف تو ہندو مسلم اتحاد کا بنیادی پتھر رکھا اور دوسری جانب ان بے نظیر تلمیحات سے اپنے کلمہ گو بھائیوں کے کانوں کو آشنا کر دیا - اور واقفین رموز پر آشکارا ہو گیا کہ محسن بحیثیت وطنی شاعر کے اپنی صنف خاص میں یکتا و فرد ہیں -

---

حضرت محسن نے دور مغلیہ کے آخری عہد میں آنکھیں کھولیں - برطانوی اقتدار کی بڑھتی ہوئی تیز اقبالی شعاعوں کو فرد اکے آئینہ میں دیکھا - یا دش بخیر اودھ کے شباب کی رنگینیوں اور سرمستیوں کا بھی مطالعہ کیا اور اس سے بھی بڑھکر ہنگامۂ مشرق کے خون آشام افسانوں کو بنظر تعمق دیکھا لیکن تعجب انگیز امر تو یہ ہے کہ محسن نے خود اُن دھوپ چھاؤں کی کائنات سے ماورا اپنے لئے جو ماحول وضع کیا وہ بالکل انوکھا اور جداگانہ تھا - اُن کے اجداد آستانۂ رسول اللہ دارض مقدس سے جدا ہو کر قصبۂ صحرام توابع حوات میں جو بغداد و ممالک خراسان کے وسط میں واقع ہے آباد تھے - قاری محمد صدیق اس خاندان کے اول فرد ہیں جو ہندوستان تشریف لائے -

مولانا حسین شہید جن کے سایۂ عاطفت میں جناب محسن نے زانوئے ادب تہ کیا، اپنے والد ماجد حضرت شاہ میر محمد قلندر کے مرید اور صاحب ارشاد و اجازت تھے - عین حالت نماز میں ایک ظالم کے ہاتھوں انھوں نے جام شہادت نوش فرمایا - اور بہ برکت اسم مبارک حضرت شہید کربلا حیات جاوید پائی اور

حال رحلت شہید اکبر گشت سر دشمن بریدہ گشت تراب

سے حضرت غوث ملت شاہ تراب علی قلندر نے تاریخ شہادت نکالی -

حضرت محسن کے والد ماجد مولانا حسن مرحوم صاحب تفریح الاذکیا فی احوال الانبیا بہت بابرکت بزرگ اور عالم متبحر تھے - وہ دو با اقبال صاحبزادوں مولوی محمد محسن اور مولوی محمد احسن کو خوش و خرم اور با اقبال چھوڑ کر ۱۹ جمادی الاول ۱۳۰۱ھ کو رحلت فرما گئے -

غرض اس متبرک اور قابل تقلید فضا میں حضرت محسن نے آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت محسن کے کلام پر ان حالات کا بہت گہرا داخلی اور خارجی اثر پڑا اور جب جناب محسن کو اپنے جذبات دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہوئی تو وہ اُسی سلسلۃ الذہب کی شاہراہ پر چلنے کے لئے مجبور ہوئے اور دنیا کو بھی مذہب کی بھولی بسری ہوئی داستانیں سنائیں -

---

جناب محسن کی ولادت ۱۲۴۲ھ بمقام قصبۂ کاکوری ہوئی نظر محمد اور منظور الٰہی تاریخی نام تھے - سات سال کے سن سے اپنے جد امجد حضرت حسین شہید کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی - اُن کی ابتدائی تعلیم جس طرز

ہوئی اس کا اقتضا یہی تھا اور دانشمندان کہن سال کا تجربہ بھی پیشین گوئی کر چکا تھا کہ یہ بچہ بڑا ہوکر صاحب کمال ہوگا۔ تین چار بجے رات سے اُٹھکر نماز تہجد پڑھتے اور تلاوت کلام پاک کے بعد درود شریف اور دیگر وظایف خاندانی میں مشغول رہتے تھے۔ مذہبی عقیدت اور نبی کی محبت رگ رگ میں سرایت کرتی جاتی تھی عمر کے متجاوز ہوتے ہی شب بیداری اور یادِ حق کی عادت محمود نے طبیعت ثانیہ بنکر تمام عمر اُن کا ساتھ دیا۔

جناب محسنؔ کا نشو و نما اپنے والد حضرت ابو المحسن حسن کے ساتھ مین پوری میں ہوا۔ کتب درسیہ کا اتمام مولوی عبد الرحیم اور اپنے باکمال پدر نامدار سے کیا۔ شاعری میں مولانا ہادی علی اشک مرحوم سے مشورہ کرتے تھے اور بیعت اپنے جد امجد سے تھی۔

۱۹۰۵ء اپریل کی پانچویں تاریخ پیام مصیبت لائی یعنی حضرت محسنؔ اسہالِ کبد کے مہلک مرض میں مبتلا ہوگئے۔ اشتہا بالکل جاتی رہی۔ علاج و معالجہ سے کوئی افاقہ نہ ہوا اور طبیعت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ ۲۳ اپریل ۱۹۰۵ء روز یکشنبہ کو بعد نماز ظہر ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا آخری وقت ہے تجہیز و تکفین کی تیاری کرو کل کوچ ہے۔ اپنے بڑے صاحبزادے سے در مختار نکلوا کر باب الشہید اسنا۔ شب کو مرض میں اشتداد ہوا اور بروز دوشنبہ بتاریخ ۱۸ صفر ۱۳۲۲ھ مطابق ۲۴ اپریل ۱۹۰۵ء کو علی الصباح ارشاد فرمایا کہ اب ہمارا کوچ ہے یہ کہکر یادِ حق میں مشغول ہوگئے پاس انفاس جاری تھا۔ حالت تلقین میں ہر بار بطریق استشہاد اَللّٰہ ھُوَ پر انگشت شہادت اُٹھاتے تھے اسی حالت میں دس بجے دن کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرمائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اور صحن عیدگاہ مین پوری میں اپنی وقف کردہ زمین میں دفن کئے گئے۔

مولانا فرجاد نے کلام پاک کی ایک آیۃ سے مادۂ تاریخ نکالا۔ اور ایک تاریخ انکے بڑے صاحبزادے علامہ نور الحسن نیرؔ صاحب نور اللغات نے فارسی میں لکھی جو کتبے پر کندہ ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

اُردو کی نشو و نما سے قبل ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کا ادبی مذاق فارسی تھا۔ عدالت کی زبان فارسی تھی۔ مراسلت فارسی میں ہوتی تھی۔ شعر کا مذاق فارسی تھا۔ حتیٰ کہ داد سخن کے طریقے بھی خالص ایرانی تھے کھانے عجمی تھے۔ لباس عجمی تھے۔ اور معاشرت میں بھی ایرانی رنگ کا اثر موجود تھا۔ چنانچہ جناب محسنؔ نے بھی اسی فضا میں آنکھیں کھولیں اور ابتدائی شاعری میں ان کے یہاں بھی عجمی رنگ کافی نمایاں ہے۔ لیکن

دولت مغلیہ کے شجر اقبال میں گھن لگتے ہی قدیم دقیانوسی رنگ نے پلٹا کھایا۔ اور جناب محسن نے بھی زمانہ باتو نسازد تو بازمانہ کے مقولہ پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور خالص ہندی سماج میں ہندی ماثل کو پیش کر کے دنیائے ادب میں بقائے دوام کا اکلیل جہانبانی سر پر رکھا۔

جناب محسن میانہ قد، گندمی رنگ کے تھے اور چہرہ گول۔ اُن کے چہرہ پر چند داغ چیچک کے بھی موجود تھے مگر ایسے کہ بادی النظر میں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ اکثر داڑھی خشخشی رکھواتے اور شروع میں خضاب کرتے تھے آخر حصہ عمر میں داڑھی بڑھالی تھی اور خضاب ترک کر دیا تھا۔ برادران وطن کا خیال ہے کہ وہ ہر معاملہ میں متانت اور سنجیدگی سے کام لیتے تھے۔ ان کی آواز میں نرمی اور لوچ تھا۔ اس کے ساتھ خوش تقریر بھی تھے۔ اطاعت والدین میں آپ اپنی نظیر تھے۔ عمر بھر حضرت ابوالمحسن حسن (اپنے والد ماجد) کی رائے سے اختلاف نہیں کیا۔ ہر شخص سے بخندہ پیشانی ملتے اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ مین پوری میں جہاں وہ وکالت کرتے تھے تمام شہر بلا قید مذہب و ملت ان کا گرویدہ تھا۔ ہر شخص کے شریک رنج و راحت ہوتے اور دامے درمے۔ سخنے۔ قدمے۔ اسکی اعانت وہمدردی کرتے تھے۔ غرض جناب محسن قدیم ایشیائی تہذیب کا ایک مکمل نمونہ تھے تمام عمر ایک طرح سے نباہی اور لطف یہ تھا کہ ہر آدمی یہی سمجھتا رہا کہ ہم سے زیادہ مولانا کسی دوسرے سے دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ "شکستن دل دوستاں جہل است و کفارہ یمین سہل

جناب محسن سفید اور صاف کپڑا پسند کرتے تھے اور قیمتی ملبوسات سے ان کو تنفر تھا۔ جو شان فقر کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ اکثر اعزہ اور احباب کی خفیہ طور پر مدد کرتے رہتے تھے۔

جس چیز نے جناب محسن کو معراج کمال پر پہنچایا وہ ان کی شاعری و انشا پردازی تھی جس کا شہرہ تمام ہندوستان میں ہے۔ ان کا نعتیہ کلام ہند سے عرب و عجم تک مقبول خاص و عام ہوا اور ان کی سخن سنجی اور معجز بیانی کا نکتہ شناسوں کے قلوب پر سکہ جما۔ جناب محسن نے نعتیہ کلام سے شہرت و عزت یا شاعرانہ وقعت حاصل کرنا نہ تھا۔ اور اُن کو کسی دنیاوی صلہ کی خواہش بھی نہ تھی بس یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں خلوص۔ عقیدت۔ جلال۔ ہیبت اور محبت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ لکھنؤ اس زمانہ میں شیخ ناسخ کے دور تناسخ سے گزر رہا تھا جانعالم۔ امانت۔ مرزا شوق۔ اسیر و امیر کا آفتاب کمال نقطۂ نصف النہار پر تھا لیکن جناب محسن نے اس پریشان ماحول سے علٰحدہ اپنے لئے ایک نئی شاہراہ منتخب کی اور رسکن کی طرح انھوں نے کلام پاک اور احادیث صحیحہ سے دُرِ بے بہا چن لئے اور گل و بلبل ہجر و وصل کے پیش اُفتادہ مضامین کی جگہ اُن کے اس سینہ سے ایک کامیاب مرصع ساز کی طرح سلک شعر کیا کہ جوہریوں کو داد سخن دیتے ہی بن پڑی۔ سامعین ادب اور

سخن سنجان صوفی مشرب اس شاعری کو خلوص سے سنتے اور درود کے فلک شگاف نعروں سے مجالس کو گرماتے رہتے ہیں۔

جناب محسن کی قادر الکلامی کا بین ثبوت یہ ہے کہ بیان حکایت میں شاعرانہ شوخی، حدودِ تہذیب و متانت سے ایک قدم آگے نہیں بڑھتی۔ اور مبالغے کے استعارات صلاحیت کا جوہر اپنے ساتھ لئے رہتے ہیں جہاں کوئی امر مناسب موقع ہے اور حدیث صحیح میں اس کی تصریح نہیں تو اس کو اس انداز خاص سے پیش کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کو صاف تمیز ہو جاتی ہے کہ اس قدر مضمون جزو حدیث نہیں ہے بلکہ کلام بزبان حال ہے۔ اُن کی صدا بہار طبیعت حسرت و یاس کے مضامین سے الگ رہتی ہے۔ شگفتگی طبع اور زندہ دلی کی کہربا قوت ہر صنف بیان میں اپنی چمک دکھاتی ہے۔ مضامین کی بلند پروازی۔ الفاظ کی شان و شوکت بندشوں کی چستی انکا خاصہ طبیعت ہے۔ تشبیب و گریز توان کا حصہ ہے اور خاتمہ و مناجات میں وہ اسلوب جدید کے موجد ہیں۔ گو اس امر میں شبہ نہیں کہ جناب محسن کا کلام تلمیحات کی بنا پر عوام کی سمجھ سے باہر ہے لیکن بندش الفاظ کا سحر اپنا کام کرتا ہے اور سخن شناس اور کم استعداد دونوں طبقوں سے خراج تحسین و آفرین وصول کرتا ہے۔

جناب محسن کاکوروی نے اپنا سارا فضل و کمال مدح رسول میں صرف کر دیا اور کل زندگی نعت گوئی کیلئے وقف کردی اور حقیقتاً یہ ہے کہ اس صنف سخن میں وہ اپنے تمام معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے۔ سخن شناسوں نے ان کی سعی و ہمت پر تحسین و آفرین کے پھول نچھاور کئے، شوکت الفاظ خوبی بندش اور زور طبیعت کی داد تو اغیار نے بھی دی۔

جناب محسن کے کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے چند اُمور پیش نظر رکھنے ضروری ہیں۔ اول یہ کہ محسن کی شاعری کا آغاز اس دور میں ہوا جب شبنم شاداب، مینا بازار، پنج رقعہ اور سہ نثر ظہوری کی پرستش کیجاتی تھی۔ چنانچہ محسن پر بھی اس دور کے استعارات و مبالغہ آمیز تحریروں کا اثر پڑا چنانچہ آپ کے ابتدائی خطوط مرزا بیدل کے رقعات کا ایک رُخ معلوم ہوتے ہیں۔ غرض محسن کی خصوصیات کلام میں سب سے زیادہ قابل لحاظ ان کی صناعی اور معنی آفرینی ہے اور انھیں صنایع بدایع کے مناسب استعمال سے محسن کا کلام انکے معاصرین کی نعتیہ نظموں سے زیادہ دلکش نظر آتا ہے۔ ابتک نعت کی بے قدری کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ اُس کی زبان بیشتر عامیانہ ہوتی تھی۔ محسن نے نعتیہ مثنوی کو مثنوی غنیمت کے رنگ میں پیش کیا اور اس خشک و بے آب و گیاہ زمین میں استعارہ و ایہام کا ایسا دریا بہا دیا کہ باوجود تمام تر لکھنوی تکلف و تصنع ان کے زور طبیعت کی داد

خواہ مخواہ دینا پڑتی ہے اور یہی وہ اعجاز ہے جس نے جناب محسن کے کلام میں سحر سامری بھر دیا ہے۔
محسن کے کلیات نعت میں قصاید، مثنویاں، مسدس، رباعیاں، اور غزلیں سبھی کچھ نظر آتا ہے، لیکن قصاید میں اُن کا بہاریہ قصیدۂ لامیہ[1] بہت مقبول ہوا اور مثنویوں میں چراغ کعبہ۔ سراپا کا مسدس بھی اُن کی قوت شاعری کا بے مثل نمونہ ہے۔

چونکہ قصیدۂ لامیہ کی تشبیب بالکل انوکھی تھی اور اس میں کاشی، متھرا، گنگا جل اور گوکل وغیرہ کا ذکر تھا جو ہندو مذہب کی روایات سے مخصوص ہیں، اس لئے لوگوں کو خاص دلچسپی پیدا ہوئی اور محسن کا یہ کارنامہ بہت مشہور ہوا۔ اب ہم کہیں کہیں سے ان کے کلام کا انتخاب پیش کرتے ہیں جس سے اُن کی خصوصیات شعری پر کافی روشنی پڑتی ہے:-

مسدس سراپا یوں تو سراپا انتخاب ہے لیکن بعض بند تو قیامت کے ہیں رعایت لفظی کے ساتھ مضمون آفرینی اور زورِ بیان کے ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں:-

عالمِ نور میں چھوڑ آئے ہیں شوخے کتنے
ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے
عقد پروین سے لکھے ہم نے معمے کتنے
حل کئے غنچۂ خورشید سے نکتے کتنے
سادہ کاغذ و رق مہرِ درخشاں ہے آج
دستِ پُر نورِ عطارد میں قلمداں ہے آج

موج ہے جس سے خجل غرقِ عرق دریا ہے
یوں خرامندہ بہ شوخی قلم رعنا ہے
آہوئے شوخ ہے کیا، کبکِ خراماں کیا ہے
بالِ پروازِ پری چٹکیوں میں اُڑتا ہے
کوئی شاخ آہوؤں کی جلوہ گری میں تو نہیں
کوئی سرخاب کا پر کبک دری میں تو نہیں

رعایت لفظی کا طوفان ملاحظہ کیجئے کہ کوئی ایک مصرعہ بھی اس سے خالی نہیں لیکن باوصف اسکے روانی کا یہ عالم ہے کہ طبیعت اس سے ایک خاص سرور حاصل کرتی ہے۔
خاقانی کی طرح بعض جگہ وہ علمی اصطلاحات سے بھی استعارہ کرتے ہیں اور نہایت خوبی کے ساتھ۔ مثلاً

انبیا شرح مفصل ہیں تو متنِ مجمل
تیری صورت سے کھُلے معنی ماقل و دل

---

[1] اس کا مطلع یہ ہے:-
سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل
برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

تو ہے خورشید ترے سامنے انجم ہیں بنی　　تو ہے شمسیہ، تصوریں تو سب ہیں قطبی

ان اشعار میں علم منطق کی اصطلاحات سے کام لیا گیا ہے۔ شمسیہ اور قطبی منطق کی مشہور کتابیں ہیں۔

تشبیہات واستعارات کو کامیاب بنانے کے لئے سب سے بڑی چیز ندرت وجدت ہے اور کلام محسن میں اس کی بھی کمی نہیں، رسول اللہ کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک رگ بشکل الف نمایاں تھی اس رگ کے ساتھ ابرو اور آنکھ کو ملاکر محسن نے عجیب ندرتِ خیال سے کام لیا ہے ملاحظہ ہو:-

رگ جو کانٹا ہے تو شاہین[1] ترازو ابرو　　مردمک سنگ ہے اور پلہ ہے چشم دلجو
آنکھ پڑ جائے اگر جانب امت سرمو　　صاف رکھی رہے میزانِ قیامت یکسو
آپ پلے پہ ہمارے ہوں تو کیا کھٹکا ہے
مردم چشم کہیں ہم نے اسے تولا ہے

ترازو اور وزن کے متعلق کوئی بات باقی نہیں رکھی اور لطف یہ ہے کہ سامع یہ محسوس نہیں کر سکتا کہ ان کو قصداً استعمال کیا گیا ہے۔

چہرۂ نبوی کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو:-

روبرو آئے جو آئینہ تو اک سکتا ہو　　شمع کے بھی دھوئیں اڑ جائیں جو کچھ دعوا ہو
شامت آجائے جو خورشید کو یہ سودا ہو　　صبح ہو جائے قمر حسن پہ گر پھولا ہو
حشر برپا ہو جو کنعانی مقابل آئیں
چرخ پر سورۂ یوسف کو ملک لیجائیں

آئینہ - سکتا - شمع - دھواں - خورشید - قمر - صبح - کنعان - یوسف، الغرض کوئی رعایت لفظی ایسی نہیں جو چھوڑ دی ہو لیکن انداز بیان کی بیساختگی نے ان سب کو ایک "خوشگوار نوش" بنا دیا ہے۔

لب کی تعریف کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

لب جاں بخش کی تشبیہ دم عیسیٰ سے　　دی نہ، دم دیتے رہے گرچہ مسیحا بھی مجھے
آب حیواں نہ کہا خضر نے گو چھینٹے دئے　　اب فقط رہ گئے خورشید کے جھوٹے شوشے
کہوں یاقوت تو وہ باتیں یہاں پائیں نہیں
لعل سمجھوں اسے آنکھیں مری پتھرائیں نہیں

---

[1] شاہین ترازو اس ڈنڈی کو کہتے ہیں جس سے دونوں پلے متعلق رہتے ہیں۔

محاورات کے ساتھ لفظی رعایت کا ایسا دلکش امتزاج، "نعت" گوئی کے سلسلہ میں سوائے کلام محسن کے کہیں اور نظر نہیں آتا۔

سراپا کا آخری بند بھی ملاحظہ ہو:۔

ہے یہ امید کہ جب گرم ہو بازارِ نشور — یوں کہے بادشہ بارگہِ عالمِ نور
لو سراپا ہیں تم دو عوضِ حور و قصور — میں کہوں واہ مجھے یہ نہیں ہرگز منظور
مفت حاضر ہے۔ مگر اس کی یہ تدبیر نہیں
کھوٹے داموں بکے یوسف کی یہ تصویر نہیں

دوسرے مصرع میں باوجود توالیِ اضافات کے جو سلاست پائی جاتی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انتخابِ الفاظ کی کتنی زبردست قوت محسن کو حاصل تھی۔

مثنویوں میں ایک مثنوی صبحِ تجلی کے نام سے لکھی ہے جس میں ولادت نبوی کا بیان ہے۔ اس کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں:۔

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے — انجم کا ستارہ ڈوبتا ہے
مہتاب کی چاندنی ڈھلی ہے — مریخ کی سمت مشتری ہے

زہرہ کا سفید ہو گیا رنگ — نظم پرویں کا قافیہ تنگ

غنچے پہ ہے خامشی کا عالم — یا صومِ سکوت میں ہے مریم
کیاری ہر اک اعتکاف میں ہے — اور آبِ رواں طواف میں ہے

ہر تخم بہ خلوت آرمیدہ — ہر ایک ثمر خدا رسیدہ
سجادہ بدوش لالہ یکسو — یکسو شب زندہ دار شبو

مثنوی چراغ کعبہ بھی بالکل اسی رنگ کی ہے لیکن زیادہ طویل ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

بھیگی ہوئی رات آبرو سے — داخل ہوئی کعبہ میں وضو سے
اوڑھے ہوئے لیلیٰ گل اندام — شبنم کی ردا بہ قصدِ احرام
گویا کہ نہا کے آئی فی الحال — جھک جھک کے نچوڑتی ہوئی بال

نامحرموں سے چھپائے چہرہ ۔۔۔ پردیں کو بنائے منھ کا سہرا
آنا کھلتا ہوا نہ جانا ۔۔۔ انداز خرام صوفیانہ

جگنو کا ہوا میں یہ اشارہ ۔۔۔ ظلمت کا چمک رہا ہے تارہ
ہر باغ نثارِ روئے شبّو ۔۔۔ ہر دست شکارِ چشم آہو
ظلمت میں ہے نور کی تجلّی ۔۔۔ بکھری ہوئی طور کی ہے چوٹی
ہر قطرہ وضو کی فکر میں گم ۔۔۔ ہر ذرہ کئے ہوئے تیمم

ابرِ رحمت گھرے ہوئے ہیں ۔۔۔ کچھ رات کے دن بھرے ہوئے ہیں
شبنم کے ہے پر لگائے گلشن ۔۔۔ بلبل سے کہو کہ پکڑے دامن
ذروں کی طرح نہ دشت اُڑ جائیں ۔۔۔ دیوانوں کہیئے ہوش میں آئیں

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل ۔۔۔ کھیت اس کا بہشت، خلد جنگل
یہ پارہ فلک سے آنے والا ۔۔۔ اطلس کو کتاں بنانے والا

گوہر کو بنا دیا سمندر ۔۔۔ آئینہ کو کر دیا سکندر

کلیات میں ایک مختصر سی مثنوی "شفاعت و نجات" کے عنوان سے بھی نظر آتی ہے جس میں سرکارِ عشق سے خطاب کیا گیا ہے۔

اس کے بعض اشعار کا رنگِ تغزل ملاحظہ ہو:۔

ذرا عشق اِدھر دیکھے بھالے ہوئے ۔۔۔ قدم اے ستمگر سنبھالے ہوئے
جفا تیری چتون میں اے بیوفا ۔۔۔ سروہی سے کے قبضہ میں دستِ قضا
جو تو رہنما ہے تو رہزن ہے کون ۔۔۔ تجھے دوست سمجھیں تو دشمن ہے کون
ترے داغ سے دل میں گلکاریاں ۔۔۔ ترے دم سے آنکھوں میں چنگاریاں
برہمن کو بت بن کے دھوکا دیا ۔۔۔ بتوں کو خدا کہکے بندہ کیا
تپش مہرِ محشر کی بڑھتی ہوئی ۔۔۔ ترے حسن کی دھوپ چڑھتی ہوئی

کہاں بل، کہاں پیچ تقدیر کے یہ لٹکے ہیں زلفِ گرہ گیر کے

محسن نے رباعیاں بھی کہی ہیں اور اسی مخصوص رنگ میں مثلاً :۔

مولا کی نوازشِ نہاں کھلتی ہے عزت مری پیشِ قدسیاں کھلتی ہے
کہدو کہ ملک گوش بر آواز رہیں مداحِ پیمبر کی زباں کھلتی ہے

گو شبہ و شک مری برائی میں نہیں پر نقص تری بھی رہنمائی میں نہیں
ہے کون پیمبری میں تجھ سے بہتر مجھ سے بدتر اگر خدائی میں نہیں

ایماں کا غروب ہونے پر ماہ آیا تب دہر میں وہ سید ذیجاہ آیا
جلدی ہوئی ایسی پھر اسی عالم تک سایہ بھی حضور کے نہ ہمراہ آیا

محسن نے غزلیں بھی کہی ہیں لیکن بہت کم۔ چند اشعار اس صنفِ سخن کے بھی پیش کئے جاتے ہیں :۔

حالت نہ پوچھئے مرے شیب و شباب کی دو کروٹیں تھیں عالمِ غفلت کے خواب کی
ہونے نہ پائی خشک بھی تر دامنی مری محشر میں دھوپ ڈھلنے لگی آفتاب کی
ان کو کبھی خیال ہو میرا یہ وہم ہے جاگیں مرے نصیب یہ باتیں ہیں خواب کی

مشیر احمد علوی۔ بی۔ اے۔ کاکوروی

بہار

مولفہ الیاس احمد ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے، یا یوں سمجھئے کہ "در زبان شاعراں" حسن و عشق کی مکمل داستان ہے۔ اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قائم ہوسکتے ہیں قایم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں عنوانات سیکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک ۸؍ ضخامت ۲۳۶ صفحات۔ ملنے کا پتہ :۔ منیجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔ یو۔ پی

ڈھائی سیر آٹا

(۱)

پروائی چل رہی تھی - مولا کو بائی نے پکڑ رکھا تھا - اور آٹھ دس روز سے کام پر جانے کے قابل نہیں رہا تھا دو تین روز تک جو دو چار پیسے جمع تھے وہ خرچ ہوئے - اور پھر اُدھار پر کام چلتا رہا - دو چار روز کے بعد بنیا بھی حیلے حوالے کرنے لگا - مجبوراً ایک دن مولا ٹانگ میں ذرا آرام پاکر صبح تڑکے ٹوکری لیکر مزدوروں کی بازار گیا - کئی کاریگروں کے ساتھ کام کر چکا تھا - ان میں سے ایک نے جس کا کام لگا ہوا تھا اس کو ساتھ لے لیا - دن بھر اینٹ گارا ڈھوتا رہا - شام کو ساڑھے چار آنے پیسے ملے - جسے لیکر گھر چلا - راستہ میں ایک آنہ بنئے کو قرضہ کا ادا کیا - ایک آنہ مکان کے کرایہ کے لئے رکھ لیا - اور ایک پیسہ کل کے چبینے کے لئے بچا لیا - باقی بچے نو پیسے اس میں سے ایک پیسہ کے آلو - ایک کا باجرے کا آٹا - پانچ پیسے کے ڈیڑھ سیر چاول - اور ایک پیسے کی دال ایک پیسہ کی لکڑی لیکر ایک لمبی سی گلی میں گھس گیا - جو آگے چل کر اتنی تنگ ہو گئی تھی کہ وہاں ابھی سے اندھیرا تھا - اس گلی میں برابر برابر کئی کوٹھریاں بنی تھیں - دو ایک سے دھواں نکل رہا تھا جو ٹھنڈا ہو کر گلی میں بھر رہا تھا - مولا کی بیوی منی جس سے شادی تو نہیں ہوئی تھی مگر پندرہ برس سے تعلقات میاں بیوی ہی کے ایسے تھے - دو لڑکیاں اور دونوں سے چھوٹے لڑکے جاڑے کے مارے پاس پاس بیٹھے مولا کا انتظار کر رہے تھے سبھوں نے خوش ہو کر اس کو گھیر لیا - یہ تھکا ہوا بہت تھا، زمین پر بچھے ہوئے ٹاٹ پر لیٹ گیا - اور پوٹلی رکھ کر بولا -

"سب لیتا آیا ہوں"

بیوی چولھے کے پاس گئی، جو اسی کوٹھری میں ایک طرف بنا ہوا تھا - آگ سلگائی، اور دال چاول پکنے کو چڑھا دئے لڑکے اور لڑکیاں چولھے کو گھیر کر بیٹھ گئے اور دال پکنے کی دل خوش کن - کھدر، کھدر، سننے لگے - ان لوگوں کے لئے اس سے بہتر اور کوئی موسیقی نہیں ہو سکتی تھی -

کمرے میں سیل اور میلے کپڑوں کی بو پھیلی ہوئی تھی - اب وہاں دھواں بھی بھرنے لگا - مگر سب کی توجہ چولھے کی طرف تھی - لڑکے بھوک سے پریشان تھے اور چاہتے تھے کہ دال چاول جلد سے جلد پک جائیں -

اس لئے وہ اکثر زیادہ لکڑی چولھے میں لگا دیتے۔ یہ دیکھ کر ان کی ماں ڈانٹ دیتی۔

"کمبختو! کل کھانا کیسے پکے گا؟"

بڑی لڑکی جس کی پلکیں بال خورے نے غائب کر دی تھیں چولھے کے برابر بیٹھی مسلسل بدن کھجلاتی جاتی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد لکڑی کی ڈوئی سے دال، اور چاول نکال کر چٹکی سے ملتی۔ اس وقت لڑکے پوچھتے۔

"کتنی دیر ہے؟"

"بس تھوڑی ہی کسر اور ہے"

یہی جواب آدھ گھنٹہ تک چلتا رہا۔ مولی ایک پرانی دری اوڑھے جس میں سیکڑوں چھید تھے ٹاٹ پر خاموش لیٹا تھا تھوڑی دیر کے بعد بولا۔

جیسے نیند آ رہی ہے"

اتنے میں کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آنے لگی۔ کوئی مزدور تھا جو تاڑی پیا کرتا تھا اور اکثر اپنی بیوی کو مارتا تھا۔ جب غل غپاڑا زیادہ ہوتا تو آس پاس کے لوگ جا کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے اسوقت یہ غل سُنکر منی بولی:۔

"ان لوگوں کے یہاں روز بروز یہی رہتا ہے۔ نہ معلوم کیسے کمینے ہیں"

مولی۔ ہونہہ —— چاول گلے نہیں اب تک؟

منی نے دیکھا چاول گل گئے تھے اُتار لئے گئے۔ ہانڈی بند تھی۔ مگر اُبال میں ہانڈی کے لگروں پر کچھ چاول آ گئے تھے۔ چھوٹے لڑکے بو نے اس میں سے دو تین چاول پونچھ کر کھالئے۔ دوسرا لڑکا منو فوراً بولا۔

"ہونہہ۔ میں بھی"

اس نے اور زیادہ کھالئے۔ اس پر دونوں میں لڑائی ہونے ہی والی تھی کہ منی نے دونوں کو ڈانٹا۔

"کمبختو، ہیں ذرا صبر نہیں۔ میں کہتی ہوں ——"

تھوڑی دیر لڑکے منی کی بات پوری ہونے کے منتظر رہے۔ جب وہ کچھ نہیں بولی۔ تو پھر کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اب دال کا سب کو بہت بے صبری سے انتظار تھا۔ آخر ایک لڑکی بولی:۔

"اماں اب گھونٹ دو"

ماں نے دال کو دیکھا تو وہ تھوڑی بہت گل گئی تھی۔ اب زائد انتظار کون کرتا۔ اس نے دال گھونٹ کر نمک ڈالا اور اُتار لی۔ پھر تین تامچینی کی پلیٹیں جس کی چینی تقریباً بالکل اُڑ گئی تھی اور ایک مٹی کی رکابی سامنے رکھی پہلے ایک بڑی پلیٹ میں چاول نکالے اور اس پر دال ڈال کر مولی کے سامنے رکھ دئے۔ مولی بہت بے صبری سے کھانے لگا

سب بچے اب ٹکٹکی باندھ کر منی کے ہاتھوں کی حرکت دیکھ رہے تھے - اس نے مٹی کی تھالی میں چاول دال نکال کر دونوں لڑکیوں کو دئے اور پھر تامچینی کی دونوں پلیٹوں میں برابر برابر چاول نکالے - اس پر دال ڈالی

ببو — "منو کی پلیٹ میں اتنا اور ہماری پلیٹ میں اتنا"

منی نے تھوڑی سی دال اس کی پلیٹ میں اور ڈالدی -

منو — "اماں ہم بھی"

ماں نے دو چار چاول اس کی پلیٹ میں بھی ڈالدئے - اور پھر باقی چاولوں کو دال کی ہانڈی میں اُلٹ کر خود کھانے لگی - ابھی چولھے میں کچھ کوئلے باقی تھے جن کی ہلکی ہلکی روشنی میں ان لوگوں کے چہرے اور چلتے ہوئے منھ دکھائی دے رہے تھے - چھوٹے لڑکے کھاتے جاتے اور پلیٹ کی طرف دیکھ کر اندازہ کرتے جاتے کہ ابھی اتنا اور ہے، اتنا اور ہے - آخر منو اپنی پلیٹ پوچھ کر بولا -

"بس — کھا چکے -"

مولی بھی چاول ختم کر چکا اور بولا -

"چاولوں میں خدا نے بڑی برکت دی ہے - ذرا سے کھالو اور پیٹ بھر گیا - اور روٹی کا یہ ہے کہ سیر بھر آٹے کی ہو تو کچھ نہیں - اور دو سیر ہو تو کچھ نہیں -"

ببو — "اماں! صبح کو کیا پکے گا؟"

منی — "میں کہتی ہوں ان لوگوں کی نیت کبھی نہیں بھرتی - ابھی کھا چکا ہے - اب پوچھ رہا ہے کل کیا پکے گا -"

منی نے بانس کے پلنگ کے نیچے سے جو کوٹھری کا چوتھائی حصہ گھیرے ہوئے تھا ایک پاندان نکالا - جس کا پیندا گھس گیا تھا - اور سب کلھیاں ایک دفتی پر رکھی ہوئی تھیں - یہ پاندان منی کی ماں کا تھا اور اس کو بہت عزیز تھا - ہمیشہ سوچا کرتی تھی کہ میں کسی گھر میں اوپر کا کام کاج کرنے کو نوکر ہو جاؤں تو سب سے پہلے اسی کو ٹھیک کراؤں گی منی نے ایک پان کے چار ٹکڑے کئے ایک خود کھایا - ایک مولا کو دیا اور دو دونوں لڑکیوں کو - پھر کوٹھری کے بیچ میں ایک ٹاٹ کا پردہ ڈالدیا گیا جس سے اس کے دو حصے ہو گئے - ایک طرف پلنگ ہو گیا - اور دوسری طرف ٹاٹ کا فرش - پلنگ پر منی اور مولی لیٹ گئے - اور ٹاٹ پر دونوں لڑکے اور دونوں لڑکیاں - سردی تیز ہو گئی تھی - مولی اور منی نے تو یہی دری اوڑھ لی - اور لڑکوں اور لڑکیوں نے بھی کسی نے موٹی چادر، اور کسی نے ٹاٹ کا ٹکڑا ادھر اُدھر اکرا اوڑھ لیا - اور پھر چڑیا کے بچوں کی طرح ایکدوسرے سے چپک کر لیٹ رہے - کوٹھری کے دروازے سے ٹھنڈی ہوا آرہی تھی، اس لئے مولا نے اُٹھکر اس کو بند کر دیا ہوا کی آمد و رفت بند ہو گئی، اور کوٹھری میں حبس کی وجہ سے گرمی ہو گئی - تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد منی بولی -

"آج منشی جی پھر آئے تھے - اور کہہ گئے ہیں کہ نواب صاحب نے حکم دیدیا ہے کہ جس پر کرایہ چڑھا ہو اس سے کوٹھری فوراً خالی کرا لو"

مولا - "نکالدیں گے - نکالدیں گے - جب سنو یہی ہے - آئیں - آکر نکالیں - ہم جاڑوں میں بچوں کو لیکر کہاں جائیں - ہوا کریں وہ بڑے آدمی - ہم تو نہیں نکلیں گے - کہدو جب کرایہ جمع ہو جائے گا دیدیں گے - ضرور دیں گے مر جائیں تو بات دوسری ہے - بڑے آئے ہیں نکالنے والے"

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی ہو گئی - پھر مولا بولا -

منشی جی کے یہاں کی نوکری کا پتہ چلا -

منی - "وہ کہتے ہیں چھوٹی لڑکی سے میرا کام نہیں چلے گا - ایسی لڑکی ہو جو جھاڑو بہارو کرے، اور دو گھڑے پانی اٹھا کے رکھدے" اس کے بعد منی ذرا رکی پھر آواز نیچی کرکے بولی :-

"میں کہتی ہوں کہ جوان لڑکی کو کیسے بھیجدوں - اس موئی کا بھی دیدہ ہوائی ہے - پانی بھرنے جاتی ہے تو ٹھٹھا کرتی ہوئی"

مولا - "جائے گی تو حرامزادی اپنے سے جائے گی - ایک چلی گئی تو کیا کر لیا ؟ لڑکا ہوتی تو چار آنہ روز کما لاتی"

مولا کی بڑی لڑکی بھاگ گئی تھی - اور سال بھر سے پتہ نہیں تھا -

منی - "کر کیا لیا ؟ موئی تھی ہی ایسی - ایسی نہ ہوتی تو جاتی کیوں ؟ لڑکے کب اچھے نکلتے ہیں ؟ کس نے لا کر ماں باپ کو کھلایا ہے ؟ اِدھر کمانے کے قابل ہوئے، اُدھر چلدئے - بھورے کو دیکھو - ٹھیلہ چلاتا ہے - دس آنے روز پاتا ہے اور سب اُڑا دیتا ہے"

منی ایک ٹھنڈی سانس بھر کر خاموش ہو گئی - اور پھر مستقل خاموشی چھا گئی - جس کو کبھی کبھی ان لوگوں کی کھانسی کی آواز برطرف کر دیتی تھی - ابھی آٹھ ہی بجے تھے، اور بازار میں چہل پہل تھی - مگر یہاں سوتا پڑ گیا -

(۲)

صبح جب مولا کی آنکھ کھلی تو اس نے منی کو جاگتا پایا - پانچ منٹ تک پلنگ پر پڑا رہا - پھر کراہتا ہوا اُٹھا، اور بولا -

"سردی کے مارے جان نکلی جاتی ہے - بدن جیسے تختہ ہو گیا - بیڑی کہاں ہے ؟"

منی نے اُٹھکر ایک کونے سے ایک بیڑی کا بنڈل اور دیا سلائی کی ڈبیہ نکال کر دی - مولا نے ایک بیڑی سلگائی اور پینے لگا اور بیڑی جب تک چٹکی سے پکڑنے کے قابل رہی اس نے ہاتھ سے نہیں چھوڑی - پھر پلنگ سے اُٹھا، اور لوٹا لیکر باہر چلا گیا - پندرہ منٹ کے بعد سردی سے کانپتا ہوا اندر آیا - اور لوٹا رکھکر بولا

"ایک بیڑی اور۔ اتنا دن چڑھ آیا، دھوپ کا پتہ نہیں۔"

مولی نے ایک بیڑی اور سلگائی۔ پھر ٹوکری اُٹھا کر بیڑی پیتا ہوا باہر چلا گیا۔

مولی کے جانے کے دو گھنٹہ بعد منی لڑکوں، اور لڑکیوں کو لیکر باہر نکلی۔ اور کوٹھری میں کنڈی لگا کر ٹہلنے چلی۔ کچھ دور پر دوسرے مزدوروں کی عورتیں دھوپ میں بیٹھی بک بک کر رہی تھیں، یہ جا کر اس میں شریک ہوگئی۔ لڑکے اور چھوٹی لڑکی آنکھ بچا کر اِدھر اُدھر ہو رہے۔

تین چار گھنٹے کے بعد منو آیا اور ماں سے کہنے لگا:۔

"ماں رے! بھوک لگی ہے۔"

منی ویسے ہی باتوں میں مشغول رہی۔ گویا یہ سننے والی بات ہی نہ تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد بو آیا اور اس نے بھی اسی فقرے کو سنایا۔ مگر اس نے ادھر بھی توجہ نہ کی۔ اسوقت وہ کسی شریف گھرانے کے گھر کی عورتوں کی بدچلنی بہت جوش و خروش سے بیان کر رہی تھی۔ اس جوش میں یہ فخر پوشیدہ تھا "گو چھوٹی ذات سہی۔ مگر میں ایسی نہیں ہوں۔" تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک لڑکا۔ یا دونوں کے دونوں، اپنی صدا لگا دیتے اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔ اب چھوٹی لڑکی بھی کہیں سے آئی اور ماں کے پاس بیٹھ گئی پھر چپکے سے بولی۔

"اماں چلو۔"

منی۔ "ابھی سویرا ہے۔ ذرا ٹھیرو"

دس منٹ اور گزرے اب تو بو ماں کا کندھا پکڑ کر کھڑا ہوگیا، اور رونی آواز سے رٹ لگا دی۔

"کھانا دو ۔ کھانا دو ۔ کھانا دو"

منی تھوڑی دیر تک یہ ریں ریں سنتی رہی۔ پھر اس کو ڈانٹ دیا۔ جس پر بو بھوں بھوں رونے لگا۔ آخر یہ بڑبڑاتی ہوئی اُٹھی۔

"میں کہتی ہوں ۔ یہ سب غارت ہوں ۔ یا میں غارت ہوں ۔ زندگی دوبھر ہے موئی۔"

منی نے کوٹھری میں آکر آگ سلگائی۔ اور باجرے کے آٹے کی پانچ ٹکلیاں پکائیں۔ دو چھوٹی، اور تین بڑی ان پر ذرا ذرا سا گڑ رکھ کر چھوٹی دونوں لڑکوں کو دیں اور بڑی خود لی اور دونوں لڑکیوں کو دیں۔ ان لوگوں کا کھانا تین چار منٹ کے اندر ہی اندر ختم ہوگیا۔ اور پھر یہ سب لوگ گھومنے چلے گئے۔

شام کو مولی جب مزدوری کے پیسے لئے پلٹ رہا تھا تو اس کی نگاہ گلی کے کونے پر پڑی۔ دیکھا تو دو، ڈھائی سیر آٹا یوں ہی پڑا ہوا ہے۔ اس نے قریب جا کر آٹے کو چٹکی میں اُٹھایا۔ گویا یہ یقین کرنا چاہتا ہے کہ آنکھیں دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں۔ جب یقین آگیا تو متحیر کھڑا رہ گیا۔ دل کہتا تھا کہ اُٹھا لے چلو۔ مگر ایک تو یہ ڈر کہ شاید

کوئی کچھ کہے۔ اور دوسری یہ جھجھک کہ اس کے ساتھی مزدور بھی پیچھے آرہے ہوں گے۔ اگر وہ مجھے آٹا اٹھاتے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔ آخر آٹا اٹھانے کی ہمت نہیں پڑی اور یہ چل کھڑا ہوا۔ مگر ہر قدم پر رفتار سست ہوتی جاتی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہی قدم پہونچکر بھونچکا سا کھڑا ہو گیا۔ جیسے چوراہے پر پہونچکر راستہ بھول گیا ہو یہ سوچ رہا تھا کہ کوئی دوسرا مزدور اس آٹے کو ضرور اٹھا لیگا۔ مجھے نہیں ملے گا اور اس کو مل جائے گا۔ رفتہ رفتہ یہ خیال اتنا گہرا ہو گیا کہ مولا خیالی آٹا اٹھانے والے مزدور کو حد سے زیادہ رشک کی نگاہوں سے دیکھنے لگا اور یہ سوچتا ہوا آٹے کی طرف واپس آیا۔ بلا سے کوئی ہنسے گا، تو ہنس لے گا۔ بیوی بچے تو آٹا پاکر خوش ہو جائیں گے مولی کے قدم اتنے جوانمردی سے آٹے کی طرف بڑھ رہے تھے گویا وہ کسی ڈوبتے ہوئے لڑکے کو دریا سے نکالنے جا رہا ہے آٹے کے پاس پہونچکر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ اپنا انگوچھا پھیلا دیا۔ اور آٹا اٹھانے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ بڑبڑاتا جاتا تھا۔

"کیا لوگ ہیں! اناج اس طرح پھینک دیا۔ پیروں تلے الگ آئے۔ نالی میں الگ جائے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ مرغی چرغی کھا لیتیں۔

جس بات کا ڈر تھا وہی ہوئی۔ پانچ چھ مزدوروں کی ایک ٹولی پاس سے گزری۔ اور یہ عجیب تماشا دیکھکر تین چار مزدور کھڑے ہو گئے۔

ایک۔ "کیا مل گیا مولی"

مولی۔ "کچھ نہیں۔ خراب آٹا ہے۔ مگر ہے تو اناج۔ پیروں تلے آرہا تھا۔ میں نے کہا مرغی بکری کھالیں تو سوارت ہو جائے"

دوسرا۔ "کیا گلی کی پڑی ہوئی چیز! کہیں نظر گزر نہ ہو"

پہلا۔ "اٹھالے۔ اٹھالے۔ اس کو بکنے دے۔ کام آجائے گا"

مولی۔ گردن جھکائے اپنے کام میں مشغول رہا۔ یہ لوگ چل کھڑے ہوئے۔ کچھ ہی دور پہونچکر ایک مزدور نے تان لگائی:۔

"سو سے برا تو ایک سے بہتر بنا دیا"

دوسرا اس کے تان ہی کی اثنا میں بولا۔

"غریب سہی، مگر ہم گلی سے گرا پڑا نہیں اٹھاتے"

یہ مزدور بڑائی کی لے رہے تھے۔ مگر حقیقت میں ان میں سے ہر ایک کو مولی کی اس خوش نصیبی پر کہ اتنا آٹا یوں ہی پڑا مل گیا رشک و حسد ہو رہا تھا ——— اس آٹے کا بھی عجیب قصہ ہوا۔

(۳)

دس بجنے کے قریب تھے، مگر کھانا ابھی تک تیار نہیں ہوا تھا۔ شوکت میاں اسکول جانے کو تیار ہو رہے تھے۔ ان کی پھوپھی نے جلدی جلدی دو چار روٹیاں ڈلوادیں اور چار کباب تلمدئے۔ جلدی سے ان کو میز پر چُن کر شوکت میاں کو کھانے کے لئے آواز دی، شوکت میاں ایک ہاتھ میں کتابیں لئے دوسرے ہاتھ سے شیروانی کے بٹن لگاتے کھانے کے کمرے میں گھس گئے۔ اور بلا ہاتھ دھوئے کھانا شروع کر دیا۔ مگر پہلا ہی نوالہ منہ میں رکھا تھا کہ ایسا منہ بگاڑ لیا گویا کونین پی گئے ہوں۔ جلدی سے وہ نوالہ پانی کے سہارے پیٹ میں پہونچا دیا، اور پھر روٹی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ چبایا۔ اور پھر منہ بگاڑ کر بولے۔

"پھوپھی جان! آٹا خراب ہے"

"آٹا خراب ہے!! کیا؟"

"شاید اکرا گیا"

پھوپھی نے بھی روٹی کا ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا۔ اور پھر بولیں:۔

"تمھاری باتیں!" اکرا کیا گیا۔ کچھ روٹیاں جلدی پکنے سے دھواں گئیں"

شوکت میاں نے کچھ جواب نہیں دیا۔ جلدی سے کتابیں اُٹھا کر بھاگتے ہوئے باہر چلے گئے۔

بیگم صاحبہ دھوپ میں بیٹھی کچھ سی رہی تھیں۔ اپنے بیٹے کو اتنی جلدی کھانے کے کمرے سے نکلتے دیکھ کر بولیں:۔

"کیا بات ہے؟"

شوکت میاں کی پھوپھی ـ "کچھ نہیں۔ ذرا روٹیاں دھواں گئیں"

بیگم صاحبہ ــ "میری سمجھ میں نہیں آتا، شوکت میاں کب تک فاقے سے اسکول جاتے رہیں گے۔ ذرا روٹیاں میں تو دیکھوں!"

شوکت میاں کی پھوپھی ایک پلیٹ میں روٹی رکھ کر سامنے لائیں۔ بیگم صاحبہ نے ذرا سا ٹکڑا منہ میں رکھا اور بولیں:۔

"یہ دھواں گئیں ہیں۔ میں کہتی ہوں بہن تم کو کب عقل آئے گی۔" اکرایا ہوا آٹا میرے بچے کے سامنے رکھدیا۔ جہاں میں ذرا غافل ہوئی بس دلدّر پنا ہونے لگتا ہے"

اس فقرہ کا نشانا پھوپھی تھیں۔ یہ بیچاری بجو میاں کے باپ کی خالہ زاد بہن تھیں۔ دس برس ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں اور ان کا یا ان کی لڑکی کا بجز اسی گھر کے اور کوئی سہارا نہیں تھا۔ بظاہر تو یہ ایک

غریب بہن کی طرح رکھی جاتی تھیں۔ مگر حقیقت میں یہ "صدر ماما" یا نوکروں کے انچارج کی خدمات انجام دیتی تھیں۔ اور ہر قسم کی بدنظمی کی براہ راست ذمہ دار تھیں۔ بیگم صاحبہ کا الزام سن کر بولیں:۔

"اے میں نے تو بھلے کی سوچی تھی۔ چھوٹی مٹکی میں آٹا تھا میں نے کہا یہ کیوں پڑا رہے۔ کام ہی آجائے"

"یہ نہ ہوا کر دیکھ لیتیں آٹا ہے کیسا؟ وہ تو روٹی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے —— خیراتن"

ان کی آواز پچیس گز کا فاصلہ طے کر کے اسی کڑک سے باورچی خانے پہونچی۔

خیراتن "—— جی بیگم صاحبہ —— پکار رہی ہوں"

"سب آٹا نالی میں پھینکدے۔ بڑے لگڑے سے آٹا نکال کر پکا"

شوکت میاں کی پھوپھی اس حکم کی تعمیل کرانے دوڑیں اور باورچی خانے میں آکر بڑبڑانے لگیں۔

"نالی میں پھینک دو۔ نالی میں پھینک دو۔ سچ ہے کہ جب چیز ہوتی ہے تو اس کی قدر نہیں ہوتی اناج بڑی چیز ہے بہن! بڑی چیز"

خیراتن ۔ "ہاں گندھا گندھایا آٹا۔ سب محنت اکارت"

"تم پھیکو دیکھو نہیں۔ لیتی جاؤ بکری کو کھلا دینا۔ ہاں، اور دیکھو مٹکی میں ابھی ڈھائی دو سیر آٹا اور ہوگا دو آنے دس پیسے کا مال ہے۔ وہ بھی تم لیتی جاؤ۔ میں پھکوا کر کیا کروں گی"

خیراتن چاہتی تو تھی کہ آٹا لیجائے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ پھوپھی مری، بچھیا برہمن کے نام کر کے احسان کرنا چاہتی ہیں، بولی:۔

"ہاں، آٹا لیجا کر کسی کونے میں ڈالدوں گی۔ پیروں تلے نہ آئے۔ اب ہے یہ کس کام کا"

پھوپھی نے اس ڈر سے زیادہ باتیں نہیں کہیں کہ کہیں خیراتن آٹا لیجانے سے بالکل ہی انکار نہ کر دے۔ اور اس طرح ذرا ظہور احسان کرنے کا جو موقع مل رہا ہے وہ بھی ہاتھ سے نکل جائے۔ فوراً کوٹھری کے اندر جا کر آٹا اپنے ایک میلے ڈوپٹے میں باندھ لائیں اور بولیں:۔

"ذرا ڈوپٹہ کا خیال رکھنا۔ پھٹنے نہ پائے۔ اور شام ہی کو اپنے ساتھ لیتی آنا"

خیراتن نے پوٹلی کی طرف ایک نظر ڈالی، اور پھر کام میں مشغول ہو گئی۔ جب گھر جانے لگی تو بچی ہوئی روٹیاں۔ گوندھا ہوا آٹا اور آٹے کی پوٹلی سب سامان لیکر گھر آئی۔ خیراتن کی بڑی لڑکی نے، جو شوہر سے لڑائی ہونے کی وجہ سے مستقل ماں کے پاس رہتی تھی۔ اس سامان کا حال پوچھا۔ جب خیراتن نے قصہ بیان کیا تو اس نے روٹی چکھی اور پھر بولی:۔

"کھانے کے قابل نہیں۔ کڑوا ہو گیا"

"بکری کھالیگی"

"اس کا دودھ نہ گھٹ جائے گا"

خیراتن نے اٹھکر روٹیاں بکری کے سامنے ڈالدیں۔ اس نے ایک روٹی تو کھالی۔ مگر اس کے بعد منھ ہٹالیا۔ پھران لوگوں نے لاکھ چمکارا گر وہ ادھر متوجہ بھی نہیں ہوئی۔ اور ادھر متوجہ کیسے ہوتی۔ وہ تو بیگم کے یہاں کے بچے کھچے مرغن کھانوں پر پلی تھی۔ اسوقت بھی اسی سے پیٹ بھرا تھا۔

اب خیراتن سوچ میں پڑگئی کہ آٹے کا مصرف کیا ہو۔ بیٹی نے تجویز پیش کی۔

"دُلارے کی نظر اُتار کر چوراہے پر ڈالدو"

یہ تجویز معقول تھی۔ اگر آدھ سیر تک آٹا ہوتا تو اس پر ضرور عمل کیا جاتا۔ مگر اکدم سے ڈھائی سیر آٹا اس طرح پھینکنے پر خیراتن کے دل نے گواہی نہیں دی۔

رات کو جب خیراتن کام کاج سے واپس آئی۔ اور اطمینان سے کھانا کھاکر لیٹی تو یہ مسئلہ اُٹھا کر آٹے کا کیا ہو۔ دوست اور عزیزوں کی فہرست دہرائی۔ مگر کوئی کام آتا شخص نظر نہ آیا۔ صبح کو ایک فقیر نے صدا لگائی، خیراتن نے موقع غنیمت جانا اور فوراً باہر آٹا نکال کر بھیک دینے لگی۔ مگر فقیر تھا شہر کا۔ آٹا دیکھ کر بولا:۔

"مائی فقیر کو خراب چیز نہ دیا کر۔ اللہ بھلا کرے"

یہ کہکر چلتا ہوا۔ خیراتن آٹا لئے بڑبڑاتی اندر آئی۔

"موئے۔ موئے فقیر۔ بھیک مانگنے چلے ہیں"

اب پھر وہی مسئلہ۔ آٹے کا کیا ہو؟ سہ پہر کو ایک عورت دو بچوں کو ساتھ لئے ان کے گھر میں آئی۔ اور اس نے اپنی کتھا یوں سنائی۔ میں کوئٹہ کی رہنے والی ہوں۔ زلزلے میں میرا سب کچھ تباہ ہوگیا۔ میرے باغات تھے۔ بڑے بڑے مکانات تھے شوہر اور لڑکے تھے۔ مگر سب تباہ ہوگئے۔ اور میں دکھیا در بدر گھوم رہی ہوں۔

خیراتن کو اور اس کی بیٹی کو ان تینوں کے حال پر بڑا ترس آیا۔ اور سب آٹا اُٹھا کر یک مشت ان لوگوں کو دیدیا ــــ وہ عورت غریب آدمیوں سے خلاف توقع اتنا آٹا پاکر متعجب ہوئی۔ مگر عورت تھی، ان عورتوں کے خلوص میں اسکو شک ہوا۔ ذرا دور گلی میں جاکر اس نے پوٹلی کھولی۔ جب حقیقت معلوم ہوئی تو خوب بڑبڑائی۔ کوسنے دئے اور آٹا گلی میں ڈالکر چلتی ہوئی۔ اس کو خراب آٹے کی کیا پروا تھی۔ اس کی جیب میں آج کی تحصیل وصول کے روپیہ کھنک رہے تھے

(۴)

شام کے وقت منی موئی کا انتظار کر رہی تھی۔ اور ببو اس کے کندھے سے لگا ریں ریں کر رہا تھا۔

"اماں بھوک لگی ــــ اماں بھوک لگی"

منی — دوپہر کو تھیں اور منو کو برابر کی ٹکیاں دی تھیں۔ دیکھو وہ کہاں روتا ہے۔

منو ایک لال لنگوٹے کا پھٹا کاغذ سر پر لپیٹے۔ ایک لکڑی ہاتھ میں لئے سپاہی بنا ٹہل رہا تھا۔ یہ سنکر بولا:-

"اماں کل اور کم دینا۔ تب بھی ہم نہیں روئیں گے۔"

منی — اب بتا ببو — وہ دیکھو کتنا اچھا لڑکا ہے"

ببو غیرت میں آکر خاموش ہو گیا۔ مگر پھر تھوڑی دیر کے بعد ویسی ہی ریں ریں کرنے لگا۔ اب منی کہنے لگی:-

"رو نہیں۔ دیکھو وہ آتے ہوں گے۔ اور تمھارے لئے چیز لاتے ہوں گے۔"

اتنے میں مولا آٹے کا پوٹلا لئے ہوئے کوٹھری میں داخل ہوا۔ منی نے پوٹلا کھولا۔ اور دیکھکر حیرت سے بولی:-

"گیہوں کا آٹا!! کہاں ملا؟"

جب سے مولا بیمار تھا ان لوگوں نے گیہوں کی روٹی نہیں کھائی تھی۔ اسے دیکھکر سب خوش ہوئے۔

مولا — "مل گیا — دیکھو کتنا ہے!"

منی دوڑ کر کہیں سے ترازو مانگ لائی۔ اور آٹا تولنے کے لئے بیٹھی۔ ایک سیر تولا۔ اور اس کو ایک اور کپڑے میں رکھدیا۔ پھر دوسری بار ترازو بھرا۔ نتیجہ دیکھنے کو سب انتہائی ذوق و شوق سے منتظر تھے جیسے لڑکے اسکول میں امتحان کا نتیجہ سننے کے منتظر کھڑے ہوتے ہیں۔ آخر منی بولی:-

"سوا دو سیر سے کم نہ ہو گا۔ کتنا اچھا آٹا ہے۔ چل چھوکری۔ دیکھ اس کے گیہوں چن۔ پہلے چراغ جلا۔ اندھیرا بہت ہے۔"

ایک لڑکی نے دوڑ کر ایک میلی سی لالٹین اُٹھا کر جلائی۔ اور پھر دونوں بیٹھ کر گھن چننے لگیں۔ دونوں چھوٹے لڑکے غل مچانے لگے۔

"گیہوں کا آٹا — گیہوں کا آٹا"

منی تھوڑی دیر چپ رہی۔ پھر چلا کر بولی:-

"چپ رہو کمبختو۔ کان پھاڑے ڈالتے ہو۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک چھوٹی لڑکی کے کھانسنے کی آواز۔ یا بڑی لڑکی کے بدن کھجلانے کی کھر کھر کے اور کوئی آواز نہ تھی۔ پانچ منٹ کے بعد منی نے حکم سنایا۔

"بس اب صاف ہو گیا۔ آدھا آٹا کل کے لئے رکھ دو۔"

منولی — "اب رکھو گی کیا۔ آج ہی پکا لو۔ سب جی بھر کر کھا لیں۔"

دونوں لڑکے — "ہاں — ہاں — میری اماں۔"

منی آٹا گوندھنے لگی - آٹے میں اب بھی گھن موجود تھے - گوندھنے میں اس کو کچھ شک ہوا - اس نے ٹکا نکالکر چکھا - پھر ذرا منھ بنا کر بولی :-

نمک ڈال کر پکانے والا ہے دو پیسے کا تیل لے آؤ تو آج پوریاں پکیں - دو پیسے کے آلو بھی لاؤ - ذرا جا کر بقانی کے یہاں سے کڑھائی تو لانا -

دونوں لڑکے بیتابانہ کڑھائی لینے دوڑے - پیچھے پیچھے چھوٹی لڑکی چلی - مولا بنیئے کے یہاں سامان خریدنے لگا - منی نے آٹا گوندھ کر رکھا - اتنے میں لڑکی کڑھائی لئے آپہونچی اور پیچھے پیچھے دونوں لڑکے چیختے ہوئے آئے -

"ہم لیجائیں گے ہم لیجائیں گے"

منی نے کوٹھری کے باہر نکل کر کڑھائی مانجی - مولا لکڑی وغیرہ لیکر آیا - لڑکیوں نے آگ بنائی - سب لڑکے چولھا گھیر کر بیٹھے - کڑھائی چڑھائی گئی - منی نے ایک مٹی کی رکابی میں ایک بڑی سی روٹی بڑھائی - کڑھائی میں دو قطرے تیل ڈالا - جب وہ کڑکڑانے لگا تو اس نے روٹی ڈالدی - وہ چرسے بولی - تیل کی بو کمرے میں پھیل گئی - لڑکے کھانسنے لگے - پوریاں پکتے دیکھ کر سب کے چہروں پر بحالی آگئی -

منو - "اہاہا کیسی اچھی خوشبو نکلی"

منی نے روٹی دوسری طرف الٹی -

منو - کیسی لال لال - اماں یہ ہم کھائیں گے"

ببو - نہیں ہم --- ہم -

منی نے پوری اتاری - پھر کڑھائی میں دو قطرے ٹپکائے - اور دوسری پوری ڈالی - اسی طرح اس نے ایک گھنٹہ میں دھیمی دھیمی آنچ میں سب پوریاں نکال لیں - کھانے میں بہت دیر ہو گئی تھی - مگر خوشی میں کسی کو محسوس نہیں ہوا - پوریاں پکا کر منی چلائی :-

"ارے آلو لاؤ - آلو لاؤ - کسی نے ابھی تک کاٹے ہی نہیں - میں کہتی ہوں یہ چھوکریاں کسی کام کی نہیں - سب کھڑی تماشا دیکھ رہی ہیں"

جلدی جلدی آلو کے پتلے پتلے قتلے کاٹے گئے - اور پھر کڑھائی میں پکانے کے لئے چڑھا دئے گئے - یہ انتظار بیشک کھل گیا - سب خاموش بیٹھے رہے - صرف کھانسی کی آواز اسکو توڑ دیتی تھی - آخر آلو تیار ہو گئے - تیار کیا ہو گئے، ذرا ملائم پڑ گئے - منی نے پلیٹیں نکالیں - اور سب میں دو دو پوریاں اور ان پر تھوڑے تھوڑے آلو رکھکر سب کے سامنے بڑھا دئے - اب جو ان لوگوں نے خیال کیا تو ببو سو رہا تھا -

منی۔ ”ببو اُٹھ، اُٹھ، دیکھ پوریاں تیار ہوگئیں“

لڑکیاں۔ اے ببو۔ ببو۔

ببو آنکھیں ملتا ہوا اُٹھا اور رونے کی نیت سے پورا منھ کھولکر ایک چیخ لگائی۔ مگر ابھی چیخ پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس کی نگاہ پوریوں پر پڑگئی۔ جس کو دیکھکر رونا بھول گیا ـــــ سب ہنس ہنس کر پوریاں کھانے لگے۔

منو۔ ”اہاہا۔ کتنی مزے کی ہیں“

چھوٹی لڑکی۔ ”اماں! سالن ہوتا“

بڑی لڑکی۔ ”ہاں! اور پلاؤ متنجن نہوتا۔ گدھی“

پھر خاموشی ہوگئی۔ یہ لوگ خوب مزے لیلیکر کھارہے تھے جس سے اچھا خاصہ شور پیدا ہوگیا تھا جب پوریاں ختم ہوگئیں تو منی نے آدھی آدھی سب کو اور دیں۔ اور پھر خود بھی لی۔ مولی نے آٹا ملنے کا قصہ بیان کیا۔ اس پر منی بولی:۔ یہ بھی خدا کی دین ہے۔ میں ببو سے کہہ رہی تھی کہ آج ابا چیز لاتے ہوں گے۔

ببو۔ ”اماں ہم گرما گرم پوری والے بنیں گے۔ اور خوب پوریاں کھائیں گے“

منو۔ ”ہم سپاہی بنیں گے۔ سب کو پکڑ پکڑ کر جیل خانے بھیجا کریں گے“

ببو۔ ”ہم تم کو پوریاں نہیں دیں گے۔

منو۔ ہم تم کو خوب پیٹیں گے۔ اور پکڑ کر تھانے میں بند کردیں گے۔

ببو۔ ہم ـــ ہم تم کو ـــ

ببو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے۔ اس نے منو کا منھ چڑھا دیا۔ اس پر منو نے ایک گھونسا رسید کیا مولا نے دونوں کو ڈانٹا ـــ ”کمبختو! آج تو خوب ٹھونس ٹھونس کر کھایا ہے۔ آج تو چپ رہو“

دونوں خاموش ہوگئے۔ مولا بولا:۔ ”خدا اب روز پیٹ بھردے“

جب یہ لوگ سونے لیٹے تو ببو بولا:۔

”اماں! کہانی کہو“

لڑکیاں۔ ”ہاں، ہاں۔ بادشاہزادے والی“

منی کی بھی طبیعت آج موزوں تھی۔ وہ کہنے لگی:۔

”ایک تھا بادشاہ ـــ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ـــــــــــــــــــ“

محمد حیات اللہ انصاری۔ بی۔ اے (علیگ)

باب المراسلۃ والمناظرہ

مذہب کی کورانہ تقلید

(جناب مشتاق حسین صاحب۔ وکیل ہائیکورٹ۔ لشکر)

ذریعہ ہذا ایک مضمون آپ کو ارسال کرتا ہوں۔ امید کہ اُس کا جواب بذریعہ نگار عطاء فرمایا جائیگا۔ ممکن ہے کہ مضمون مرسلہ اُس معیار پر پورا نہ اُترے۔ جو آپ نے نگار کیلئے مخصوص کر رکھا ہے۔ لیکن عرصہ تک نگار کا مطالعہ کرنے کے بعد میرے دل میں جو شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہیں۔ میں ان کا ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ یا بالفاظ دیگر اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ آپ اس کا جواب معقول عنایت فرمادیں گے۔

میں رسالہ نگار کا تاریخ اجراء رسالہ سے مسلسل مطالعہ کر رہا ہوں۔ ابتک مذہب اسلام کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ اور مذہب کے بارہ میں آپ کی جو رائے ہے وہ کوئی پوشیدہ امر نہیں ہے۔ میں یہ بحث تو کرنا نہیں چاہتا کہ آپ نے معتقدات و مذہبی جذبات کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا ہے۔ وہ صحیح ہے یا غلط۔ لیکن آپ سے یہ معلوم کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ اگر تمام رسم ورواج واعتقادات واصول داذعان کو آج خیرباد کہدیا جاوے۔ اور بقول آپ کے صرف قرآن کی صحیح تعلیم کو پیش نظر رکھا جائے۔ تو کیا مسلم قوم کی اجتماعی قوت زندہ ہو سکتی ہے۔

مورخ وعلم النفس کے ماہرین اس امر پر متفق ہیں کہ قومی ترقی وعروج کے لئے کسی عقیدہ کا ہونا ضروری ہے اور جس قوم کا عقیدہ جس قدر راسخ ہوگا اسی قدر اس میں قوت زیادہ ہوگی۔ مثلاً مذہب اسلام کے ابتدائی زمانہ کو لیجئے کہ عرب کے ان جاہلوں میں وہ کونسی قوت تھی جس کی وجہ سے۔ روم۔ یونان اور ایشیا کی تمام اقوام لرزہ براندام تھیں۔ اور فتح وکامرانی ان جاہلوں کے ارادہ کے ساتھ چلتی تھی۔ میرے خیال میں ان تمام اشخاص یا قوم میں صرف عقیدہ کی قوت کام کر رہی تھی۔ یعنی ان کو بتلایا گیا تھا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ خدا کے حکم سے کر رہے ہو۔ اور اگر تم شہید ہو گئے تو تم کو جنت ملے گی۔ اور جنت میں تم کو یہ آرام وآسائیاں ملیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ یہ جاہل موت کو تلاش کرتے تھے۔

اور موت ان سے گریز کرتی تھی۔ آج آپ جنت و دوزخ کو فرضی نام بتلاتے ہیں۔ مگر اسوقت اس فرضی نام ہی میں یہ قوت تھی کہ انھیں فرضی اعتقادات کے تحت لاکھوں انسانوں نے اپنی جانوں کو متاع حقیر خیال کیا۔ ابتک آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہو۔ ممکن ہے کہ آپ اسکا یہ جواب دیں کہ وہ صرف تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے ہے۔ جاہلوں سے اسکا کوئی واسطہ نہیں مگر آپ کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا ہے کہ جب کسی عقیدہ یا اُصول مذہبی میں بحث و دلیل شروع کر دیجائے اور عوام کو مشاہدات و احساسات کی روشنی میں عقیدہ یا اُصول کی پرکھنے کی عادت ڈالدیجائے۔ تو پھر نہ اُصول باقی رہتا ہے نہ عقیدہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمدنی ترقی کے اسباب مفقود ہوجاتے ہیں اور قوم پر ایک قسم کا جمود طاری ہو کر دور وحشت لوٹ آتا ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ عقیدہ یا ایمان کو جب تک عقل سلیم قبول نہ کرے۔ انسان کیونکر تقلید گوارا کر سکتا ہے۔ میری رائے میں آپ کا یہ مشورہ صحیح نہیں ہے۔

دنیا میں جب کبھی قومی انقلابات ہوتے ہیں۔ تو کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ ان انقلابات میں کتنے انشاپرداز۔ اڈیٹر۔ منطقی و فلاسفر شامل ہوتے ہیں غالبًا اس کا جواب نفی میں ہوگا۔ انقلابات کے بانی صرف مذہبی لوگ ہوئے ہیں جنھوں نے اصول و اعتقادات اور ان کی حمایت میں اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کیا۔ آج بھی آپ روزانہ کا عمل دیکھ رہے ہیں کہ آپ کسی واقعہ کو مذہبی رنگ دیکر سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی قربانی کرا دیجئے۔ برخلاف اس کے آپ کسی منطقی دلیل سے کسی ایک انسان کی بھی بھینٹ نہیں چڑھا سکتے۔ چنانچہ آج بھی آپ کو ہر قوم میں لاکھوں آدمی ایسے مل سکتے ہیں جو اپنے اُصول و اعتقادات کے تحت اپنی جانوں کو بیدریغ قربان کر سکتے ہیں۔ حالانکہ آپ ان اُصول و اعتقادات کو مجموعہ خرافات خیال کرتے ہیں۔

میرے خیال میں کسی قوم کی اجتماعی اور تمدنی ترقی کے لئے کسی اُصول و عقیدہ کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ خواہ وہ اصول یا عقیدہ صحیح ہو یا غلط۔ کیونکہ بغیر اس کے کامیابی ہونا ناممکن ہے۔ اگر بقول آپ کے تمام اسلامی عقاید مثل جنت دوزخ۔ معجزات۔ کتب الہامی۔ معراج و حیات بعد الموت۔ وغیرہ جن سب سے آپ کو انکار ہے۔ اگر آج ان کل عقاید کو کل دنیا کے ہر مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ تبلایئے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ یا حل پیش کرتے ہیں۔ جس سے وہ تمام فواید جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں، آیندہ حاصل ہو سکتے ہیں۔ کسی عقیدہ کے قوت و نفوذ کو وہی عقیدہ ضعیف کر سکتا ہے۔ جو قوت و نفوذ میں اُس کے برابر ہو۔ اس بناء پر ایمان کا دشمن ایمان ہی ہو سکتا ہے۔ رہا یہ امر کہ مولوی۔ مُلّاان عقیدہ یا اُصول سے ناجایز فایدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور گمراہی پھیلاتے ہیں اور اُنھوں نے اس کو اپنی معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تو جناب والا اس کے لئے خواہ کتنی ہی کوشش کریں۔ یہ طبقہ برابر فائدہ اُٹھاتا رہیگا اور کوئی دلیل یا منطق ان کو اس فعل سے باز نہیں رکھ سکتی۔ جب تک مثل ایران۔ ٹرکی اس طبقہ پر پابندیاں عاید نہ کر دیجاویں۔ اور ان کو خود حلال کی روزی کمانے پر قانونًا مجبور نہ کر دیا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اب تک آپ نے جو کچھ اعتقادات و اُصول کے خلاف تحریر فرمایا ہے۔ وہ اگر صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کا نتیجہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے۔ کہ ۹۵ فیصدی غیر تعلیم یافتہ طبقہ جو معتقدات پر سختی سے عامل ہے اور جو اس کے موروثی عادات کا جزو ہو گئے ہیں۔ اور جن کے تمام اعمال میں معتقدات سرایت کر گئے ہیں ان کو غلط راستہ پر ڈال دیا جائے اگر آپ ان کو بھی صحیح راستہ بتانا چاہتے ہیں تو مہربانی فرما کر اس خام ایمان کے مقابلہ میں کوئی پختہ ایمان تجویز فرمایئے۔ جو ان کی ذہنیت اور ماحول کے مطابق ہو۔

دنیا آپ کی تخریبی پروگرام سے تو واقف ہو چکی ہے۔ اب تعمیری پروگرام کا انتظار کر رہی ہے۔ فقط

(نگار) آپ کی تحریر کا خلاصہ غالباً صرف اس قدر ہے کہ:۔

۱۔ رسم و رواج یا اعتقادات کا وجود قومی ترقی کے لئے ازبس ضروری ہے اور

۲۔ عقاید کو علم یا عقل کی روشنی میں دیکھنا اجتماعی زندگی اور تمدنی ترقی کے مانع ہے۔

اور انھیں دو بنیادی اُصول پر آپ نے محاکمہ کرتے ہوئے میری مذہبی آزادی کو مضرت رساں اور جہلاء کے عام عقاید کو مفید ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اس باب میں آپ کا غلو اس حد تک پہونچ گیا ہے کہ خالص قرآنی تعلیم کو بھی آپ کافی نہیں سمجھتے۔ گویا بہ الفاظ دیگر آپ کا کہنا یہ ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کا راز صرف یہی تھا کہ وہ حشر و نشر دوزخ و جنت وغیرہ کے قایل تھے اور اگر اب ان کو اس عقیدہ سے ہٹایا جائے گا تو وہ یقیناً گمراہ ہو کر اپنی قومی و اجتماعی زندگی تباہ کر لیں گے۔

آپ کے اس بیان میں نظر بہ واقعہ و حقیقت جتنا اختلاف و تضاد پایا جاتا ہے اور بہ لحاظ نتیجہ آپ کا استدلال جس درجہ نادرست ہے، افسوس ہے کہ وکیل ہونے کی حیثیت سے بھی آپ کی نگاہ اس پر نہیں گئی، اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کا کیا ذکر ہے۔

میرے عزیز دوست افسوس ہے کہ آپ نے اس مسئلہ پر غور کرنے سے قبل اعتقاد اور معتقدات کے فرق و امتیاز کا کوئی لحاظ نہیں کیا۔ ایک چیز "اعتقاد" ہے یعنی وہ کیفیت یقین جو ہمارے نفس میں پائی جاتی ہے اور دوسری چیز "معتقدات" یعنی وہ مسایل جن سے ہماری کیفیت یقین متعلق ہے اور ان دونوں کا فرق ظاہر ہے۔

پھر یہ تو آپ بھی کہتے ہیں کہ اعتقاد نام ہے ایک ایسے یقین کا جس میں ادنیٰ شائبۂ ریب و شک کی گنجایش نہیں لیکن شاید اس حقیقت کی طرف آپکی نگاہ نہیں گئی کہ یقین نام ہے اس کیفیت کا جو استدراک و شعور کے ماتحت نفس انسانی میں پیدا ہوتی ہے ـــ اس لئے آپ کا "یقین کی منزل" کو عقل و استدلال کی دسترس سے باہر سمجھنا بالکل ایسا ہی ہے جیسا آپ کا کسی ملزم کی صفائی میں عدالت کے سامنے یہ کہدینا کہ اس نے

جُرم کیا ہے اور اسی لئے اس کو سزا نہ ملنی چاہئے۔

بہر حال درجاتِ یقین میں کوئی پست ترین درجہ بھی ایسا نہیں ہے جو بغیر شعورِ نفس کی مدد کے حاصل ہو جائے اور چونکہ قوتِ شاعرہ بڑی حد تک تربیت و ماحول، اسباب و حوادث خارجی سے متاثر ہوتی رہتی ہے اس لئے یہ ضرور نہیں کہ ہر زمانہ میں ہر ملک و قوم کا شعور نفس ایک ہی طرح کا ہو۔ ذوق و وجدان کے اس اختلاف کی صراحت بیکار ہے کیونکہ اس سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا۔ وہی ایک چیز جو میرے لئے قابل قبول ہے آپ کے لئے نہیں، اور جو آپ کے نزدیک واضح نہیں ہے وہ میرے لئے کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ بہر حال آپ کا یہ کہنا کہ مذہب و اعتقاد کے باب میں عقل و شعور کو درخور حاصل نہیں! اصولاً و طبعاً بالکل غلط ہے۔ ایک بُت پرست اگر پتھر کی مورتی کو پوجتا ہے تو اس کیفیت شعور کے ساتھ کہ واقعتاً وہی اس کے مقاصد کو پورا کرنے والی ہے اور آپ خدائے واحد کی پرستش کرتے ہیں تو بھی اس احساس کے ساتھ کہ وہی مستجاب الدعوات ہے۔ اس لئے جس حد تک "اعتقادِ محض" کا تعلق ہے، کفر و اسلام میں کوئی فرق نہیں، لیکن "معتقدات" کے باب میں تمام مذاہب ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور یہیں سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ یہ اختلاف حقیقتاً شعور و ادراک کا اختلاف ہے، استدلال و استنتاج کا اختلاف ہے، عقل و طبایع کا اختلاف ہے اور اس لئے آپ کا یہ کہنا کہ "معتقدات مذہب" کو علم و عقل سے علحدہ رکھنا چاہئے نفسیاتی اُصول کے لحاظ سے بالکل ناقابل عمل اور داعیاتِ فطرتِ انسانی۔ کے بالکل منافی ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی قوم کی ترقی و عروج کے لئے کسی نہ کسی عقیدۂ راسخ کا پایا جانا بالکل ضروری ہے، کیونکہ جب تک کوئی غرض مشترک نہ ہو اجتماعی مرکزیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ اس اُصول کو سامنے رکھ کر آپ یہ کیونکر ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ عقیدۂ راسخ جو ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے اسلام کے سوا کسی اور جگہ نہیں پایا جاتا۔

آپ کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ عرب کے جاہلوں کی بیداری اسلام ہی کی ممنون تھی اور ہو سکتا ہے کہ ان کا یہ تمام جوش و ولولہ صرف اس عقیدہ کی بناء پر ہو کہ انھیں مرنے کے بعد "حور مقصورات فی الخیام" مرحمت ہوں گی۔ لیکن کیا میں اپنے فاضل دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ اسلام سے پہلے جتنی قومیں ترقی کر چکی تھیں کیا وہ سب انھیں معتقدات کی قایل تھیں جو اسلام نے پیش کئے اور اب جو ممالک ترقی کر رہے ہیں اس کا سبب بھی ہے کہ وہ مسلمانوں کی طرح حیات بعد الممات، حشر و نشر اور دوزخ و جنت کے قایل ہیں۔ بحث کا یہ پہلو میں نے اس لئے اختیار کیا ہے کہ آپ ہی کی تحریر کے مطابق ترقی و عروج کا مفہوم صرف فتوحات دنیاوی قرار پاتا ہے، ورنہ شاید میرا طریق بحث اس سے زیادہ نازک و دقیق ہوتا۔ خیر، تو مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ قوموں

کی ترقی کے لئے اتحاد خیال وعقیدہ یقیناً ضروری ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ عقیدہ وہی ہو جو اسلام نے پیش کیا ہے۔
آپ نے جاہل عربوں کی فتوحات کا تو ذکر کیا، لیکن میدیوں اور کلدانیوں کے عروج، یونان و روما کی فتوحات، قدیم مصریوں کی شوکت و جبروت، ہند و چین کی دولت و ثروت اور موجودہ عیسوی قوموں کے ارتقاء کو نظر انداز کر گئے۔ کیا ان سب کے معتقدات وہی تھے جو اسلام نے پیش کئے اور کیا تاریخ میں بت پرست قوموں کی فتوحات و ترقی کا حال آپ کی نگاہ سے نہیں گزرا۔ پھر آپ کا یہ کہنا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب صرف اُن کے معتقدات تھے درست نہیں۔ کیونکہ ان معتقدات کے علاوہ دوسرے عقاید کے ماننے والوں نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں ترقی کی اور آیندہ بھی جب آسمانی مذاہب کا خیال بھی لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا، ترقی کا دروازہ بدستور کھُلا رہیگا اور ایک قوم دوسری قوم پر غلبہ پانے کی اسی طرح کوشش کرتی رہیگی۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا و درست ہے کہ دنیا کے انقلابات میں انشا پردازوں، اڈیٹروں، منطقیوں اور فلاسفروں نے کوئی حصہ نہیں لیا اور بقول آپ کے یہ مذہب ہی کی کورانہ تقلید کا نتیجہ تھا کہ لاکھوں آدمیوں نے اپنی گردنیں کٹوادیں، لیکن معاف فرمایئے، اگر مذہب کا مدعا واقعی صرف کشت و خون ہے اور جان لینا اور جان دیدینا ہی اس کا حقیقی مقصود ہے تو شاید انشا پردازوں، اڈیٹروں اور فلسفیوں کو بانیانِ مذاہب کی زندگی پر غبطہ کرنے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوگی۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت دوست!

اس قدر بیان سے غالباً دو باتیں آپ پر واضح ہو گئی ہوں گی۔ ایک یہ کہ اعتقاد و معتقدات ایک دوسرے سے بالکل جُدا دو چیزیں علٰحدہ علٰحدہ ہیں اور دوسرے یہ کہ اجتماعیت کا اصلی راز صرف اشتراک خیال ہے، خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو۔ پھر کیا یہ بات آپ کی سمجھ میں آتی ہے کہ کورانہ عقیدہ تو انسان کی ترقی کا باعث ہو جائے اور وہ عقیدہ راسخ جو علم و تجربہ کے بعد پیدا ہو، انحطاط و زوال کو مستلزم ہو۔

بسوخت عقل زحیرت کایں چہ بوالعجبی ست

معاف فرمایئے، آپ نے شروع ہی سے نفس مذہب اور خصوصیت کے ساتھ تعلیمات اسلام کا مفہوم بالکل غلط قرار دیا ہے، آپ سمجھتے ہیں کہ انسانی ترقی نام ہے صرف توسیع حکومت و سلطنت کا اور چونکہ یہ بغیر جنگ و جدل کے ممکن نہیں اس لئے آپ کے نزدیک وہی مذہب سب سے بہتر ہے جس نے سب سے زیادہ خونریزی کی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ بدنصیب ہے وہ مذہب جس کی حمایت کرنے والے ایسی خوں آشام ذہنیت رکھتے ہوں اور لایق صد ہزار تحسین ہے وہ لامذہبیت جو انسانی ترقی کا معیار صرف ذہنی و اخلاقی عروج پر قایم کرنے والی ہو۔ رسول اللہ کا دعویٰ تو یہ تھا کہ اسلام دنیا میں امن و سکون

قائم کرنے کے لئے آیا ہے، انسان کو "نفس مطمئنہ" کی اس لذت سے آشنا کرنا چاہتا ہے جو مادی دنیا سے ماورا، صرف اخلاق کی دنیا سے متعلق ہے اور اسی لئے بانی اسلام کو "رحمۃ اللعالمین" کے لقب سے یاد کیا گیا، لیکن آپ یہ فرماتے ہیں کہ نہیں اسلام نام ہے صرف اُن معتقدات کا جنھوں نے مسلمانوں کو خونریزی پر آمادہ کیا اور چونکہ آپ کے پندار کے مطابق مسلمانوں ہی نے زیادہ خونریزی کی ہے اس لئے تمام مذاہب عالم میں اسلام ہی کو یہ دعویٰ کرنے کا حق حاصل ہے کہ اس سے زیادہ سچا مذہب اور کوئی نہیں۔

آپ نے یہ بھی دریافت فرمایا ہے کہ اگر

"تمام اسلامی عقاید مثل جنت، دوزخ، معجزات، کتب الہامی، معراج، وحیات بعد الموت وغیرہ جن سے آپ کو انکار ہے، آج اگر ان عقاید کو کل دنیا کے مسلمان غلط قرار دیدیں تو پھر یہ بتائیے کہ ان غلط عقاید کے مقابلہ میں آپ کونسا صحیح عقیدہ پیش کرتے ہیں جس سے وہ تمام فواید حاصل ہوں جو ان عقیدوں سے اب تک حاصل ہوئے ہیں"

اس کے جواب میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر موجودہ عقاید کے فواید وہی ہیں جنھوں نے بقول آپ کے روم و یونان کی اقوام کو لرزہ براندام کر دیا تھا اور جو انسانوں کو اپنی جان دینے پر آمادہ کر دیتے تھے، تو میں نہایت ادب سے عرض کروں گا کہ اس لحاظ سے ہلاکو اور چنگیز کے عقاید کیا برے تھے۔ لیکن اگر مذہب کا تعلق حریت فکر و رائے سے بھی ہے تو پھر سوال عقاید جہلا کی پیروی کا نہیں بلکہ ان کی اصلاح کا ہوا کرتا ہے اور اہل علم کو محض اس خیال سے خاموش نہ بیٹھ رہنا چاہئے کہ عوام کو ان کے عقاید سے ہٹانا دشوار ہے۔ اگر دوزخ و جنت یا حیات بعد الممات کا عقیدہ انسان کو آمادۂ عمل کر سکتا ہے تو اس عقیدہ کا انکار بدرجۂ اولیٰ جدوجہد پر آمادہ کرنے کی اہلیت اپنے اندر رکھتا ہے، کیونکہ اُس صورت میں تو سب کچھ "وعدۂ فردا" پر منحصر ہے اور اس صورت میں معاملہ "نقد سودے" کا ہے۔

آپ کو علم نہیں، مجھ سے پوچھئے کہ اس وقت تعلیم یافتہ ممالک میں مذاہب کی طرف سے کیسی عام بیزاری پیدا ہو رہی ہے اور مذہبیت کے خلاف کیسی سخت باضابطہ جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اس کا سبب حقیقتاً یہ نہیں ہے کہ نفس مذہب سے ان کو عناد ہے بلکہ اس کی وجہ وہی عقاید کی لغویت ہے۔ اس لئے اس زمانہ میں اگر کوئی مذہب قایم رہ سکتا ہے تو صرف وہی جو اپنے عقاید کے لحاظ سے ترقی علم کا ساتھ دے اور ایسا پروگرام دنیا کے سامنے پیش کرے جو باوصف اختلاف نسل و رنگ ساری دنیا کو ایک مرکز پر لے آنے والا ہو۔

اگر آپ نے گزشتہ ماہ کا نگار ملاحظہ فرمایا ہے تو مجھے بتائیے کہ ملاحظات میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو ناقابل عمل سمجھنے میں آپ کے پاس کیا دلایل ہیں اور اگر اسلام کا وہی مفہوم قرار دیا جائے جو اس میں ظاہر کیا گیا ہے تو کیا

کسی فرشتۂ عذاب کے نازل ہونے کا اندیشہ ہے ۔۔ آپ اس کے جواب میں کہیں گے کہ اسلام کی تعلیم تو وہ نہیں ہے جو اس میں ظاہر کی گئی ہے۔ میں کہوں گا کہ سوائے اس کے کوئی اور مقصد اسلام کا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ تاریخ اسلام سے استدلال کریں گے، میں تعلیم اخلاق کو پیش کروں گا، یعنی آپ مسلمانوں کا حال دیکھ کر اسلام کا مفہوم متعین کریں گے، اور میں اسلام کے مفہوم سے مسلمانوں کا جایزہ لوں گا۔ آپ فرمائیں گے کہ اسلام نام ہے دوزخ وجنت کے عقیدہ کا، میں عرض کروں گا کہ اسلام کا مدعا صرف نوع انسانی کی فلاح و بہبود ہے، ان عقاید سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ممکن ہے کہ اس "تو تو میں میں" میں آپ کامیاب ہو جائیں کیونکہ آپ ٹھہیرے مسلمان جس کے نزدیک جان دیدینا اور لے لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن جس وقت سوال صلح و آشتی کا پیدا ہوگا اور اسلام کو ایک عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کی ضرورت ہوگی، تو اس وقت آپ کی یہ جنگجویانہ تعبیر بیکار ثابت ہوگی (کیونکہ میدان جنگ وجدل میں بھی اس وقت وہی قومیں آپ سے زیادہ کامیاب ہیں جو جنت و دوزخ وغیرہ کے عقاید کو بالائے طاق رکھ چکی ہیں۔) اور آپ کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک مذہب کے لئے یہ امر کبھی وجہ افتخار نہیں ہو سکتا کہ اس نے جہلا کو اُن کے جہل پر برقرار رکھا بلکہ اس کا سب سے بڑا فخر یہ ہونا چاہیئے کہ اس نے ذہنی ترقی کے لئے نئی نئی راہیں کھولدیں اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک مذہب، علم وعقل کو مشعل راہ نہ بنائے۔

جنوری ۳۶ء کے نگار

میں کیا ہوگا

ہندی شاعری کی مفصل تاریخ ۔ ہندی کلام کا بے نظیر انتخاب ۔ اساتذۂ فن کے دلچسپ حالات ۔ برج بھاشا کے نوادر پر فاضلانہ نقد و تبصرہ ۔ برہن شاعری کے بے مثل نمونے ۔ ہندی کے عاشقانہ رنگ کے عجیب و غریب دوہے ۔ ہندوستان کی گوپیوں کی شاعری ۔ قیمت فی پرچہ دو روپیہ ۔ نگار کے سالانہ خریداروں سے کچھ نہیں ۔ نگار کا سالانہ چندہ پانچ روپیہ ہے ۔

منیجر نگار لکھنؤ

مکتوبات نیاز

ادب و انشاء کی دنیا میں وہ چیز جس کی مثال آپ کو اردو زبان میں مل ہی نہیں سکتی۔ طنزیات و محاکات شوخی و رنگینی سلاست و بیساختہ پن، لطیف و پاکیزہ اشعار کا محل استعمال، جذبات کی پاکیزگی، طرز ادا کی ندرت، اگر آپ ان تمام خوبیوں کو یکجا دیکھنا چاہتے ہیں تو وہ آپ کو صرف "مکتوبات نیاز" میں نظر آئیں گی اس میں حضرت نیاز کی تازہ تصویر بھی شامل ہے اور ان کی تحریر کا بلاک بھی ۔ ضخامت ۲۸۰ صفحات ۔ کاغذ دبیز ۔ قیمت معہ محصول عہ ۔ کتاب مجلد شایع ہوئی ہے ۔

منیجر نگار ۔ لکھنؤ

باب الاستفسار

فارسی زبان اور طنزیات

(جناب سید فضل الدین صاحب۔ دھرمپور)

میں (Satire) پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں اور اس سلسلہ میں مجھے فارسی کی طنزیہ شاعری کا مطالعہ کرنا ہے۔ براہ کرم مطلع فرمائیے کہ اس کے لئے کیا تدبیر اختیار کروں۔ جناب رشید احمد صاحب صدیقی کا ایک مضمون اس موضوع پر نکل چکا ہے، لیکن اسکا تعلق زیادہ تر اُردو سے ہے۔ تمہید و مقدمہ میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ زیادہ بسیط نہیں اور فارسی زبان کی طرف تو کوئی توجہ ہی نہیں کی گئی، امید ہے کہ جلد سے جلد جواب دینے کی زحمت گوارا کی جائے گی۔

(نگار) فارسی میں "طنزیہ شاعری" ایک خاص صنف کی حیثیت رکھتی ہے اور اگر اسی میں ہجو کو بھی شامل کر لیا جائے تو پھر یہ دفتر اتنا وسیع نظر آتا ہے کہ شاید ہی کسی دوسری زبان کی شاعری اس کا مقابلہ کر سکے۔

اس موضوع پر آپ کو کوئی خاص تصنیف تو ملیگی نہیں، البتہ اگر آپ شعراء فارس کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ فرمائیں گے تو کافی ذخیرہ ہاتھ آجائے گا۔ مہرجی بھائی نوشیرواں جی کوکا ام۔ اے نے انگریزی میں فارسی لطائف وظرائف پر ایک کتاب لکھی ہے اور اس میں بعض مثالیں طنزیہ شاعری کی بھی دی ہیں، اسے ملاحظہ فرمائیے۔ چند یہاں درج کئے دیتا ہوں، جن سے معلوم ہوگا کہ صرف انداز بیان کی ندرت سے کیسی پاکیزہ صورتیں ہجو و طنز کی پیدا کی گئی ہیں:۔

ا۔ خواجہ نصیر کو کسی امیر نے کافر کہدیا تھا۔ اس نے جلکر دو شعر کا ایک قطعہ لکھا جو شاعر و امیر دونوں سے

زیادہ مشہور ہوا اور ابتک دنیا میں موجود ہے۔ لکھتا ہے:۔

نظامِ بے نظام ار کافرم خواند — چراغِ کذب را نبود فروغے
مسلماں خوانمش زیرا کہ نبود — سزاوار دروغے جز دروغے

بدتمیز امیر نے مجھے کافر کہا حالانکہ جھوٹ کا چراغ عرصہ تک روشن نہیں رہتا۔ بہرحال میں اُس کو مسلمان ہی کہوں گا کیونکہ جھوٹ کا جواب جھوٹ ہی ہوا کرتا ہے۔

۲ــ بالکل اسی انداز کا ایک قطعہ کمال الدین اسماعیل کا بھی ہے ملاحظہ ہو:۔

گر خواجہ بہر ما بدی گفت — ما چہرہ زغم نمی خراشیم
ما غیر نکوئی اش نگوئیم — تا ہر دو دروغ گفتہ باشیم

اگر خواجہ نے مجھے بُرا کہا تو رنج کی کیا بات ہے، میں اسے اچھا کہوں گا تاکہ دونوں کا جھوٹ برابر کا رہے

۳ــ جمال الدین اصفہانی کو کسی رئیس نے شراب تحفتاً بھیجی جو اُس کے لئے بہت ہلکی تھی اور اُسے پسند نہیں آئی اس نے چار شعر کا ایک قطعہ لکھ کر جن الفاظ میں شکریہ ادا کیا ہے، وہ سننے کے قابل ہیں:۔

اے کریمے کہ دام منت را — کرم و بخشش تو دانۂ ماست
از تو مارا شکایتے ست لطیف — واں نہ از تست کز زمانۂ ماست
آں چہ مے بود کم فرستادی — کہ ہمہ شہر بر فسانۂ ماست
اگر آنرا شراب شاید خواند — چاہِ ما پس شرابخانۂ ماست

یعنی یہ آپ نے کیسی شراب بھیجی کہ اگر واقعی اس چیز کا نام شراب ہو سکتا ہے تو میں اپنے گھر کے کنوئیں کو کیوں نہ شراب خانہ کہوں، جس میں ہر وقت ایسی شراب موجود رہتی ہے۔

۴ــ شہاب ترشیزی نے کسی کی ہجو میں دو شعر لکھے ہیں بیان کا ارتقاء ملاحظہ ہو:۔

زبہر تاختن در وادی ہجو — سمندِ طبع را چوں رام کردم
ترا خر خواندم و گشتم پشیماں — کہ آں بیچارہ را بدنام کردم

یعنی تجھے خر کہا اور یہ کہکے پشیمان ہوا کہ ناحق بیچارے گدھے کو بدنام کیا۔

۵ــ ایک بار مولانا جامی کو کسی شاعر نے غزل سنائی جو نہایت مہمل تھی لیکن اس میں التزام اس بات کا تھا کہ حرف (الف) کہیں نہیں پایا جاتا تھا۔ شاعر نے اس صنعت کی طرف مولانا جامی کو خاص طور سے توجہ دلائی انھوں نے جو داد دی ہے وہ سننے کے قابل ہے:۔

بشاعرے خواند پُر خلل غزلے — کیں بہ حذفِ الف بود موصوف

گفتمش نیست صنعتے بہ ازاں — کہ کنی حذف ازاں تمام حروف

یعنی اگر الف کے ساتھ ہی غزل کے سبھی حروف حذف کر دیئے جاتے تو زیادہ مناسب تھا۔

۶ — تاج الدین سرخسی نے کسی ظالم شخص کی موت پر ایک رباعی لکھی تھی، اس کی طنزیہ شان ملاحظہ ہو:۔

در ماتمت آں قوم کہ خوں می بارند — مرگِ تو حیاتِ خویش می پندارند
غمناک ازانند کہ تا دوزخیاں — جاوید چگونہ با تو صحبت دارند

یعنی تیرے ماتم میں جو لوگ خون کے آنسو بہا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ تیرے مرنے کا انھیں افسوس ہے کیونکہ تیری موت تو حقیقتاً اُن کی زندگی ہے۔ بلکہ غم اس بات کا ہے کہ اہل دوزخ تیرے ساتھ دائمی زندگی کیونکر بسر کر سکیں گے۔

۷ — کمال الدین اسماعیل نے کسی بخیل کا حال ایک رباعی میں لکھا ہے۔ اور انداز بیان میں عجیب مزاح پیدا کیا ہے لکھتا ہے:۔

بہ دہن نانِ خواجہ چوں بردم — خواجہ گفتا کہ آہ من مُردم
گفتمش خواہ میر و خواہ ممیر — کہ من ایں لقمہ را فرو بردم

میں نے خواجہ کے دسترخوان پر روٹی کا نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا تو وہ بولا کہ "آہ میں مر گیا"۔ میں نے اُس سے کہا کہ اب تو مرے یا جیئے، میں تو اس لقمہ کو نگلے بغیر مانتا نہیں،

۸ — عبدالعلی طوسی نے بھی ایک رباعی میں کسی بخیل کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

اے کاسۂ تو سیاہ و دیگِ تو سفید — از آتش و آب ہر دو بریدہ امید
آں شستہ نمی شود مگر در باراں — ویں گرم نمی شود مگر از خورشید

یعنی تیرا سیاہ پیالہ اور تیری سفید دیگ دونوں آگ اور پانی سے بالکل بے نیاز ہیں، کیونکہ پیالہ اگر کبھی دُھلتا ہے تو بارش کے پانی سے اور دیگ اگر کبھی گرم ہوتی ہے تو صرف دھوپ میں۔

۹ — ہجو میں مبالغہ کی ایک نہایت دلکش مثال میرزا ابو قاسم شیرازی کے اس قطعہ میں پائی جاتی ہے:۔

بہ فلاں گفتم اے پسر پدرت — جز بتاریکی از چہ ناں نہ خورد
گفت ترسد ز روشنی کہ مباد — سایہ اش دست سوئے کاسہ برد

میں نے ایک لڑکے سے پوچھا کہ کیا بات ہے تیرا باپ جب کھانا کھاتا ہے تاریکی میں۔ اس نے کہا کہ وہ روشنی سے اس لئے گھبراتا ہے کہ مبادا اس کا سایہ کھانے کی طرف ہاتھ بڑھا دے۔

۱۰ — مولانا شہاب الدین کسی طبیب سے جس کا نام اصیل تھا خفا ہو گئے تو اس کی ہجو میں ایک قطعہ لکھا:۔

ملک الموت از اصیل طبیب — می بنالید بدرگاہ خدائے

کہ جہاں را ز خلق خالی کرد | اندریں دور گم شدہ سر و پائے
یا ازیں شغل دور کن او را | یا مرا خدمتِ دگر فرمائے

یعنی فرشتۂ موت خدا کے حضور میں رو رو کر عرض کر رہا تھا کہ اصیل طبیب نے تو دنیا خالی کر دینے پر کمر باندھ رکھی ہے اس لئے یا تو اس کے لئے کوئی اور پیشہ تجویز کر یا مجھے کسی اور خدمت پر مامور فرما۔

۱۱— کمال الدین اسماعیل کو اس کے خواجہ نے کچھ غلّہ عنایت کیا جو اچھا نہ تھا۔ اس نے تین شعر کا قطعہ شکایت میں لکھا۔ ملاحظہ ہو:۔

غلہ کامسال داد خواجہ مرا | گر نہ بُد جملہ بود اکثر خاک
نسبت خاک و گندمش باہم | ہمچناں بد کہ تخم اندر خاک
خاک مردم خورد، ندانستم | کہ خورد مردم اے برادر خاک

امسال خواجہ نے مجھے غلہ عنایت کیا جو اگر سب کا سب مٹی نہ تھا تو اس کا اکثر حصہ ضرور مٹی تھا، اور اسمیں گیہوں اور مٹی کی نسبت بالکل وہی تھی جیسے مٹی اور تخم کی ہوتی ہے۔ میں سنا کرتا تھا کہ مٹی انسان کو کھاتی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ کبھی کبھی انسان بھی مٹی کھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

۱۲— کاتبی نیشاپوری کو کسی امیر کی طرف سے کوئی سالانہ امداد مقرر تھی لیکن وہ اتنی کم تھی کہ اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ چنانچہ ایکبار اس نے شکایت لکھ بھیجی کہ:۔

خسروا از خورد و پوشِ من نداری آگہی | چوں ننالد سر دم از تو نالہ و افغان مرا
نیستم کعبہ کہ در سالے دہی یک جامہ ام | یا نیم گردوں کہ روزے لبس بود یک ناں مرا

یعنی تو جو میرے کھانے پینے کی طرف سے غافل ہے تو شکایت نہ کروں تو کیا کروں، بندہ نواز، میں کوئی کعبہ تو ہوں نہیں کہ سال میں صرف ایک لباس میرے لئے کافی ہو اور نہ آسمان ہوں کہ روزانہ صرف ایک روٹی پر (کنایہ ہے آفتاب کی طرف) قناعت کر لوں۔

۱۳— کمال الدین اسماعیل کو کسی رئیس نے گھوڑا مرحمت کیا، لیکن شاعر کے پاس خود اسی کے لئے اسباب معیشت تنگ ہوتے ہیں وہ گھوڑے کو کیا کھلاتا۔ اس نے اس واقعہ کو ایک نہایت لطیف مکالمہ کے ذریعہ سے ظاہر کیا ہے:۔

دی اسپ مرا گفت کہ درایں چہ تنگ است | کاصطبل تو از زاویہ ہائے فلک است
نے آب دراں نہ سبزہ نے کاہ نہ جو | ایں جائے ستور نیست جائے ملک است

کل میرے گھوڑے نے مجھ سے کہا کہ تیرا اصطبل اس دنیا کی چیز تو ہے نہیں ممکن ہے کوئی آسمانی

چیز ہو۔ نہ اس میں پانی ہے نہ سبزہ، نہ گھاس ہے نہ جو اس لئے یہاں بجائے گھوڑے کے تو کسی فرشتہ کو لاکر باندھ، میں یہاں کیا کروں گا۔

۱۴۔ رشدی سمرقندی نے وزیر کی مدح میں قصیدہ کہا لیکن کوئی صلہ اس کو نہ ملا۔ اس نے خفا ہو کر دو شعر اور لکھے

تو وزیری و منت مدحت گوئے ۔۔۔ دستِ من بے عطا روا بینی

تو وزارت بمن سپار و مرا ۔۔۔ مدحت گوئے تا عطا بینی

تو وزیر ہے اور میں تیرا مدح گو لیکن مفلس و محتاج۔ تو وزارت میرے سپرد کر اور میری تعریف میں قصیدہ لکھ تو پھر میں بتاؤں کہ انعام و صلہ کیونکر دیا جاتا ہے۔

۱۵۔ عبید زاکانی اپنے افلاس کا حال لکھتا ہے:۔

در خانۂ من ز نیک و بد چیزے نیست ۔۔۔ جز بنگ و پارۂ نمد چیزے نیست

از ہرچہ پزند نیست غیر از سودا ۔۔۔ وز ہرچہ خورند جز لگد چیزے نیست

میرے گھر میں سوائے بھنگ اور نمل کے ٹکڑے کے اور کوئی چیز نہیں۔ پکانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "سودا" اور کھانے کی چیز اگر کوئی ہے تو صرف "لات"۔

۱۶۔ اسیری نے کسی بخیل امیر کے دسترخوان کا حال نہایت لطیف انداز میں بیان کیا ہے۔ لکھتا ہے:۔

ترا اے خواجہ کز امساک بر خواں ۔۔۔ ز نعمتہائے الواں ہیچ اثر نیست

چو مہ بر نطع گردوں سفرہ اترا ۔۔۔ شب از یک گردۂ ناں بیشتر نیست

ولے ہر کو شکست آں گردۂ ناں ۔۔۔ اگرچہ دانم آں حد بشر نیست

کند گر دعوئے اعجاز شاید ۔۔۔ کہ ایں معجز کم از شق القمر نیست

اے خواجہ تیرا دسترخوان آسمان سے کم نہیں کہ وہاں بھی چاند کی صرف ایک روٹی ہے اور یہاں بھی ایک اس لئے اگر کوئی شخص تیرے ساتھ کھانے میں شریک ہو سکے (جس کا بظاہر کوئی امکان نہیں) تو اس کا دعویٰ اعجاز غلط نہ ہوگا کیونکہ اس کا تیرے دسترخوان پر روٹی توڑنا گویا چاند کے دو ٹکڑے کرنا ہوگا۔

ڈراما اصحاب کہف

ابھی طیار نہیں ہوا ہے۔ اس لئے کوئی صاحب ابھی اس کا آرڈر نہ دیں یہ ڈراما ۱۳ جنوری ۱۹۳۶ء کے بعد شایع ہوگا۔ اور صرف انھیں حضرات کو مل سکے گا جو نگار کے خریدار ہیں ــــ جو اصحاب اس کی قیمت بھیج چکے ہیں وہ اسے واپس لے سکتے ہیں اگر اتنا انتظار انھیں گوارا نہ ہو۔

منیجر نگار لکھنؤ

خواتین کے مطالعہ کی کتابیں

- گودڑ کا لال — للعہ
- شوکت آرا بیگم حصہ ۱ و ۲ — سے
- ” حصہ سوم — ۸
- سعیدہ کے خطوط — عہ/
- پیاری سہیلی — ۱۰/
- نئی نویلی پیاری سہیلی — عہ
- عورتوں کی انشا — عہ/
- انشائے نسوان — ۸/
- سیرۃ الکبریٰ — عہ
- حاز زندگی حصہ ۱ و ۲ — عا
- محذرات تیموریہ — عا
- ازواج النبی — ۱۲/
- ازواج الانبیا — عہ
- سیرۃ عائشہ صدیقہ — عا
- عفت المسلمات — عہ
- سبیل الجنان — عا
- بچوں کی پرورش — عہ
- حرز اطفال — عہ/
- تہذیب نسوان — عا
- بیوی کی تعلیم — عہ
- بیوی کی تربیت — عہ/
- تربیت اطفال — ۱۲/

- فرائض مادری — ۱۲/
- افسانہ نادر جہان — عہ
- اقبال دولہن — عہ
- حسن معاشرت — عہ
- ایامیٰ — عہ
- سولہ کہانیاں — ۱۲/
- سترہ کہانیاں — ۱۲/
- سولہ قصے — ۸/
- مراۃ العروس — ۸/
- بنات النعش — ۸/
- توبۃ النصوح — ۱۲/
- کنیز فاطمہ — ۸/
- نیکمر ٹابان — ۸/
- نصیحت کا کرنپھول — ۸/
- برکات سلطانی — ۸/
- ابن الوقت — عہ
- چند پند — ۴/
- منتخب الحکایات — ۴/
- تندرستی — عہ/
- حفظ صحت — عہ
- طبیب نسوان — عہ
- رہبر صحت — ۸/

ناول، ڈرامے اور افسانے

- قطرات اشک — عہ
- جتند عاناقہ — عہ
- بس کا روگ — عہ
- فسانۂ سعید — ۸/
- خوفناک ڈکیتی — عہ
- سیلاب اشک القصور — عہ
- بے زبان دوست — ۶/
- جمال ہمنشین — عہ
- تقصیر عصمت — عہ
- جوہر قدامت — عہ
- تائید غیبی — ۸/
- پراسرار قتل — عا
- اعلان آزادی — ۵/
- سرگذشت حاجرہ — ۱۰/
- نوحۂ زندگی — ۱۲/
- قلب حزین — ۸/
- عروس کربلا — عہ
- شہید مغرب — عہ
- ماہ عجم — عہ
- صبح کمال — عہ
- سراب مغرب — ۸/
- منازل السائرہ کامل — عا

- مومنی — ۱۲/
- وداع ظفر — عہ
- یاسمین شام — عہ
- طوفان اشک — عہ
- شاہین و دراج — ۸/
- درس عشق — عہ
- گرد ربی جور — عہ
- تین بندوق باز — عہ
- کرشمۂ رقابت — ۸/
- انقلاب قسطنطنیہ — ۸/
- شاہد رعنا — عہ
- دیبا کی سرگذشت — ۴/
- شگوفۂ محبت — ۶/
- نسوانی زندگی — ۸/
- ولایتی نجی — ۸/
- شمع خاموش — ۸/
- شب زندگی کامل — عا
- مودودہ — ۸/
- سیندر کلا — ۸/
- گلستان خاتون — عہ
- صبح زندگی — عہ
- شام زندگی — عہ

تاریخ و سوانح عمریاں

- تاریخ مغرب — عہ
- مختصر تاریخ اسلامی — ۸/
- ” ” حصہ ۱ — ۹/
- ” ” حصہ ۲ — ۱۰/
- ” ” حصہ ۳ — عہ
- الصالحات — عہ
- امت کی مائیں — عہ
- الزہرا — ۱۲/
- اسوۂ حسنہ — ۸/
- ہندو شعرار — عہ
- نونہار — عہ
- سوانح اکبر الہ آبادی — عہ/
- سفرنامۂ عراق — عہ/
- تاریخ افاغنہ — عہ
- اسلام اور غیر مسلم — ۸/
- سیر المصنفین حصہ ۱ — عا
- ” حصہ ۲ — سے
- تاریخ اسلام ۵ جلد — عہ
- اخبار الاندلس ۳ جلد — عا
- خلافت موحدین — للعہ
- خلافت مولدین — عا
- عرب اور اسکا مستقبل — عہ

لغات و ادب

- بازاری زبان — ۸/
- لغات سعیدی — للعہ
- لغات کشوری — سے
- گنجینۂ تحقیق مجلد — للعہ
- منتخب اللغات فارسی — عا
- محاورات نسوان — ۸/
- جواہر اللغات — ۴/
- گوہر اللغات — ۱۲/
- چراغ سخن — عہ
- دکھنی لغت — ۸/
- جواہرات کلیات نظیر — عہ
- عزیز اللغات — عا
- تذکرہ ریختی — عہ
- تاریخ اردوے قدیم — عہ
- دکن میں اردو — عا
- منتخب کلام ہندی — عا
- رباعیات عمر خیام — عا
- منتخب کلام ہندی — عہ
- اردو کے اسالیب بیان — عہ
- تصریح الاغلاط — ۴/
- مفیص اردو — ۵/
- نور اللغات ۴ جلد — للعہ

دواوین فارسی

- دیوان شمس تبریز — عہ
- کلیات عراقی — ۱۲/
- دیوان حافظ — عہ
- دیوان بیدل — عہ
- دیوان عرفی — ۱۲/
- کلیات جامی — عا

- کلیات غالب — عہ
- کلیات صائب — عہ
- دیوان ناصر علی — ۸/
- کلیات سعدی — عہ
- کلیات حزین — عہ
- دیوان عنصری — ۴/

- دیوان غنی کشمیری — ۶/
- دیوان ہلالی — ۶/
- اسرار خودی و رموز — سے
- زبور عجم — سے
- پیام مشرق — سے
- قصائد عزیز مجلد — سے

دواوین اردو

- کلیات ظفر — عا
- کلیات مومن — عہ
- دیوان ناسخ — عہ
- کلیات میر — عہ
- کلیات سودا — عہ
- کلیات انشا — عہ

- کلیات نظیر اکبر آبادی — عہ
- گلزار داغ — عہ
- دیوان زند — ۱۲/
- دیوان ذوق — ۱۲/
- گلکدۂ عزیز — عہ
- مراۃ الغیب — عہ

- صنم خانۂ عشق — عا
- فریاد داغ — عہ
- عالم خیال با تصویر — عہ
- دیوان شہیدی — عہ
- کلیات اکبر الہ آبادی — للعہ
- نغمۂ دل شاہجہانپوری — عہ

تذکرہ و تاریخ

- پیغمبر اعظم
- شب معراج
- سراج منیر
- پیغمبر عالم
- سوانح حضرت رسول
- سید المرسلین
- حیدر کرار
- سیرۃ الصدیق
- عمر ابن خطاب
- ابوبکر صدیق
- ائمہ اسلام
- الحبیب
- عمر بن عبدالعزیز
- دولت فاطمیہ
- مکمل مجموعہ زیب النساء بیگم
- تذکرہ اولیا
- تذکرہ اولیائے ہند
- مراۃ الکونین
- قصص الانبیا مکمل
- سفرنامہ چین
- تکمیل التاریخ
- خاتون جنت
- ارشادات الصوفیہ
- خواتین اگرہ
- مشاہیر نسوان
- مشاہیر ہند
- فتوحات تیموریہ
- فتوحات بنگال

جاسوسی کی ناول

- شرلاک ہومز
- محاصرہ پیرس
- شیخ چلی
- بہرام کی واپسی
- انقلاب فرانس
- بحری قزاق
- قطرتی جاسوس
- ترکی حرم سرا
- جنگ طرابلس
- بہرام چور
- زر پرست
- کنجی کا راز
- عبدالرحمن ناصر
- عروس مصر
- سیلاب خون
- سیاحت زمین
- سیاحت ہوا
- تا زمین مراکش
- سمندر کی سیر
- اسرار بالشوزم
- درج لیلیٰ
- امین بک
- حجاج بن یوسف
- یوسف پاشا
- انقلاب عثمانی
- بہرام کی رہائی
- بہرام کی آزادی
- بہرام کی سرگزشت

مراثی

- مراثی دبیر
- مراثی انیس کامل
- مراثی ضمیر
- مراثی یونس
- مراثی دلگیر

عجائب غرائب

- عجائب مخلوقات
- تصویر رنگین
- بلا تصویر سادہ
- مجمع الفنون
- طلسم فرنگ
- کارخانہ عالم

رینالڈز کے ناولوں کے ترجمے

- السدین ولیلیٰ
- فریب حسن
- سوزن عشق
- روزا لیمبرٹ
- ناول اسرار
- شام جوانی
- حرم سرا

ناول سجاد حسین

- احمق الذین
- حاجی بغلول
- پیاری دنیا
- کایا پلٹ
- میٹھی چھری
- طرحدار لونڈی
- طلسمی فانوس

ناول جوالا پرشاد

- مرزا لنی
- مار آستین
- بنگالی دولہن
- معشوقہ فرنگ
- پرتاب
- زوبنی

ناول سرشار

- سیر کہسار
- خدائی فوجدار
- جام سرشار
- الف لیلہ بطرز ناول
- کامنی
- سوانح عمر و عیار

ظفر عمر بی اے

- چوروں کا کلب
- نیلی چھتری
- بہرام کی گرفتاری

ادبی کتابیں

- مکمل شرح دیوان غالب
- بزم خیال
- مشاطۂ سخن
- مکاتیب محسن الملک

تذکرۃ الشعراء

- تذکرہ حیینی
- گلشن بےخار
- سراپائے سخن
- سوانح نظیر اکبرآبادی

ناول شرر

- جنید بغدادی
- مخدرات
- چوپائے حق
- لعبت چین
- فاتح و مفتوح
- بابک خرمی
- ایام عرب
- قیس ولبنیٰ
- یوسف و نجمہ
- زوال بغداد
- حسن کا ڈاکو
- دربار حرام پور
- میا بازار
- مقدس نازنین
- دودستہ اکبر علی
- فلپانا
- شوقین ملکہ

مولانا شبلی نعمانی

- سیرۃ النبی جلد اول
- سیرۃ النبی جلد دوم
- سیرۃ النبی جلد سوم
- الفاروق
- الغزالی
- المامون
- رسائل شبلی
- موازنۂ انیس و دبیر
- کلام شبلی اردو
- الکلام
- علم الکلام
- شعر العجم جلد اول
- شعر العجم جلد دوم
- شعر العجم جلد سوم
- شعر العجم جلد چہارم
- شعر العجم جلد پنجم

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

ہر قسم کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

رجسٹرڈ نمبر ال ۱۱۰۴

رجسٹرڈ نمبر ال ۱۱۰۴